530

صاحب المثنوی

قاضی تلمذ حسین مرحوم

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند)

جملہ حقوق محفوظ

سلسلۂ دار المصنفین

(۹۸)

صاحب المثنوی

یعنی

اسلام کے مشہور صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومیؒ کی مفصّل محققانہ سوانح عمری

مؤلفہ

قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم

معارف پریس اعظم گڑھ میں چھپی
۱۳۸۶ھ
۱۹۶۷ء

فہرستِ مضامین

صاحب المثنوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

مولانا جلال الدین رومیؒ بہت بڑے صوفی اور عارف باللہ بھی تھے اور متکلم اسلام بھی، انھوں نے مثنوی میں جس دلنشین طریقوں سے اسلامی عقائد واعمال اور تصوف کے مسائل کو سمجھایا ہے، اس کی نظیر کسی دوسری کتاب میں مشکل سے مل سکتی ہے، اس لیے اس کو علماء و مشائخ دونوں میں بڑی مقبولیت حاصل رہی ہے، اور مشائخ میں تو اس کو صحیفۂ تصوف کا درجہ حاصل ہے اور اس کا باقاعدہ درس ہوتا ہے، ہندوستان کے علماء و مشائخ نے علمی حیثیت سے بھی اس کی جانب بڑا اعتناء کیا اور اس کی شرحیں اور حواشی لکھے، اردو میں سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم نے مولانا روم کی سوانح عمری لکھی لیکن اس میں سوانح کا حصہ بہت مختصر ہے، زیادہ زور مثنوی کی خصوصیات دکھانے میں صرف کیا گیا ہے، جو مصنف کا اصل مقصود تھا، سوانح کی اس کمی کو قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد نے پورا کیا،

قاضی صاحب مرحوم وسیع النظر، فاضل اور نامور اہل قلم تھے، ان کو مثنوی اور صاحب مثنوی سے بڑی عقیدت تھی، مثنوی کا انھوں نے برسوں مطالعہ کیا تھا، اور ان سے متعلق کئی کتابیں لکھیں، مرأۃ المثنوی، نقد المثنوی اور صاحب مثنوی، مرأۃ المثنوی میں انھوں نے مثنوی شریف کو نئے طریقے سے مرتب کیا ہے جس سے اس کی حکایتوں میں تسلسل قائم ہوگیا ہے اور اس کے مطالعہ میں بڑی سہولت پیدا ہوگئی ہے، یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں بڑے اہتمام سے حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہے،

صاحب مثنوی، مولانا رومی کی نہایت مبسوط و محققانہ سوانح عمری ہے، یہ کتاب بھی اسی زمانہ میں لکھی جاچکی تھی، چنانچہ اس کا ذکر مرأۃ المثنوی کے دیباچہ میں موجود ہے، مگر مصنف مرحوم کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی، اور ان کی وفات کے بعد برسوں ان کے ورثہ کے پاس پڑی رہی، ایک جوہر شناس (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) کی نگاہ اس پر پڑی، ان کے مشورہ سے دارالمصنفین نے اسکو خرید لیا، مصنف نے جس تلاش و تحقیق سے یہ کتاب لکھی ہے، اور ایک ایک واقعہ کی جس دقت نظر سے تحقیق کی ہے اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہوگا، اس لحاظ سے اردو کیا دوسری زبانوں میں بھی مولانا روم کی ایسی مبسوط و محققانہ سوانح عمری نہیں نکل سکتی، کتاب کے آخر میں مولانا کے صاحبزادے سلطان ولد کی مثنوی بھی ہے، جو پہلی مرتبہ شائع ہو رہی ہے،

بعض مجبوریوں کی بنا پر اس کتاب کی کتابت باہر بھیجکر ایک نئے کاتب سے کرانا پڑی، دارالمصنفین کے مصحح صاحب نے بھی تصحیح کی طرف پوری توجہ نہ کی، اس لیے کتابت میں مختلف قسم کی غلطیاں رہ گئیں طباعت کے بعد جو اہم غلطیاں نظر آئیں اُن کی کسی نہ کسی طرح تصحیح کر دی گئی، اور چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی تصحیح کے لیے صحت نامہ لگا دیا گیا ہے. کتاب میں کئی ضمیمے تھے، ایک ضمیمہ میں مولانا روم کے زمانہ کے مشہور سلاسل صوفیہ اور ان کے ہمعصر اور قریب العہد صوفیہ کے حالات تھے، یہ نامکمل تھا اور غیر ضروری بھی، اس لیے اس کو نکال دیا گیا ہے، باقی ضمیمے موجود ہیں۔

دارالمصنفین کی طلائی جبلی کے موقع پر حکومت ہند نے جو عطیہ دیا تھا، یہ کتاب اس کے صرف سے شائع کیگئی ہے، اس کیلئے ہم جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب نائب صدر جمہوریہ ہند کے شکر گذار ہیں۔

فقیر معین الدین احمد ندوی

۱۵ مارچ ۱۹۶۷ء

دارالمصنفین، اعظم گڈھ

فصلِ اوّل

اصلُ ثابتٌ وفرعُ ثابتٌ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اصل ثابت و فرع ثابت

ظاہرا آن شاخ اصل میوہ است   باطناً بہر ثمر شد شاخ ہست

جس ناہج مناہج شریعت و سالک مسالک طریقت کا ذکر خیر زبان قلم کو گویائے اسرار اور صفحۂ قرطاس کو آئینۂ انوار بنانیوالا ہے، اس سلطان العارفین و خاتم الکاملین کا نام نامی محمد، لقب جلال الدین، خطاب خداوندگار[1] اور عرف مولانا رومی تھا،[2] اور اسی لئے

---

[1] یہ خطاب مولانا کے والد بزرگوار حضرت بہاء الدین ولد کا عطا کردہ تھا۔ اور مولانا ابھی خورد سال ہی تھے۔ کہ حضرت بہاء الدین اسی خطاب سے آپ کو مخاطب فرمایا کرتے تھے۔ "تاریخ گزیدہ" میں مولانا کے نام کے ساتھ ایک اور خطاب "بہاء الدولہ" مندرج ہے اور صرف ایک جگہ نہیں بلکہ دو جگہ (صفحہ ۷۰۹، ۷۹۱) آیا ہے مگر کسی اور تاریخ یا تذکرے میں یہ خطاب نظر سے نہیں گزرا۔ "تاریخ گزیدہ" مولانا کے انتقال کے تھوڑے ہی زمانہ بعد یعنی سنہ ۷۳۰ھ و ۷۳۵ھ کے مابین لکھی گئی ہے، (اور یہ وہی زمانہ ہے جب افلاکیؒ مناقب العارفین کی جمع و ترتیب میں مشغول تھے) مصنف تاریخ گزیدہ (حمد اللہ المستوفی رشید الدین فضل اللہ صاحب جامع التواریخ مشہور بہ تاریخ رشیدی) کے مصاحبوں میں داخل تھے۔ خود بھی بلند پایہ امراء میں تھے، اور ان کے برادر عمزاد فخر الدین محمد مستوفی، غیاث الدین مسعود (سنہ ۶۹۲ھ / ۱۲۹۳ - سنہ ۶۹۲ھ / ۱۱۵۶) کے عہد میں وزارت دوم پر فائز تھے۔

اس کتاب مین بھی یہ التزام۔ کیا گیا ہے کہ جب تک کوئی خاص ضرورت داعی نہ ہوگی اس اکمل الکاملین کی طرف صرف لفظ "مولانا" کی اشارت کافی سمجھی جائیگی،

(باقی حاشیہ ص ۱) تاریخ گزیدہ ص ۴۰۵) ان وجوہ سے اس باب مین حمد اللہ کے معلومات کے صحیح ہونے کا پہلو غالب ہے اور فی نفسہ بھی اس کے قبول کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ یہ خطاب درباری نوعیت کا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خطاب سلاطین روم کی طرف سے مولانا کے والد حضرت بہاء الدین کے نام کی مناسبت سے اس زمانہ میں ملا ہو، جب مولانا ہنوز علماے ظاہر کے لباس مین تھے مگر چونکہ اس سے بوے امارت آتی تھی، اور یہ امر مولانا کی شان فقر کے خلاف تھا، اس وجہ سے سپہ سالار و افلاکی نے اس کے ذکر کو نظرانداز کر دیا ہو اور اس طرح بعد کے مصنفین کے لئے اس کا خیال بھی خارج از بحث ہوگیا ہو۔

سر گور اوسلی نے (ص ۱۴۴) لکھا ہے کہ مولانا کے والد سلطان العلما بہاء الدین کے انتقال کے بعد مولانا کو سلطان العلما کا خطاب ملا مگر اوسلی اس راے مین منفرد ہیں اور سپہ سالار یا افلاکی نے اس کا مطلق ذکر نہین کیا ہے۔ یہ تو مسلّم ہے کہ مولانا اپنے والد کے علوم ظاہر و باطن کے وارث صحیح تھے مگر (جیساکہ آگے چلکر معلوم ہوگا) حضرت بہاء الدین کو یہ خطاب آنحضرت صلعم کے اشارہ غیبی سے ملا تھا، اس لئے کسی دوسرے کا اس سے مخاطب ہونا دائرۂ ادب سے خارج ہوگا اور مولانا سے یہ توقع نہین ہوسکتی ہے کہ آپنے اسے جائز رکھا ہو۔

؎ ہندوستان مین عام طور پر آپ کو "مولانا روم" اور "مولاناے روم" کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے تا آنکہ مولانا شبلی مرحوم نے اپنی تصنیف کا نام ہی "سوانح مولانا روم" رکھدیا ہے اور صرف "مولاناے روم" تحریر فرمایا ہے، خود مولانا کا شعر ہے ؎

شمس تبریزیست و مولاناے روم ہر دو عالم عاشقان را سود باد

بلکہ ایک جگہ "مولاے روم" بھی نظم کر دیا ہے ؎

نسب | تمام تذکرہ نویسون نے بلا استثنا یہ لکھا ہے کہ مولانا کا نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے، سب سے اوّل خود مولانا کے فرزند رشید سلطان ولدؒ کا قول موجود ہے کہ

اصل او در نسب ابوبکرؓ ست — زان چو صدیق داشت او صدرے

اس کے بعد سپہ سالار کی شہادت ہے کہ نسب او متصل است بخلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابی بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بروایات صحیح و اسانید درست۔"

بعد کے تمام تذکرہ نویس اسی پر مہر تصدیق ثبت کرتے آئے ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ پورا شجرۂ نسب کسی نے نہین دیا ہے۔ تذکرون مین مولانا کے پردادا (حضرت احمد خطیبیؒ) تک کے نام دیئے ہین، ان سے آگے کے نام نہین دیئے ہیں اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ تذکرہ نویسون نے عام طور پر مولانا کے والد بزرگوار حضرت بہاء الدین ولدؒ کے حال سے ابتدا کی اور اس ضرورت سے مولانا کے دادا (حسینؒ البکری) کا ذکر کیا اور جب حسینؒ کا نام آیا تو عام رواج کے مطابق ان کے نام کے ساتھ "ابن احمد الخطیبی" درج کر دیا۔ اور معمول کے مطابق اس سے زیادہ آگے

(بقیہ حاشیہ) در تبریز شمس دین گشت بری زکبر دکین — رخ بنہاد بر زمین در بر "مولانائے من"

یہ ظاہر ہے کہ نحوی حیثیت سے "مولانائے روم" اور "مولانا روم" صحیح نہین ہین "او رمولانائے من" مین "ئے" زاید بلکہ بیکار محض ہے لیکن اصل یہ ہے کہ "مولانا" کا لفظ اب مرکب نہین مفرد سمجھا جاتا ہے اور "نا" کا مفہوم ذہن سے بالکل محو ہو گیا ہے، ہندوستان مین "ہمارے مولانا" کا لفظ نہایت عام ہے، اسی طرح روم مین بھی ہوا ہوگا اور مولانا نے اس غلط العوام کو فہم عام کے خیال سے جایز رکھا ہوگا مگر فارسی کی مستند کتابوں میں "مولائے روم" "مولوی رومی" "ملائے روم" "ملائے رومی" "مولانا رومی" اور زیادہ تر "خدمت مولانا" کے الفاظ مستعمل ہوتے رہے ہین "مولانائے روم" یا "مولانا روم" کے الفاظ کسی مستند کتاب مین نظر سے نہین گزرے اس لئے اس رواج عام کے باوجود بھی اس ترکیب سے اجتناب ہی اولیٰ ہے،

بڑھنے کی ضرورت نہین تھی مکمل شجرہ دینے کا کسی نے خیال نہین کیا۔

تاہم کچھ مزید نام بعض ذرایع سے معلوم ہوجاتے ہین چنانچہ، ڈہاوس نے لکھا ہے کہ ان کے پاس مثنوی شریف کا جو نسخہ ہے اس کے ترکی دیباچہ مین سلسلہ نسب حسب ذیل دیا ہے[1]۔

مولانا جلال الدین رومی رح

مولانا بہاء الدین رح (سلطان العلما)

حسین رح

احمد رح

مودود رح

ثابت رح

مسیب رح

مطہر رح

حماد رح

عبد الرحمن رض

ابو بکر رض

علی ہذا جواہر حنفیہ مین[2] بھی ایک مکمل، نسب نامہ دیا ہے اور اس مین بھی دس نام ہین۔ احمد الخطیبی رح اور عبد الرحمن رض کے درمیان صرف تین نام دئے ہین۔

مولانا جلال الدین محمد رح

محمد رح

---

[1] ص ۱۳۲ (حاشیہ) [2] الجواہر المنیفہ جلد دوم ص ۱۲۳-۱۲۵ مطبوعہ دایرۃ المعارف حیدرآباد سنہ ۱۳۳۲ھ۔

محمدؒ[1]

حسینؒ

احمدؒ

قاسمؒ

مسیبؒ

عبداللہؓ

عبدالرحمٰنؓ

ابوبکرؓ

رڈہاوس نے اپنے ترکی نسخے کے شجرے کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے (اور یہی خیال جواہرِ مضیہ والے شجرے پر بھی صادق آتا ہے) کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کے انتقال (۵۵۱ھ) اور مولاناؒ کی ولادت (۶۰۴ھ / ۱۲۰۷ء) کے درمیان (۵۳۵)[2] برس کا زمانہ گزرا ہے جس سے ایک شخص کے انتقال اور دوسرے کی ولادت کے درمیان بالاوسط ۶۶ برس کی مدت واقع ہوتی ہے یہ بجائے خود اس امر کے لئے کافی ہے کہ اس شجرے پر اعتماد نہین ہو سکتا، جو نام دیئے گئے ہیں انہین اگر صحیح فرض کر لیا جائے تو اتنا ضرور ہے کہ بہت سے نام غائب ہیں جو غالباً اتنے ہی ہون گے جتنے دیئے گئے ہین" یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قسم کے شجرون مین اکثر ایسا ہوتا ہے کہ

---

[1] اس شجرے مین حسینؒ اور بہاءالدینؒ محمد (سلطان العلما) کے درمیان ایک نام محمد کا اضافہ ہوگیا ہے، جو کسی سہو سے درج ہوگیا ہے اور اس کے سہواً درج ہونے کا ثبوت خود جواہرِ مضیہ ہی سے مل گیا، اسی کتاب مین مولاناؒ کے فرزند سلطان ولدؒ کے نام کے ساتھ جو نسب نامہ دیا ہے اس مین یہ زاید نام نہین ہے۔ جلد اول صفحہ ۱۲۰

[2] بحساب سال شمسی، بحساب قمری ۵۵۱

زیادہ مشہور نام لکھدیے جاتے ہین اور غیر معروف اسما ترک کر دیے جاتے ہین، یہی اس مین بھی ہوا ہوگا۔

بہرحال ان دونون شجرون سے مولانا کے پردادا تک کا نام بالتسلسل معلوم ہوگیا اور جواہر مضیہ کے شجرہ سے اتنا مزید معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ سے یہ سلسلہ حضرت عبدالرحمنؓ کے فرزند حضرت عبداللہؓ کے ذریعہ سے ملتا ہے۔

پس مولانا کا متحقق شجرۂ نسب حسب ذیل ہوا،

مولانا جلال الدین محمد البلخی الرومی ابن سلطان العلما بہاء الدین محمد (سلطان ولد) ابن جلال الدین الحسین ابن احمد الخطیبی . . . . ابن عبداللہؓ ابن عبدالرحمنؓ ابن ابوبکرؓ الصدیق

جواہر مضیہ مین اگرچہ شجرے کے کل نام "ابن" کے ساتھ دیے ہین مگر احمد الخطیبی اور عبداللہؓ ابن عبدالرحمنؓ کے درمیان صرف (قاسم و مسیب) دو نامون کے ہونے سے یہ ثابت ہے کہ شجرہ مسلسل نہیں ہے، اس عدم تسلسل سے یہ خطرہ دل مین وارد ہو سکتا ہے کہ شاید آخر کے دو نامون مین بھی "ابن" کا لفظ حقیقی معنی مین نہو لیکن جب تمام کتب اسماء الرجال سے ثابت ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کے مشہور ترین فرزند حضرت عبدالرحمنؓ تھے اور حضرت عبدالرحمنؓ کے خلف اکبر عبداللہؓ تھے (اور اسی وجہ سے حضرت عبدالرحمنؓ کی کنیت ابوعبداللہ تھی) تو اسے مسلم سمجھنا چاہیے کہ یہان "ابن" کا لفظ حقیقی معنی مین استعمال ہوا ہے، یعنی عبداللہ حضرت ابوبکرؓ کے پوتے تھے، اور انھین کے وسیلے سے مولانا کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکرؓ سے ملتا ہے،

وطن | مولانا کے اسلاف بلخ (واقع خراسان[1]) کے رہنے والے تھے اور مولانا کا مسقط الراس

---

[1] بلخ اس وقت حدود افغانستان مین شامل ہے مگر افغانستان شمالی حصہ سابقاً خراسان کا جز تھا، اگرچہ خود خراسان کے حدود مین علمائے جغرافی کا اختلاف ہے اور باوقات مختلفہ یہ حدود بدلتے بھی رہے ہین مگر بلخ ہمیشہ خراسان مین شامل سمجھا گیا ہے،

بھی بلخ ہی ہے، مگر مشیتِ ایزدی نے مولاناؒ کو خراسان سے نکال کر روم پہنچا دیا، اور روم کے دار الملک قونیہ کو مولاناؒ کا مسکن و مدفن اور آپ کے اخلاف کا موطن بننے کا شرف حاصل ہوا، تاہم بلخ کا یہ فخر زائل نہیں ہوا کہ اس کا انتساب مولاناؒ کی ذات کے ساتھ بدستور قائم رہا، چنانچہ آپ کے نام کے ساتھ "البلخی الرومی" یا "البلخی ثم الرومی" لکھا ہوتا ہے[1]۔

"یہاں بالطبع یہ معلوم کرنے کا اشتیاق دل میں پیدا ہوتا ہے کہ مولاناؒ کے اسلاف کس وقت سے خراسان میں سکونت پذیر ہوئے؟ اور اُن میں سے اوّلاً کس نے بلخ میں طرح اقامت ڈالی، اور اسے اپنا وطن بنایا؟

سوال اوّل کا مجمل جواب مناقب العارفین کی ایک روایت سے مل جاتا ہے کہ "از اسلام شدن خراسان من اول الحال ببرکت جہاد و فتح کردن اجداد (او بود)[2]" جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خراسان کی فتح کے وقت ہی سے مولانا کے اسلاف وہاں سکونت پذیر ہو گئے تھے، او

---

[1] مولاناؒ کو اگرچہ پانچ برس کی عمر میں بلخ کو ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہنا پڑا، مگر وطن قدیم کی محبت آپ کے دل میں اس درجہ جاگزیں تھی کہ تقریباً پچپن برس کی عمر میں جب مثنوی شریف کا دیباچہ لکھا ہے، تو اس میں اپنا نام اس طرح لائے ہیں "العبد الضعیف المحتاج الی رحمۃ اللہ تعالیٰ، محمد ابن محمد بن الحسین البلخی" روم میں ربع صدی سے زیادہ اقامت گستر رہنے کے بعد ہنوز اپنے کو "الرومی" نہیں لکھا، لطف علی نے اپنے تذکرے آتشکدۂ آذر میں مولاناؒ کا شمار بلخ ہی کے شعرا میں کیا ہے،

بلخ میں جس کثرت سے علمار و صلما پیدا ہوئے، اُس کے لئے سمعانی کے یہ الفاظ کافی ہیں کہ "لا یحصے من العلماء والائمۃ والمحدثین قدیماً وحدیثاً" (کتاب الانساب ورق ۸۹ (الف))

[2] مناقب العارفین ص ۶ (تقریر وزیر خوارزمشاہ)

اس فتح میں خود ان بزرگوں کی شرکت بھی تھی[۵] مگر سوال دوم کا جواب قطعی حیثیت سے کہیں نہیں ملتا[۱] پس اس معاملہ میں اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ تغلیبی قیاس پر قناعت کیجائے روایت مذکورۂ بالا سے اس قدر واضح ہی کہ مولٰنا کے اسلاف فتح خراسان میں شریک ہوئے اور اسی وقت سے وہاں اقامت گزیں ہو گئے تھے، اب دیکھنا یہ ہی کہ (۱) خراسان کب فتح ہوا، اور (۲) اس وقت حضرت ابو بکرؓ کی اولاد میں کون کون اصحاب ایسے تھے جن کا خراسان کی طرف جانا اغلب ہو سکتا ہی،

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد اول ص۹۲۳ پر یہ درج ہی کہ ۱۳۰ھ کے قریب ابو داؤد البکری نے ابو مسلم کی جانب سے طخارستان اور بلخ میں عباسیوں کے حق میں شورش برپا کرنا شروع کی،، اس سے ایک ضمنی شہادت اس امر کی ملتی ہی کہ حضرت ابو بکرؓ کے اخلاف میں کچھ لوگ قدیم سے وہاں سکونت پذیر اور بارسوخ تھے،

[۲] ڈ ہاؤس نے اپنے الفاظ میں یہ لکھا ہے، کہ قدیم باختر کو جب ۶۵۰ء کے قریب حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں مسلمانوں نے اول فتح کیا تو مجاہدین میں حضرت ابو بکرؓ کی اولاد میں سے ایک صاحب شامل تھے، ان کی اولاد نہایت عزت و ثروت کے ساتھ چنگیز خاں کے حملہ سے کچھ قبل تک وہاں مقیم رہی، (صفحہ ۵ دیباچہ) لیکن مناقب العارفین کی مذکورۂ بالا روایت کے سوا ڈ ہاؤس نے کسی اور ذریعہ سے اس کی کوئی سند نہیں دی ہے، اور اسی کی ضرورت ہے،

[۳] مصر میں ایک کتاب "بیت الصدیق،، (تصنیف بکری محمد توفیق) شائع ہوئی ہے، اس وقت باوجود سعی و کوشش کے وہ کتاب مجھے دستیاب نہ ہو سکی، اگر وہ کتاب مل جاتی تو اولاد حضرت ابو بکرؓ کے بہت تفصیلی حالات معلوم ہو جاتے، اور غالبًا یہ مسئلہ بھی قطعی طور پہ متعین ہو جاتا،

خراسان کی فتح کا مسئلہ کسی قدر پیچیدہ ہو گیا ہے اوّل تو خراسان کے حدود ہی کچھ غیر متعین سے ہین دوسرے خراسان اور اس کے ذیل میں بلخ کی فتح کا ذکر تاریخون مین کئی بار آیا ہے، یہان تفصیلی بحث کو نظر انداز کر کے صرف نفس مطلب کو صاف الفاظ مین بیان کر دینا کافی ہے :-

(۱) خراسان پہلی بار بعہد حضرت عمرؓ فتح ہوا، ابن اثیر نے ۲۲ھ کے تحت مین اس فتح کا ذکر کیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ بروایت بعض یہ فتح ۱۸ھ مین ہوئی[1] اور صاحب معجم البلدان نے اسی کی توثیق کی ہے[2]۔

(۲) ابن اثیر نے اس بحث کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے کہ "ایک قول یہ بھی ہے کہ خراسان حضرت عثمانؓ کے زمانہ مین فتح ہوا اور آگے چلکر اس کی پوری تفصیل دی ہے کہ حضرت عمرؓ کے انتقال کے بعد اہل خراسان نے نقض عہد کیا اور عبد اللہ بن عامر بن کریز نے خراسان کو دوبارہ فتح کیا اور اسی سلسلہ مین احنف بن قیس کے ہاتھ سے بلخ بھی فتح ہوا[3]، معجم البلدان مین اسے "استرداد" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے

(۳) اس کے بعد ۵۱ھ کے تحت مین ابن اثیر نے ایک اور روایت یہ دی ہے کہ اسی سنہ مین ربیع بن زیاد، خراسان کے والی مقرر ہوئے اور ان کے ساتھ بصرہ اور کوفہ سے پچاس ہزار اشخاص مع اپنے اہل وعیال کے خراسان گئے اور وہین سکونت اختیار کر لی۔ اسی سلسلہ مین یہ بھی لکھا ہے کہ خراسان پہنچکر انھون نے

---

[1] جزو ثالث صفحہ ۱۳ و ۱۴ مطبوعہ ازہریہ مصر۔ [2] جزو اول صفحہ ۴۲۰ مطبعۃ السعادت مصر، ۱۳۲۴ھ [3] جزو ثالث ص ۴۸، فتوح البلدان ص ۴۱۴

(ربیع بن زیاد) نے بلخ کو صلح سے فتح کیا کیونکہ احنف بن قیس سے صلح کرنے کے بعد بلخیون نے روگردانی کی تھی[1]۔

حاصل کلام یہ کہ خراسان پر پہلی فوجکشی سنہ ۱۸ھ مین ہوئی، سنہ ۳۱ھ مین دوبارہ تسخیر کی ضرورت پیش آئی اور سنہ ۵۲ھ مین بلخ کا مقامی انحراف فرو کرنا پڑا اور اسی سنہ ۵۳ھ مین عربون کی ایک کثیر تعداد خراسان مین آباد کردیگئی کہ آیندہ انحراف کا قطعی سدباب ہوجائے،

پس حضرت ابوبکرؓ کے اخلاف مین سے جو بزرگ بزمرہ مجاہدین بلخ پہنچکر وہان آباد ہوے وہ اسی سنہ ۱۸ھ، سنہ ۳۱ھ یا سنہ ۵۲ھ مین وہان گئے ہونگے لیکن اس تمام فتح و تسخیر کے ذیل مین جن امراے جیوش اور ولاۃ ممالک کے نام مستند تاریخون مین آئے ہین ان مین حضرت ابوبکرؓ کے اخلاف مین سے کسی کا نام کہین نظر نہین آتا، لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ ان مین سے جو صاحب بھی فاتحین خراسان مین شریک رہے ہون ان کو امارت و ایالت سے کوئی تعلق نہین تھا بلکہ وہ محض مجاہد فی سبیل اللہ تھے۔

(۲)

اب حضرت ابوبکرؓ کے اخلاف و اعقاب پر نظر کیجائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اولاد ذکور مین تین اصحاب تھے، عبداللہؓ، عبدالرحمنؓ، محمدؓ۔ ان مین سے عبداللہؓ سنہ ۱۱ھ مین انتقال کرگئے اور آپ کی اولاد کا سلسلہ آگے نہ چلا[2]۔ محمدؓ مدینہ مین متولد ہوے اور اسماءؓ بنت عمیس کے بطن سے تھے جن سے حضرت ابوبکرؓ نے سنہ ۸ھ مین عقد کیا تھا، پس محمدؓ کی ولادت سنہ ۸ھ کے بعد کی ہے، آپ زیادہ تر مصر مین رہے اور وہین سنہ ۳۸ھ مین عمرو بن

---

[1] زوثالث ص ۴۹ ۱۵ سنہ ابن اثیر جزو ۲ صفحہ ۲۰۵ (الازہریہ) سنہ ۱۳۰۱ھ طبقات ابن سعد ۳ عبداللہ طائف مین آنحضرتؐ کے ساتھ تھے حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت مین وفات پائی، ان کے ایک فرزند اسمٰعیل تھے،

عاص سے شکست کھاکر شہید ہوئے۔[1]

آپ کی اولاد مین ایک صاحب قاسمؒ تھے (جو فقہاے سبعہ مین شمار ہوتے ہین) ان کے نسبت یہ صریحًا معلوم ہے کہ وہ خراسان نہین گئے، البتہ ان کی اولاد کا سلسلہ آگے کو چلتا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے اخلاف مین سے جو لوگ مختلف ممالک مین جاکر آباد ہوئے ان مین سے بیشتر آپ کے فرزند حضرت عبد الرحمٰنؓ کے اعقاب مین سے تھے۔

حضرت عبد الرحمٰنؓ مکہ مین متولد ہوے اور مکہ ہی مین ۵۳ھ[2] مین وفات پائی' آپ کے دو فرزند عبد اللہؓ اور محمدؓ تھے اور آپ کی کنیت "ابو عبد اللہ" تھی، آپ کی اولاد و حفا کی کثرت اس سے ظاہر ہے کہ آپ کے فرزند عبد اللہؓ کی اولاد مین چار افراد محمدؓ اکبرؒ، عثمانؒ، عبد الرحمٰنؒ تھے اور محمدؒ کی اولاد مین پانچ افراد محمدؒ، ابو بکرؒ، عثمان، عبد الرحمٰنؒ اور عمرؒ تھے،[3] خود حضرت عبد الرحمٰنؓ کے دونون فرزندون میں سے کسی کا خراسان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰کا) ان کا انتقال ہوگیا، ان کے اخلاف باقی نہین رہے، مروج الذہب جلد ۴ صفحہ ۱۸۰ مطبوعہ پیرس ۱۸۶۵ء۔ اشہر مشاہیر الاسلام جلد اول ص ۱۳۹ [1] ابن اثیر جزو ۳ صفحہ ۱۴۰ [2] ۵۳ھ۔ اصابہ فی تمیز الصحابہ جزو ۵ صفحہ ۱۷۹ المطبعۃ الشرقیہ (۱۳۲۵ھ، ۱۹۰۷ء) [3] طبقات ابن سعد جزو ۵ صفحہ ۳۴ مطبوعہ لیدن ۱۳۲۲ھ مسعودی نے آپ کی نسبت لکھا ہے کہ لعبد الرحمٰن اخبار وله عقب کثیر بہ و حضر فی ناحیۃ الحجاز ممالی الجازہ من طرق العراق والموضع المعروف بالصفینیات والسیح (مروج الذہب جلد ۴ صفحہ ۱۹۰ و ۱۹۱) بعینہ یہی الفاظ اشہر مشاہیر الاسلام مین بھی ہین۔ مسعودی نے اپنی دوسری کتاب التنبیہ والاشراف ( ) مین اسکی مزید تفصیل دی ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبد الرحمٰن کے اخلاف مین سے جو لوگ عراق مین آباد تھے وہ "طلحیین" کہلاتے تھے (یعنی اولاد طلحہ بن عبد اللہ بن عبد الرحمٰن)

جانا تو کہین سے ثابت نہین ہے، پس اگر بعد خلافت عثمانؓ (یا بزمان معاویہؓ) گئے ہونگے تو حضرت عبد الرحمنؓ کے پوتون مین سے کوئی صاحب گئے ہونگے اور جب جواہر مضیئہ کے شجرے مین عبد اللہ بن عبد الرحمن درج ہے تو لامحالہ یہ سمجھ لینا چاہئے کہ حضرت عبد اللہ کے فرزندون مین سے (طلحہ کو مستثنیٰ کرکے کہ ان کی اولاد کا عراق مین آباد ہونا مسلّم ہے) ابو بکرؒ، عمران یا عبد الرحمن کوئی بزرگ اس جہاد مین شریک ہوے اور خراسان مین اقامت گزین ہو گئے ہونگے۔ یا ربیع بن زیاد کے ساتھ آبادکارون کے سلسلہ مین گئے اور تیسری فتح بلخ کے بعد بلخ مین آباد ہو گئے۔

غرض مولانا کا حضرت ابو بکر الصدیقؓ کے سلسلہ مین ہونا مصدق، آپ کے بزرگون سے کسی کسی کا فتح خراسان کے زمانہ ہی سے اس ملک مین مقیم ہونا مسلّم اور حضرت ابو بکرؓ سے آپ کے سلسلہ نسب کا حضرت عبد اللہ بن عبد الرحمنؓ کے وسیلہ سے ملنا ہر طرح قرین قیاس ہے۔

تعلقات قرابتداری اس مایہ ناز انتساب سے مفتخر ہونے کے علاوہ مولاناؒ کے بزرگون کے ملکی ومقامی تعلقات قرابتداری بھی بغایت معزز وموقر تھے۔ خود سلطان العلما بہاء الدین ولد نے ان تعلقات کی جانب اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ افلاکیؒ نے بروایت سید برہان الدین ترمذی لکھا ہے کہ مولاناؒ ئے بزرگ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میرا بیٹا نسل بزرگ سے ہے، بادشاہ اصل ہے اور اس کی دمایت باصالت ہے، اس کی نانی شمسؒ الدین سرخسی کی بیٹی تھین جن کا نسب مان کی جانب سے بھی حضرت علیؓ سے ملتا ہے؛ میری والدہ خوارزم شاہ بلخ کی دختر تھین اور میرے دادا احمد الخطیبی کی والدہ بھی بادشاہ بلخ کی لڑکی تھین۔[1]

[1] مناقب ص ۱۰ (میری والدہ "مادر من" کا ترجمہ ہے، مطبوعہ نسخہ مین "مادرش" ہے مگر یہ صریحاً

مولاناؒ کے سلسلۂ مادری کی نسبت "فیہ ما فیہ" مین ہے کہ "نسب . . . .

از مادر بسلطان ابراہیم ادہم"[1]

ان اقوال سے یہ نتیجے مستنبط ہوتے ہین کہ

(۱) کسی بادشاہ بلخ کی لڑکی مولاناؒ کے جد امجد کو منسوب تھین۔

(۲) خاندان خوارزم شاہی کی کسی شہزادی کا عقد مولاناؒ کے دادا حسین سے ہوا تھا

(۳) مولاناؒ کی نانی شمس الائمہ سرخسیؒ کی بیٹی تھین۔

(۴) مولاناؒ کی والدہ کا نسب سلطان ابراہیم ادہم سے ملتا تھا،

لیکن ان واقعات کو تاریخ سے تطبیق دینے مین سخت دشواریان لاحق ہین کیونکہ تاریخون مین ان تعلقات کا کوئی صریح اشارہ کہین نہین ملتا۔ چونکہ اس بحث مین اور اس کے بعد کی متعدد واقعات کی تنقیح و توضیح مین سلسلہ خوارزمشاہی کے مختلف بادشاہون کا ذکر مختلف حیثیتون سے آئے گا اس لئے مناسب یہ ہے کہ نہایت اختصار کے ساتھ خوارزم شاہیون کے حالات یکجا طور پر درج کر دیئے جائیں تاکہ متفرق حوالون اور تصریحون کی ضرورت باقی نہ رہے۔ چنانچہ لاحقہ (۱) مین یہ حالات باریک خط مین درج کر دیئے گئے ہین، مناسب ہے کہ اول اُسے ملاحظہ کر لیا جائے۔

اس تعلیق کے مطالعہ کے بعد اب سلسلہ وار نتائج پر غور کیجئے :-

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲) غلط ہے۔ قلمی نسخہ مین "مادر من" ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ مولاناؒ کی والدہ خوارزمشاہ کی بیٹی نہین تھین بلکہ مولاناؒ کی دادی خوارزمشاہ کی بیٹی تھین۔

[1] فیہ ما فیہ صفحہ ۲۔

مولانا کے پردادا احمد الخطیبیؒ کی والدہ

مناقب العارفین مین سلطان العلماء بہاء الدین ولد کا جو قول منقول ہے اسکے الفاظ یہ ہین کہ "والدۂ احمد خطیبی حدم ہم دختر ملک بلخ است" رڈہاوس نے اس مفہوم کو اپنی طور پر یون ادا کیا ہے کہ "۴۹۱ھ ۱۰۹۷ء کے بعد وسط ایشیا کے خوارزمشاہیون مین سے کسی بادشاہ نے اپنی لڑکی مولانا کے جد الجد کو دی" اس مین اوّل تو تاریخ کا تعین افلاکی کا نہیں ہے، دوسرے رڈہاوس نے خوارزمشاہیون کی تخصیص کی ہے، حالانکہ اس وقت تک خوارزمشاہیون نے مستقل بادشاہی کیا مستقل امارت کی حیثیت بھی نہین پیدا کی تھی، سلطان العلما کے قول سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ان کے دادا کی والدہ بلخ کے کسی بادشاہ کی لڑکی تھین۔

بلخ غزنیون کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد سے مختلف شاہی خاندانون کے ہاتھ مین رہا، ۴۳۲ھ مین سلجوقیون کے ہاتھ آگیا تھا پھر نکل گیا، سنجر نے اسے سیف الدین بن علاؤ الدین غوری سے لیا اور سیف الدین کا زمانہ ۵۵۱ھ سے ۵۵۸ھ تک رہا ہے، اس کے بعد بلخ پھر غوریون کو واپس ملگیا، غیاث الدین ابو الفتح محمد بن سام کے زمانہ مین جب خوارزمشاہ نے غوریون کو شکست دی اور پھر صلح ہوئی تو یہ قرار پایا کہ بلخ اور ہرات، غوریون کے پاس اور مرو و نیشاپور خوارزمشاہیون کے پاس رہے اور یہ تقریباً ۵۹۴ھ مین ہوا، قطعی طور پر بلخ ۶۰۳ھ مین خوارزمشاہیون کے ہاتھ مین آیا،

ل صفحہ ۱۳۳ ۵ فتحہا العرب ۳۱ھ ہجریہ علی ید الاحنف بن قیس فی خلافۃ عثمان رضی اللہ عنہ ثم انتقلت الی السامانیہ ثم انتقلت الی یدین سبکتگین ثم انتقلت الی ید السلاجقۃ ثم انتقلت الی ید الاتراک ثم سلمہا الغوریون ثم اخذ منہم الخوارزمیہ

لہذا ارڈبادس کے اس خیال کی کوئی بنائے قطعی نہین معلوم ہوتی کہ احمد الخطیبیؒ کی والدہ خوارزمشاہیون مین سے کسی بادشاہ کی بیٹی تھین۔ وہ شاہان بلخ مین سے کسی بادشاہ کی بیٹی تھین مگر یہ کہ کس بادشاہ کی بیٹی تھین اس کا تعین مشکل ہے۔ سلطان العلما کا مفہوم صرف شاہی تعلق کا ظاہر کرنا ہے، خوارزمشاہیون کی تخصیص نہین ہے۔

(۲)

(مولاناؒ کی دادی ملکۂ جہان)

احمد الخطیبیؒ کے فرزند جلال الدین حسین (یعنی مولاناؒ کے دادا) کے عقد کے متعلق سلطان ولدؒ نے اپنی مثنوی مین کوئی اشارہ نہین کیا ہے اور سپہ سالارؒ بھی خاموش ہین مگر افلاکیؒ نے اس عقد کے حالات نہایت شرح و بسط سے بیان کئے ہین اور تمام تذکرہ نویس قدیم و جدید، مشرقی و مغربی، سب متفق اللفظ کہتے آئے ہین کہ حسین خطیبی کا عقد خوارزمشاہی خاندان مین ہوا تھا۔ یہ روایت اس حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہے کہ اس مین کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجایش بھی باقی نہین رہجاتی مگر اس کے ساتھ ہی ان تذکرہ نویسون کا یہ لکھنا کہ (مولانا کی دادی) ملکہ جہان، سلطان علاء الدین محمد خوارزمشاہ کی دختر تھین کسیطرح صحیح نہین قرار پاسکتا اور نہ تاریخ سے اس کی تطبیق ہوسکتی ہے۔

اس باب مین سب سے پہلی سند افلاکیؒ کی ہے اس لئے اول اسی پر نظر کرنا چاہئے، ان کی روایت کا ماحصل یہ ہے کہ

"علاء الدین محمد خوارزمشاہ (عم جلال الدین محمد خوارزمشاہ) کی لڑکی ملکہ جہان جب حد بلوغ کو پہونچی تو خوارزمشاہ کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ کوئی بادشاہ ایسا نظر نہین آتا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰) ثم استوی علیہ التتر معجم البلدان جزو (۲) صفحہ ۱۴۳-۱۴۴

جسے وہ اپنا کفو سمجھ سکے، اس باب مین وزیر سے مشورہ کیا تو وزیر نے کہا کہ بادشاہون کے کفو علماے کرام ہوتے ہین کیونکہ "الملوک حکام علی الناس والعلماء حکام علی الملوک" بادشاہ نے پوچھا کہ ایسا عالم کون ہے، وزیر نے جواب دیا کہ جلال الدین حسین خطیبی ایسے عالم ہین اور ابھی عالم نوجوانی مین ہین، ادہر خود حسینؒ کے دل مین یہ خیال گزرا کہ مین نے سنت رسول اللہ صلعم سے کوئی امر ترک نہین کیا، سواے سنت نکاح کے، اسی شب خواب مین دیکھا کہ آنحضرتؐ فرماتے ہین کہ بادشاہ خراسان کی لڑکی کو پیغام نکاح دو، ادھر بادشاہ، وزیر اور ملکہ جہان نے بھی یہی خواب دیکھا، غرض یہ تقریب نہایت تزک و احتشام سے انجام پائی۔[1]

اس روایت مین صراحتہً علاء الدین محمد خوارزمشاہ کا نام آیا ہے اور جن علماے مشرق و مغرب نے بہ تعین اسم اس واقعہ کا ذکر کیا ہے ان سب نے بلا استثنا اسی علاء الدین محمد کا نام لیا ہے[2] مگر کسی نے اس پر لحاظ نہین کیا کہ فی نفسہ اس کا امکان بھی

---

[1] مناقب صفحہ ۵ و ۶، [2] مغربی اسانید مین انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ نگار نے تو مجمل فقرہ درج کر دیا ہے کہ "ان کا خاندان بواسطہ عقد خوارزم کے شاہی خاندان سے مربوط تھا" مگر دیگر علماے یورپ نے صراحتہً اسی علاء الدین کا نام لیا ہے، سر گور اوسلی نے "علاء الدین یعنی فرمانروایان خوارزم آخری بادشاہ سے قبل کا بادشاہ" لکھا ہے (ص ۱۱۲) رڈہاوس نے افلاکیؒ کے الفاظ کا بعینہ ترجمہ کر دیا ہے یعنی "علاء الدین محمد خوارزمشاہ عم جلال الدین خوارزمشاہ" اور اپنی طرف سے کچھ تصریح نہین کی ہے، براؤن نے "علاء الدین محمد خوارزمشاہ بن تکش" لکھا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا مین علاء الدین بن تکش (بہ تعین عہد حکومت سنہ ۵۹۶ھ - سنہ ۶۱۷ھ) درج ہے۔ ڈاکٹر نکلسن نے "محمد قطب الدین خوارزمشاہ مخاطب بہ تکش" لکھا ہے (دیوان شمس تبریز ص ۱۶ دیباچہ) مگر "مخاطب بہ تکش" کے بجاے "ابن تکش" ہونا

ہے یا نہین؟

افلاکیؒ کے بیان اور تمام دوسرے تذکرہ نویسون کے فحوائے کلام سے یہ صاف عیان ہے کہ خاندان خوارزمشاہی کے جس رکن نے اپنی لڑکی کا عقد مولاناؒ کے دادا حسین خطیبی سے کیا اس نے خود اپنے عہد شاہی مین ایسا کیا اور اس پر بھی ان سب کا اجماع ہے کہ یہ بادشاہ علاء الدین محمد خوارزمشاہ تھا۔ بعض تذکرہ نویسون نے اس کے عہد حکومت تک کا تعین کر دیا ہے، چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا مین اس کا نام بقید دور حکومت دیا ہے، اور مولانا شبلی مرحوم نے بھی اس کے نام پر نشان دیکر تعلیق مین لکھا ہے کہ اس کا دور حکومت ۵۹۶ھ سے ۶۰۲ھ تک رہا۔

آگے چلکر معلوم ہو گا کہ مولاناؒ کی ولادت ۶۰۴ھ مین ہوئی ہے اور اس سے دو برس قبل آپ کے بڑے بھائی متولد ہو چکے تھے اور مولانا کی ہمشیرہ . . . . . کی ولادت اس سے بھی پہلے ہو چکی تھی۔ پس علاء الدین محمد کے دور حکومت ہی نہین بلکہ اسکی عمر کا بھی وہ کونسا زمانہ ہو سکتا ہے جب مولاناؒ کے دادا حسینؒ خطیبی کا عقد اس کی لڑکی سے ہوا ہو، اور ۶۰۴ھ بلکہ ۶۰۲ھ مین حسینؒ کے پوتے اور اس سے قبل پوتی کی ولادت ظہور مین آگئی ہو۔ تعجب ہے کہ ایک ایسے محال صریح پر کسی نے توجہ نہ کی اور سب سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶ کا) چاہئے یا "قطب الدین" نہ ہونا چاہئے کیونکہ "قطب الدین" تکش کا خطاب نہین تھا بلکہ اس کے بیٹے محمد کا خطاب تھا۔ مولانا شبلی مرحوم نے اپنی بیٹی کی ان سے (حسین بن احمد سے) شادی کردی تھی۔ بہاء الدین انہی کے بطن سے پیدا ہوئے، اس لحاظ سے سلطان محمد خوارزمشاہ، بہاء الدینؒ کا ماموں اور مولاناؒ کا نانا تھا" سمجھ مین نہین آتا کہ بہاء الدینؒ ولد جب محمد خوارزمشاہ کی بیٹی کے بطن سے تھے تو محمد خوارزمشاہ، بہاء الدینؒ ولد کا ماموں کیسے ہو گیا۔

زیادہ حیرت مولانا شبلی مرحوم پر ہے کہ انھون نے پوری تفصیل کے ساتھ سب کچھ لکھا اور یہ نہ سوچا کہ اتنی قلیل مدت مین دو پشتین کیسے وجود مین آگئی ہونگی ۔

تذکرہ نویسون نے صرف اسی پر اکتفا نہین کی ہے کہ ملکہ جہان علاء الدین محمد خوارزمشاہ کی دختر تھین بلکہ بعض نے اس پر کچھ اضافہ بھی کیا ہے ، یعنی وہ علاء الدین محمد کی . . . . . اکلوتی بیٹی تھین ، رڈ ہاوس اور انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کی تحقیق یہی ہے ۔ افلاکی[۲] نے اس موقع پر جو الفاظ لکھے ہین ان کا مفہوم بھی کچھ ایسا ہی ہے[۱] ۔ پس اگر یہ مان لیا جائے کہ علاء الدین محمد خوارزمشاہ کے ایک ہی لڑکی تھی اور اسی علاء الدین محمد کے متعلق دولت شاہ کے ان الفاظ کو قابل وثوق سمجھ لیا جائے کہ "دختر بجان سمرقند داد وازخان کاشغر دختر خواست[۲]" تو یہ تمام قصہ ہی پاک ہوا جاتا ہے ۔

اس محال عقلی و عادتی سے قطع نظر کرکے تاریخی حیثیت سے اس مبحث پر نظر کیجائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اول خود افلاکی[۲] کی روایت کی تنقیح ہو ، اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ تاریخی شہادت و ثبوت یا کم از کم تاریخی تخمین و قیاس سے کہان تک اس روایت کی تائید ہو سکتی ہے ۔

افلاکی[۲] نے اس موقع پر "علاء الدین محمد خوارزمشاہ عم جلال الدین محمد خوارزمشاہ" کے الفاظ استعمال کئے ہین ۔ اس مین "عم" کا واسطہ قایم رکھکر یہ ثابت ہونا چاہئے کہ "جلال الدین محمد خوارزمشاہ" کا چچا "علاء الدین محمد خوارزمشاہ" تھا ، لیکن اگر "جلال الدین محمد خوارزمشاہ" سے مراد وہی "جلال الدین" ہے جو خاندان خوارزمی کا آخری فرمانروا تھا اور جس کا دور حکومت

---

[۱] "اورا نازنین دخترے بود کہ در اقالیم سبعہ ربع مسکون بملاحت و موزونی وکمال وجمال نظیرے خود نداشت . . . . مناقب ص ۶ ۔ [۲] تذ ۔ الشعرا ص

٦١٧ھ سے ٦٢٨ھ تک سمجھنا چاہئے) اور "علاء الدین محمد خوارزمشاہ" وہی فرمانروا ہے جس کا دورِ حکومت ٥٩٦ھ سے ٦١٧ھ تک رہا ہے تو یہ "علاء الدین" اس "جلال الدین" کا چچا نہین بلکہ باپ تھا۔ اگر "جلال الدین" یہ نہین کوئی دوسرا ہے تو "علاء الدین محمد خوارزمشاہ" کے کسی بھتیجے "جلال الدین" کا کوئی ذکر کسی تاریخ مین نہین ملتا[1]، اور اگر "علاء الدین" کوئی دوسرا ہے تو جلال الدین کا کوئی چچا "علاء الدین" کے نام سے کسی تاریخ مین مذکور نہین ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ان دونون فرمانرواؤن کے سوا یہ کوئی دوسرے دو شخص ہین تو یہ تعریف باعتبار حالات باطل ہے، لامحالہ کوئی تیسری توجیہ ہونا چاہئے اور یہ توجیہ بادنیٰ تامل خود مناقب العارفین ہی سے ہاتھ آجاتی ہے کہ مناقب العارفین اور نیز رسالہ سپہ سالار کے مطالعہ کرنے والون پر یہ امر پوشیدہ نہین رہ سکتا کہ افلاکیؒ اور سپہ سالارؒ دونون بزرگون نے "علاء الدین" اور "جلال الدین" کے نامون مین خلط کر دیا ہے۔ آگے چلکر معلوم ہوگا کہ حضرت بہاء الدینؒ ولد نے علاء الدین محمد کے دور مین بلخ کو ترک کیا ہے۔ "فیہ مافیہ" مین صاف لکھا ہوا ہے کہ "خاطر او از محمد خوارزمشاہ و بلخیان برنجید[2]" افلاکیؒ نے اس موقع پر تو صرف "محمد خوارزمشاہ" لکھ دیا ہے (ایک جگہ "محمود خوارزمشاہ" بھی ہے مگر یہ صریحاً کتابت کی غلطی ہے۔) لیکن دوسرے موقع پر صراحۃً "جلال الدین محمد خوارزمشاہ" لکھا ہے۔ سپہ سالارؒ نے یہان بھی دو جگہ "سلطان سعید جلال الدین محمد خوارزمشاہ" لکھا ہے[3]،

---

[1] تاریخون مین علاء الدین محمد کے ایک بھتیجے ہندو شاہ بن ملک شاہ مذکور ہوا ہے جس نے علاء الدین محمد کی تخت نشینی کے بعد بغاوت کی اور غیاث الدین (شاہ غزنین) سے مدد پا کر بلخ سے قریب ہی مرو پر قبضہ کر لیا مگر نہ اسے کوئی مستقل کامیابی ہوئی اور نہ اسے "جلال الدین" کا خطاب حاصل تھا، کسی دوسرے اعتبار سے بھی اسکی کوئی اہمیت ایسی نہین پائی جاتی جس کی وجہ سے افلاکیؒ کو خصوصیت کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہو۔ [2] صفحہ ٣ [3] صفحہ ٧

پس اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہان سپہ سالار اور افلاکیؔ کو مغالطہ ہوگیا ہے. اگر یہ نہین ہے تو ممکن ہے کہ اسی محمد خوارزمشاہ کو جس طرح "قطب الدینؒ" "علاء الدین" "ظل اللہ فی الارض" اور "سکندر ثانی" کے خطابات حاصل تھے اور آخر مین اس نے "سنجر" کا لقب بھی اپنے نام کے ساتھ بڑھا لیا تھا، اسی طرح "جلال الدین" کا خطاب بھی مل گیا مگر یہ محض ایک قیاس فرضی ہے. کہین سے ثابت نہین ہے)

پس یہ فرض کرکے (بلکہ اسے قطعی سمجھکر) کہ افلاکیؔ جسے "جلال الدین" کہتے ہین وہ "علاء الدین" ہے. آگے نظر کیجے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اسی علاء الدین محمد کا چچا سلطان شاہ تھا اور وہ ۵۵۸ھ سے ۵۸۹ھ تک حکمران رہا. ممکن بلکہ اغلب ہے کہ سلطان شاہ کو بھی "علاء الدین" کا خطاب حاصل رہا ہو کیونکہ اس قسم کے خطابات اکثر خاندانی ہو جاتے ہین، اور اگر افلاکیؔ نے "عم" کا لفظ غلطی سے نہین لکھدیا ہے یا بعد مین یہ غلطی نہین ہوگئی ہے تو قیاس یہ چاہتا ہے کہ اس لفظ کا اشارہ اسی سلطان شاہ کی طرف ہو.

دو امور اس قیاس کے موید نظر آتے ہین' اول یہ کہ سلطان شاہ اور (علاء الدین محمد کے باپ) تکش مین بہت دنون جنگ رہی. اور سلطنت دونون مین تقسیم ہوگئی تھی' اس تقسیم مین خراسان، سلطان شاہ کے قبضہ مین رہا اور حسین خطیبیؒ کا وطن بلخ بھی اسی جانب مین تھا، قرب قرابت کا موقع ادھر زیادہ تھا، تکش کی مملکت (خوارزم)

۱؎ علاء الدین محمد کا خطاب تخت نشینی سے قبل "قطب الدین" تھا تخت نشین ہونیکے بعد اس کا خطاب اس کے والد تکش کے خطاب "علاء الدین" سے بدل دیا گیا. ابن اثیر جلد ۱۲ صـــ ابو الفدا جلد سوم ص ۹۰ (المطبعۃ الحسینیہ مصر)

اور بلخ کے درمیان خراسان حائل تھا، دوسرے یہ کہ افلاکیؒ ہی نے دوسرے موقع پر لکھا ہے کہ ملکہ جہان کے عزیزون نے باتفاق یہ چاہا کہ حضرت بہاؤالدینؒ ولد کو تخت شاہی پر بٹھائین مگر خود آپ نے منظور نہ کیا۔[۵۱] خاندان خوارزمشاہی کی کل تاریخ مین تفرقہ مملکت صرف اسی ایک وقت رونما ہوا ہے۔ سلطان شاہ کے بعد اس کے امرا نے غالباً تکش کو روکنا چاہا ہوگا اور اس کی بہترین صورت یہی ہو سکتی تھی کہ سلطان شاہ کے خاندان ہی سے کسی کو تخت نشین کر دیا جائے۔ سلطان شاہ کے کسی بیٹے کا ذکر کسی تاریخ مین نہین آیا ہے۔ پس اگر ملکہ جہان اسی سلطان شاہ کی دختر تھین تو امرا کا ملکہ جہان کے فرزند حضرت بہاؤالدینؒ ولد کی طرف متوجہ ہونا بالکل قرین قیاس معلوم ہوتا ہے،

پس افلاکیؒ کی روایت پر تنقیدی نظر ڈالنے سے یہ امر تقریباً مسلّم ہو جاتا ہے کہ "جلال الدین" کا نام غلط آگیا ہے اور ملکہ جہان علاء الدین محمد خوارزمشاہ (۵۹۶–۶۱۷ھ) کی بیٹی نہین، بہن تھین (اور اگر "عم" کا رشتہ صحیح لکھا گیا ہے تو حقیقی بہن نہین عمزاد بہن تھین)

اس خیال کی نہایت پر زور تائید ایک جدید سند سے ہوتی ہے۔ تاتاریون کی ایک نہایت مکمل تاریخ "تلخیص الاخبار و تلقیح الآثار فی وقایع قزان و بلغار و ملوک التتار" کے نام سے م۔ م الرمزی نے شایع کی ہے۔[۵۲] اس مین فتنۂ تتار کے اسباب کی بحث مین لکھا ہے کہ "حکے ایضاً ان مولانا بہاء الدین البلخی والد مولانا جلال الدین الرومی صاحب المثنوی کان ابن اخت خوارزمشاہ . . . ."[۵۳]

---

[۵۱] مناقب صفحہ ۱۰، [۵۲] المطبعۃ الکریمیہ والحسینیہ ببلدۃ "اورنبورغ" ۱۹۰۸ء

[۵۳] جلد اول صفحہ ۲۴۸،

.... (یعنی مولانا بہاؤالدین خوارزمشاہ کی بہن کے لڑکے تھے) اور اس سے ایک صفحہ پہلے اسی خوارزمشاہ کو "السلطان علاؤالدین محمد خوارزمشاہ" لکھا ہے۔ یہ روایت بہت زیادہ قرین عقل معلوم ہوتی ہے۔ غور طلب صرف یہ رہجاتا ہے کہ یہ محمد خوارزمشاہ کی حقیقی بہن تھیں یا محض رشتہ کی بہن تھیں۔ اگر اس کے ساتھ یہ ملا لیا جائے کہ سپہ سالار اور افلاکی نے "علاؤالدین کے بجائے غلطی سے جابجا" جلال الدین" لکھدیا ہے، اور افلاکیؒ نے صاف لکھا ہے کہ "عم جلال الدین خوارزمشاہ" تو قطعی ثابت ہے کہ یہ شہزادی علاؤالدین محمد کی عمزاد بہن تھیں اور اس لئے قرینہ قویہ یہ ہے کہ سلطان شاہ کی لڑکی ہونگیؔ[1]، اگر حقیقی بہن تھیں تو علاؤالدین تکش کی بیٹی رہی ہونگی۔

لیکن اس تمام قیل وقال کے بعد جب ایک دوسری نظر سے غور کیا جاتا ہے کہ یہ عقد کس زمانہ میں ہوا ہوگا تو یہ تمام قیاسات پادر ہوا ہوے جاتے ہیں، اس عقد کے زمانہ کے متعلق کوئی خفیف ترین اشارہ بھی کہیں نہیں ملتا مگر مناقب العارفین میں ایک دوسری روایت ایسی ہے کہ اگر اسے صحیح تسلیم کیا جائے تو اس عقد کا سنہ تقریباً قطعی طور پر معین ہوا جاتا ہے۔ افلاکیؒ نے سلطان ولدؒ کے زبانی نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "میرے دادا

---

[1] خود رمزی ہی نے ایک تصریح کی ہے جو اس قیاس کی مد ہے۔ مجدالدین بغدادی کی ہلاکت کی بحث میں لکھا ہے کہ "ان ترکان خاتون ام السلطان علاالدین محمد خوارزمشاہ کانت تحضر مجلس وعظ الشیخ مجدالدین البغدادی" یعنی سلطان علاؤالدین محمد خوارزمشاہ کی ماں حضرت مجدالدین بغدادی کی مجلس وعظ میں حاضر ہوتی تھیں، یہاں "ام" کے لفظ پر یہ حاشیہ دیا ہے۔ والظاہر انہا لیست بامہ حقیقۃ بل کانت زوجۃ ابیہ فقیل لہا انہا امہ مجازاً" یعنی وہ ان کی حقیقی ماں نہ تھیں۔ ان کے باپ کی زوجہ تھیں۔ مجازاً "ماں کہا گیا ہے) ممکن ہے اسی طرح بلکہ جہاں کبھی مجازاً "اخت" کہا گیا ہے

بہاء الدینؒ ولد نے پچاسی برس کی عمر میں انتقال فرمایا[1]" بہاء الدینؒ ولد کا انتقال ۶۲۸ھ میں ہوا ہے۔ پس اگر مناقب العارفین کے چھ سو برس کی نقل در نقل سے "ہشتاد و پنج" کے الفاظ میں کوئی غلطی نہیں واقع ہوئی ہے تو حضرت بہاء الدینؒ ولد کا سال ولادت ۵۴۳ھ قرار پاتا ہے، تبصرۂ تاریخی سے واضح ہے کہ خوارزمشاہیوں میں سے یہ زمانہ علاء الدین محمد خوارزمشاہ کے پردادا اتسر کا تھا۔ اتسر کے بعد الپ ارسلان فرمانروا ہوا، اور ۵۵۶ھ میں انتقال کیا اس وقت سلطان شاہ کی عمر اتنی نہ تھی کہ وہ زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لے سکتا، علاء الدین تکش، سلطان شاہ سے بڑا تھا لیکن بہاء الدینؒ کی ولادت اگر ۵۴۳ھ میں تسلیم کیجائے تو حسینؒ خطیبی کا نکاح ۵۴۲ھ میں ہوا ہوگا[2]، اور اگر علاء الدین تکش کی لڑکی سے نکاح ہوا، تو تکش کی عمر اس وقت بدرجہ اقل تیس بتیس برس کی ماننا پڑیگی یعنی تکش کی ولادت ۵۱۰ھ کے قریب ہوئی ہو لیکن تکش کے متعلق حبیب السیر میں صاف لکھا ہے کہ "مورخان مدت سلطنتش را بست وہشت سال تعین کردہ اند و مدت حیاتش رانپجاہ و دو سال شمردہ اند[3]" تکش کی وفات ۵۹۶ھ میں ہوئی، اس حساب سے اس کی ولادت ۵۴۴ھ میں ہوئی ہوگی پس ۵۴۲ھ میں خود تکش کا وجود نہ تھا، لڑکی کا کیا ذکر،

لہٰذا اس موقع پر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یا بہاء الدینؒ ولد کی عمر کی روایت کو غلط سمجھا جائے یا یہ قرار دیا جائے کہ حسینؒ خطیبی کا عقد علاء الدین کی لڑکی سے نہیں ہوا تھا،

---

[1] مناقب ص ۲۸ (حدم بہاء الدینؒ ولد در سن ہشتاد و پنج سالگی نقل فرمودہ) [2] کیونکہ مناقب العارفین ہی میں یہ روایت ہو کہ نکاح کے نویں مہینے حضرت بہاء الدینؒ ولد پیدا ہوے اور اس سے دو سال بعد حسینؒ نے انتقال فرمایا

[3] حبیب السیر جلد دوم ص ۱۷۷، (سلطان شاہ اور تکش میں ۵۵۶ھ سے ۵۶۸ھ تک خانہ جنگی کا سلسلہ جاری رہا، اس سلسلہ میں بعض تاریخوں میں یہ بھی منقول ہو کہ سلطان شاہ نے تکش کو ایک رباعی بھیجی، تکش کے بیٹے ملک شاہ نے اس کا جواب دیا اور سلطان شاہ نے پھر جواب الجواب بھیجا، اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ تکش کے بیٹے ملک شاہ کی . . . .

(خواہ علاء الدین محمد (۵۹۶ھ/۱۱۹۹ء ۔ ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء) ہو یا علاء الدین تکش (۵۶۸ھ/۱۱۷۲ء ۔ ۵۹۶ھ/۱۱۹۹ء) بلکہ صرف اس قدر تسلیم کیا جائے کسی خوارزمشاہ کی لڑکی سے عقد ہوا تھا۔ (اور حضرت بہاء الدینؒ کے قول میں "خوارزمشاہ بلخ" کی جو قید ہے یہ بھی زاید ہے۔

(ذاتی حیثیت سے میرا میلان شق اول ہی کے قبول کرنے کی طرف ہے کیونکہ ۵۴۳ھ کو حضرت بہاء الدینؒ ولد کا سال ولادت قرار دینے سے مولاناؒ کی ولادت کے وقت بہاء الدینؒ کی عمر اکسٹھ برس کی ماننا پڑے گی۔ مولاناؒ کے بڑے بھائی اور ہمشیرہ کی ولادت اس سے قبل ہو چکی تھی اگر اسے بھی شامل کر لیا جائے تو بھی بہاء الدین کی عمر سن کہولت سے تجاوز کر چکی تھی اور اس روایت کی بنا پر بلخ کے ترک کرنے کے وقت مولاناؒ کی دادی (ملکہ جہان) کی عمر اسی سے کم نہ رہی ہوگی اور اگر مناقب العارفین کی ایک روایت میں "ملکہ جہان" سے مراد آپ ہی کی ذات ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس سفر میں ہمراہ تھیں بلکہ ۶۱۸ھ تک شریک قافلہ تھیں ان دونوں تنقیحات میں عقلاً کوئی محال نہیں ہے مگر عادتاً یہ استبعاد معلوم ہوتا ہے کہ کیوں اس عمر تک حضرت بہاء الدینؒ کے اولاد نہ ہوئی اور ملکہ جہان اس سن و سال میں سالہا سال تک ایسے طولانی سفروں کی کس طرح متحمل ہوئیں)

حاصل کلام یہ کہ مولاناؒ کی دادی ملکہ جہان کا شاہان خوارزم کے خاندان سے ہونا یقینی وقطعی ہے مگر تمام روایات پر نظر کرتے ہوئے تعین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ملکہ جہان کس فرمانروائے خوارزم کی لڑکی تھیں۔

(اس بحث کو ختم کرنے کے قبل یہ اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ رو ہادس نے بلا سند

(بقیہ حاشیہ ص ۲۳) عمر اس زمانہ میں "شعر گوئی" کی حد کو پہنچ گئی تھی مگر اس سے تکش کی مدت عمر کے متعلق قطعی نتیجہ اخذ نہیں ہو سکتا۔)

اس شاہی قرابتداری کو بہت بڑھادیا ہے۔ انھون نے لکھا ہے کہ "مولاناؒ کی والدہ[1] ۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔ اور خود مولاناؒ کی بیوی بھی اسی شاہی خاندان سے تھین[2]۔ مگر یہ دونون باتین غلط ہین۔
اس موقع پر رڈہاؤس کی عبارت پیچیدہ ہوگئی ہے مگر صفحہ کے پہلے ٹکڑے کے آخری جملے اور
تیسرے ٹکڑے کے پہلے جملہ کو ملا کر دیکھنے سے اس کے سوا کوئی دوسرا مفہوم نہین
نکل سکتا)

مناقب العارفین سے ملکہ جہان کے کچھ مزید حالات نہین معلوم ہوتے مگر افلاکیؒ کی ایک
روایت نے اہل یورپ کے لئے استخراج نتائج کا راستہ کھول دیا ہے اس لئے مجبوراً اس باب مین بھی
چند الفاظ لکھنے کی ضرورت ہے۔

رڈہاؤس نے اپنے دیباچہ مین[3] لکھا ہے کہ "مولانا بہاء الدینؒ جب آقشہر سے لارندہ کو روانہ ہوئے
تو اس وقت مولانا جلال الدینؒ کی والدہ اس قافلہ کے ساتھ تھین"، مگر اول تو افلاکیؒ نے اس
موقع پر ایک لفظ بھی مولاناؒ کی والدہ کی نسبت نہین لکھا ہے[4]۔ دوسرے خود رڈہاؤس ہی کے
اس بیان مابعد سے اس کا بطلان ہوتا ہے کہ "مولانا بہاء الدینؒ کے لڑکون کی والدہ کا
ذکر بعد مین کہین نہین آیا ہے[5]"۔ فی الاصل اس موقع پر رڈہاؤس سے قدرے تسامح ہوگیا ہے
اور اسے محض لغزش قلم سمجھنا چاہئے انھون نے "بہاء الدینؒ" کے بجائے غلطی سے "جلال الدینؒ"
لکھدیا ہے، ان کا مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا بہاء الدینؒ کی والدہ (ملکہ جہان) اس
قافلہ کے ہمراہ تھین، اسی سلسلہ مین رڈہاؤس نے یہ لکھا ہے کہ

---

[1] سر گور اوسلی نے بھی لکھا ہے کہ مولاناؒ کی والدہ کسی شاہ خراسان کی لڑکی تھین۔ صفحہ ۱۱۲،
[2] صفحہ ۸ [3] دیباچہ [4] صفحہ ۹، [4] روانگی لارندہ کا پورا حال مناقب العارفین صفحہ ۱۸ سے صفحہ ۲۰
تک مندرج ہے۔ [5] صفحہ ۱۳۴۔

(۱) بہاؤالدینؒ کی والدہ روانگی بلخ کے وقت ان کے ہمراہ تھیں ۔

(۲) سنہ ۱۲۳۰ء (۶۲۸ھ) تک ان کا (والدۂ بہاؤالدینؒ ولد کا) زندہ رہنا معلوم ہوتا ہے پھر اس کے بعد ان کا بھی کہیں کوئی مذکور نہیں ہوا ہے ۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ مفروضہ اول مفروضہ دوم کا نتیجہ ہے اور خود اس مفروضہ دوم میں بھی غلطی واقع ہوگئی ہے ۔ بلخ سے روانگی کے وقت افلاکیؒ نے ملکہ جہان کے ہمراہ ہونے نہ ہونے کا مطلق کوئی ذکر نہیں کیا ہے مگر آگے چلکر آقشہر کے قیام کے موقع پر یہ لکھا ہے کہ "ملکہ جہان ملازم خدمتش می بود"[1] اس سے یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ جب ملکہ جہان آقشہر میں بہاؤالدین ولد کے ہمراہ تھیں تو لامحالہ بلخ سے ان کے ہمراہ گئی ہونگی ۔

سنہ ۱۲۳۰ میں مولانا کی دادی (ملکہ جہان) کے زندہ ہونے کا کوئی ادنےٰ اشارہ بھی تمام مناقب العارفین میں کہیں موجود نہیں ہے ، یہ زمانہ تو تھا جب مولاناؒ کے والد حضرت بہاؤالدینؒ قونیہ میں مستقلاً اقامت پذیر ہوچکے تھے ، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ بھی اسی روایت مذکورۂ بالا سے نتیجۃً ماخوذ ہے ۔ آقشہر سے لارندہ کی جانب مولانا بہاؤالدینؒ کی روانگی سنہ ۶۱۸ھ میں ہوئی ہے ۔ غلطی سے سنہ ۶۱۸ھ کو سنہ عیسوی میں بدلکر سنہ ۱۲۳۰ کردیا گیا[4]

لیکن یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ افلاکیؒ کی روایت مذکورۂ بالا میں "ملکہ جہان" سے مراد بہاؤالدینؒ کی والدہ سے ہو ، مگر سیاق وسباق عبارت سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ یہاں "ملکہ جہان" اسم معرفہ نہیں بلکہ اسم توصیفی ہے ، اور اس کا اشارہ ملک فخرالدین والئی آذربیجان

---

[1] مناقب العارفین صفحہ ۱۰ ، اسی روایت سے استنباط کرکے رڈہاؤس نے دیباچہ میں غلطی سے لکھدیا ہے کہ مولانا جلال الدینؒ کی والدہ قافلہ کے ہمراہ تھیں حالانکہ لکھنا یہ چاہیئے تھا کہ مولانا بہاءالدینؒ کی والدہ (یعنی مولاناؒ جلال الدین کی دادی) قافلہ کے ہمراہ تھیں ۔

کی ملکہ عصمت خاتون کی طرف ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے چند صفحے آگے قیام اقشہر کی

کیفیت دیکھنا چاہیے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ نواحی اقشہر میں ملک فخر الدین (والئی آذربیجان) اور

اس کی ملکہ عصمت خاتون نے مولانا بہاء الدین سے ملاقی ہو کر یہ چاہا کہ مولانا چلکر شہر میں قیام

کریں مگر آپ نے اسے پسند نہ کیا۔ اس کے بعد افلاکی کے الفاظ یہ ہیں کہ "فرمودہ کہ اگر طالب و

عاشق من اید درین قصبہ برائے من مدرسہ عمارت کنند تا مدتے اقامت افتد و ایشان در

اقشہر آذربیجان جہت ایشان مدرسہ عمارت کردند، چہار سال در آن مدرسہ درس عام

می فرمودند و "ملکہ جہان" ملازم خدمتش می بود۔ ہمانا کہ چون بتقدیر مقدر الامور قیا

الجہور ملک فخر الدین و عصمت خاتون دفات یافتند[1]۔

بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ یہاں خصوصیت کے ساتھ حضرت بہاء الدین کی

والدہ ملکہ جہان کے ذکر کی کیا ضرورت تھی اور اگر یہاں "ملکہ جہان" کا اشارہ عصمت خاتون

کی طرف سمجھ لیا جائے تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے؟ بظاہر تو یہ زیادہ قرین قیاس

معلوم ہوتا ہے کہ جب عصمت خاتون نے ازراہِ ارادت و عقیدت مدرسہ تعمیر کیا تو انھوں

نے مولانا بہاء الدین کی خدمت گذاری کو اپنے لئے باعث سعادت سمجھا ہوگا، اور افلاکی کا

مقصود غالباً یہی ہوگا کہ عصمت خاتون شرایط خدمت بجالاتی تھی؛ ماسوا ازیں کوئی شخص

کتنا ہی بلند پایہ کیوں نہ ہو، اس کی والدہ کی نسبت یہ لکھنا کہ "ملازم خدمتش می بود" کسی طرح

موزون و مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

بہرحال یہ ایک قیاس ہے اور اگر "ملکہ جہان" سے مراد مولانا بہاء الدین کی والدہ

ہی ہے تو اس روایت سے آپ کا ۶۱۸ھ تک زندہ ہونا اور سفر میں بہاء الدین ولد کے

---

[1] صفحہ ۱۸ — ۱۹۔

ہمراہ ہونا ثابت ہوتا ہے جیسا کہ رڈہاوس نے لکھا ہے۔ (اور اگر حضرت بہاء الدین کی عمر کی روایت کو جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے صحیح سمجھا جائے تو یہ بھی ظاہر ہے کہ اس وقت ملکہ جہان کی عمر بدرجۂ اقل نوے برس کی ہو چکی ہوگی۔

(۳)

(مولانا کی نانی)

حضرت بہاء الدین ولد کے قول سے یہ ثابت ہے کہ مولانا کی نانی شمس الائمہ سرخسی کی بیٹی تھین مگر اسے بھی تاریخ سے ثابت کرنے مین شدید دشواری کا سامنا ہے۔

مناقب العارفین مین یہ مذکور دو جگہ آیا ہے۔ پہلی روایت صفحہ (۵۱) پر دی ہے جو اوپر منقول ہو چکی ہے۔ یہان شمس الائمہ[1] کی نسبت یہ درج ہے کہ "گویند شمس الائمہ شریف بود، ہم از قبل مادر با میر المومنین علی مرتضی رضی اللہ عنہ می رسند" دوسری روایت صفحہ ۸۰ پر ہے۔ یہان شمس الائمہ کے نسب کے متعلق تو صرف اس قدر لکھا ہے کہ "او حسینی بود" مگر ان کی کثرت تصانیف پر مفصل گفتگو کی ہے۔ پس اب شمس الائمہ کے خطاب کے ساتھ "سرخسی" اور "صاحب تصانیف کثیرہ" کے قیود کا اضافہ کر کے تاریخی حیثیت سے نظر کیجیے تو ان اوصاف سے متصف صرف ایک شخص کا پتہ چلتا ہے اور وہ محمد بن احمد بن ابی سہل ابو بکر ہین۔ دیکھنا یہ ہے کہ زمان و مکان کے اعتبار سے کہانتک اس روایت کا اطلاق ان شمس الائمہ پر

---

[1] مطبوعہ نسخہ مین اس موقع پر فقرہ اوّل مین "شمس الدین" چھپ گیا ہے اور پھر اسی روایت مین بعد کو "شمس الائمہ" ہے اور صفحہ ۸۰ والی روایت مین بھی شمس الائمہ ہی ہے، اور قلمی نسخون کے مقابلہ سے یہ معلوم ہوگا کہ "شمس الدین" کا لفظ محض غلطی طباعت ہے، اس پر لحاظ کرنے کی کوئی ضرورت نہین ہے۔

ہوسکتا ہے۔ مکان کے اعتبار سے توصرف اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ سرخس بلاد خراسان مین سے تھا اور مشہد اور مرو کے درمیان ہری رود پر واقع تھا، شمس الایمہ سرخسی کی زندگی زیادہ تر انھین نواح (بخارا اور ارجند وغیرہ) مین گذری بلخ بھی انھین اطراف مین تھا، پس اس اعتبار سے مولانا کے خاندان کے ساتھ سرخسی کے تعلقات قرابتداری مین کوئی استبعاد نہین ہے، لیکن زمان کے اعتبار سے ان تعلقات مین قدرے دشواری نظر آتی ہی، اسکو واضح طور پر ذہن نشین کرنے کے لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

پانچوین صدی ہجری مین خراسان مین متعدد علماے کبار "شمس الایمہ" کے خطاب سے موسوم ہوے، انھین مین ایک بزرگ عبد العزیز بن نصر بن صالح تھے جو "شمس الایمہ حلوائی" کے لقب سے مشہور ہین اور غالباً سب سے پہلے "شمس الایمہ" یہی ہوے ہین، ان کا سال وفات بقول اکثر ۴۴۸ھ ہے مگر ۴۳۹ھ ۴۵۲ھ اور ۴۵۶ھ بھی مذکور ہین[1]۔ انھین کے ایک شاگرد محمد بن احمد بن ابی سہل ابوبکر تھے اور یہی وہ "شمس الایمہ سرخسی" ہین جو صاحب تصانیف کثیرہ ہوے ہین۔ ان کا سنہ وفات قطعی طور پر نہین معلوم ہے، البتہ الفواید البہیہ مین ہے کہ پانچوین صدی ہجری کے اواخر مین انتقال کیا[2] اور جواہر المضیہ مین ہے کہ ۴۹۰ھ مین وفات پائی[3] مگر جرجی زیدان نے ان دونون کے خلاف ان کا سنہ وفات ۴۸۲ھ دیا ہے[4]

[1] الجواہر المضیہ جلد اول ص ۳۱۸، الفواید البہیہ صفحہ ۹۵-۹۶۔ انھین کے ایک شاگرد بکر بن محمد بن علی بن الفضل الحسن الشہیر بہ "شمس الایمہ زرنجری" بھی تھے (الجواہر المضیہ جلد اول ص ۱۶۲-۱۶۳ الفواید البہیہ ص ۵۶) ان کا سال ولادت ۴۲۷ھ اور سال وفات ۵۱۲ھ دیا ہی، اگر شمس الایمہ حلوائی نے ۴۴۸ھ مین انتقال کیا تو شمس الایمہ زرنجری کا سن اسوقت صرف گیارہ برس کا رہا ہوگا، پس انھون نے کس سن مین شمس الایمہ حلوائی سے استفادہ کیا، لہذا شمس الایمہ حلوانی کے سال وفات کے متعلق آخری روایت کو صحیح سمجھنا چاہئے۔ [2] صفحہ ۱۵۰۔ [3] جلد دوم ص ۲۸۔ [4] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ جلد سوم ص ۱۰۱

اور "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" مین اسی کی توثیق کی گئی ہے[1] پس اگر ان کے سال وفات کے متعلق انتہائی روایت پانچوین صدی ہجری کے اواخر کو قبول کر لیا جائے تو بھی یہ تصور خالی از تردد نہین معلوم ہوتا کہ شمس الائمہ کے انتقال اور مولانا کے تولد کے مابین بدرجہ اقل ایک سدی سے زاید زمانہ گزر گیا لیکن یہ محض ایک تردد ہے، اس مین کوئی محال عقلی نہین ہے۔ اگر شمس الائمہ کا انتقال بقول جرجی زیدان ۴۹۳ھ مین بھی مان لیا جائے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت سلطان العلما بہاء الدین کی ولادت ۵۴۳ھ مین ہوئی تو بھی اس امر کے فرض کر لینے مین کوئی محال لازم نہین آتا کہ آخر عمر مین شمس الائمہ کے ہان کوئی لڑکی ہوئی ہو جنکی عمر ۵۴۳ھ تک ساٹھ اکسٹھ برس کی ہوئی ہوگی اور کم و بیش اسی زمانہ مین ان بنت شمس الائمہ کے کوئی لڑکی ہوئی ہو جو حضرت بہاء الدین ولد کی زوجہ محترمہ اور مولانا (جلال الدین رومی) کی والدہ مکرمہ بنی ہون[2]

افلاکی نے اوایل کتاب مین جو کچھ لکھا ہے اس سے جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ یہی ہے۔ جو مذکور ہوا مگر کتاب کے اختتام پر بذیل سلسلۂ خرقہ خود افلاکی ہی نے ایک ایسی روایت دی ہے جس سے یہ کل توجیہات باطل ہوئے جاتے ہین یعنی حضرت بہاء الدین ولد شمس الائمہ کے مرید تھے۔ فصل دوم مین مولانا کے سلسلۂ باطنی کی بحث مین تفصیلاً معلوم ہوگا کہ یہ سلسلہ کس طرح چلا ہے، یہان صرف مجمل اشارہ کر دینا کافی ہے وہ یہ کہ مولانا کے دادا (حسین خطیبی) کا انتقال اس وقت ہوا ہے جب مولانا کے والد (بہاء الدین ولد) صرف دو برس کے تھے،

---

[1] جلد چہارم صفحہ ۱۵۹۔ [2] اس عمر مین کسی عورت کے اولاد کا ہونا کچھ عجائبات سے نہین ہے حضرت غوث اعظم شیخ عبد القادر جیلانی کی نسبت منقول ہے کہ آپ کی ولادت کے وقت آپ کی والدہ کی عمر ساٹھ برس کی تھی (خزینۃ الاصفیا جلد اول ص ۹۵)

مولاناؒ کے دادا (حسینؒ) اپنے والد (احمدؒ خطیبی) کے مرید تھے مگر مولاناؒ کے والد کو یہ موقع نہین حاصل ہوا کہ وہ اپنے والد (حسینؒ خطیبی) سے بیعت کرتے۔ افلاکیؒ نے اس خلل کو اس طرح پورا کیا ہے کہ احمدؒ خطیبی کے مرید "شمس الایمہ سرخسی" تھے اور "شمس الایمہ سرخسی" کے مرید حضرت بہاالدین ولد۔ پس اگر حضرت بہاءالدین ولد کی عمر بروایت افلاکیؒ پچاسی برس کی تسلیم کرلی جائے تو بھی بدرجۂ اقل اول الذکر کی ولادت اور آخر الذکر کی وفات مین پچاس برس سے کم کا فصل نہین پڑتا۔

لہذا اب اس تمام روایت پر بالکل ہی دوسرے پہلو سے نظر کرنا چاہئے۔ اول تو یہ خیال کرنا چاہئے کہ "شمس الایمہ" کا خطاب اس زمانہ مین مسلسل چلا آرہا تھا۔ اوپر ذکر ہوچکا ہے کہ شمس الایمہ حلوائی کے ایک شاگرد "شمس الایمہ زرنجری" بھی تھے۔ ان زرنجری کے فرزند عماد الدین بھی "شمس الایمہ" کے خطاب سے مخاطب تھے[1] ممکن بلکہ اغلب ہے کہ "سرخسی" کے سلسلہ مین بھی بعد کو کوئی بزرگ اس خطاب سے مخاطب ہوے ہون اور یہ اشارہ نہین کی طرف ہو۔[2] شمس الایمہ کے متعلق افلاکیؒ کی دوسری روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھون نے جن شمس الایمہ سرخسی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ صاحب تصانیف کثیرہ تھے اور جن شمسؒ الایمہ سرخسی کا حال تذکرون مین موجود ہے وہ بھی بہت بڑے صاحب تصانیف تھے، آپ کے تصانیف مین سب سے مشہور کتاب "مبسوط" ہے[3]،

---

[1] الفوائد البہیہ ص ۱۴۶۔ [2] اس موقع پر اتنا لکھ دینا بیمحل نہ ہوگا کہ بعض زمانون مین بعض خطابات اس طرح رائج ہوجاتے ہین کہ وہ ایک عہدے کی سی حیثیت پیدا کرلیتے ہین۔ چنانچہ تقریباً اسی زمانہ مین "صدالشریعت" کے خطاب کا بھی یہی حال تھا، اگر "شمس الایمہ" کا خطاب بھی اسی طرح چلتا رہا ہو تو کچھ بعید نہین۔ حلوائی، زرنجری، عماد الدین تین مدارج تو یہین موجود ہین۔ [3] یہ کتاب پندرہ جلدون مین ہے اور جس طرح

اس کے علاوہ اور بھی متعدد ضخیم کتابین لکھی ہین جنہین شرح "السیر الکبیر" زیادہ مشہور ہے مگر افلاکی نے جس انداز مین اس روایت کو لکھا ہے وہ ان کتابون پر صادق نہین آتی، لکھتے ہین کہ انھون نے (شمس الائمہ) نے بکثرت کتابین تصنیف کین اور یہ کتابین ایسی تھین کہ کسی عالم نے خواب مین بھی نہین دیکھی تھین۔ اس زمانہ کے بزرگون نے مصلحت اسی مین سمجھی کہ ان کتابون کو ظاہر نہ کرین تاکہ "قتلہ انبیا و جہلہ اولیا" کے ہاتھ نہ لگین اور فساد واقع نہ ہو۔ یہ کتابین بغداد مین ہنوز سربمہر محفوظ ہین[1]"۔ لیکن مولانا بالا شمس الائمہ سرخسی نے جو کتابین لکھین وہ تو اول دن سے متداول اور معروف و مشہور رہین اور اس وقت تک مستند و مسلم سمجھی جاتی ہین اور "نبیون کو قتل کرنے والون اور ولیون سے مخالفت کرنے والون کو" ان پر کبھی اعتراض نہین ہوا، علاوہ ازین، آپ نے زیادہ تر شرق خراسان، از جند وغیرہ مین رہکر کتابین لکھین، بغداد سے انھین کیا سروکار، اور سب سے بڑھکر یہ کہ آپ آخر تک علمائے ظاہر کے لباس مین رہے۔ بیعت و ارادت کے سلسلہ مین کہین آپ کا ادنی مذکور بھی نہین ملتا۔

پس یہ تمام قیاسات اس جانب راجع ہین کہ جن شمس الائمہ کا اشارہ مناقب العارفین مین ہے یہ کوئی دوسرے شمس الائمہ ہونگے جو سلسلۂ فقر و تصوف سے تعلق رکھتے تھے اور جن کے تصانیف اس نوعیت کے تھے کہ علمائے ظاہر ان پر معترض ہوتے۔

اس تمام بحث کے بعد اب رڈھاوس کی طرف توجہ کیجے تو ایک بالکل ہی نئی بات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱ کا) تصنیف ہوئی وہ ایسا محیر العقول واقعہ ہے کہ تصنیف و تالیف کی تمام تاریخ مین اس کی کوئی نظیر نہین مل سکتی۔ حضرت ممدوح قید مین تھے ایک کتاب بھی پاس نہ تھی، زبانی املا کراتے تھے، اور شاگرد باہر بیٹھ کر لکھتے تھے، او خوبی پر خوبی یہ کہ ساری کتاب مرصع عبارت مین ہے۔ [1] مناقب ص ۱۷۸

معلوم ہوتی ہے، انھون نے مولانا کے سلسلۂ باطنی مین اکثر بزرگون کا سال وفات بھی دیا ہے، انہین مین "امام سرخسی" کا سال وفات ۵۷۱ھ دیا ہے[۱] (البتہ شمس الایمہ سرخسی نہین لکھا ہے بلکہ "امام سرخسی" لکھا ہے) مجھے ندامت کے ساتھ اپنی کم بضاعتی کا اعتراف ہے کہ مین کہین سے کسی "امام سرخسی" کا سال وفات ۵۷۱ھ محقق نہ کرسکا لیکن اگر اس کا پتہ چل جائے تو تمام دشواریان حل ہو جاتی ہین۔

غرض اس تمام کدوکاوش سے جو نتیجے اخذ ہو سکتے ہین وہ حسب ذیل ہین :۔

(۱) مولانا کی نانی شمس الایمہ سرخسی (؟) کی دختر تھین۔

(۲) شمس الایمہ حسینی تھے، اور مان کی جانب سے بھی ان کا نسب حضرت علی رضؓ سے ملتا تھا،

(۳) اگر یہ شمس الایمہ وہ تھے جن کا انتقال پانچوین صدی کے اواخر مین ہوا ہے تو حضرت بہاؤالدین ولد کے شیخ کوئی دوسرے شمس الایمہ تھے۔

(۴) اگر یہ وہی شمس الایمہ تھے جو حضرت بہاءالدین ولد کے شیخ تھے تو لامحالہ ان کا زمانہ چھٹی صدی کے اواسط بلکہ ربع ثالث مین قرار پائے گا (جیساکہ رڈہاوس نے لکھا ہے) اور جملہ حالات پر نظر کرتے ہوئے بھی قیاس زیادہ قرین بہ صواب ہے،

حاصل کلام یہ کہ مولانا کا نسب جس طرح باپ کی جانب سے حضرت ابوبکر رضؓ سے ملتا تھا اُسی طرح مان کی جانب سے حضرت علی رضؓ سے ملتا تھا۔

(۴)

(مولانا کے نانا)

مولانا کی والدہ کا نسب سلطان ابراہیم ادہم[۲] سے ملتا تھا، یعنی مولانا کے نانا

---

[۱] صفحہ ۵ [۲] سلطان ابراہیم ادہم کی نسبت یہ روایت نہایت تواتر کے ساتھ مشہور ہے کہ

سلطان ابراہیمؒ ادہم کی اولاد مین تھے۔

یہ روایت "فیہ مافیہ" کی ہے جسے مولاناؒ کے حالات مین سب سے زیادہ مستند سمجھنا چاہئے۔ اس کے متعلق اگرچہ کوئی مزید تصریح کہین مذکور نہین ہے مگر اس کے رد کرنے کی بھی کوئی وجہ نہین ہوسکتی، لہذا اسے مسلّم سمجھنا چاہئے کہ مولاناؒ کے نانا سلطان ابراہیمؒ کی اولاد سے تھے۔ ان تعلقات عالیہ پر نظر کرنے سے مولاناؒ کی خاندانی عظمت و وقعت کا جیسا کچھ باوقعت وحرمت اثر دل مین پیدا ہوجاتا ہے وہ ظاہر ہے۔ مگر مولاناؒ کے آبا واجداد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۳ کا) بلخ کے بادشاہ تھے اور بادشاہی چھوڑ کر فقیری اختیار کی تھی۔ خود مولاناؒ نے دفتر دوم مین ایک حکایت حضرت ابراہیمؒ ادہم کے متعلق لکھی ہے اس مین بھی یہ اشارہ ملتا ہے ؎

کو رہا کرد آنچنان ملک شگرف ۔۔۔ برگزید از فقر بس باریک حرف

ترک کرد او ملک ہفت اقلیم را ۔۔۔ میزند بر دلق سوزن چو گدا

ملک ہفت اقلیم ضایع میکند ۔۔۔ چون گدا بر دلق سوزن میزند

حضرت ابراہیمؒ ادہم کے سال انتقال کی روایتون مین اختلاف ہے، سنہ ۱۶۰ھ سے سنہ ۱۶۶ھ تک مختلف سنین مذکور ہین، یہ زمانہ خاندان عباسیہ کے تیسرے خلیفہ مہدی (۱۵۸ھ/۷۷۵ء - ۱۶۹ھ/۷۸۵ء) کا تھا، خاندان بنو امیہ کا انقراض ۱۳۲ھ/۷۵۰ء مین ہوا، بنو امیہ کے آخر دم تک شرق سے غرب تک تمام ممالک اسلامیہ متحد ومتفق رہے، بنو عباس کا دور شروع ہونے پر مغرب مین اختلال واقع ہوا، ۱۳۲ھ/۷۵۰ء مین اسپین، ۱۷۲ھ/۷۸۸ء مین مراقش، ۱۸۴ھ/۸۰۰ء مین بربر یکے بعد دیگرے آزاد ہوگیے مگر مشرقی ممالک پر ان کا تسلط بدستور قائم رہا تا آنکہ مامون (۱۹۸ھ/۸۱۳ء - ۲۱۸ھ/۸۳۳ء) نے ۲۰۴ھ/۸۱۹ء مین طاہر ذوالیمینین کو خراسان کا والی مقرر کیا اور پھر یہ ولایت اسی خاندان مین موروثی ہوگئی اور عملاً خراسان خود مختار ہوگیا۔ پس ابراہیم ادہم کے زمانہ مین بلخ مین کسی بادشاہ کا ہونا صریحاً خلاف واقعہ ہے، نفحات الانس مین تو صرف اس قدر لکھا ہے کہ "ازابنا

محض نسبی عز و شرف پر فخر کرنے والون مین نہین تھے بلکہ ان بزرگون کے ذاتی اکتسابات و کمالات بھی بجائے خود نہایت عالی و رفیع تھے، تمام تذکرہ نویس متفق اللسان ہین کہ کیا بلحاظ علم و فضل اور کیا بلحاظ زہد و ورع مولانا کے بزرگون کا پایہ نہایت بلند تھا خود سلطان ولد فرماتے ہین کہ ؎

جملہ اجداد او شیوخ کبار ہمہ در علم و در عمل مختار

ان کے عز و وقار کا اندازہ صرف اس ایک امر سے ہو سکتا ہے کہ دنیاوی حشمت و ثروت سے بے تعلق ہونے کے باوجود بلخ و خوارزم کے بادشاہون نے اپنی شہزادیون کا عقد اس خاندان مین کیا۔

اب اس بالواسطہ انتساب فضیلت کی بحث کو ترک کر کے ہم بلاواسطہ بیان فضائل کی طرف متوجہ ہوتے ہین جن سے مولانا کے والد (اور فی الحقیقت خود مولانا)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴ کا) ملوک است"، گو تذکرۃ الاولیا مین پوری تفصیل کے ساتھ ان کے بادشاہ بلخ ہونے اور بادشاہی کو ترک کرنے کے حالات مشہورہ درج ہین، اصلیت صرف اس قدر معلوم ہوتی ہے کہ آپ امرائے بلخ مین سے رہے ہونگے اور چونکہ فقر اختیار کرنے کے بعد آپ خراسان سے ہجرت کر کے شام کو چلے گئے تھے اور وہان بہت ہی زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے اس لئے بمرور ایام آپ کی نسبت یہ مشہور ہو گیا ہو گا کہ آپ بادشاہ بلخ تھے اور بادشاہی ترک کر کے زمرۂ اہل تصوف مین داخل ہو گئے تھے، سمعانی نے اپنی "کتاب الانساب" مین بعینہٖ یہی خیال ظاہر کیا ہے: "اصلہ من البلخ ثم انتقل بعد ان تاب و ترک الامارۃ الی الشام طلباً للحلال . . . . . (ورق ۵۹ ب) سمعانی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم ادہم نے ابو اسحٰق سے روایت کی ہے اور ثوری اور . . . نے ابراہیم ادہم سے روایت کی ہے بہر حال آپ کا اہل تصوف کے طبقہ اولین مین ہونا متفق علیہ ہے اور آپ کے پایہ بلند سے کسی کو انکار نہین ہے، اور اس موجودہ بحث مین صرف اسی قدر کافی ہے کہ مولانا کا سلسلۂ نسب اس سلطان اقلیم فقر و تصوف سے بھی ملتا تھا

کی شان رفیع آشکارا ہو سکے۔

اسے مسلّم قرار دیکر کہ مولاناؒ کے دادا (حسین خطیبیؒ) کا عقد خاندان خوارزمشاہی کی کسی شہزادی سے ہوا تھا، سلسلۂ روایت وحکایت اس طرح آگے بڑھتا ہے کہ اسی شہزادی (ملکہ جہان) کے بطن سے تاریخ عقد سے ایک سال کے اندر ہی مولاناؒ کے والد متولد ہوئے۔ آپ کا نام "محمد" رکھا گیا اور لقب "بہاء الدین" قرار پایا ؎

نقش بد "بہاء دین ولد"
عاشقانش گزشتہ از حد وعد

(رباب نامہ)

سن رشد کو پہنچنے پر عالم رویا میں سرکار دو جہان سے خطاب "سلطان العلماء" عطا ہوا۔ اگر حضرت بہاء الدینؒ کی عمر کی روایت جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے صحیح ہے تو آپ کی ولادت ۵۴۳ھ میں ہوئی ہوگی۔[1] آپ کی ولادت کے دو برس بعد حضرت حسینؒ خطیبی نے

---

[1] حضرت بہاء الدینؒ ولد کے سال ولادت کا پتہ کسی کتاب سے نہیں چلا۔ صرف ایک کتاب "آئینہ تصوف" (مصنفہ شاہ محمد حسن صابری، مطبوعہ مطبع حسینی رامپور) میں آپ کا سال ولادت "بوقت عشا روز دوشنبہ ۱۴ ماہ صفر ۵۴۳ھ" دیا ہے (صفحہ ۲۲۰) لیکن یہ اپنی نوعیت میں ایک عجیب وغریب کتاب ہے۔ اس کا انحصار "طرت نامہ" اور "مکتوبات لطائف" پر ہے اور یہ دونوں تحریریں اسرار اولیا اللہ سے ہیں جو قطب وقت کے دفتر میں محفوظ رہتی ہیں، اہل ظاہر ان تحریروں کو دیکھ نہیں سکتے اور اہل باطن میں بھی شاذونادر ہی کوئی خوش نصیب اولیاء ہوگا جو ان تحریروں کی زیارت کر سکے۔ کتاب میں کئی سو اولیاء اللہ کے حالات درج ہیں اور جس کی ولادت و وفات بقید وقت، روز، ماہ و سنہ دی ہے۔ پھر کسی کی وفات "مرتبہ جبروت" میں ہے، کسی کی وفات "مرتبہ لاہوت" میں، کسی کی وفات "مرتبہ ملکوت" میں۔ عمریں بھی خلاف قیاس ظاہر دی ہیں، ڈیڑھ سو

رحلت فرمائی، عقد کے وقت حسینؒ خطیبی کی عمر تیس برس کی تھی پس انھون نے تقریباً تینتیس سال کی عمر مین وفات پائی۔

حضرت بہاء الدینؒ ولد کے کسی بھائی یا بہن کا کوئی ذکر کہین نہین آیا ہے مگر ترکِ بلخ کے موقع پر افلاکیؒ نے یہ لکھا ہے کہ "حضرت بہاء الدینؒ ولد را دایہ بود نصیب خاتون نام . . . . بعضے گویند خواہرش بود مذکورہ را با شوہرش آن جایگاہ رہا کردند" افلاکیؒ نے اسے شک کے ساتھ لکھا ہے اور کوئی دوسری سند بھی نہین ہے کہ حضرت بہاء الدینؒ ولد کے علاوہ حسینؒ خطیبی کے کوئی اور اولاد بھی ہوئی تھی۔ اس لئے ظنِ غالب یہی ہے کہ نصیب خاتون اگر حضرت بہاء الدینؒ ولد خواہر تھین تو حقیقی بہن نہ ہونگی، کسی اور رشتہ سے بہن رہی ہونگی۔

حضرت بہاء الدینؒ ولد کا خطاب "سلطان العلما" سے ملقب ہونا۔

حضرت بہاء الدینؒ ولد نوعمری ہی مین تمام علوم مین کامل و ماہر ہو گئے تھے، ایک روز آپ اپنے والدؒ کے کتبخانہ کا ملاحظہ فرما رہے تھے کہ آپ کے ذہن مین یہ خیال گزرا کہ انہین علوم کی وجہ سے میری والدہ ملکہ جہان میرے والدؒ کے عقد مین آئین۔ اسی وقت سے آپ ہمہ تن علوم دینی کے حصول مین مستغرق

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶ کا) اور دو سو برس تو بہت عام ہین، پانچسو اور چھ سو برس تک کی عمر ین درج ہین، چنانچہ حضرت بہاء الدینؒ کے نام سے اور شیخ صدر الدینؒ قونوی کا نام ہے ان کی ولادت ۴۹۵ھ مین اور وفات ۷۲۶ھ مین قرار دی ہے یعنی انھون نے دو سو تیس برس کی عمر پائی ا حالانکہ کتب اہل ظاہر سے شیخؒ کی ولادت کا اوایل ساتوین صدی مین ہونا مستنبط ہوتا ہے اور وفات ۶۷۲ھ مین محقق ہے۔ اور بھی اکثر نام اسی طرح کے ہین، اس لئے باب باب ظاہر اس کتاب کو سند قرار نہین دیا جا سکتا ہے۔

لہ مناقب ص ۱۱-۱۲ ۔ ٢ہ قیاس بھی اس کا موید ہے کیونکہ بہاء الدینؒ کی ولادت کے دو ہی برس بعد حسینؒ خطیبی کا انتقال ہو گیا تھا۔

ہوگئے اور علایق دنیاوی سے بالکلیہ قطع تعلق کرلیا، آخر یہ مرتبہ حاصل ہوا کہ ایک ہی شب مین بلخ کے تین سو مفتیون نے یہ خواب دیکھا کہ ایک میدان مین ایک بہت بڑا خیمہ نصب ہے اور آنحضرتؐ رونق افروز ہین، بہاؤالدینؒ ولد کی نشست آپ کے پہلو مین ہے اور دوسرے علما و فضلا فاصلہ سے بیٹھے ہوے ہین آنحضرتؐ نے فرمایا کہ آج سے بہاؤالدینؒ ولد کو سلطان العلما" کہین۔ صبح کو یہ اصحاب اس غرض سے چلے کہ حضرت بہاؤالدینؒ ولد کو واقعۂ خواب سے آگاہ کرین۔ راستہ مین جو ملتا وہ اپنا خواب بیان کرتا اور جماعت کا تحیر بڑھتا جاتا جب قریب پہنچے تو حضرت بہاؤالدینؒ ولد نے اول ہی فرمادیا کہ "تا حضرت پیغامبر علیہ السلام از حال در ویشان اعلام نفرمود شمارا یقین نگشت" پھر تو سب بیکبار مرید ہوگئے اور اس کے بعد سے حضرت بہاؤالدینؒ اپنے نام کے بجائے "کتبہ سلطان العلما" لکھنے لگے[1]

اس واقعہ کو سلطان ولدؒ نے اپنی مثنوی مین، سپہ سالارؒ نے اپنے رسالہ مین، افلاکیؒ نے مناقب العارفین مین شرح و بسط سے لکھا ہے، "فیہ مافیہ" مین بھی موجود ہے اور بعد کے تمام تذکرہ نویسون نے متفق اللفظ ہوکر اسے نقل کیا ہے،

آپ کے علم و فضل کی کیفیت یہ تھی کہ تمام اقصاے خراسان سے مشکل فتادے آپ ہی کے پاس آتے تھے سلطان ولدؒ فرماتے ہین ؎

مثل او کس نبود در فتوے | از فرشتہ گذشتہ در تقوی

سپہ سالارؒ نے لکھا ہے کہ

"از اقصاے خراسان فتاواے مشکل بحضرت او آوردندے[2]

مناقب العارفین مین بروایت سلطان ولدؒ منقول ہے کہ حضرت سلطان العلماؒ

---

[1] فیہ مافیہ ص۲ رباب نامہ، رسالہ سپہ سالارؒ ص، مناقب العارفین ص ۱۰۔ [2] سپہ سالارؒ ص ۶،

نہایت قوی ہیکل اور تنومند شخص تھے[1] مگر اس کے ساتھ ہی دوسرے موقع پر یہ بھی درج ہے کہ آپ کے ریاضات و مجاہدات اس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ منھ مین صرف چند دانت رہگئے تھے[2]

لباس | آپ علماے ظاہر کے لباس مین رہتے تھے[3]

معیشت | بیت المال سے کچھ رقم آپ کے لئے معین تھی۔ اسی پر گذر فرماتے، وقف سے اصلاً کوئی شے نہین لیتے تھے[4]

طریق مجلس | مجلس کا طریق بادشاہون کا سا تھا[5]

ترتیب اوقات | آپ کا معمول تھا کہ صبح سے دوپہر تک درس عام ہوتا، ظہر کے بعد اپنے خاص اصحاب کے حلقہ مین حقایق و معارف بیان فرماتے۔ دوشنبہ اور جمعہ کو عام وعظ کہتے[6] گفتگو کا یہ انداز تھا کہ "چون بہ تکلم آمدے بغریدے چون شیر و نعرہا زدے" آغاز کلام ایسے الفاظ سے فرماتے تھے کہ جبتک اس سے تین چار درجہ پست نہین ہوتے تھے مفہوم کسی کی سمجھ مین نہین آتا تھا[7]

عظمت و ہیبت | تجلیات جلالی کی کثرت سے مزاج مبارک مین تندی پیدا ہوگئی تھی۔ ہیبت نمایان رہتی اور ہمیشہ متفکر معلوم ہوتے تھے۔

مریدون اور شاگردون کی یہ مجال نہ تھی کہ بے اجازت حرکت کرسکین[8]

مولانا کی ولادت | غرض اس علم و رتبہ کے شخص کے خلف صدق و فرزند ارجمند مولانا جلال الدین محمد تھے جو اسلاف کے لئے باعث فخر و مباہات اور اخلاف کے لئے موجب

---

[1] مناقب صفحہ ۲۲ - [2] ایضاً [3] سپہ سالار صفحہ ۶ [4] ،، صفحہ ۶-۷

[5] سپہ سالار ص ۷، [6] ،، ص ۷، [7] ،، [8] ،، ،،

اعزاز و برکات ثابت ہوئے۔ آپ ۶۰۴ھ مین بلخ مین متولد ہوئے، سپہ سالار نے تاریخ ولادت نہین دی ہے۔ صرف "در شہور سنہ اربع و ستمایہ لکھدیا ہے"[1] مگر افلاکی نے تاریخ ولادت ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ درج کی ہے[2] اور اسی پر اتفاق عام ہے۔

مولانا کے برادر و خواہر | مولانا کے ایک بھائی علاء الدین کا صرف ضمناً پتہ چلتا ہے، ترک بلخ کے موقع پر افلاکی نے یہ لکھا ہے کہ "گویند مولانا جلال الدین دران زمان پنج سالہ بود و برادرش علاء الدین محمد ہفت سالہ"[3]، اس سے زیادہ علاء الدین محمد کا کچھ حال کہین مذکور نہین ہوا ہے۔ شجرۂ نسب سے مولانا کی ایک ہمشیرہ فاطمہ خاتون کا نام بھی معلوم ہوتا ہے اور اسی شجرے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت سلطان العلما کے بلخ کو ترک کرنے سے قبل ہی فاطمہ خاتون کا عقد ہو چکا تھا، اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ بلخ ہی مین رہگئی تھین[4]۔

پس حضرت سلطان العلما کی اولاد مین سب سے بڑی ان کی صاحبزادی فاطمہ خاتون تھین، ان کے بعد علاء الدین تھے اور سب سے چھوٹے مولانا جلال الدین تھے، جن کی ذات سے بزرگون کا نام بھی صفحہ قرطاس پر باقی رہگیا۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم و تربیت | حضرت سلطان العلما کے مریدان با اختصاص مین ایک

---

[1] سپہ سالار ص ۱۲ (یورپی تذکرہ نویسون نے بھی یہی سنہ دیا ہے، البتہ اسپرنگر نے ۶۰۲ھ یا ۵۹۲ھ لکھا ہے اور سرگور اوسلی نے اس دوسری روایت (یعنی ۵۹۲ھ) سے اتفاق کیا ہے، ظاہر ہے کہ اسپرنگر اور اوسلی کو اس باب مین صریح مغالطہ ہوا ہے) [2] مناقب العارفین ص ۵۰، انگریزی تاریخ کی تطبیق مین قدرے اختلاف ہے، براؤن نے مجملاً موسم خزان ۱۲۰۷ء لکھدیا ہے۔ ریڈ ہاؤس نے ۵ ستمبر ۱۲۰۷ء لکھا ہے انسائیکلوپیڈیا برٹینکا مین ۳۰ ستمبر ۱۲۰۷ء مندرج ہے اور یہی تاریخ ڈاکٹر نکلسن نے قرار دی ہے (دیوان شمس تبریز ص ۱۶ دیباچہ) [3] مناقب ص ۱۳ [4] مناقب ص ۲۰، ۲۱ (نسخہ قلمی)

بڑے پایہ کے بزرگ سید برہان الدین محقق ترمذی تھے (جن کے کچھ حالات فصل دوم مین ملین گے) حضرت سلطان العلما نے آپ ہی کو مولانا کا اتالیق مقرر فرمایا اور ترک بلخ سے کچھ قبل تک یعنی چار پانچ سال کی عمر تک مولانا آپ ہی کے زیر تربیت رہے اور پھر اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد منازلِ سلوک بھی آپ ہی کے زیر ہدایت طے فرمائے (جس کا ذکر فصل دوم مین آئے گا)

مولانا کے ایام طفولیت کے بعض واردات و واقعات موقع کے اعتبار سے مناسب ہوگا کہ مولانا کے ایام طفولیت کے چند خوارق العادت واقعات بھی یہان بیان کر دیئے جائین۔

مولانا کی عمر ابھی پانچ سال کی تھی کہ آپ اکثر اوقات اچھل پڑتے اور مضطرب ہو جاتے تھے، اضطراب اس قدر بڑھتا تا کہ حضرت بہاء الدین ولد کے مرید آپ کو پکڑ لیتے تھے۔ یہ اثر صور غیبی اور اشکال روحانی کے متمثل ہو کر نظر آنے کا تھا۔[1]

شیخ بدرالدین نقاش المولوی نے (مولانا کے فرزند) حضرت سلطان ولد سے روایت کی ہے کہ (مولانا کے والد) حضرت بہاء الدین ولد کے دست مبارک کا لکھا ہوا ایک کاغذ ایک صحیفہ میں ملا جس میں درج تھا کہ

مولانا کی عمر ہنوز چھ برس کی تھی کہ ایک جمعہ کو بلخ مین اکابر شہر کے لڑکوں کے ساتھ

---

[1] مناقب صفحہ ۲۰ سے سرگور اوسلی نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے، مگر اس کا ناقل شیر خان لودی کو بتایا (ص ۱۱۵) مولانا کے سوانح مین تقریباً تمام ہی تذکرون مین یہ روایت منقول ہے، ازانجملہ مرآۃ الخیال (ورق ۲۲ ب) مین بھی ہے اور مرآۃ الخیال کے مصنف شیر خان لودی ہین غالباً اوسلی کا ماخذ یہی ہے، کیونکہ مولانا کے تاریخ انتقال کے نسبت بھی انھون نے وہی غلطی کی ہے جو مرآۃ الخیال مین ہے۔

کوٹھے پر سیر کر رہے تھے کہ ایک لڑکے نے کہا کہ آؤ اس چھت سے دوسری چھت پر کودیں، مولانا نے ہنسکر جواب دیا کہ یہ تو بلّی، اور دوسرے جانور بھی کر سکتے ہیں، اگر قوت روحانی ہے تو آسمان پر چلو اور منازل ملکوت کی سیر کرو، یہ کہتے ہی نظروں سے غائب ہو گئے، لڑکے چلانے لگے، آپ پھر ظاہر ہو گئے اور فرمایا کہ جس وقت میں تم سے باتیں کر رہا تھا، سبز قباوالوں کی ایک جماعت مجھے تمھارے درمیان سے اٹھالے گئی، بروج آسمان اور عجائب عالم روحانی کی سیر کرائی، جب تمھارے چلانے کی آواز پہنچی تو مجھے پھر یہاں پہنچا دیا۔[۱]

یہ بھی مروی ہے کہ اس سن میں مولانا تیسرے چوتھے روز کھانا کھاتے تھے۔[۲]

مولانا کے اتالیق سید برہان الدین محقق ترمذی کا قول ہے کہ مولانا کے بچپن میں نے بارہا انھیں اپنے کندھے پر بٹھا کر عالم ملکوت کی سیر کرائی ہے۔[۳]

مولانا کے والد جب بلخ کو ترک کر کے بغداد میں وارد ہوئے اور مدرسہ مستنصریہ میں قیام فرما تھے تو آپ نصف شب میں پانی طلب کیا کرتے تھے، مولانا اٹھکر جاتے دروازہ از خود کھل جاتا اور دجلہ سے پانی لے آتے، واپس آتے تو دروازہ پھر بند ہو جاتا، دربان نے جب بار بار یہ حالت دیکھی، لوگوں سے ذکر کیا اور جب اس کا چرچا ہوا تو حضرت بہاؤالدین ولد کو اس سے انفعال ہوا اور دربان کو نصیحت کی، وہ تائب ہو کر مرید ہو گیا[۴]

ترک وطن | مولانا کے والد ماجد کا اثر جب زیادہ بڑھا اور آپ کی دعوت و نصیحت کو حد سے

---

[۱] مناقب صفحہ ۵۰-۵۱ ردہاوس اور بعض دیگر علماے یورپ نے اس روایت کو خوش اعتقادی اور قبول محال کی مثال کے طور پر پیش کیا ہے، اس کا تعلق ملکۂ باطنی اور قدرت ولایت کے مبحث عام سے ہے اور اس پر گفتگو کرنا میرے موضوع بلکہ حیطۂ قدرت سے باہر ہے [۲] مناقب ص ۵۱ [۳] مناقب صفحہ ۵۴ [۴] مناقب ص ۱۶-۱۷۔

زیادہ قبول عام حاصل ہوا اور مریدون کی تعداد بیشمار ہوگئی تو بعض علماے عصر کو رشک ہونے لگا۔ ان مین امام فخرالدین رازی، قاضی زین فرازی، جمال الدین حصیری وغیرہم کے ایسے علماے جلیل القدر بھی شامل تھے۔ حضرت سلطان العلما اپنے وعظ مین مذہب حکماے یونان کی مذمت فرمایا کرتے کہ "کچھ لوگون نے کتب آسمانی کو پس پشت ڈال رکھا ہے اور فلسفیون کے ازکار رفتہ اقوال کو اپنا مسلک بنا لیا ہے۔ یہ لوگ کیونکر نجات کی امید کر سکتے ہین"[1] اسی طرح ایک روز وعظ مین جب زیادہ جوش مین آئے تو فرمایا کہ

. . . . . اے فخر رازی، اے محمد خوارزم شاہ اور اے مبتدعان دیگر آگاہ ہو جاؤ اور جان لو کہ تم نے لاکھون باراحت دلون کو اور دولتون کو چھوڑ رکھا ہے اور اس قدر روشنی کو دنیا کی ان دو چار تاریکیون نے تمھارے لئے تاریک بنا دیا ہے اور یہ سب کچھ غلبۂ نفس و شہوت کی وجہ سے ہے کہ اس نے تمھین بیکار کر رکھا ہے اور جب بیکار ہوگے ساری برائیان پیدا ہونگی[2]

غرض اس طرح کی برملا مذمت سے علمائے ظاہر کے دلون مین آپ کی طرف سے کدورت بیٹھ گئی مگر چونکہ خود خوارزمشاہ آپ کا نہایت معتقد تھا، ان لوگون کو موقع شکایت کا نہین ملتا تھا۔ ان کدورتون کا آغاز ۶۰۵ھ سے ہوا اور کئی برس تک صورت حالات اسی طرح جاری رہی۔ اتفاق سے ایک روز سلطان آپ کی زیارت کو آیا تو دیکھا کہ مجمع نہایت کثیر ہے۔ امام رازی سے مخاطب ہو کر کہا کہ کتنا کثیر مجمع ہے، امام صاحب کو موقع ملا آپ نے کہا کہ اگر اس کی تدبیر نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ انتظام سلطنت مین

---

[1] سپہ سالار ص ، [2] مناقب ص ۸۰ و ۹۰ [3] ایضاً ص ۸۱ (واضح رہے کہ اس کے قریب ہی زمانہ یعنی ۶۰۳ھ مین محمد خوارزمشاہ نے بلخ کو فتح کیا تھا۔)

خلل واقع ہو جائے اور تدارک مشکل ہو جائے چونکہ اطراف و جوانب کے ملوک واکابر و مشاہیر زیارت کو آتے ہین اور پایہ تخت مین[1] اجتماع رہا کرتا ہے، ممکن ہے کہ کسی وقت غفلت مین یہ لوگ شورش کر بیٹھین، یہ بات خوارزمشاہ کے دل مین بیٹھ گئی۔ اس نے پوچھا کہ کیا تدبیر کرنا چاہئے، امام رازی نے یہ صلاح دی کہ خزانہ اور قلعون کی کنجیان مولانا کے پاس بھیجکر یہ کہلانا چاہئے کہ جمعیت و کثرت تو سب کچھ جناب کو حاصل ہی ہے، میرے پاس امور سلطنت مین سے صرف یہ کنجیان رہگئی ہین، وہ بھی حاضر ہین"

---

[1] یہان ایک اشتباہ کا رفع کر دینا بھی ضروری ہے کہ سپہ سالار[2] اور افلاکی[3] دونون بزرگون نے بلخ کو پایہ تخت لکھا ہے، اور مولانا شبلی[4] مرحوم نے اس موقع پر کچھ ایسی عبارت لکھی ہے جس سے صریحاً نہین مگر ضمناً ایسا ہی مترشح ہوتا ہے کہ بلخ پایہ تخت تھا، سر گور اوسلی نے بھی لکھا ہے کہ "خوارزمشاہ کا دربار اسی شہر بلخ مین تھا" رز باوس[5] نے بھی ایسا ہی سمجھا ہے لیکن فی الاصل بلخ خوارزمشاہیون کا پایہ تخت نہین تھا۔ خوارزم کا پایہ تخت جر جانیہ تھا جو اکثر تاریخون مین جرجانہ، خوارزم اور جرجانیہ خوارزم کے نامون سے ملتا ہے،[6] یہ تقریباً اسی موقع پر واقع ہے جہان اب ارگنج ( ) لکھا ہوتا ہے اسی کے تھوڑا ہٹکر خیوا تھا اور قدرے تغیر و تبدل کے ساتھ خوارزمیون کا پایہ تخت آخر تک انھین اطراف مین رہا وسیع معنی مین خیوا کو خوارزمشاہیون کا پایہ تخت سمجھنا چاہئے اور خیوا ہی کو خوارزم بھی کہتے تھے، انگریزی نقشون مین اس وقت تک تحت اللفظ "خوارزم" لکھا ہوتا ہے۔ اس زمانہ مین "خوارزم" کا لفظ ملک اور

[1] از اطراف جمع از ملوک واکابر و مشاہیر بزیارت او (سلطان العلماؒ) مجتمع میشوند و در پایہ تخت اجتماع عظیم میکردند ...... ص ۸ [2] بہاءالدینؒ تمام خلق بلخ را بخود راست کردہ است ...... درین چند روز قصد تخت سلطان خواہد کرد ...... ص ۹ [3] خوارزمشاہ نے ...... خزانہ شاہی اور قلعہ کی کنجیان بہاءالدین کے پاس بھیجدین ...... ص ۲ [4] [5] ص ۱۲ [6] اسم الناحیۃ کبیر عظیمۃ قصبتہا الجرجانیۃ

(بقیہ حاشیہ بر ص ۴۵)

یہ روایت سپہ سالار کی ہے[1]۔ افلاکیؒ نے یہ لکھا ہے کہ خوارزمشاہ نے یہ پیغام بھیجا تھا کہ "اگر مملکت بلخ کو قبول فرمائیں تو آج سے کل ملک و سلطنت و فوج آپ کے اختیار میں ہی، مجھے اجازت دیں کہ کسی دوسری جگہ چلا جاؤں کیونکہ ایک ملک میں دو بادشاہ ہونا چاہیئے، الحمدللہ کہ حضرت کو دو دو سلطنتیں حاصل ہیں۔ ایک اس جہان کی سلطنت دوسری آخرت کی سلطنت۔ اگر اس جہان کی سلطنت میرے لئے ایثار فرمیں تو اس سے

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴ کا) پایہ تخت دونوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بلخ کو علاالدین محمد خوارزمشاہ نے ۶۰۳ھ میں فتح کیا تھا، ممکن ہے فتح کے بعد کچھ دنوں موکب شاہی وہیں فروکش رہا ہو یا گاہ بگاہ بلخ میں قیام رہتا ہو، اور اس بنا پر اسے "پایہ تخت" کہدیا ہو، اس کی نظیر خود مولاناؒ کے کلام سے ملتی ہے، چنانچہ اسی خوارزمشاہ نے ۶۰۷ھ میں گورخان قراخطائی کو شکست دیکر سمرقند پر قبضہ کر لیا تھا، مولاناؒ نے مثنوی شریف کے دفتر میں بذیل حکایت "شاہ سمرقند و دلقک" سمرقند کو خوارزمشاہ کا پایہ تخت ظاہر کیا ہے۔ فرماتے ہیں سہ کودل شہ باغم و پرہیز بود ؛ زانکہ خرم شاہ بس خونریز بود ، جائے تخت اور سمرقند گزین ؛ بد وزیرے داہی اور ہمنشین۔ پس اس قسم کے الفاظ پر قطعی تاریخی صحت کے لحاظ سے نظر نہ ڈالنا چاہئے۔ [1] سپہ سالار ص ۷-۸

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴) (یاقوت) ۶ خواند امیر نے حملہ چنگیز خان کے موقع پر لکھا ہے کہ "وران زمان جرجانیہ کہ بہترین ولایت آن دیار است و ترکان اورا اورگنج گویند دارالملک سلاطین خوارزمشاہی بود . . . . . (حبیب السیر جلد ۳ ص ۲۱) لیکن یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اورگنج ہی جرجانیہ ہے۔ جرجانیہ کو ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ میں چنگیز خان نے تباہ کر دیا تھا۔ مگر اس کے بعد اسکی رونق پھر قائم ہو گئی تھی، ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ میں تیمور نے اسے اس طرح خاک میں ملایا کہ شہر کو نیست و نابود کر کے اس پر کاشت کرا دی۔ بعد میں اسی مقام سے کچھ ہٹکر اورگنج آباد ہوا جو ابتک آباد ہے۔

دست بردار ہو جائین کہ بہت بڑا احسان ہوگا[1]"

(اگرچہ سلسلۂ کلام منقطع ہوتا ہے مگر یہان ایک اہم غلطی کا رفع کرنا بسا ضروری ہے، مذکورۂ بالا روایت مین امام رازیؒ کا نام جس حیثیت سے آیا ہے وہ محل نظر ہے۔ سلطان ولدؒ نے اس موقع پر امام رازیؒ یا کسی اور عالم کا نام نہین لیا ہے۔ افلاکیؒ نے اس واقعہ کو ایسے الفاظ مین بیان کیا ہے جن سے صاف طور پر تو یہ نہین پایا جاتا کہ خاص امام رازیؒ نے خوارزم شاہ کو یہ صلاح دی تھی لیکن عبارت کچھ ایسی ہے کہ امام رازیؒ کو قطعاً خارج از بحث بھی نہین سمجھ سکتے[2]۔ مگر سپہ سالارؒ نے نہایت قطعی صراحت کے ساتھ امام رازیؒ کا نام لیا ہے، اور مذکورۂ بالا عبارت سپہ سالار ہی کی ہے۔ مولانا شبلی مرحوم نے بھی بغیر کسی تصریح کے بہ تیقن تمام خوارزم شاہ اور امام رازیؒ کا وہی مکالمہ درج کیا ہے[3]۔ جو اوپر مذکور ہوا، لیکن اس موقع پر امام رازی کی موجودگی بلاشبہ غلط ہے۔ امام رازی (ابو عبداللہ بن عمر بن الحسین) ۵۴۴ھ / ۱۱۴۹ء مین متولد ہوے۔ مجد الدین جیلی سے تحصیل علوم کیا، خوارزم و ماوراء النہر مین برابر سفر کیا اور ان اسفار مین فارسی اور عربی دونون زبانون مین وعظ کہا کرتے تھے، خوارزم اور ماوراء النہر کے علماء سے آپ کے بکثرت اختلافات بھی ہوئے، یہ بھی صحیح ہے کہ "اتصل بخوارزم شاہ ونال عندہٗ اسنی مراتب[4]" (یعنی خوارزم شاہ سے ملے اور بلند ترین مرتبہ پر پہنچ گئے) یہ بھی ضرور ہے کہ امام رازیؒ چونکہ علمائے ظاہرین سے تھے اور

---

[1] مناقب ص ۹ و ۱۰ و ۵۲ "ہمانا کہ از سر نفاق اتفاق کردہ بخدمت خوارزمشاہ بتصدیع و تشنیع غلو کردندے" (ص ۹) یہان بلحاظ سیاق و سباق عبارات اس صیغہ جمع سے امام رازیؒ خارج نہین ہو سکتے۔

[2] سوانح مولانا روم ص ۳۰۲ [3] حاشیہ الفوائد البہیہ ص ۱۹۲-۱۹۳

فلسفی بھی تھے، علمائے باطن آپ کے خلاف رہے ہون اور حضرت بہاء الدینؒ ولد نے
ان مواقع پر جب امام رازی ماوراءالنہر مین رہے ہون آپ پر تعریفات کئے ہون،
مولاناؒ کا یہ شعر تو ضرب المثل کی حد کو پہنچ گیا ہے ؎

گر باستدلال کار دین بدے فخر رازی رازدار دین بدے

مگر ان تمام امور کے باوجود حضرت بہاء الدینؒ ولد کے ترک بلخ کے وقت خوارزمشاہ
کو آپ کے خلاف اکسانے والے امام رازیؒ نہین ہو سکتے۔ امام رازی اپنے انتقال کے
کئی برس قبل ہرات مین سکونت پذیر ہو گئے تھے اور وہین یکم شوال ۶۰۶ھ (۱۲۰۹ء)[1] کو انتقال
فرمایا، کسی نے تاریخ کہی ہے ؎

امام و عالم و عادل محمد الرازی کہ کس ندید و نہ بیند در انظیر و مثال
بسال شش صد و شش در گذشت شد بہرا نماز دیگر اثنین غرۂ شوال

حضرت بہاء الدینؒ ولد نے بلخ کو ۶۰۹ھ یا ۶۱۰ھ مین ترک کیا ہے (جیسا آگے
چلکر معلوم ہوگا) پس امام رازیؒ کا اس موقع پر موجود ہونا غلط اور قطعاً غلط ہے۔ یہ سمجھ لینا
چاہئے کہ سپہ سالارؒ سے اس موقع پر قدرے تسامح ہو گیا ہے۔

البتہ طبقات ناصری[2] سے معلوم ہوتا ہے کہ خوارزمشاہ کے مقربون مین ایک
بزرگ سید بہاءالدین رازی تھے اور ۶۱۶ھ تک ان کا موجود ہونا بھی اسی تاریخ سے
ثابت ہے، اس سے ایک بہت ہی بعیدی امکان اس کا ہو سکتا ہے کہ شاید خوارزمشاہ کو

---

[1] الفوائد البہیہ کے حاشیہ مین امام رازیؒ کے انتقال کی تاریخ ۶۰۶ھ
بھی لکھ گئی ہے۔ مگر یہ محض لغزش قلم ہے۔

[2] صفحہ ۳۳۵ (مطبوعہ کالج پریس کلکتہ ۱۸۶۴ء)

ورغلانے والے "سید رازی" رہے ہون اور زمانہ مابعد مین یہ بدنامی بطفیل ہموطنی "شیخ رازی"
کے سر آپڑی ہو۔

غرض خوارزمشاہ کے پیغام کو سنکر آپ نے ارشاد فرمایا کہ "سلطان اسلام سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اس ملک فنا کا یہ تمام خزینہ و دفینہ ملک و لشکر بادشاہون کے لایق ہے، ہم درویشون کو اس سے کیا سروکار، مین نہایت خوشی سے سفر کرتا ہون کہ بادشاہ اپنے اتباع و احباب کے ساتھ بالاستقلال سلطنت کرے[1]۔ جمعہ کو وعظ کہکر چلا جاؤن گا[2]"

دوسرے روز مجلس مین فرمایا کہ کل ارادہ روانگی کا ہے جس کو ہم سے ارادت ہو سفر کے لئے طیار ہو جائے۔ کہتے ہین کہ تین سو اونٹ کتابون اور ہمراہیون کے سازو سامان کے لئے مہیا کئے گئے[3]۔ اور سپہ سالار[4] نے لکھا ہے کہ آپ کے مریدین و معتقدین مین سے تین سو اصحاب آمادہ سفر ہوئے[4]۔ اہالی بلخ کو جب یہ حال معلوم ہوا، شہر مین ایک تہلکہ عظیم برپا ہو گیا۔ خوارزمشاہ سخت متوہم ہوا، پھر قاصد بھیجے اور رات کو خود مع وزیر کے آیا کہ ارادۂ سفر سے باز رکھے مگر آپنے قبول نہ کیا، آخر یہ استدعا کی کہ آپ اس طرح سے روانہ ہون کہ لوگون کو خبر نہ ہو ورنہ سخت فتنہ برپا ہو جائے گا، سلطان العلماء نے اسے منظور کیا، جمعہ کو وعظ کہا اور شنبہ کو بلخ سے بغداد کی طرف روانہ ہو گئے' اس وعظ مین خوارزمشاہ کو متنبہ کر دیا کہ میرے بعد لشکر تاتار آ رہا ہے، وہ تمام ملک خراسان پر قابض ہو جائے گا، اہل بلخ کو قتل کریگا، بادشاہ بھاگ کر روم کی طرف جائے گا۔ اور وہان ہلاک ہو جائے گا[5]۔

---

[1] سپہ سالار صفحہ ۹۔ [2] مناقب صفحہ ۱۰۔ [3] سپہ سالار صفحہ ۸۔
[4] سپہ سالار صفحہ ۸۔ [5] مناقب صفحہ ۱۱۔

سپہ سالار اور افلاکیؔ نے ترک بلخ کی فوری وجہ یہی قرار دی ہے، مگر افلاکی ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ آپس کی رنجشوں کا سلسلہ ۶۰۴ھ سے شروع ہوگیا تھا، اور اس سے قریب ہی زمانہ یعنی ۶۰۲ھ میں خوارزمشاہ نے بلخ کو فتح کرکے اپنی مملکت میں شامل کیا تھا، (بروایتے) ملکۂ جہاں کا آپکے ساتھ چلا جانا اور فتح بلخ کے بعد ہی، آپسے اختلاف کا ہو جانا، یہ سب امور موید اس کے ہیں کہ خوارزمشاہ تعلقات خاندانی کی بنا پر ضرور آپ کی طرف سے متوہم تھا،

سلطان ولدؔ نے اس باب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اس سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے، کہ یہ محض اتفاق و ناگہانی امر نہیں تھا، بلکہ اس میں اشارۂ غیبی بھی شامل تھا، اور غالباً یہی وجہ تھی کہ بعد میں خوارزمشاہ کے پشیمان ہونے اور عذر کرنے پر بھی آپنے قیام نہ کیا،

چونکہ از بلخیان بہاؔ ولدؔ گشت دل خستہ آں شہ سرمد
ناگہش از خدا رسید خطاب کاے یگانہ شہنشہِ اقطاب
چوں ترا ایں گروہ آزردند دلِ پاکِ ترا ازجا بردند
بدر آ از میانِ ایں اعدا تا فرستمشان عذاب و بلا
چونکہ از حق چنیں خطاب رسید رشتۂ خشم را دراز تنید
کرد از بلخؔ عزمِ سوے حجاز زانکہ شد کارہ گرد درواں راز

اس موقع پر ایک دوسرے مماثل واقعہ کا ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا، ممکن ہے کہ اس واقعہ کو بھی اس سے کوئی قریبی یا بعیدی تعلق ہو، اور ممکن ہے کہ نہ بھی ہو، آگے چل کر یہ معلوم ہوگا کہ بعض روایات کے بموجب حضرت بہاالدینؒ ولد شیخ نجم الدین کبریٰ

کے مرید تھے، اور حضرت شیخؒ کے خلیفۂ اکبر حضرت مجد الدینؒ بغدادی تھے، حضرت مجد الدینؒ کو اسی محمد خوارزمشاہ نے محض تہمت کی بنا پر دریا میں غرق کرا دیا تھا، یہ واقعہ بقول اکثر ۶۰۶ھ کا ہے[1]، شیخؒ کو جب اس کی خبر ہوئی تو سجدے میں گر پڑے، دیر کے بعد سجدے سے سر اٹھایا، اور فرمایا کہ میں نے خدا سے دعا کی تھی کہ مجد الدینؒ کے خونبہا میں سلطان کا ملک اس سے نکال لے، یہ دعا قبول ہوگئی، سلطان بعد کو بہت پشیمان ہوا، اور حضرت کی خدمت میں دیت اور شمشیر و کفن لیکر حاضر ہوا، آپنے فرمایا کہ مجد الدینؒ کی دیت تیرا سارا ملک اور تیرا سر ہے، میرا بھی سر جائیگا، اور بھی ہزارہا آدمی قتل ہونگے، اس کے بعد آپنے اپنے مریدوں کو خوارزم سے نکل جانے کے لئے فرمایا، مگر خود وہیں مقیم رہے، تاآنکہ فتنۂ تتار میں شہید ہوئے، چونکہ حضرت بہاء الدینؒ ولد بھی اسی سلسلہ میں داخل تھے، اس لئے ممکن ہے کہ شیخ نجم الدینؒ کا ارشاد بھی آپکے اس عزم کا باعث ہوا ہو،

یہاں اس قدر لکھدینا بے محل نہ ہوگا کہ بلخ کو ترک کردینے کے بعد بھی حضرت بہاء الدینؒ کا اثر زائل نہیں ہوا تھا، چنانچہ آپنے ایک مرتبہ ملک مغان تکن جد خوارزمشاہ کو قاضی روم کی شفاعت میں (جسے مغان تکن نے قید کردیا تھا) خط لکھا، اور اس خط کے پہونچنے پر قاضی موصوف کو فوراً رہا کردیا گیا،

دوسری مرتبہ خود خوارزمشاہ کو ایک مظلوم کی سفارش میں خط لکھا، اور اس کا بھی خاطر خواہ اثر ہوا[2]،

---

[1] بعضوں نے ۶۱۶ھ اور ۶۱۱ھ تاریخ قرار دی ہی، مگر اتفاقِ عام ۶۰۶ھ ہی پر ہے،

[2] یہ دونوں خط آخری فصل میں نقل کر دیئے گئے ہیں، وہاں دیکھنا چاہیے،

مولانا نے بھی مثنوی شریف مین دو تین جگہہ خوارزمشاہ کا ذکر کیا ہے تو اچھے الفاظ مین کیا ہے۔ خوارزمشاہ کی ایک حکایت (دفتر پنجم مین) وہ ہے جب اس نے شہر سبزوار کو فتح کیا اور وہان کے لوگون سے ابوبکر نامی شخص کا مطالبہ کیا۔ یہان بہ تعیین اسم خوارزمشاہ کا ذکر کیا ہے اور "الپ الغ" کے شاندار الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔

شد محمد الپ الغ خوارزمشاہ　　در قتال سبزوار پر تباہ

دوسری جگہہ ایک گھوڑے کی خوبی اور خوارزمشاہ کی فریفتگی کا ذکر ہے۔ یہان "شاہ فرد" کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔

بد امیرے را یکے اسپ گزین　　در گلہ سلطان نبودش ہمقرین
او سوارہ گشت در موکب پگاہ　　ناگہان دید اسپ را خوارزمشاہ
چون دمے حیران شد از وے شاہ فرد　　روے باسوے عماد الملک[1] کرد

اسی دفتر ششم مین ایک اور حکایت ملک ترمذ کی ہے، وہان ضمناً خوارزمشاہ کا ذکر آگیا ہے اور موقع کے اعتبار سے سخت لفظ استعمال فرمایا ہے مگر اس سے فی الجملہ مذمت مترشح نہین ہوتی۔

کہ دل شاہ با غم و پرہیز بود　　زانکہ خرم شاہ بس خونریز بود
جاے تخت او سمرقند گزین　　بد وزیرے داہی[2] او را ہمنشین

---

[1] عماد الملک کا خطاب مختلف زمانون مین متعدد افراد کو حاصل رہا ہے اور طبقات ناصری (ص ۳۲۵) مین بذیل حالات فتنۂ تتار منقول ہے کہ "عماد الملک تاج الدین امیرکے از ارکان خوارزمشاہی بود" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد خوارزمشاہ کے مقربین مین بھی ایک عماد الملک داخل تھے۔ [2] داہی کا لفظ اگرچہ لغۃً زیرک و کاردان کے معنی مین ہے مگر استعمالاً کچھ خراب مفہوم کو لئے ہوے ہے اور اس مین شک نہین کہ

بس شہانِ آنطرف را کشتہ بود   یا بحیلت یا بسطوت "آن عنود

بلخ سے روانگی کی قطعی تاریخ کسی مشرقی تذکرہ نویس نے نہین دی ہے، افلاکی کا یہ بیان اوپر نقل ہو چکا ہے کہ بلخ سے روانگی کے وقت مولانا کی عمر پانچ سال کی تھی، مگر خود افلاکی ہی نے آگے چلکر یہ بھی لکھا ہے[۱] کہ شیخ بدر الدین نقاش (المولوی) کی روایت ہے کہ مین نے حضرت سلطان ولدؒ سے سنا ہے کہ حضرت بہاء الدینؒ (مولوی بزرگ) کے خط مبارک مین ایک تحریر ایک صحیفہ مین ملی جس مین مرقوم تھا کہ "جلال الدین محمد من در بلخ شش سالہ بود ....." اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۶۱۱ھ مین مولاناؒ بلخ ہی مین تھے اغلباً یہ سفر آغاز ۶۱۱ھ یا زیادہ سے زیادہ اواخر ۶۱۱ھ مین شروع ہوا ہوگا، لیکن اکثر علماے مغرب نے بلخ سے روانگی کی تاریخ ۶۰۹ھ مین متعین کی ہے[۲]، اور افلاکیؒ کی روایت اول کے مطابق اسے تسلیم کرنے مین کوئی وقت نہین ہے۔

تعظیم و تکریم | بہرحال حضرت سلطانؒ العلما بلخ سے اس شان کے ساتھ روانہ ہوے کہ جس شہر کے قریب پہنچتے تھے وہان کے اعاظم و اکابر شہر سے باہر نکلکر استقبال کرتے او

(بقیہ حاشیہ ص ۵۱) محمد خوارزمشاہ کا وزیر عمید الدین اچھا شخص نہین تھا، اور آخر مین اس نے اپنے آقا سے بھی درپردہ غداری کی۔ [۱] مناقب ص ۵۰ [۲] سرگور اوسلی و منفیلڈ "قریباً ۶۰۸ھ/۱۲۱۱" "انسائیکلو پیڈیا برٹینکا" ۶۰۹ھ/۱۲۱۲ "فہرست کتبخانہ بانکی پور" ۶۰۹ھ/۱۲۱۲، مگر ان سب سے جداگانہ خیال انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" مین ظاہر کیا گیا ہے جس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ حضرت بہاء الدینؒ ولد نے ۶۰۶ھ/۱۲۱۰ مین بلخ کو ترک کر دیا تھا۔ اور یہی سنہ ڈاکٹر نکلسن نے (دیوان شمس تبریزؒ، دیباچہ) دیا ہے مگر یہ کسی طرح قابل قبول نہین ہے۔ رڈہاوس نے ۶۰۵ھ/۱۲۰۸ اور ۶۰۸ھ/۱۲۱۱ کے درمیان قرار دیا ہے (دیباچہ ص ۸) ان مین سے پہلا سنہ تو بالکل غلط ہے اور دوسرا بہت کچھ محل تامل ہے۔

نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ شہر مین لاتے تھے، افلاکیؒ کا قول ہے کہ جن جن مقامات سے آپ کا گزر ہوتا تھا وہان کے لوگ پہلے سے حضرت رسول اللہ صلعم کو خواب مین دیکھتے تھے کہ آپ فرماتے ہین کہ سلطان العلما بہاؤ الدین ولد بلخ سے آرہے ہین برغبت تمام اور اعتقاد تمام ان کا استقبال کرو[۱]۔ اس مین شک نہین کہ حضرت سلطانؒ العلما کی شہرت ایسی تھی کہ آپ کے پہنچنے سے قبل ہی لوگون کو خبر ہو جاتی ہوگی اور آپکے ورود مسعود کو لوگ غنیمت سمجھتے ہونگے، اکثر مقامات پر لوگون کے التماس سے حضرت بہاؤ الدینؒ اپنے اصحاب مین سے کسی نہ کسی شخص کو اپنے قایم مقام کے طور پر چھوڑ جاتے تھے[۲]۔

ورود نیشاپور و ملاقات شیخ فرید الدین عطار

جب آپ شہر بہ شہر قیام کرتے ہوے نیشاپور مین پہنچے تو وہان فریدالدینؒ عطار سے ملاقی ہوے[۳]۔ الشیخ نے مولانا (جلال الدین) کو دیکھکر آپ کے آیندہ عظمت و جلال کی پیشین گوئی کر دی اور اپنی کتاب "اسرار نامہ[۴]" آپ کو عنایت فرمائی۔ مولانا آخر تک اس کتاب کو بہت عزیز رکھتے تھے[۵]۔

---

[۱] مناقب ص ۱۲ و [۲] سپہ سالار ص ۸ [۳] الشیخ کے حالات حصہ دوم مین زیر عنوان "مولاناؒ کی غزل کا مقابلہ دوسرے شعرا کی غزلون سے" دیکھنا چاہیے۔ [۴] بعض انگریزی کتابون مین "الہی نامہ" لکھا ہے . . . . مگر تمام مشرقی تذکرون مین "اسرار نامہ" ہی ہے۔ [۵] حضرت سلطان ولدؒ، سپہ سالارؒ اور افلاکیؒ نے اس ملاقات کا حال درج نہین کیا ہے مگر بعد کے تمام تذکرہ نویسون نے بلا استثنا اسے لکھا ہے۔ اس وقت قطعی طور پر یہ پتہ نہ چل سکا کہ اسکی ابتدا کس کتاب سے ہوئی مگر جو کتابین سردست پیش نظر ہین ان مین قدیم ترین کتاب نفحات الانس تصنیف ۸۸۱ھ ہے اس مین "گویند" کی قید کے ساتھ یہ روایت درج ہے۔ علماے مغرب نے بھی بالاتفاق اسکا ذکر کیا ہے مگر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام نے اسے ایک دوسرے ہی طریق پر لکھا ہے کہ مولانا جلال الدین جب تین برس کے تھے (یعنی ۶۰۷ھ مین) تو آپ کے والد آپ کو نیشاپور لیگئے

وروو دبغداد | نیشاپور سے چلکر بغداد پہنچے، جب حوالی شہر مین پہنچے تو محافظین شہر نے آگے بڑھکر دریافت کیا کہ کون لوگ ہین اور کہان سے آرہے ہین، حضرت سلطانؒ العلما نے جواب دیا کہ "من اللہ والی اللہ ولاحول ولا قوۃ الا باللہ" "از لامکان می آیم وبلا مکان می رویم"[1] خلیفہ کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے حضرت شیخ شہابؒ الدین سہروردی سے تذکرہ کیا، آپ نے فرمایا کہ یہ قول حضرت بہاءؒ الدین ولد کے سوا اور کسی کا نہین ہو سکتا، شیخؒ نے خود بڑھکر استقبال کیا اور چاہا کہ آپ کی خانقاہ مین ٹھہرین مگر مولانا بہاءؒ الدین نے فرمایا کہ ائمہ وطلبہ کے لئے مدرسہ ہی مناسب ہے، اور مدرسہ مستنصریہ مین قیام فرمایا[2] خلیفہ نے تین ہزار دینار ہدیۃً بھیجے مگر آپنے قبول نہ کئے، نہ خلیفہ سے ملاقات کی، البتہ شیخؒ کے کہنے سے جمعہ کے روز وعظ فرمایا، خلیفہ بھی مجلس مین موجود تھا، آپ نے خلیفہ کے خلاف شرع افعال کی بہت کچھ مذمت فرمائی اور اسی وعظ مین مغلون کے ہاتھون سے بغداد کے غارت ہونے اور خلیفہ کے شہید ہونے کی پیشین گوئی کردی[3]۔

(حضرت سلطان العلما غالباً ۶۱۱ھ مین بغداد مین تشریف لائے ہونگے، یہ زمانہ خلیفہ الناصر لدین اللہ کا تھا جو ۵۷۵ھ سے ۶۲۲ھ تک حکمران رہا، اس کا زمانہ بہت ہی امن کا زمانہ تھا، اور وہ خود نہایت شجاع، باہمت، رعایا پرور اور رحم پر فرمانروا تھا، فلاکی نے حضرت بہاء الدینؒ

(بقیہ حاشیہ ص ۵۳) اور شیخ فرید الدین عطار سے ملاقات کا ذکر اس کے بعد کیا ہے کہ اس زمانہ مین ....." سر گوراوسلی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور لکھدیا ہے کہ شیخ فرید الدینؒ عطار نے آگے بڑھکر آپ کا استقبال کیا اور نہایت تکریم وتعظیم سے اپنے مکان مین ٹھہرایا (ص ۱۱) تقریباً یہی مفہوم ڈاکٹر نکلسن کا بھی ہے، (دیوان شمس تبریز ص ۱۷ دیباچہ) براؤن نے ورود نیشاپور کی تاریخ ۱۲۱۲ھ دی ہے مگر یہ انکا قیاس ہے، کوئی سند نہین ہے۔

[1] مناقب العارفین ص ۱۴، ۱۵ [2] سپہ سالار ص ۸ [3] مناقب العارفین ص ۱۴-۱۵

کی زبان سے اس کے خلاف شرع اور ظالم ہونے کی جو کیفیت نقل کی ہے وہ تاریخوں کے بیان سے خلاف واقع معلوم ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ بقول افلاکیؒ حضرت سلطان العلماءؒ نے تاتاریوں کے ہاتھ سے اس خلیفہ کے ہلاک ہونے کی جو پیشین گوئی کی تھی وہ بھی صحیح نہیں۔ ناصر کا انتقال سنہ ۶۲۲ھ میں ہوا۔ اس کے بعد ظاہر، مستنصر اور مستعصم خلیفہ رہے اور مستعصم سنہ ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) میں تاتاریوں کے ہاتھوں سے شہید ہوا۔ البتہ تاتاریوں کے خروج کی پیشین گوئی صحیح تھی، کیونکہ سنہ ۶۱۶ھ میں یہ فتنہ شروع ہوگیا اور ناصر ہی کے عہد میں انتہا کو پہنچ چکا تھا، بغداد اگرچہ بچا رہا مگر دیگر ممالک اسلام کی تباہی و بربادی ناصر ہی کے زمانہ میں ہوئی۔)

قیام بغداد صحیح طور پر نہیں معلوم ہوتا کہ بغداد میں قیام کتنے دنوں رہا۔ مگر سپہ سالارؒ نے یہ لکھا ہے کہ ایک مہینے تک بسم اللہ کی تفسیر بیان فرماتے رہے[1]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قیام کچھ زیادہ دنوں تک رہا۔ افلاکیؒ نے مذکورۂ بالا مجلس کے حالات درج کرنے کے بعد یہ لکھا ہے کہ "منقول ایست کہ حضرت بہاءالدینؒ ولد روز سوم از راہ کوفہ بسوے کعبہ عزیمت نمود" غالباً اس سے مقصود یہی ہے کہ وعظ کے تیسرے روز وہاں سے روانہ ہوئے۔ افلاکیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہنوز آپ بغداد ہی میں تھے کہ بلخ کی تباہی کی خبر خلیفہ کے پاس پہنچ گئی تھی[2]۔ اور

۱؎ سپہ سالار ص ۸۔ ۲؎ مناقب ص ۱۰۔ روڈ ہاؤس نے جہاں اس روایت کا ترجمہ دیا ہے وہاں (ص ۵) اپنی طرف سے توسین میں ۶۰۸ھ مطابق ۱۲۱۱ء بڑھا دیا ہے اور ڈاکٹر نکلسن نے بھی اسی کی توثیق کی ہے (دیوان شمس تبریز ص ۱۹ دیباچہ) ونفیلڈ نے بلا تعین تاریخ یہ لکھا ہے کہ "جب یہ لوگ بغداد پہنچے تو چنگیز خان کے ہاتھوں بلخ کے تباہ ہونے کی خبر سنی" (ص ۲۹۔ ۳۰ دیباچہ) روڈ ہاؤس نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ چنگیز خان نے ۱۲۱۱ء میں خوارزمشاہیوں کا تختہ الٹ دیا اور ان کے پایہ تخت بلخ کو تباہ کر دیا" (ص ۸ دیباچہ) مگر یہ بھی غلط ہے، اول تو چنگیز خان کا حملہ ۶۱۶ھ کے قبل شروع نہیں ہوا۔ دوسرے بلخ خوارزمشاہیوں کا پایہ تخت نہیں تھا۔

"فیہ مافیہ" میں بھی ہے کہ "در راہ خبر بادرسید کہ لشکر تتار قصد بلخ کردند و قتل و خرابی بسیار واقع شد و اہالی آن متفرق شدند[۱]" مگر بروایت متفقہ بلخ کو چنگیز خان نے ۶۱۷ھ (۱۲۲۰) میں تباہ کیا ہے، اور افلاکی ہی کی دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مولانا لارندہ میں تھے[۲]۔

اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا بہاء الدین ہنوز اثنائے سفر میں تھے کہ خراسان پر مغلوں کی فوجکشی شروع ہو گئی تھی۔ اس فوجکشی کا آغاز ۶۱۲ھ میں ہوا ہے، پس سلطان ولد کی مراد سفر سے یہی ہو گی کہ اس وقت تک قونیہ میں مستقل قیام نہیں ہوا تھا۔

حج وزیارت | غرض، بغداد سے براہ کوفہ مکہ معظمہ کو روانہ ہوئے یا نہیں، مگر "فیہ مافیہ" میں صاف لکھا ہے کہ "القصہ مولانا بہاؤ الدین بعد از گزاردن حج متوجہ روم شدند[۳]" جس سے معلوم ہوا کہ مولانا کو بچپن ہی میں دولت حج کی سعادت نصیب ہو گئی تھی، بعد فراغ حج حجاز سے گزرتا ہوا یہ قافلہ دمشق پہنچا، راستہ میں مدینہ منورہ کے قیام کو ایک نتیجۂ لازمی سمجھ لینا چاہئے۔ دمشق میں اس وقت الملک العادل سیف الدین ابو بکر ایوبی (۵۹۲ھ-۶۱۵ھ / ۱۱۹۶-۱۲۱۸) برادر سلطان صلاح الدین حکمران تھا۔ اہل شام نے بہت چاہا کہ مولانا بہاء الدین وہاں قیام فرمائیں مگر آپ رضامند نہ ہوئے اور شہر بشہر سفر کرتے ہوئے ملاطیہ پہنچے اور غالباً ۶۱۴ھ میں ملاطیہ میں تھے۔

ورود اقشہر | یہ قافلہ جب ملاطیہ سے روانہ ہو کر آذربیجان سے گزر رہا تھا تو اکثر ہمراہیوں نے چاہا کہ آذربیجان میں قیام کریں مگر مولانائے بزرگ نے شہر میں جانا پسند نہ کیا[۴]۔ جب

---

[۱] صفحہ ۳ [۲] مناقب ص ۱۸ [۳] ص ۳ [۴] غالباً اس کا سبب وہ فتنہ تھا جو خوارزمشاہ کی وجہ سے اس نواح میں برپا ہو گیا تھا۔ خوارزمشاہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر بھاگتا پھرتا تھا اور مغول اس کے تعاقب میں تھے۔ اس وقت چنگیز خان وفات پا چکا تھا اور اس کا فرزند اوقتائی خان اس کی جگہ خان ہوا تھا۔ خوارزمشاہ نے اس سے بھاگ کر آذربیجان کا رخ کیا اور یہ ملک بھی فتنہ و فساد سے بھر گیا۔

عصمت خاتون (ملکہ ملک فخر الدین والی آذربیجان) کو یہ خبر ہوئی کہ مولانا بہاء الدین حوالی شہر سے گزر رہے ہین تو وہ خود آپ کے عقب مین روانہ ہوئی اور آقشہر کے قریب آپ سے ملاقی ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ملک فخر الدین بھی پہنچ گیا۔ ان دونون نے بہت چاہا کہ آپ شہر مین چلین مگر آپ راضی نہ ہوے۔ آخر آپ نے یہ خواہش کی کہ اسی قصبہ مین ایک مدرسہ آپ کیلیے بنادیا جائے۔ چنانچہ آقشہر واقع آذربیجان مین آپ کے لئے ایک مدرسہ بنادیا گیا۔ آپ نے چار برس[1] وہان قیام فرمایا اور درس وتدریس مین مشغول رہے۔ چار برس کی مدت افلاکی نے لکھی ہے مگر سپہ سالار[2] نے آقشہر کے قیام کی مدت کم وبیش ایک برس قرار دی ہے مگر اگلے کی تاریخون کے ملانے سے افلاکی کی روایت اصح معلوم ہوتی ہے۔

ورود لارندہ جب ملک فخر الدین اور عصمت خاتون کا انتقال ہوگیا تو حضرت سلطان العلماء آقشہر سے شہر لارندہ مین تشریف لائے۔ لارندہ توابع قونیہ سے تھا۔ یہان امیر موسی نائب سلطان علاء الدین نے آپ کا خیر مقدم کیا۔ امیر نے اپنے مکان مین ٹھہرانا چاہا مگر آپ نے منظور نہ فرمایا اور یہان بھی آپ کے لئے ایک مدرسہ تعمیر کیا گیا۔ کم وبیش سات برس یہان قیام رہا۔

حضرت سلطان العلما کے لارندہ پہنچنے سے کچھ قبل یا بعد سمرقند کے ایک نہایت معزز ومؤقر شخص خواجہ شرف الدین سمرقندی بھی (غالباً فتنہ مغول کی وجہ سے) ترک وطن کر کے لارندہ مین آگیے تھے۔ خواجہ، سمرقند کے بہت بڑے مالدار اشخاص مین تھے حشمت وجاہ مین بھی پایہ بلند رکھتے تھے۔ ان کی زوجہ کرائے خاتون بزرگ بھی بڑی دیندار بوہی تھین[3]

---

[1] مناقب العارفین ص ۱۷، ۱۸ [2] سپہ سالار ص ۹ [3] مناقب العارفین ص ۴۰ (نسخہ قلمی) (مناقب بھی مین

افلاکیؒ نے خواجہ کے نسبت لکھا ہے کہ "مردے بود معتبر کریم الاصل و شریف" حضرت سلطان العلماؒ اور خواجہ شرف الدین دونوں کو اس غریب الوطنی مین ہموطنی کا لطف حاصل ہوا ہوگا اس مودت باہمی نے ترقی کر کے مواصلت کی صورت پیدا کردی. خواجہ کے ایک لڑکی گوہر خاتون نامی تھین، وہ ابھی خورد سال ہی تھین کہ حضرت سلطان العلما کی خواہش پر خواجہ نے ان کی نسبت مولانا جلال الدین سے کردی[1] اور کچھ زمانہ بعد لارندہ ہی مین گوہر خاتون سے مولاناؒ کا عقد ہوگیا[2]۔ اس وقت مولانا کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی۔[3]

(بقیہ حاشیہ ص ۵۷ کا) ایک روایت اور ہے جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ کراے خاتون بزرگ، خواجہ شرف الدین کے انتقال کے بعد تنہا روم کو گئین اور وہان سلطان العلما کی مرید ہوگئی تھین. مگر اول تو خود مناقب مین یہ روایت بے سند درج ہے. دوسرے عبارت مذکورۂ بالا سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔ قرینہ تو یہی ہے کہ لارندہ مین جب خواجہ شرف الدین کا انتقال ہوگیا ہے اسوقت کراے خاتون قونیہ چلی گئین اور یہ صورت غالباً حضرت سلطان العلما کی رحلت کے بعد پیش آئی کیونکہ حضرت سلطان العلما کے انتقال کے بعد مولاناؒ خود لارندہ مین جاکر کچھ دنون مقیم رہے تھے اور آپ کا ایسا کرنا اسی وجہ سے ہوا ہوگا کہ آپ کے سسرالی رشتہ دار لارندہ مین موجود تھے۔ کراے خاتون بزرگ کا قونیہ مین مولانا کے دوکان فروکش ہونا متعدد ذرائع سے ثابت ہے اور سلطان ولد کی ایک روایت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ (سلطان ولدؒ) دمشق مین تحصیل علوم مین مشغول تھے اسوقت قونیہ مین کراے خاتون بزرگ کا انتقال ہوا ہے واضح رہے کہ ان کو کراے خاتون بزرگ اس وجہ سے کہتے تھے کہ مولاناؒ کی دوسری زوجہ محترمہ کا نام بھی کراے خاتون تھا.) [1] مناقب ص ۱۸ [2] ایضاً [3] یہ روایت پوری تفصیل کے ساتھ مناقب العارفین ص ۸۰ پر ہے مگر اہل یورپ کی تشکیک پسند طبیعت کے لیے کہین نہ کہین سے کوئی مواد ہاتھ آجاتا ہے. ص ۹۰ پر سلطان ولدؒ کی زبانی ایک مختصر روایت اسی باب مین اور ہے جس کا

یعنی یہ عقد ۶۲۱ھ یا زیادہ سے زیادہ ۶۲۲ھ میں ہوا۔

انہی گوہر خاتون کے بطن سے ۶۲۳ھ[۱] میں مولانا کے خلف صدق سلطان ولد متولد ہوے اور اس کے بعد دوسرے فرزند علاء الدین بھی لارندہ ہی میں پیدا ہوے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۵۸) ترجمہ رڈہاؤس نے یوں کیا ہے کہ "سلطان نے میرے دادا کو قونیہ میں بلایا، پھر .. امیر موسی نے انھیں لارندہ میں بلایا اور میرے والد کو اپنا داماد بنایا" یہاں منجملہ دیگر شبہات کے ایک شبہ یہ وارد کیا ہے کہ اس سے قبل مولانا کی زوجہ گوہر خاتون کو خواجہ شرف الدین سمرقندی کی بیٹی بتایا گیا ہے۔ کیا شرف الدین موسی کا لقب تھا؟ یا مولانا نے لارندہ میں دو شادیاں کی تھیں؟ مگر یہ سارے شبہات صرف اس عبارت کے غلط ترجمے سے پیدا ہوے کہ "حضرت پدرم را داماد کردند" جس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ "وہاں میرے والد کی شادی ہوئی"۔ ؎ مناقب ص ۳۳ ؎ ایضاً ص ۱۸

[۱] ۶۲۳ھ سے یورپی علما کو سخت مغالطہ ہوا ہے۔ ان لوگوں نے اسے مولانا کے عقد کا سنہ قرار دیدیا ہے حالانکہ صاحب مناقب العارفین کا منشا اس سے سلطان ولد کے تولد کا سنہ ہے۔

"ز حضرت سلطان ولد از آن خاتون در وجود آمد در سنہ ثلاث و عشرین و ستمایۃ" "نفحات الانس" میں اسے پوری طرح صاف کر دیا ہے" در لارندہ خدمت مولانا جلال الدین۔ اور سن ہژدہ سالگی کہ خداوندگار خفتہ ودر سنہ ثلث عشرین وستمایۃ سلطان ولد متولد شد۔ ص ۲۰۰) پس جب ۶۲۳ھ میں سلطان ولد متولد ہوے (اور سلطان ولد کی ولادت کا یہ سنہ متفق علیہ ہے) تو ظاہر ہے کہ عقد اس سے بھی ... دو برس قبل ہوا ہوگا۔

اس غلطی کی بنیاد رڈہاؤس نے رکھی اور وہ بھی بناء الباطل علی الباطل۔ لکھتے ہیں کہ "بلخ چھوڑنے کے وقت اگر مولانا کی عمر پانچ برس کی تھی تو ضرور ہے کہ آپ ۱۲۰۴ء یا ۱۲۰۵ء میں پیدا ہوے ہوں، اور اس لئے ۱۲۲۶ء میں آپ کی عمر اکیس یا بائیس برس کی رہی ہوگی (یہ تفریق اس ضرورت سے ہے کہ رڈہاؤس نے قرار دے لیا ہے کہ مولانا نے ۱۲۰۵ء یا اس کے بعد ہی بلخ کو ترک کیا ہے، مگر اکی کوئی

ورودِ قونیہ | جس زمانہ میں حضرت سلطان العلماؒ بغداد میں قیام فرما تھے علاء الدین کیقباد (سلطان رومؒ) کی طرف سے کچھ لوگ وہاں آئے ہوئے تھے، وہ آپ کی عظمت

(بقیہ حاشیہ ص ۵۹ کا) دلیل نہیں ہے)۔ ڈاکٹر براؤن نے اس بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ کچھ عجیب مجمع الاضداد بن گیا ہے، ان کا بیان ہے کہ "مولانا جلال الدینؒ نے تقریباً اکیس برس کی عمر میں بمقام لارندہ لالا شرف الدین سمرقندی کی دختر گوہر خاتون سے عقد کیا، گوہر خاتون کے بطن سے دو لڑکے علاء الدین اور بہاء الدین (سلطان ولدؒ) ہوئے . . . . سلطان ولدؒ ۱۲۲۶ء میں پیدا ہوئے، (ص ۵۱۵-۵۱۶)"

دو لڑکوں کی پیدائش کے لئے بدرجہ اقل تین برس کا زمانہ تو رکھنا چاہئے ابس اس اعتبار سے مولانا کا عقد ۱۲۲۳ء میں ہوا ہوگا، اور اگر عقد کے وقت آپ کی عمر اکیس برس کی تھی تو آپ کی ولادت ۱۲۰۲ء کی ہونا چاہئے مگر ڈاکٹر صاحب خود اس سے قبل ہی لکھ چکے ہیں کہ مولاناؒ کی ولادت موسم خزاں ۱۲۰۷ء میں ہوئی تھی، اس شمار سے مولاناؒ کی عمر اواخر ۱۲۲۸ء میں اکیس برس کی ہوگی نہ کہ ۱۲۲۶ء۔

لہ سلاجقہ روم میں سے جس بادشاہ کا ذکر مولاناؒ کے سوانح کے تعلق میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے وہ بھی علاء الدین کیقباد ہے جو اس سلسلہ کا دسواں اور سب سے زیادہ جلیل القدر فرمانروا تھا اسی کے دور حکومت میں مولاناؒ قونیہ میں وارد ہوئے، غیاث الدین اور رکن الدین کا ذکر بھی آیا ہے، مگر بہت زیادہ کثرت کے ساتھ رکن الدین کے وزیر معین الدین سلیمان پروانہ کا تذکرہ ہوا ہے۔ چونکہ مختلف مواقع اور مختلف اعتبارات سے اس سلطنت اور اس کے فرمانرواؤں کا تذکرہ ہوا ہے، اس لئے مناسب ہے کہ (شاہان خوارزم کی طرح) نہایت اختصار کے ساتھ اول سے آخر تک سلاجقۂ روم کی کیفیت بھی یکجا درج کر دیجائے۔ چنانچہ لاحقہ (۲) میں ان کے کوائف مختصراً درج کر دئے گئے ہیں، حسب ضرورت اس لاحقہ کو دیکھنا چاہئے۔

وشان کو دیکھکر مرید ہو گئے تھے، واپس جاکر سلطان سے حالات بیان کئے، سلطان غائبانہ آپ کا معتقد ہو گیا اور اس آرزو مین رہتا تھا کہ ملاقات صوری بھی نصیب ہو پس جب سلطان کو معلوم ہوا کہ امیر موسیٰ نے سلطانؒ العلما کو لارندہ مین روک رکھا ہے اور سلطان سے اطلاع تک نہین کی ہے تو وہ سخت رنجیدہ ہوا اور امیر موسیٰ کے نام تہدیدی فرمان بھیجا، امیر موسیٰ فرمان کو دیکھکر بہت پریشان ہوا اور سلطانؒ العلما کی خدمت مین حاضر ہوکر کل حالات عرض کئے کیونکہ خود آپ ہی امیر موسیٰ کو اس اطلاع سے روکتے تھے جسکی وجہ یہ تھی کہ سلطان شراب پیتا اور چنگ سنتا تھا۔ اور اس وجہ سے حضرت سلطان العلماؒ اس سے ملنا نہین چاہتے تھے، جب امیر موسیٰ کے نام سلطان کا فرمان آیا اس وقت حضرت سلطانؒ العلما نے فرمایا کہ فوراً ہی بے تحاشا روانہ ہوجاؤ اور سلطان سے کل حالات بیان کردو، سلطان نے حالات سنکر عہد کیا کہ اگر حضرت بہاؤالدینؒ ولد قونیہ مین تشریف لائین اور یہین مستقلاً قیام کرین تو مین آئندہ شراب پیون گا نہ چنگ سنون گا۔

سلطانؒ کے اس خیال کے معلوم ہونیکے بعد سلطان العلماؒ قونیہ کی طرف روانہ ہوئے سلطان نے خود استقبال کیا۔ محل کے قریب پہنچکر گھوڑے سے اتر پڑا، سلطان العلماؒ جس قدر منع فرماتے، سلطان اور زیادہ فروتنی کرتا، سلطان کی اس ارادت کا اثر آپ کے دل پر بھی ہوا اور خود آپ بھی گاہ بگاہ سلطان کے پاس جایا کرتے تھے، سلطان نے چاہا کہ محل شاہی مین قیام فرمائین مگر آپ نے اسے منظور نہ کیا اور مدرسہ التونیان مین قیام فرمایا، سلطان نے نذور وتحایف بہت کچھ پیش کئے مگر حضرت سلطان العلماؒ نے کچھ بھی قبول نہ کیا اور فرمایا کہ میرے پاس بقدر کفایت مال موجود ہے۔ مجھے حاجت نہین، اس اثنا مین دوجوان آپکے

لـه از ہمہ ملک رُم قونیہ را　　برگزید و مقیم شد آنجا　　(ولد نامہ)

مرید ہوئے : ایک جاز تھا دوسرا قصاب، آپ نے دونوں کو ہزار ہزار دینار دیئے کہ درویشوں کے لئے ہمیشہ سامان خورد و نوش مہیا رکھیں۔

سلطان اس وقت تک کسی کا مرید نہیں ہوا تھا، وہ خود مع اکثر امرا کے آپ کا مرید ہوگیا۔

مگر سلطان ولدؒ کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قونیہ میں ورود کے کچھ زمانہ بعد جب اکثر اہل قونیہ سلطان العلماؒ کے معتقد و مرید ہو چکے تھے، اس وقت سلطان آپ کا مرید ہوا۔ ے

همه بردند از دو لایتها | همه کردند از درو ایتها
چند روزے برین نسق چون گزشت | که ز مه مرد و زن مریدش گشت
بعد ازان علاء دین سلطان | ز اعتقاد تمام با میران
آمدند و زیارتش کردند | قند پندِ در از جان خوردند
گشت سلطان علاء دین چون مرید | روے او را بعشق و صدق مرید
چونکه وعظش شنید گشت حیران | کرد او را مقام در دل و جان
دید بسیار از کرامتهٔ | یافت یا خویش از دعا منتها[1]

سنہ ورود قونیہ | حضرت بہاء الدینؒ ولد نے قونیہ میں دو برس قیام کے بعد انتقال

---

[1] "فیہ مافیہ" (صفحہ ۲) سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے، اور اس سے افلاکیؒ کی روایت کی تنقیص نہیں ہوتی۔ سلطان کا حضرت بہاء الدینؒ ولد کا استقبال کرنا اور خدمتگذاری میں مشغول ہونا مستلزم اس کا نہیں تھا، کہ وہ فوراً مرید بھی ہو گیا ہو۔

فرمایا ہے اور آپ کا انتقال ۶۲۸ھ مین ہوا ہے اس لئے قونیہ مین ورود ۶۲۶ھ مین ہوا ہوگا۔[۱]

اس طرح بلخ کو ترک کرنے اور جدید وطن اختیار کرنے کے درمیان کم وبیش پندرہ برس کا زمانہ گزرا، اس تمام مدت مین مولاناؒ ہمیشہ اپنے والدؒ کے ہمراہ رہے اور علوم ظاہری

---

[۱] مولاناؒ کی عمر اس وقت بائیس برس کی ہوچکی تھی مگر مولاناؒ شبلی مرحوم نے لکھا ہے کہ "۱۸ یا ۱۹ برس کی عمر مین جیسا کہ اوپر گزرچکا ہے اپنے والد کے ساتھ قونیہ مین آئے" (سوانح مولانا روم ص ۷) اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بہاءالدین ۶۲۲ھ یا ۶۲۳ھ مین قونیہ مین وارد ہوئے لیکن خود مصنف موصوف کی عبارت ہی سے اس کا بطلان ہوتا ہے۔ صفحہ (۵) پر تحریر ہے کہ "آذربیجان سے لارندہ کا رخ کیا یہان سات برس تک قیام رہا، اس وقت مولانا رومؒ کی عمر ۱۸ برس کی تھی۔ بہاءالدینؒ ولد نے اسی سن مین شادی کردی، مولاناؒ کے فرزند رشید ۶۲۳ھ مین پیدا ہوئے" پس ۶۲۲ھ مین قونیہ مین آکر سکونت پذیر ہونا کیونکر ہو سکا انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مین بھی یہ لکھا گیا ہے کہ "۱۲۲۶ یا ۱۲۲۸ء (یعنی ۶۲۳ھ و یا ۶۲۵ھ) مین باستقلال قونیہ قیام کیا" مگر یہ بھی صحیح نہین ہے۔

مناقب العارفین مین ایک روایت سلطان ولدؒ کی زبانی یہ بھی ہے کہ جب سلطان نے میرے دادا کو قونیہ مین بلایا اس کے ایک سال بعد امیر موسیٰ نے انھین لارندہ مین بلایا، وہین میرے والدؒ نے شادی کی اور مین وہین پیدا ہوا (ص ۱۷۹) اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے حضرت بہاءالدین کو قونیہ آنے کی دعوت بہت قبل دی تھی مگر واقعاً آپ ۶۲۶ھ مین قونیہ مین آکر سکونت پذیر رہے۔

اور اس کی توثیق اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ سلطان کو جب یہ معلوم ہوا کہ امیر موسیٰ نے حضرت بہاءالدینؒ لارندہ مین روک رکھا ہے تو وہ امیر موسیٰ سے ناخوش ہوا۔

و باطنی آپ سے حاصل کرتے رہے۔ اس دوران مین آپ نے عقد بھی کیا۔ آپ کے اولاد بھی ہوئی اور بائیس برس کے سن مین آپ اس شہر مین وارد ہوے جو آئندہ آپ کا اور آپ کی اولاد کا مسکن و مدفن بننے والا تھا۔

سلطان کا اتابیق امیر بدرالدین گہرتاش المعروف "وژدار"[۱] نہایت متمول اور صاحب خیر امیر تھا، ایک روز سلطان العلما مسجد سلطانی مین وعظ فرما رہے تھے، امیر بدرالدین کے دل مین یہ خیال گزرا کہ سلطان العلما نے کس قدر کتابین دیکھی ہین، اور کیسا ذہن پایا ہے کہ اس قدر مسائل محفوظ رکھتے ہین۔ سلطان العلما نے منبر ہی پر سے امیر کی طرف اشارہ کیا کہ آپ کوئی آیت پڑہیے۔ انھون نے سورہ قد افلح المومنون پڑہنا شروع کی، آپ نے فرمایا کہ اب بے استحضار و مطالعہ سنئے اور کئی جمعہ تک انھین آیتون کی تفسیر بیان فرماتے رہے، امیر گہرتاش نے اپنے خطرہ دل کو سلطان العلما سے بیان کیا اور منبر کے پایہ کو بوسہ دیا، حضرت سلطان العلما نے فرمایا کہ اس حالت کے شکرانہ کے طور پر میرے لڑکون کے لئے ایک مدرسہ بنائیے۔ چنانچہ مدرسہ "خداوندگار" طیار ہوا اور اس کے لئے بہت بڑا وقف مقرر کیا گیا۔[۲]

مدرسہ کی توسیع | مولانا کے لیے مدرسہ تو حضرت سلطان العلما، کی زندگی ہی مین طیار ہو گیا تھا۔ مگر مدرسہ کے ساتھ خدام وغیرہ کے لیے عام خانہ مولانا کے زمانہ مین امیر تاج الدین نے

---

[۱] مناقب العارفین کے مطبوعہ نسخہ مین "المعروف بہ پدردار" ہے۔ قلمی نسخہ مین "المعروف بدرداز" تحقیق سے معلوم ہوا کہ اصل مین "المعروف بہ وژدار" تھا۔ مطبوعہ نسخہ مین ایک "ب" کا اضافہ کر کے "بہ پدردار" بنا دیا گیا (وژدار بمعنی "قلعہ دار") [۲] مناقب ص ۲۰، امیر بدرالدین کی قبر اسی مدرسہ مین ہے۔ (مناقب) خزینۃ الاصفیاج دوم ص ۲۷۰۔

نہایت اصرار کرکے اور سلطان ولدؒ سے سفارش کراکے تین ہزار دینار کے صرف سے طیار کیا[1]

مناقب العارفین کی ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سلطان عزالدین کیخسرو کے وزیر "قاضی شہید مرحوم مولانا عزالدین قونیہ" نے خاص قونیہ میں مولاناؒ کے لئے ایک مسجد جامع بھی بنائی تھی۔[2]

قونیہ کے عوام وخواص سے قطع نظر کرکے خود سلطان علاءالدین کیقباد کی نظر میں حضرت سلطانؒ العلما کی جو عظمت و وقعت تھی اس کا اندازہ ان روایتوں سے ہوسکتا ہے، جو سپہ سالارؒ اور افلاکیؒ نے نقل کی ہیں یہاں صرف تین چار روایتیں اس قسم کی درج کی جاتی ہیں۔

(۱)

ایک مرتبہ سلطان العلماؒ راستہ سے گزر رہے تھے، دیکھا کہ ایک سپاہی کسی مظلوم کو مارپیٹ رہا ہے، آپ نے اسے ایک عصا مارا اور ایک ہی ضرب میں وہ شخص مرگیا سلطان کو تردد ہوا کہ بے وجہ ایک شخص کو مار ڈالا، سلطان العلماؒ نے فرمایا کہ تردد کی کوئی بات نہیں، بے حکم خدا کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے درحقیقت ایک کتے کو مارا ہے اور ایک انسان کو اس کے ظلم سے بچایا ہے، سلطان نے اسکی قبر کے کھولنے کا حکم دیا تو دیکھا گیا کہ واقعی ایک سیاہ کتا پڑا ہوا ہے۔ ؎

سیرتے کان در وجودت غالب است | ہم بر ان تصویر حشرت واجب است[3]

(۲)

سلطان علاءالدین نے جب قونیہ کا قلعہ تیار کیا تو ایک روز حضرت سلطان العلماءؒ

---

[1] مناقب ص ۱۰۲ [2] مناقب ص ، [3] مناقب ص

اس کے سیر کی التجا کی، آپ نے فرمایا کہ "دفع سیل اور منع خیل کے لیے اچھا ہے مگر مظلومون کی تیر دعا کا کیا علاج آپ نے سونچا ہے جو ہزارون لاکھون برجون سے گزر جاتی اور عالم کو خراب کر ڈالتی ہے، عدل و انصاف کا قلعہ بنایئے کہ اسی مین دنیا کا امن اور عاقبت کی خیر ہے" سلطان پر اس نصیحت نے اپنا پورا اثر دکھایا۔[1]

(۳)

ایک روز سلطان زیارت کو آیا حضرت سلطان العلمؒ نے ہاتھ کے بجائے عصا آگے بڑھا دیا، سلطان نے اسی کو بوسہ دیا مگر دل مین یہ خیال گزرا کہ سلطانؒ العلما، کو اپنے علم و فضل پر کس درجہ غرور ہے، آپنے فوراً ہی یہ فرمایا کہ "یہ تملق و تواضع علماے گدا چشم کا کام ہے جن سلطان دین نے اصل کو پالیا ہے وہ اس کی پروا نہین کرتے اور یہ غرور نہین ہے"[2]

(۴)

ایک مرتبہ آپ نے سلطان علاء الدین سے فرمایا کہ "مین بھی سلطان ہون اور آپ بھی سلطان ہین، آپ کی سلطنت اُس وقت تک ہے کہ آپ کی آنکھ کھلی ہوئی ہے، میری سلطنت اُس وقت سے شروع ہوگی جب میری آنکھ بند ہوگی"

جس زمانہ مین حضرت شیخ شہاب الدینؒ سہروردی سلطان علاء الدین کے پاس قیام فرما تھے، سلطان نے خواب دیکھا کہ اس کا سر سونے کا، سینہ چاندی کا، ناف سے نیچے لوہے کا، رانین سرب کی اور دونون پاؤن ارزہر کے ہوگئے ہین۔ لوگ اس خواب کی تعبیر سے عاجز رہے، شیخؒ نے اس کی تعبیر حضرت سلطانؒ العلما، کے حوالہ کی، آپنے فرمایا کہ "اے سلطان! جب تک تو دنیا مین رہے گا آسودگی رہے گی، تیرے بعد

---

[1] مناقب ص ۳۰، [2] مناقب ص ۳۰

تیرے فرزند کا زمانہ (سونے کے مقابلہ میں) چاندی کے مثل ہوگا، اس کے بعد تیرے پوتے کا زمانہ لوہے کا ایسا ہوگا، جب سلطنت تیسرے بطن میں پہنچے گی دنیا درہم و برہم ہوجائیگی اور چوتھے بطن تک پہنچکر ملک روم بالکل خراب ہوجائے گا اور آل سلجوق کا زوال ہوجائے گا[1]"

سپہ سالار اور افلاکی دونوں نے روم پر خوارزمشاہ کے حملہ، اس کی ہزیمت اور اس معاملہ میں سلطان العلماء کے تصرف باطنی کا حال بالتفصیل درج کیا ہے مگر اس روایت میں چند تنقیدات واقع ہوگئے ہیں جن سے اس روایت کو تاریخ سے تطبیق دینے میں سخت پیچیدگی پڑگئی ہے۔ پہلے اصل روایت درج کیجاتی ہے پھر اس پر تنقید ہوگی روایت یہ ہے کہ

جب خوارزمشاہ نے روم کا رخ کیا اور سلطان علاءالدین اس کے مقابلہ کے لئے حدود مملکت کی طرف بڑھا اور ارزنجان میں دونوں ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے تو سلطان کو خوارزمشاہ کی فوج کی کثرت و عظمت کا حال معلوم ہوا اور اس سے رومی لشکر میں خوف و ہراس پیدا ہوگیا، سلطان نے ارادہ کیا کہ خود جاسوسون کے بھیس میں جاکر اس کی تحقیق کرے، چنانچہ ترکمانون کی وضع بناکر کچھ گھوڑے ہمراہ لئے اور شاہ کے لشکر میں پہنچکر یہ ظاہر کیا کہ وہ ترک ہے اور اس کے آباو اجداد نواح آموں سے یہان آکر آباد ہوئے تھے، کچھ دنون سے سلطان علاءالدین اس سے متغیر ہوگیا ہے اور وہ لوگ شاہ کی آمد کے لئے دست بدعا تھے۔ شاہ نے اس پر نوازش کی اور ایک خیمہ میں ٹھرایا، رات کو شاہ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ ان تمام اطراف

---

[1] مناقب ص ۲۱ (تاریخ سے بھی اسکی پوری تطبیق ہوتی ہے۔ علاءالدین کے زمانہ میں فتنہ مغول

واکناف مین جہان تک تجسس کیا گیا سب لوگ سلطان سے راضی وخوش معلوم ہوئے، ممکن ہے ان لوگون کی شکایت مصنوعی ہو اور یہ جاسوس ہون، اسی وقت ملک مغیث الدین (والی ارزن الروم) کو بلاکر مشورہ کیا اور یہ قرار پایا کہ صبح ان لوگون کے حالات کا تفحص کیا جائے گا ادہر سلطان علاء الدین نے خواب دیکھا کہ حضرت سلطان العلماؒ تشریف لائے اور فرماتے ہین کہ "این چہ وقت خواب است، زود برخیز وسوار شو" سلطان جاگا اور پھر یہ سونچکر سو رہا کہ کل بھی لشکر کے حالات دیکھکر چلا جاؤنگا پھر خواب دیکھا کہ حضرت سلطان العلماؒ عصا لیکر اس کے تخت پر چڑہ آئے ہین اور سینہ پر گھونسہ مار کر فرماتے ہین کہ "چہ خفتۂ" سلطان اس ہیبت سے بیدار ہوگیا اور ہمراہیون کو جگایا، خود اپنے گھوڑے پر زین کس اور روانہ ہوگیا، شاہ نے کچھ رات رہے سے ان کے خیمون پر پہرہ لگوادیا، صبح کو جب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ سب غایب ہین، تعاقب کیا مگر گرفتار نہ کرسکا، علاء الدین بخیریت اپنے لشکر مین پہنچ گیا اور اس واقعہ سے لوگون کے دلون مین ڈھارس بندھ گئی، چونکہ سلطان موقع کو دیکھ آیا تھا، اپنے لشکر کو بہت موقع سے اتارا، اول تین دن تک خوارزمیون کا پلہ بھاری رہا، چوتھے روز رومیون کو غلبہ ہوا اور پانچوین روز رومیون کے لشکر کی طرف سے آندھی چلی جس سے خوارزمیون کے آنکھین گرد وخاک سے بند ہوگئین ان کو ہزیمت ہوئی اور فتح ونصرت سلطان کے حصہ مین آئی۔[1]

اس موقع پر سپہ سالارؒ نے لکھا ہے کہ "روز عزم سلطان علاء الدین کیقباد بحضرت سلطان العلماؒ قدس اللہ سرہٗ آمدند واستمداد ہمت از درون مبارکش فرمودند. ہمت ہمین کوس رحیل آنجا زدند[2]

(بقیہ حاشیہ ص ۶۷ کا) سرحد روم تک پہنچ گیا تھا مگر علاء الدین کے عاقلانہ تدابیر اور اس کی شجاعت وسیاست کے

افلاکیؒ کے الفاظ یہ ہین کہ "بعد از وفات حضرت بہاء الدینؒ ولد اندک زمانے گزشت کہ جلال الدین خوارزمشاہ بخدمت سلطان علاء الدین رسید. ہمانا کہ زیارت تربت شیخ را دریافتہ بوسہا داد وزاریہا نمود واستعانت وہمت درخواست کردہ استعداد واستیصال او را مہیا ساخت . . . . سلہ

سپہ سالارؒ نے اس واقعہ کی تاریخ بھی "سنہ سبع عشرہ وستمایۃ" (۶۱۷ھ) دیدی ہے مگر افلاکیؒ نے اس موقع پر کوئی تاریخ نہین دی ہے، البتہ ایک دوسرے موقع پر یہ لکھا ہے کہ "در شہر سیواس در سنہ ست عشرہ وستمایۃ (۶۱۶ھ) خبر دادند کہ جلال الدین خوارزمشاہ از دست مغل گریزان گشتہ شہر اخلاط را بمحاصرہ گرفتہ است و براے خود تختگاہ میطلبد والبتہ روم را بخشم گرفتہ است وشغف عظیم می نماید،[2] ہمان کہ سلطان علاء الدین کیقباد با ملک اشرف شام بالاے آذربیجان در مابین حوض لشکر خوارزمیان را شکستند و خوارزمشاہ بجانب جزیرہ گریزان گشت در دست کردان گرفتار گشتہ کشتہ شد . . . ."

اوپر کے واقعات سے یہ بھی واضح ہوچکا ہے کہ سلطان اگرچہ اسی وقت سے مولاناؒ کا معتقد ہوچکا تھا جب سے اس نے اپنے سفراء بغداد کی زبانی آپ کا حال سنا تھا مگر ملاقات

(بقیہ حاشیہ ص ۶۸ کا) باعث روم اس اثر سے بالکل محفوظ رہا، علاء الدین کے بعد اس کے بیٹے غیاث الدین کے زمانہ مین مغلون نے روم کے شرقی حصص مین تاخت وتاراج کی مگر ملک بدستور سلاجقہ کے پاس رہگیا، غیاث الدین کے بعد اس کا بیٹا رکن الدین مغلون کے ہاتھ سے مارا گیا، کچھ دنون پروانہ نے سلطنت کو سنبھالے رکھا مگر اس کے بعد طوایف الملوکی پھیل گئی اور ساتوین صدی کے ختم ہوتے ہوتے سلاجقہ روم کا خاتمہ ہوگیا) لہ سپہ سالار ص ۱۰-۱۱ ۔ لہ سپہ سالار ص ۱۰ -

لہ مناقب صفحہ ۳۲ ۔ لہ ایضاً ص ۳۳ -

صوری اس وقت ہوئی جب مولانا قونیہ مین تشریف فرما ہوے اور یہ ۶۲۶ھ مین ہوا۔

پس اگر سپہ سالار کی روایت صحیح سمجھی جائے تو لازم آتا ہے کہ حضرت بہاءالدین ولد سے سلطان کی ملاقات ۶۱۷ھ کے قبل ہی ہو چکی تھی اور اگر افلاکی کی روایت صحیح مانی جائے کہ سلطان نے حضرت بہاءالدین کی قبر پر حاضر ہو کر دعا کی تھی تو ضروری ہوتا ہے کہ یہ جنگ خوارزمشاہ کے ساتھ نہین بلکہ کسی اور کے ساتھ . . . . ہوئی ہو کیونکہ حضرت بہاءالدین ولد کے انتقال کے وقت تک سلسلہ خوارزمشاہیہ کا خاتمہ ہو چکا تھا لیکن اس صورت مین تمام تفصیلات غلط ہوئے جاتے ہین۔

پس اب تاریخی حیثیت سے دیکھنا چاہیے کہ خوارزمشاہ کا روم پر کب حملہ کیا اور اسکا انجام کیا ہوا۔

فتنہ مغول کے بعد خوارزمشاہیون کی تاریخ اگرچہ کسی قدر ناصاف ہوگئی ہے مگر تمام حالات و واقعات کو یکجا کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ روم کی طرف خوارزمشاہیون نے دو مرتبہ رخ کیا۔

اول جب علاءالدین محمد چنگیز خان کے ہاتھون بھاگتا ہوا مازندان کی طرف گیا اور قلعہ بحر مین پناہ گزین ہوا ہے اور پھر وہان سے نکلنے کے بعد نہایت پریشانی اور مصیبت کے عالم مین دنیا سے گزر گیا، یہ واقعہ ۶۱۷ھ کا ہے جو سپہ سالار کی روایت کی تاریخ ہے۔ ابن اثیر نے اس کی پوری تفصیل دی ہے[۱] حمداللہ المستوفی نے بھی مختصراً ذکر کیا ہے[۲] مگر اسوقت علاءالدین کے ساتھ کوئی جنگ نہین واقع ہوئی۔

دوسرا واقعہ ۶۲۶ھ کا ہے، جب علاءالدین محمد کے بیٹے جلال الدین نے کرمان سے

---

[۱] تاریخ کامل جزو ۱۲ ص ۱۷۰ [۲] تاریخ گزیدہ ص ۴۹۹۔

روم وشام کا رخ کیا۔ اخلاط کا محاصرہ کر لیا جو ملک اشرف ایوبی کی مملکت مین تھا اور چھ ماہ کے محاصرہ کے بعد آخر الامر اس پر قابض ہوگیا۔ اس دوران مین اس نے کیقباد سلجوقی سے مراسلت کی مگر یہ مراسلت بے نتیجہ رہی۔ اور کیقباد ملک اشرف کا شریک ہوگیا۔ اور دونون نے آذربیجان کے قریب ۶۲۷ھ مین جلال الدین کو شکست دی حمد اللہ المستوفی نے اس انہزام کی وجہ جلال الدین کی علالت کو قرار دیا ہے۔ اس کی پوری تفصیل ابن اثیر نے (جلد دوازدہم صفحہ ۲۲۶۔۲۲۹ مین) دی ہے۔ اس کے بعد ہی جلال الدین ۶۲۸ھ مین ایک کرد کے ہاتھ سے مارا گیا۔

پس وہ تمام تفصیلات جن کا ذکر سپہ سالار اور افلاکی نے کیا ہے وہ اسی جنگ سے مطابق ہین۔ اس مین درحقیقت

(۱) سپہ سالار کو تعین سنہ جنگ مین مغالطہ ہوگیا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ جو سنہ "سبع عشرہ وستمایۃ" لکھا ہے وہ "سبع عشرین وستمایۃ" ہوگا اور یہی مغالطہ افلاکی کے یہان ہوگیا ہے[۱]

(۲) چونکہ یہ واقعہ ۶۲۷ھ کا ہے اور اس کے بعد ہی ۶۲۸ھ مین حضرت سلطان العلماء کا انتقال ہوا ہے اور افلاکی کی تصنیف آپ کے انتقال کے تقریباً نوے برس بعد شروع ہوئی ہے اس لئے ممکن بلکہ اغلب ہے کہ افلاکی تک اس روایت کے پہنچنے مین اتنا سہو ہوگیا ہو کہ انھون نے اسے سلطان العلماء کے انتقال کے بعد قرار دیدیا

---

[۱] افلاکی کے مطبوعہ نسخہ مین سنہ ستہ عشرہ وستمایۃ ہے اور ایک قلمی نسخہ مین سنہ شش صد و شانزدہ ہے، پس اس طرح کہین عربی اور کہین فارسی ہوکر غلطی کا ہوجانا امکانات سے ہے۔

جب یہ واقعہ ۶۲۲ھ کا ہے تو سلطان العلماءؒ کے استمداد کا مسئلہ بالکل صاف ہو۔ کیونکہ آپ ۶۲۶ھ میں قونیہ میں تشریف فرما ہو چکے تھے اور یہ شکست خواجہ جلال الدین کی علالت کی وجہ سے ہوئی ہو یا جیسا کہ ابن اثیر نے لکھا ہے رومیوں اور شامیوں کی تجربہ کار افواج اور ان کے ساز و سامان سے جلال الدین کے مرعوب ہو جانے کی وجہ سے ہوئی ہو، ہر دو صورت میں ایک معتقد کو اپنے مرشد کا تصرف باطنی ہی نظر آئے گا۔

(جلال الدین کے انتقال کے بعد بھی امرائے خوارزمشاہی اپنی اپنی طور پر قیام سلطنت کے لیے کوشاں رہے اور شام و روم سے ان کی لڑائیاں بھی ہوئیں مگر ان واقعات کی تطبیق ان میں سے کسی جنگ سے نہیں ہو سکتی، اس لئے وہ خارج از بحث ہیں۔)

قونیہ میں دو برس[۱] کے قیام کے بعد حضرت بہاء الدینؒ ولد بیمار ہوئے سلطان علاء الدین کو آیا بہت رویا اور کہا کہ میری خواہش تو یہ ہے کہ سلطانؒ العلماء کو تخت پر بٹھاؤں در خود سر لشکر بوں اور فتوح حاصل کردن، سلطانؒ العلماء نے یہ سنکر فرمایا کہ اگر یہ نیت صحیح ہے تو بس معلوم ہو گیا کہ میں عالم شہادت سے جہانِ سعادت کی طرف سفر کیا چاہتا ہوں ؎

زانکہ گر من شوم بظاہر تیز بادشاہ، این جہان شود ناچیز

. . . .

---

[۱] بعد دو سال از قضائے خدا . . . سر ببالین نہاد روز عشاء (رباب نامہ)

چون دو سال بدین حال گزشت مولانا بہاء الدینؒ برحمت حق پیوست (فیہ مافیہ ص ۴)

پس یقین شد کہ رفت خواہم من   تا نگر دد خراب ہذا لم نزن (ارباب نامہ)

چنانچہ اس کے تیسرے دن جمعہ کے روز دوپہر کے وقت ۲۸ ربیع الآخر ۶۲۸ھ کو انتقال فرمایا۔[1]

سلطان کو سخت رنج ہوا، سات دن تک محل سے باہر نہ نکلا اور چالیس روز تک سوار نہ ہوا، رسم عزا اہتمام و کمال انجام دی، مرقد مبارک تعمیر کیا، اس کے گرداگرد حصار کھچوایا اور سنگ مرمر پر تاریخ وفات کندہ کرکے لگائی، آپ کا مرقد پہلے مختصر تھا بعد کو وسیع کیا گیا مگر شاید مولاناؒ کے زمانہ میں ایسا نہیں ہوا کیونکہ افلاکیؒ کی روایت ہے کہ ایک روز معین الدین پروانہ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ سلطانؒ العلماء کے مزار پر ایک عمدہ گنبد بنائے، فرمایا کہ آسمان کے گنبد سے بہتر نہیں ہو سکتا، جو ہے وہی کافی ہے۔[2]

سلطان ولدؒ کی ایک روایت کے بموجب انتقال کے وقت حضرت سلطان العلماء کی عمر پچاسی برس کی تھی[3] (مگر اس روایت کی صحت میں کسی قدر شک کی گنجایش ہے)

حضرت سلطانؒ العلماء کو مولانا سے ابتدا ہی سے غایت درجہ کی محبت تھی، اور مولاناؒ کے مرتبہ سے آپ دوسروں کو بھی آگاہ فرماتے تھے "خداوندگار" کا خطاب آپ ہی کا عطا کیا ہوا تھا۔ اور بہت ہی کم سنی سے آپ کو اس لفظ سے مخاطب فرمایا تھا۔

---

[1] خزینۃ الاصفیا میں ہے کہ "بعضے در ۶۲۳ھ نیز گفتہ اند" اسپر نگر اور سرگور اوسلی نے ۶۳۱ھ کو سال وفات قرار دیا ہے، مگر یہ دونوں قول غلط ہیں۔ [2] مناقب العارفین ص ۴۴ [3] در سن ہشتاد و پنج سالگی انتقال فرمود (مناقب ص ۲۸)

ایک مرتبہ فرمایا کہ جب تک مین زندہ ہون کوئی میرا مثل پیدا نہین ہوتا، ذرا انتظار کرو کہ مین گزر جاؤن، پھر دیکھنا کہ میرا فرزند جلال الدین محمد کیا ہوتا ہے، وہ میری جگہہ پر ہوگا، بلکہ مجھ سے بھی بالاتر ہو جائے گا۔[۱]

دوسری طرف مولاناؒ کے دل مین حضرت سلطان العلماءؒ کی جو عظمت و وقعت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سلطان ولدؒ نے فرمایا ہے کہ میرے والدؒ نے اپنے انتقال کے وقت فرمایا تھا کہ "سلطان ولد آگاہ ہو کہ قیامت کے دن مین اور میرے تمام مرید مولانائے بزرگ کے زیر سایہ ہونگے، اور آپ ہی کے وسیلہ سے ہم سب پر رحمت ہوگی"۔[۲]

ایک دوسرے موقع پر مجمع اصحاب مین یہ فرمایا کہ "اگر مولانائے بزرگ چند سال اور زندہ رہتے تو مین شمس الدین تبریزیؒ کا محتاج نہ ہوتا"۔[۳]

حضرت سلطان العلماءؒ رات کے ر ا ت اور دن کے مجاہدات سے ایک لحظ بھی غافل نہین ہوتے تھے، لوگون نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ یہ سب کچھ اپنے فرزندون اور دوستون کے لئے کرتا ہون۔[۴]

اگر راستہ مین بھی کسی مرید کی نظر کسی خوشرو پر پڑ جاتی تو جب وہ خدمت شریف مین حاضر ہوتا تو اس پر بھی اس کو متنبہ فرما دیتے تھے۔

آپ کی ایک عادت یہ تھی کہ گورستان مین پھرا کرتے تھے اور کہا کرتے کہ خدایا

---

[۱] مناقب ص ۲۲، ۲۳ [۲] مناقب ص ۲۳۔ [۳] مناقب کی اصل عبارت یہ ہے کہ اگر حضرت مولانائے بزرگ سالے چندے ماندے من محتاج شمس الدین تبریزی نمی شدم" رڈہاؤس نے اس کا ترجمہ یہ کر دیا ہے کہ "مولانائے بزرگ چند سال اور زندہ رہین گے مجھے شمس الدین کی حاجت ہوگی" ص، [۴] مناقب ص ۲۸

مجھے تو خوشخو اور متحمل بنا، مریدون سے فرمایا کرتے تھے کہ دن کو گورستان مین پھرو، رات کو ستارون کو دیکھو کہ عجائب عالم کا مشاہدہ ہو[1]۔

آپ اپنے ہمعصر علما وصلحا کا پاس و لحاظ ہمیشہ مدنظر رکھتے تھے۔ خلیفہ بغداد نے جب شیخ شہابؒ الدین سہروردی کو سلطان علاءالدین کیقباد کے پاس بطریق رسالت بھیجا، اس وقت سلطان قلعہ کونیا مین تھا اور حضرت سلطانؒ العلما، کو بھی اپنے ہمراہ لے گیا تھا، شیخؒ کو بھی وہین قلعہ مین بُلایا، مولاناؒ نے شیخؒ کی بیحد تعظیم و تکریم کی، اور فرمایا کہ "سہروردیان نند و خویشان نزدیک اند[2]"

حضرت سلطان ولدؒ کے ایک قول سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلطان العلماءؒ جہاد مین بھی شریک ہوا کرتے تھے سلطان ولدؒ کے الفاظ یہ ہین کہ "وقتے کہ بغزا سوار شدے در صف حیدر کرار بودے[3]"

آخر مین سلطانؒ العلماء کے تین چار اقوال حکم آمیز نقل کرکے اس فصل کو ختم کیا جاتا ہے۔

سلطان علاء الدین جب آپ کا مرید ہوا ہے تو ایک بہت بڑا اجتماع کیا تھا، جس مین تمام علماء و شیوخ جمع تھے، اس وقت اس کے دل مین یہ خیال گزرا کہ اگر سلطان العلماء کچھ فرماتے تو لوگ مستفید ہوتے، آپ نے اس خطرۂ دلی کو محسوس کرکے فرمایا کہ "اے بادشاہ آپ کو خبر ملی تھی کہ سلطان العلماء آرہے ہین، یہ خبر نہین ملی تھی کہ کوئی خصال (   ) آرہا ہے کہ بادشاہ کے لیے طیار کرے اگر اخلاص و حضور دل کے ساتھ ایک دم مراقبہ کرو اور ادب باطن کو نگاہ رکھو

---

[1] مناقب ص ۲۸ [2] ایضاً [3] مناقب ۳۲

تو جو کچھ مطلوب و مقصود دل ہے بے گفت زبان میسر ہو"[1]

ایک مرتبہ درس عام مین جلال الدین حصیری بحث کرنے لگے، آپ نے ناخوش ہو کر فرمایا کہ "آپ جن صحف پر اس قدر ناز کرتے ہین اگر یہ باقی نہ رہین اور دنیا مین کوئی مدرسہ و مسند قایم نہ رہے تو کیا کیجئے گا، کوشش کیجئے کہ صحیفۂ دل کے لطایف از بر ہو جائین کہ ہمیشہ باقی رہین اور وہ علم عشق ہے کہ مرنے کے بعد کام آئے"[2]

اسی طرح ایک مرتبہ آپ بلخ مین وعظ کہہ رہے تھے اثناے وعظ مین فرمایا کہ "قیامت مین خدا تعالیٰ جزائے اعمال صالحہ کے عوض مین حور و قصور عطا فرمائے گا" ایک پیر مرد نے مسجد کے گوشہ سے اٹھکر کہا کہ "اس عالم مین ہم اپنے احوال کی درستی مین مشغول رہین، قیامت مین حور و قصور کی سیر پر اکتفا کرین، آخر دیدار کب نصیب ہوگا" فرمایا کہ "یہ حور و قصور کے رموز فہم عوام کے قصور کی وجہ سے ہین ورنہ اصل دیدار ہی ہے"[3]

ترک وطن کے سلسلہ مین یہ مذکور ہو چکا ہے کہ بلخ سے چلے جانے کے بعد بھی حضرت سلطان العلماء کا اثر زائل نہین ہوا تھا، اور اس سلسلہ مین آپ کے دو خطون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، افلاکی نے ان خطون کی نقل دی ہے اور چونکہ سلطان العلماء کی کوئی اور تحریر کہین محفوظ نہین ہے اس لئے تبرکاً و تیمناً ان دونون خطون کو یہان نقل کر دیا جاتا ہے،

---

[1] مناقب ص ۲۱ [2] مناقب ص ۲۲، ۲۴، [3] مناقب ص ۲۴،

بعد از سلام و دعا بر حضرت ملکے کہ ملک دارش را سعد و نحس انجم بکار نیاید، ہیچ کارے کمال نگیرد مگر نکوکاری. میل بقوت و غلبہ نباید کرد، غلبہ در حقیقت دین و تقویٰ راست کہ لیظہرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون. قاضی امام رومی یعرف بہ بدیانت و صلاحیت آراستہ و سعادت بمعاونت بر و تقوی باربستہ است. تعاونوا علی البر والتقوی والسلام علی من اتبع الہدیٰ

بعد از حمد و شکر جائے کہ مرجع مظلومان است و دفع ظلم متغلبان است لاسیما از اصحاب تصوف و ارباب خیر خاندانے کہ تربیت سلاطین حالیہ تعمدہم اللہ بغفرانہ یافتہ است ذکر جمیل ایشان بہ انجا سایر، حمداً للہ تعالیٰ کہ سدہ منیع و جناب رفیع زاد اللہ تعالیٰ و قعتہ، بدان حلیہ متحلی است کہ مثال کریم صادر شدہ است کہ متغلب در امثال ملکے می نمانند، آنرا با مضار رسانند تا بیفائدہ نگردد والسلام۔

(ملک شاہ سلجوقی (۴۶۵ھ/۱۰۷۲ - ۴۸۵ھ/۱۰۹۲) کے ایک ملوک بلکاتگین کا ایک غلام نوشتگین تھا۔ ملک شاہ نے بلکاتگین کے بعد (۴۷۰ھ/۱۰۷۷ میں) اس کی جگہہ پر اسی نوشتگین کو مقرر کر دیا اور نوشتگین کی آخر عمر تک خوارزم کی شحنگی اسی سے متعلق رہی۔

نوشتگین نے ۴۹۰ھ/۱۰۹۷ مین بعہد برکیارق (۴۸۷ھ/۱۰۹۴ - ۴۹۸ھ/۱۱۰۴) انتقال کیا اور سنجر (۵۱۱ھ/۱۱۱۷ - ۵۵۲ھ/۱۱۵۷) کے اشارے سے نوشتگین کا بیٹا محمد اس کی جگہہ مقرر کر دیا گیا، اور اسے "قطب الدین" کا خطاب ملا۔ یہ شخص آخر تک سلجوقیون کا وفادار رہا اور اول خوارزم شاہ یہی تھا۔ ۵۲۱ھ مین انتقال کیا۔

اس کے بعد سنجر نے اس کے بیٹے اتسز کو اس کی جگہہ عطا کی۔ اتسز اول سنجر ہی کی خدمت مین رہتا تھا اور سنجر کی جو نظر عنایت اس پر تھی وہ کسی امیر پر نہ تھی، اس سے دوسرے امرا کو رشک ہوا اور انھون نے دونون کو ایک دوسرے سے بدظن کر دیا۔ اتسز اجازت لے کر خوارزم کو چلا گیا۔ خوارزم پہونچکر اس نے بار بار بغاوت کی اور سنجر نے ہر بار اسے شکست دی مگر ہر مرتبہ معاف بھی کر دیا۔ خوارزم کا اول باستقلال بادشاہ اسی کو سمجھنا چاہئے، اس نے ۵۵۱ھ مین انتقال کیا، انتیس برس فرمانروائی کی جن مین سے سولہ برس مستقل فرمانروا رہا۔

اتسز کے بعد اس کا بیٹا الپ ارسلان[1] تخت نشین ہوا الپ ارسلان اور اس کے بھائی سلیمان مین بہت دنون تک خانہ جنگی رہی، مگر شاہی الپ ارسلان ہی پر قرار پائی چونکہ سنجر کا انتقال ہوچکا تھا اور خراسان مین بدنظمی پھیلی ہوئی تھی، الپ ارسلان کو موقع ملا اور اس نے کچھ حصص خراسان و ماوراء النہر پر بھی قبضہ کر لیا، ۵۵۸ھ مین انتقال کیا، الپ ارسلان کی وصیت کے بموجب اس کا چھوٹا بیٹا سلطان شاہ بادشاہ ہوا، چونکہ یہ خوردسال تھا، زمام سلطنت اس کی مان بکلہ ترکان کے ہاتھ مین رہی، بڑے بھائی تکش نے خوارزم پر قبضہ کر لیا مگر بقیہ حصص ملکت پر سلطان شاہ حکمران رہا اور ۵۸۹ھ مین انتقال کیا، تکش کا دور حکمرانی ۵۶۸ھ سے ۵۹۶ھ تک رہا۔

قطب الدین محمد (علاء الدین محمد) بن تکش خان (۵۹۶ھ) مین اپنے باپ کے انتقال کے بعد خوارزم کا بادشاہ ہوا، اس سلسلہ کا سب سے بڑا بادشاہ یہی ہوا ہے۔ اور اگرچہ اس کے بعد گیارہ برس تک شاہی اس خاندان مین رہی مگر درحقیقت شاہی کا خاتمہ اسی پر سمجھنا چاہیے۔

سلجوقیون کا تقریباً تمام ملک اور اس سے کچھ زاید اس کے قبضہ مین تھا۔ ستائیس بادشاہ باری باری سے ایک ایک روز اس کی نوبت بجاتے تھے۔ علاوہ اس عظمت و شان کے صاحب علم بھی تھا۔ ابو الفدا نے لکھا ہے کہ "کان فاضلاً عالماً بالفقہ والاصول وغیرہما"[2] مولانا کے والد حضرت بہاء الدینؒ کو جس بادشاہ سے سابقہ پڑا وہ یہی بادشاہ تھا

---

[1] بعض تاریخون مین اس کا نام الپ ارسلان اور بعض مین ایل ارسلان لکھا ہے، (ابن اثیر نے ایل ارسلان لکھا ہے) [2] کتاب المختصر فی اخبار البشر جلد ثالث صفحہ ۱۲۷۔

۶۰۹ھ مین اس نے غوریون کو شکست دی: "ظل اللہ فی الارض" کا خطاب پایا، اور غزنین اور غور پر مستقل قبضہ کرنے کے بعد "سکندر ثانی" کے خطاب سے ملقب ہُوا۔ چنگیز خان سے جنگ کا آغاز ہوا اور اگرچہ چنگیز خان کو اولاً ہزیمت ہوگئی مگر سلطان پر بھی خوف طاری ہوگیا، اور وزیر بدرالدین عمید کی غداری سے سلطان کا سارا کام بگڑ گیا، اور جب چنگیز خان نے بالاستقلال حملہ کیا تو سلطان کو سوائے فرار کے کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ سلطان ایک صوبے سے دوسرے صوبے کی طرف بھاگتا پھرتا تھا اور مغول اس کے عقب مین تمام ممالک اسلام کو خراب کرتے ہوے بڑھتے جاتے تھے۔ آخر سلطان بحیرہ خزر مین جزیرہ آبسکون مین جاکر پناہ گزین ہوا، وہان سے ایک بار نکلا مگر پھر وہین واپس آیا اور ۶۱۷ھ مین وہین نہایت مصیبت و پریشانی کے عالم مین انتقال کر گیا۔ کفن تک نصیب نہ ہوا، جب جلال الدین مشہد سے ایران مین آیا تو اس کی لاش کو وہان سے لیجا کر قلعہ ارش مین دفن کیا مگر جب مغلون نے اس قلعہ پر قبضہ کیا تو اس کی لاش کو نکال کر جلا ڈالا، انا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا بہاء الدین ولد کے بلخ کو ترک کرنے کا باعث ہونے کے سوا، مجد الدین بغدادی خلیفہ شیخ نجم الدین کبری کی ہلاکت بھی اسی بادشاہ کے اشارے سے وقوع مین آئی اور تاریخون مین مذکور ہے کہ شیخ نے اس حادثہ کی خبر سنکر بددعا کی۔

اس کے سات بیٹون مین سے چار مغلون کے فتنہ مین قتل ہوگئے۔

رکن الدین عراق و کرمان وغیرہ کے حصص پر برائے نام حکمران رہا اور دو برس بعد ۶۱۹ھ مین مغلون کے ہاتھ مین گرفتار ہوگیا، اور مغلون کے سردار کے سامنے زانو تہ نکرنے کے باعث مغلون نے اسے مع ہمراہیون کے شہید کر ڈالا۔

دوسرا بیٹا غیاث الدین رے اور خوزستان میں رہا آخر میں کرمان آیا، براق حاجب نے اس کی بہت عزت و توقیر کی مگر ایک سازش کی وجہ سے براق نے اسے ۶۲۷ھ میں خفیہ ہلاک کر ڈالا۔

جلال الدین اس سلسلہ کا نواں اور آخری فرمانروا تھا، علاء الدین نے اپنی زندگی میں اسے غور و غزنین کا حکمراں بنا دیا تھا، باپ کے انتقال کے بعد خوارزم آیا مگر امرا کی عدم موافقت کی وجہ سے پھر غزنین کو مراجعت کر گیا، مغلوں سے سات مرتبہ جنگ کی اور فتحیاب رہا، آخر چنگیز خاں خود اس کے مقابلہ کو بڑھا اور ۶۱۸ھ میں اسے شکست دی۔ جلال الدین نے چنگیز خاں کی آنکھ کے سامنے مع اپنے سات سو سپاہیوں کے دریائے سندھ میں گھوڑے ڈال دیئے اور دریا کو عبور کر گیا، مگر سات سو سپاہیوں میں سے صرف سات آدمی دوسرے کنارے پر پہنچے۔ جلال الدین نے ایک نئی فوج جمع کر کے ہندوستان کا کچھ حصہ فتح کیا اور پھر وہاں سے چل کر ۶۲۱ھ میں ایران پہنچا، کرمان، اصفہان، رے، بغداد، آذربیجان پر حملہ آور ہو کر اس پر قبضہ کر لیا، ملکہ خاتون سے عقد کیا اور پھر طفلس سے عاجلانہ کوچ کرتا ہوا سترہ دن میں کرمان پہنچ گیا، جلال الدین کی اس غیبت میں ملک اشرف (والی شام) قلعہ خوی (خرتی) سے ملکہ خاتون کو نکال لے گیا، اور اہل گرجستان نے بھی سرکشی اختیار کی، سلطان یہ سن کر اخلاط کی طرف بڑھا، گرجستان کو پوری طرح زیر کیا، اخلاط کو جو ملک اشرف کی مملکت میں تھا، چھ ماہ کے محاصرہ کے بعد فتح کر لیا، اور ملک اشرف کی ملکہ کو قید کر لیا، اس کے بعد شام اور روم کی طرف بڑھا اور آذربیجان میں ۶۲۷ھ میں وہ جنگ واقع ہوئی جس کا ذکر مولانا بہاؤالدین

کے تصرفات باطنی کے سلسلہ میں آچکا ہے، اس جنگ میں اگرچہ سلطان کو ہزیمت ہوئی مگر بعد کو اس نے شام و روم کا بہت حصہ تاراج کر ڈالا، ادھر سے پلٹ کر اصفہان کے سامنے مغلوں سے جنگ کی۔ دونوں فوجوں کے بیسرے کو شکست ہوئی، سلطان خود کردستان کو چلا گیا اور اس کی فوج اصفہان میں داخل ہوئی۔ پھر سلطان اصفہان ہوتا ہوا کردستان کو چلا گیا اور وقفِ عیش و نوشی ہو گیا، مغل اس کے تعاقب میں تھے، ایک روز سلطان شراب سے مست تھا، مغلوں نے شبخون مارا اور قریب تھا کہ اسے گرفتار کر لیں مگر وہ بچ نکلا، ایک کرد نے کپڑے کی طمع سے اسے گرفتار کر لیا، مگر جب معلوم ہوا کہ سلطان ہے تو اسے اپنے مکان میں ٹھہرایا، مگر ایک دوسرے کرد نے جس کا بھائی جنگ اخلاط میں سلطان کی فوج کے ہاتھوں مارا گیا تھا موقع پا کر اسے قتل کر دیا۔ اور اس طرح شوال ۶۲۸ھ میں جلال الدین کی ذات کے ساتھ خوارزم شاہیوں کا خاتمہ ہو گیا۔

(علاؤ الدین محمد اور جلال الدین کے حالات میں جلال الدین النسوی "منشی" کی تصنیف سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے کیونکہ وہ آخر تک جلال الدین کے ساتھ رہا، ابو الفدا نے اسی سے حالات اخذ کئے ہیں۔ جلد ۲ صفحہ ۱۴۸)

ترکوں کے وہ قبائل جو ممالک اسلامی کی حد پر پھیلے ہوئے تھے اُن میں سے ایک اہم قبیلہ کا سردار بلکہ چند قبیلوں کا سردار سرداران سلجوق نامی تھا' اس کے چار بیٹے اسرائیل، میکائیل، موسیٰ اور یونس تھے۔ یہ لوگ تنگیٔ چراگاہ کی وجہ سے ۲۷۵ھ / ۹۰۵ء میں بخارا، سغد اور سمرقند وغیرہ کے قرب میں آکر آباد ہو گئے۔ سلطان محمود (۳۸۸ھ / ۹۹۸ء - ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء) ان کے تعلقات اولاً اچھے رہے مگر ان کی کثرت تعداد سے سلطان متوہم ہو گیا اور اسرائیل کالنجر میں قید کر دیا' وہ قید ہی میں مر گیا' بعد میں سلطان نے اسرائیل کے بھائیوں کو جیحون سے پار ہو کر آباد ہونے کی اجازت دیدی' ان آباد کاروں کے پیشرو میکائیل کے بیٹے چغر بیگ اور طغرل بیگ تھے، ۴۲۹ھ / ۱۰۳۷ء میں نیشاپور میں طغرل بیگ کی تاجپوشی عمل میں آئی، سلطان مسعود (۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء - ۴۳۲ھ / ۱۰۴۰ء) کو ان لوگوں نے دو بار شکست دی' اپنی دوسری فتح کے بعد ان لوگوں نے اپنے مقبوضات آپس میں تقسیم کر لئے چغر بیگ نے خراسان

لیا اور مرو کو اپنا پایۂ تخت بنایا، عراق طغرل بیگ کے حصہ میں آیا اور اس نے رے کو دار الملک قرار دیا، غزنیں دہرات نیز بند موسیٰ کو لے اور چغر بیگ کے بیٹے قاوَرد کو طبس اور کرمان دیا گیا، سنہ ۴۵۳ھ/۱۰۶۱ء میں چغر بیگ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا الپ ارسلان اس کا جانشین ہوا، پھر سنہ ۴۵۵ھ/۱۰۶۳ء میں طغرل بیگ کے انتقال کے بعد الپ ارسلان کا بھائی سلیمان اس کا جانشین قرار پایا، مگر سلیمان کے برادر عم زاد قتلمش بن اسرائیل نے اسے شکست دے کر ملک پر قبضہ کر لیا، الپ ارسلان بھائی کی مدد کو آیا، جنگ میں قتلمش گھوڑے سے گر کر مر گیا اور الپ ارسلان کل ملک پر قابض ہو گیا، الپ ارسلان چاہتا تھا کہ قتلمش کے کل خاندان کو مٹا دے مگر نظام الملک مانع ہوا اور شہزادگی کا نام خارج کر کے ان لوگوں کو سپہ دار بنا کر ملک شام کی طرف بھجوا دیا۔

(۱) انھیں سپہ داروں میں سلیمان بن قتلمش (سنہ ۴۷۰ھ/۱۰۷۷ء - سنہ ۴۷۹ھ/۱۰۸۶ء) سے سلاجقۂ روم کا سلسلہ شروع ہوا، اس نے انطاکیہ فتح کیا اور حلب پر بھی قبضہ کر لیا، اسی اثنا میں تتش ابن ارسلان نے اس پر حملہ کر دیا، سلیمان کے امرا برگشتہ ہو گئے اور اس نے خود اپنے کو ہلاک کر ڈالا، یہ زمانہ ملک شاہ سلجوقی کا تھا، وہ بھائی کی اس حرکت سے سخت ناخوش ہوا اور

(۲) سلیمان کے بیٹے داؤد کو اس کی جگہ پر مقرر کر دیا، داؤد سنہ ۴۸۰ھ/۱۰۸۷ء میں قونیہ کو اپنے قبضہ میں لایا اور اسے پایۂ تخت قرار دیا، اور بیس برس کی حکمرانی کے بعد سنہ ۵۰۰ھ/۱۱۰۶ء میں انتقال کیا، اس کے بعد

(۳) قلج ارسلان بن سلیمان (سنہ ۵۰۰ھ/۱۱۰۶ء - سنہ ۵۳۹ھ/۱۱۴۴ء) اور

(۴) مسعود بن قلج ارسلان (سنہ ۵۳۹ھ/۱۱۴۴ء - سنہ ۵۵۸ھ/۱۱۶۲ء) فرمانروا ہوئے۔

(۵) مسعود کے بعد اس کا بیٹا عزالدین قلیج ارسلان (۵۵۸ھ/۱۱۶۲ تا ۵۷۸ھ/۱۱۸۲) میں حکمراں ہوا، اس نے سیواس و قیصریہ پر قبضہ کر لیا اور آقشہر کی تعمیر کی۔

(۶) عزالدین نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے غیاث الدین کیخسرو کو اپنا جانشین قرار دیا مگر

(۷) غیاث الدین کے بڑے بھائی رکن الدین نے قونیہ پر قابض ہو کر غیاث الدین کو خارج کر دیا۔ ارزن الروم کو اسی نے فتح کیا۔ ۶۰۲ھ/۱۲۰۵ میں انتقال کیا۔

(۸) اس کے بعد اس کا لڑکا عزالدین قلیج ارسلان جانشیں ہوا مگر غیاث الدین نے واپس آکر قونیہ پر قبضہ کر لیا اور عزالدین کو معزول کر دیا اور وہ قیدی میں مر گیا، ۶۰۹ھ/۱۲۱۲ میں غیاث الدین بھی انتقال کر گیا۔

(۹) غیاث الدین کے بعد عزالدین کیکاؤس اس کا جانشیں ہوا مگر ایک برس بعد ہی بعارضۂ سل داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

(۱۰) عزالدین کے بعد اس کا بھائی علاءالدین کیقباد (۶۱۰ھ/۱۲۱۳ تا ۶۳۶ھ/۱۲۳۸[۱]) فرمانروا ہوا، اس سلسلہ میں یہ سب سے زیادہ صاحب جاہ و جلال فرمانروا ہوا ہے، اس کے حدود مملکت اتنے وسیع تھے کہ شہنشاہی کا اطلاق ہوتا تھا۔ ۶۲۷ھ/۱۲۳۰ میں بمقام ارزن الروم خوارزم شاہ کو اسی نے شکست دی جس کے بعد ہی خوارزم شاہیوں کا خاتمہ ہو گیا اور اس طرح اگرچہ ملک روم کا راستہ مغلوں کے لئے کھل گیا، مگر اس بادشاہ کے آخر عہد تک یہ ملک مغلوں کی تاخت و تاراج سے بچا رہا، اخلاط وغیرہ پر قابض ہو جانے سے ملک اشرف کو علاءالدین سے حسد ہوا اور سولہ ایوبی حکمرانوں نے ملک کامل کے تحت میں اس کے مقابلہ کی طیاری کی مگر آپس کی بداعتمادی کی وجہ سے کچھ کر نہ سکے، اس نے قونیہ سیواس وغیرہ

[۱] باختلاف روایت ۶۳۴ھ/۱۲۳۶۔

ہیں بہت سی عمارتیں بنوائیں جو یادگار زمانہ رہیں۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ ادھر ۶۱۶ھ میں علاء الدین قونیہ میں تخت نشیں ہوا، اور ادھر سے قریب ہی زمانہ میں مولانا بلخ سے عازم حجاز و روم ہوے اور اسی کے عہد میں قونیہ میں مستقلاً قیام اختیار کیا، حضرت بہاؤالدین ولد سے علاء الدین کو کمال عقیدت تھی اور خود مولانا کا بھی بغایت معتقد تھا۔

(۱۱) علاء الدین کو اس کے بیٹے غیاث الدین کیخسرو (۶۳۶ھ/۱۲۳۸ - ۶۴۴ھ/۱۲۴۶) نے زہر دیا اور خود اس کا جانشین ہو گیا، اس کے زمانہ میں مغلوں نے ملک روم کو بہت خراب کیا مگر قونیہ پر قابض نہیں ہوے۔

(۱۲) غیاث الدین کے بعد اس کا بیٹا رکن الدین سلیمان شاہ (۶۴۴ھ/۱۲۴۶ - ۶۶۴ھ/۱۲۶۵) تخت نشیں ہوا مگر درحقیقت اب آزادی باقی نہیں رہی تھی، ملک پر مغلوں کی سیادت قائم ہو گئی تھی۔ رکن الدین کے دو بھائی اور تھے، علاء الدین اور عزالدین ان دونوں نے اس کے خلاف جد و جہد کی، علاء الدین تو بالکل بے نیل مرام زہر سے ہلاک ہوا، البتہ عزالدین کو کچھ جزدی کامیابی حاصل ہوئی مگر سلسلہ شاہان میں رکن الدین ہی کا نام سمجھنا چاہیے۔ اسی رکن الدین کا وزیر معین الدین پروانہ تھا، رکن الدین اوائل عہد سلطنت میں مولانا کا بہت معتقد تھا، اور مولانا کو اپنا باپ بنایا تھا مگر بعد میں مولانا کو اس سے کچھ رنج ہو گیا تھا، جس کی نسبت مولانا کے دیوان کے تبصرے میں اشارہ کیا گیا ہے[1]۔ رکن الدین اباقا خان کے حکم سے مارا گیا۔ اور بعض تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس

---

[1] بذیل تشریح غزل

نگفتمت مرو آنجا کہ مبتلات کنند ۔۔۔ کہ سخت دست دراز اند بستہ مات کنند

میں پروانہ کی بھی سازش تھی۔

(۱۳) رکن الدین کے بعد اس کا خرد سال لڑکا کیخسرو (سنہ ۶۶۴ھ - سنہ ۶۹۲ھ) اس کا جانشین قرار پایا، مگر مغلوں کی طرف سے پروانہ کو اختیارات کامل عطا کیے گئے اس نے کیخسرو کی والدہ سے عقد ہی کر لیا۔ اور اپنے انتقال کے وقت تک اصل حکمراں وہی رہا۔

پروانہ کا نام سلیمان اور لقب معین الدین تھا۔ کاشان کا رہنے والا تھا، رکن الدین کے زمانہ میں اسے عروج حاصل ہوا، مولاناؒ کی اس پر خاص نظر عنایت تھی، اور مولاناؒ کے ساتھ اس کی عقیدت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، مولاناؒ کی تصنیف "فیہ ما فیہ" میں بیشتر مواعظ وہی ہیں جو پروانہ کی مجلس میں آپ نے بیان فرمائے تھے، مناقب العارفین میں پروانہ سے متعلق واقعات بکثرت دیئے گئے ہیں، مولاناؒ کی متعدد غزلوں میں اس کی جانب اشارات بھی ملتے ہیں۔ اور مثنوی شریف میں بھی دو ایک جگہ کنایۃً اس کا تذکرہ آیا ہے اور پروانہ کا دور عروج ہی مثنوی شریف کی تصنیف کا زمانہ ہے، مولاناؒ کے بعد پروانہ سنہ ۶۷۶ھ (۱۲۷۷ء) میں اباقا خان کے حکم سے قتل ہوا، جس کی وجہ یہ ہوئی کہ سلطان بیبرس (ملک مصر) نے جب مغلوں کو شکست دی اور پھر اپنے ملک کو واپس چلا گیا تو اباقا خان نے معین الدین کو اس کا شریک سمجھ کر اس سے انتقام لیا، بعد میں رکن الدین بھی احمد خان کے حکم سے قتل ہوا۔

کیخسرو کے بعد مسعود اور کیقباد برائے نام سلطان ہوئے، ہر طرف ملوک الطوائف کا دور دورہ ہو گیا اور انھیں ملوک الطوائف میں عثمان بھی تھا جو سلطنت عثمانیہ کا بانی ہوا۔ غرض سلاجقہ روم کی سلطنت کا سنہ ۷۰۰ھ (۱۳۰۰ء) میں اور بقول بعض سنہ ۷۰۴ھ (۱۳۰۴ء) میں خاتمہ

ہو گیا۔

اصل یہ ہے کہ سلطنت کا خاتمہ تو رکن الدین کے زمانہ میں ہو گیا تھا، آخر کے تین چار فرمانروا مغلوں کی جانب سے محض والی کی حیثیت رکھتے تھے۔

فصل دوم

اتمام الکمال

خام بدم، نان شدم، بارِ دگر جاں شدم	جان چون بجاناں رسید مقصد جاناں شدم
۶۲۸ھ	۶۴۲ھ

حضرت سلطان العلماءؒ کی وفات کے بعد سلطانِ وقت اور تمام اکابر واعاظم کے اتفاق رائے سے مولاناؒ آپ کے جانشین ہوئے اور آپ کے سلسلۂ درس و تدریس اور تلقین وارشاد کو بدستور جاری رکھا، سلطان ولدؒ اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔

تعزیہ چوں تمام شد پس ازاں — خلق جمع آمدند پیر وجواں
ہمہ کردند رو بہ بفرزندش — کہ توئی درجمال مانندش
بعد ازیں دست ماو دامنِ تو — ہمہ بنہادہ ایم سوے تورو
شاہِ ما بعد ازیں تو خواہی بود — از تو خواہیم جملہ مایۂ دسود

نشست بر جاش شہ جلال الدینؒ روے کرد خلق روے زمیں

مناسب ہے کہ اس موقعہ پر مولاناؒ کے سلسلہ باطنی کی قدرے تفصیلی توضیح کر دی جائے، فصل اول میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ حضرت بہاء الدینؒ ولد نے اپنے ایک مرید خاص سید برہان الدینؒ محقق ترمذی کو مولاناؒ کا اتالیق مقرر کیا تھا مگر جب حضرت بہاء الدین بلخ سے روانہ ہوئے ہیں اس وقت سیدؒ وہاں موجود نہ تھے بلکہ اس سے کچھ قبل اپنے وطن ترمذ کو چلے گئے تھے اور پھر شیخؒ سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی بلکہ شیخؒ کے انتقال کے بعد سیدؒ قونیہ میں تشریف لائے اور مولاناؒ سے ملے، مولاناؒ آپ کے مرید ہو گئے اور اپنے والدؒ ماجد کے بعد مراتب سلوک آپ ہی سے طے کئے پس مولاناؒ کے شیخ سید برہان الدینؒ، اور بواسطہ سید برہان الدینؒ (اور بلا واسطہ بھی) حضرت بہاء الدین تھے۔

حضرت بہاء الدینؒ کے اسناد خرقہ کے ذیل میں سپہ سالارؒ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ "اما تلقین ذکر و خرقہ او متصل است، بپدرش احمد الخطیبیؒ واز و بامام احمد غزالی۔"[1] لیکن احمد الخطیبیؒ حضرت بہاء الدین ولد کے باپ نہیں بلکہ دادا تھے اور حضرت بہاء الدینؒ ابھی دو ہی برس کے تھے کہ آپ کے والد حسینؒ بن احمد الخطیبیؒ کا انتقال ہو گیا تھا، پس ظاہر ہے کہ یہاں ایک نام درمیان سے رہ گیا ہے اور افلاکیؒ نے اس کمی کو اس طرح پورا کیا ہے کہ حضرت بہاء الدینؒ ولد اور احمد الخطیبیؒ کے مابین شمس الائمہ سرخسیؒ کا نام دیا ہے اور اس طرح سلسلہ کو مربوط کر دیا ہے،[2] احمد الخطیبیؒ حضرت احمد غزالیؒ کے مرید تھے اور آگے کو سلسلہ

---

[1] صفحہ ۶ [2] صفحات ماسبق میں یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ شمس الائمہؒ سے مولانا بہاء الدینؒ کی قرابت خاندانی بھی تھی یعنی شمس الائمہ کی نواسی حضرت بہاء الدین کی زوجہ محترمہ تھیں۔

احمد غزالیؒ سے چلا ہے۔

مکمل شجرہ حسب ذیل ہے۔

آنحضرت صلعم	سنہ ۱۱ھ / ۶۳۲ء
حضرت علیؓ	سنہ ۴۰ھ / ۶۶۰ء
حسن بصریؒ	سنہ ۱۱۱ھ / ۷۲۹ء (باختلاف روایت سنہ ۱۱۲ھ / ۷۳۰ء، ۱۱۴ھ / ۷۳۲ء)
حبیب عجمیؒ	سنہ ۱۵۶ھ / ۷۷۲ء
داؤد طائیؒ	سنہ ۱۶۵ھ / ۷۸۱ء
معروف کرخیؒ	سنہ ۲۰۰ھ / ۸۱۵ء (باختلاف روایت سنہ ۲۰۶ھ / ۸۲۱ء)
سری سقطیؒ	سنہ ۲۵۳ھ / ۸۶۷ء (باختلاف روایت سنہ ۲۵۰ھ / ۸۶۴ء)
جنید بغدادیؒ	سنہ ۲۹۷ھ / ۹۰۹ء (باختلاف روایت سنہ ۲۹۸ھ / ۹۱۰ء، سنہ ۳۰۲ھ / ۹۱۴ء)
شبلیؒ	سنہ ۳۳۴ھ / ۹۴۵ء (باختلاف روایت سنہ ۳۴۲ھ / ۹۵۲ء)
ابوبکر عمر محمدؒ زجاج نیشاپوری	سنہ ۳۴۸ھ / ۹۵۹ء
ابوبکر نساج طوسی[1]	سنہ ۴۸۷ھ / ۱۰۹۴ء
احمد غزالیؒ	سنہ ۵۲۰ھ / ۱۱۲۶ء (باختلاف روایت سنہ ۵۱۷ھ / ۱۱۲۳ء)
احمد الخطیبی البلخی	
شمس الائمہ سرخسی	سنہ ۵۷۱ھ / ۱۱۷۵ء (بقول روڈہاؤس)

---

[1] تمام تذکروں میں ابوبکر نساجؒ کو ابوالقاسم گرگانی (سنہ ۴۵۰ھ / ۱۰۵۸ء) کا مرید لکھا ہے اور سنین وفات سے بھی یہ عیاں ہے کہ زجاجؒ اور نساجؒ کے درمیان ایک یا دو نام رہ گئے ہیں۔

سلطان العلماء بہاء الدینؒ ولد ۶۲۸ھ / ۱۲۳۱ء

سید برہان الدین محقق ترمذیؒ ۶۳۷ھ / ۱۲۴۰ء

مولانا جلال الدینؒ رومی ۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء

[جو نام قوسین میں ہیں وہ کتب خانۂ آصفیہ کے نسخۂ قلمی میں نہیں ہیں مگر دیگر کتب سے ثابت ہیں۔ مناقب العارفین میں مولاناؒ کے بعد تین نام اور دیئے ہیں، مولانا شمس الدینؒ تبریزی (غیبت ۶۴۵ھ / ۱۲۴۷ء)۔ مولانا بہاء الدینؒ ولد (۷۱۲ھ / ۱۳۱۲ء)۔ مولانا جلال الدین امیر عارف (۷۱۹ھ / ۱۳۱۹ء)]

اس شجرے میں اگرچہ احمد الخطیبیؒ اور سلطان العلماء کے درمیان ایک نام کے آجانے سے فصل زمانی کی دشواری رفع ہو جاتی ہے مگر اس میں جو دقت لاحق ہے اس کا تفصیلی ذکر فصل اول میں ہو چکا ہے، اسے ملحوظ رکھنا چاہیے۔

شمس الائمہ سرخسیؒ کے واسطے کے علاوہ حضرت بہاء الدینؒ ولد کی سند خرقہ ایک دوسری طرح پر بھی منقول ہے۔ ملا عبدالرحمٰن جامیؒ[1]، دارا شکوہ[2]، اور غلام سرور لاہوریؒ ہر سہ تذکرہ نویسوں نے حضرت بہاء الدینؒ ولد کو شیخ نجم الدین کبریٰؒ کے مریدوں میں شامل کیا ہے۔

اس کے قبول کرنے میں کوئی دقت لاحق نہیں ہے کہ حضرت بہاء الدینؒ ولد شیخ نجم الدینؒ کبریٰ کے بھی مرید رہے ہوں۔ شیخؒ نے بدوران فتنۂ مغول ۶۱۸ھ میں جام شہادت نوش

---

[1] بعضے گفتہ اند کہ وے بصحبت شیخ نجم الدین کبری رسیدہ است و از خلفائے ویست (نفحات الانس صفحہ ۲۸-۴۶۱) بعضے گفتہ اند کہ مولانا بہاء الدینؒ والد مولانا جلال الدین نیز از ایشاں (یعنی از مریدان شیخ نجم الدین کبری) است۔ سفینۃ الاولیا صفحہ ۱۳۴ [2] مرید شیخ نجم الدین کبری است و از اعاظم خلفائے وے، خزینۃ الاصفیا صفحہ ۲۶۳ جلد دوم

فرمایا ہے۔ پس آپ کا زمانہ وہی ہے جو حضرت بہاؤ الدینؒ ولد کا زمانہ ہے۔

شیخ نجم الدین کبریٰ کو شیخ اسمٰعیل قصریؒ اور شیخ عمار یاسر دو بزرگوں سے خرقہ ملا تھا[1] اور شیخ عماد الدین المعروف بہ شیخ عمار یاسر (۵۹۹ھ) کا سلسلہ شیخ ضیاء الدینؒ ابو نجیب عبد القاہر سہروردی (۵۶۳ھ) کے واسطہ سے حضرت احمد غزالی سے مل جاتا ہے[2] اور پھر آگے کو سلسلہ وہی ہے جو شجرے میں منقول ہوا۔ شیخ بہاؤ الدین کے ایک قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ جب شیخ الشیوخ شہاب الدینؒ سہروردی قونیہ میں تشریف لائے ہیں تو حضرت بہاؤ الدینؒ نے فرمایا ہے کہ "سہروردیاں عیقانند خویشان نزدیکند"[3]

یہ اشارہ خواہ اس معنی کر کے ہو کہ سلسلہ سہروردیہ کا تعلق بھی حضرت احمد غزالیؒ سے تھا یا اس معنی کر کے ہو کہ شیخ نجم الدینؒ کبریٰ کے وسیلہ سے خود حضرت بہاؤ الدینؒ کا سلسلہ عبد القاہر سہروردی سے ملتا تھا، ملا عبد الرحمٰن جامیؒ نے بھی اسی قسم کا خیال

---

[1] یہ سلسلہ حسب ذیل ہے۔

آنحضرتؐ، حضرت علیؓ، کمیل بن زیادؒ۔ عبد الواحدؒ۔ ابو یعقوب سوسی (ابو یعقوب نہرجوری۔ ابو عبد اللہ بن عثمانؒ) ابو یعقوب طبریؒ۔ ابو القاسم بن رمضانؒ۔ ابو العباسؒ ادریس۔ محمد داؤدؒ بن داؤد۔ محمد ابانؒ (عرف ممانکیل) شیخ اسمٰعیل قصری شیخ نجم الدینؒ۔ نفحات الانس صفحہ ۲۷۰۔ خزینۃ الاصفیا صفحہ ۲۵۹۔ تواریخ آئینہ تصوف صفحہ ۴۸، صفحہ ۱۱۲۔ (قوسین کے دو نام تواریخ آئینہ تصوف میں نہیں ہیں) نفحات الانس میں ہے کہ "شیخ نجم الدین بصحبت وے (یعنی اسمٰعیل قصری) رسیدہ است و خرقۂ اصل از دست وے پوشیدہ۔

[2] نفحات الانس صفحہ ۲۶۹ [3] مناقب صفحہ ۲۱

ظاہر کیا ہے۔ آپ نے حضرت نجم الدینؒ کبریٰ کے واقعۂ شہادت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ "جب کفار (مغول) شہر میں آئے تو آپ اپنے باقیماندہ اصحاب کو لیکر مقابلہ کو نکلے، دونوں جیب میں پتھر بھر لئے تھے اور ہاتھ میں نیزہ تھا، آپ نے پتھر پھینکنے شروع کئے تا آنکہ کل پتھر ختم ہو گئے۔ کافروں نے آپ پر تیر برسائے، ایک تیر سینہ میں لگا آپ اپنے ہاتھ سے کھینچکر پھینک دیا اور آگے بڑھے، شہادت کے وقت آپ نے ایک کافر کا پرچم (موئے پیشانی) پکڑ لیا، بعد شہادت دس آدمیوں نے اسے چھڑانا چاہا نہ چھوٹ سکا، آخر قطع کر دیا" یہ لکھ کر تحریر فرماتے ہیں کہ بعضوں نے کہا ہے کہ "حضرت مولانا جلال الدینؒ رومی قدس اللہ سرہٗ درغزلیات خود اشارت بایں قصہ و انتساب خود بحضرت شیخؒ کردہ آنجا کہ گفتہ است ؎

ما ازاں محتشانیم کہ ساغر گیرند | نہ ازاں مفلسگاں کہ بز لاغر گیرند
بیکے دست مئے خالص ایماں نوشند | بیکے دست دگر پرچم کافر گیرند[1]

بہرنوع حضرت بہاء الدینؒ ولد کو خواہ شیخ نجم الدینؒ کبریٰ کا مرید مانا جائے یا بیک واسطہ حضرت احمد الخطیبی کا مرید سمجھا جائے دونوں سلسلے اوپر کو حضرت احمد الغزالیؒ سے مل جاتے ہیں اور نیچے کی طرف مولانا بلاواسطہ اور بالواسطہ اپنے والد کے وارث ہیں، مولاناؒ کے بعد یہ سلسلہ جس طرح آگے چلتا رہا وہ باب سوم کے تعلیقات سے پوری طرح واضح ہو جائے گا، یہاں مختصراً اسقدر اشارہ کر دینا کافی ہے کہ مولاناؒ کے اخلاف میں آپ کے فرزند سلطانؒ ولد صاحب سجادہ ہوئے اور سلطان ولد کے جانشین ان کے فرزند امیر عارف ہوے اور یہ سلسلہ الی یومنا ہذا اسی

---

[1] نفحات الانس ص ۴۷۰

طرح اس خاندان میں چلا آرہا ہے، خاندان سے باہر مولانا کے جانشین (سلطان ولد سے قبل) حسام الدین چلپی ہوئے اور کوئی دوسرا شخص خاندان سے باہر اس سلسلہ کا سجادہ نشین نہیں ہوا۔

اس امر کے متحقق ہو جانے کے بعد کہ مولانا کا سلسلۂ فقر حضرت احمد غزالی تک پہنچتا ہے اور مولانا نے اپنے والد ماجد کے انتقال کے بعد مراحل سلوک سید برہان الدین محقق ترمذی کے زیر ہدایت طے کئے، اب سید کے ورودِ قونیہ اور مولانا کی ارادت کے متعلق کچھ حالات درج کئے جاتے ہیں، سید جس خیال کے ساتھ قونیہ میں وارد ہوئے اس کے نسبت سلطان ولد، سپہ سالار اور افلاکی کے بیانات میں بہت فرق ہے۔ سلطان ولد کا بیان یہ ہے کہ سید برہان الدین کو جب اپنے شیخ سے ملے ہوئے بہت دن گذر گئے تو آپ کو زیارتِ شیخ کا اشتیاق ہوا، کسی نے آپ سے کہا کہ شیخ روم میں ہیں، آپ روم کو روانہ ہوئے اور جب قونیہ پہنچے اس وقت معلوم ہوا کہ شیخ کے انتقال کو ایک برس گزر چکا ہے، یہی حال ایک خاص اضافہ کے ساتھ "فیہ مافیہ" میں بھی ہے کہ (سید برہان الدین) "درحالت ہجرت مولانا بہاء الدین از بلخ غائب بود چوں بعد از مدتے باز متوجہ بلخ شد و احوال معلوم کرد، عازم قونیہ شد" جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سید اپنے وطن ترمذ سے شیخ کی ملاقات ہی کے خیال سے روانہ ہوئے مگر اول بلخ گئے اور وہاں سے عازم قونیہ ہوئے۔ چونکہ حضرت بہاء الدین نے بلخ سے روانہ ہونے اور قونیہ میں اقامت پذیر ہونے کے درمیانی زمانہ میں

علہ : ا، صفہ ۴

مستقل توطن کے خیال سے کسی جگہ قیام نہیں کیا تھا اور وہ زمانہ سخت فتنہ و آشوب کا تھا، ترمذ اور روم کے مابین تمام ممالک تہ و بالا ہو رہے تھے اس لئے کچھ بعید نہیں کہ سیدؒ کو شیخؒ کے جائے اقامت کی خبر نہ رہی ہو۔

سپہ سالارؒ کا بیان ہے کہ جب سلطان العلماؒ نے رحلت فرمائی ہے، سید برہان الدینؒ وہاں موجود نہ تھے، خبر وفات پا کر رنج و الم میں شمع کی طرح گھلتے رہے، ایک برس اسی حال میں گذر گیا کہ ناگاہ ایک شب حضرت سلطان العلماؒ کو خواب میں دیکھا کہ نہایت سختی سے فرما رہے ہیں کہ "برہان الدین" تم نے میرے محمد کو کیوں تنہا چھوڑ دیا ہے اور کیوں ان کی محافظت میں تقصیر کرتے ہو" جب بیدار ہوے تو قونیہ کو روانہ ہوے اور مولانا کے پاس آکر رہے۔ [1]

رباب نامہ اور فیہ ما فیہ کی روایت کے خلاف اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ روانگی ترمذ سے قبل ہی سید برہان الدینؒ کو حضرت سلطانؒ العلماء کی خبر وفات مل چکی تھی، اور آپ مولانا کی رفاقت ہی کے خیال سے وارد قونیہ ہوے تھے۔

افلاکیؒ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اور لکھا ہے کہ حضرت بہاء الدین کے انتقال کے بعد ہی سیدؒ کو کشف سے معلوم ہو گیا تھا کہ شیخؒ نے رحلت فرمائی، آپ نے بہت فریاد کی، غائبانہ نماز جنازہ ادا کی، چالیس روز تک رنج و غم میں رہے، عرس چہلم کے بعد فرمایا کہ میرے شیخ کے فرزند جلال الدین تنہا ہیں اور میرے انتظار میں ہیں، مجھ پر فرض ہے کہ روم کی طرف روانہ ہو جاؤں اور جو امانت ان کے والد نے میرے

---

[1] سپہ سالار صفحہ ۱۱

سپرد کی ہے وہ ان کے حوالہ کردوں، بعد قطعِ منازل جب قونیہ پہنچے تو شیخ کے انتقال کو ایک برس گزر چکا تھا۔

ان تینوں روایتوں میں مابہ الاختلاف یہ ہے کہ سید برہان الدینؒ ترمذ سے اس علم کے ساتھ روانہ ہوئے یا نہیں کہ حضرت سلطان العلماءؒ کا انتقال ہو چکا ہے، اس سے اصل مقصود پر چنداں اثر نہیں پڑتا، مابہ الاشتراک ان تینوں روایتوں کا یہ ہے کہ سید برہان الدینؒ حضرت سلطان العلماء کے انتقال کے ایک برس بعد یعنی ۲۹ سنہ کے اواخر میں قونیہ پہنچے اور مولانا آپ کی صحبت سے فیضیاب ہوئے[1]،

---

[1] مناقب صفحہ ۳۶ (یہاں ایک مشہور عام غلطی کی طرف اشارہ کر دینا نہایت ضروری ہے۔ ہندوستان میں مثنوی کا نسخہ اولاً بمبئی میں طبع ہوا اس کے آخر میں وقار کی ایک مختصر نظم (جو ایران کے مطبوعہ نسخہ سے لی گئی ہے) مولاناؒ کے حالات میں درج ہوئی وہیں سے یہ نظم تمام نسخوں میں نقل ہوتی رہی اور اب تو مثنوی کے ہر نسخہ کا جزو ہو گئی ہے، اس میں سید برہان الدینؒ کے نسبت یہ تحریر ہے۔

سید ترمذ کہ برہان داشت نام	بود بر عہد والشاں را امام
کرد شان پدرود اندر نیمہ راہ	داد جاں بر شوق دیدار الٰہ
لیک چوں میکرد آہنگِ رحیل	شد بلکِ روم ایشاں را دلیل
کاندراں ملک از فرود آرید رخت	فیہا یابید از اقبال و بخت
پس بہاء الدین ز روئے اعتماد	عزم قونیہ کرد و رخت آنجا کشید

اس میں سید برہانؒ کا سفر میں سلطان العلماءؒ کے ہمراہ ہونا، آپ کا "امام" یعنی پیر ہونا، راستہ میں رحلت کرنا، سب خلاف واقعہ ہے۔

سیدؒ جب قونیہ میں وارد ہوئے ہیں اس وقت مولانا وہاں تشریف نہیں رکھتے تھے بلکہ شہر لارندہ کو چلے گئے تھے، سیدؒ چند ماہ مسجد سنجاری میں معتکف رہے اور مولانا کے پاس خط بھیجا کہ قونیہ میں آجایئے، لارندہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ خط پاکر مولانا رحؒ بعجلت تمام قونیہ میں تشریف لائے، سیدؒ سے ملے اور آپ کو اپنے مدرسہ میں ٹھہرایا۔

مولانا کے آجانے کے بعد سیدؒ نے آپ سے کہا کہ آپ کے والدؒ صاحبِ قال ہونے کے ساتھ صاحب حال بھی تھے، قال میں تو آپ اپنے والد سے بھی بڑھ گئے ہیں، اب حال کی طرف بھی توجہ کیجے کہ آپ اپنے والد کے پورے وارث و جانشیں ہوجائیں۔ ؎

قال او را گرفتہ بد دو دست ہچو من شو ز حال او دست،
تا تمامت تو وارثش باشی نور اندر جہاں چو خور باشی،
وارثِ والدی تو اندر پوست مغز من بردہ ام نگر در دوست

(بقیہ حاشیہ ص۹۹) تذکرے کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ یہ کل حالات "آتشکدہ آذر" سے ماخوذ ہیں صرف نثر کو نظم کر لیا ہے آتشکدہ کی عبارت یہ ہے "مرشد ایشاں سید برہان الدین محقق ترمذی کہ دراں سفر ہمراہ بود در شام پدر وداع حیات کرد، و بایشاں گفتہ کہ در ولایت روم بہت شما فتوحات خواہد شد بنا بر علیہ مولانا بہاء الدینؒ با عیال روانہ روم شدہ ولایت قونیہ را انتخاب کردہ آنجا بساط افادہ و ارشاد گسترانیدہ" صفحہ ۳۲۲ (مطبوعہ فتح الکریم بمبئی ۱۲۹۹ھ)

سرگور اوسلی نے بھی بعینہٖ یہی لکھا ہے۔ غالباً ان کا ماخذ بھی یہی تذکرہ رہا ہوگا مگر قونیہ کے بجائے قسطنطنیہ اور روم کے بجائے یونان (   ) لکھا ہے (صفحہ ۱۱۳) پھر دوسرے صفحہ (صفحہ ۱۱۴) پر تحریر کیا ہے

سیدؒ نے جب اس طرح مولاناؒ کو فقر و سلوک کی جانب توجہ دلائی تو آپ سید کے مرید اور جان و دل سے آپ کی تعمیلِ احکام میں منہمک ہو گئے۔

مولاناؒ کس وقت سید کے مرید ہوئے اس میں قدرے اختلاف ہے اور افلاکیؒ نے اس کی صراحت کردی ہے کہ سیدؒ کے ورود قونیہ کے بعد آپ ان کے مرید ہوئے اور بعضوں کا خیال ہے کہ بلخ ہی میں آپ کے والدؒ نے آپ کو سیدؒ کا مرید کردیا تھا۔

یہ مسلم ہے کہ بلخ سے روانگی کے وقت مولانا کی عمر کم و بیش چھ برس کی تھی، اور سیدؒ آپ کے ترک بلخ کے قبل ہی وہاں سے جا چکے تھے، پس ہو سکتا ہے کہ ایام طفلی میں مولاناؒ کے والد نے رسمی طور پر آپ کو سیدؒ کا مرید کردیا ہو اور سیدؒ کے قونیہ تشریف لانے کے بعد آپ دوبارہ مرید ہوئے ہوں، بہرحال اصل ارادت یہی ہے کہ طریق سلوک میں سیدؒ کے ارشاد پر عمل پیرا ہوئے۔

سیدؒ کے ورود قونیہ کی غرض و غایت کے نسبت سپہ سالارؒ اور افلاکیؒ نے صرف اسقدر لکھا ہے کہ قونیہ میں سیدؒ کا ورود صرف اس غرض سے ہوا تھا کہ آپ کو اپنے مرشد و شیخؒ سے جو کچھ ملا تھا اسے مولاناؒ تک پہنچادیں مگر سلطان ولدؒ نے کچھ اور ہی بات لکھی ہے، آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ سیدؒ کو جب قونیہ پہنچ کر یہ معلوم ہوا کہ شیخ کا انتقال ہو چکا ہے تو فرمایا کہ "شیخ خود میرے اندر موجود ہیں، شیخ بمنزلہ جان کے ہے اور جان جسم سے جدا نہیں ہو سکتی، یعنی خود عین شیخؒ ہوں" اس کے بعد آپ نے

(بقیہ حاشیہ ص۹۹

؟ کہ بہاء الدین قونیہ میں مقیم ہو گئے' اور اسی صفحہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ چند برس یونان (   ) میں رہے۔ درحقیقت روم کے مفہوم میں سرگوراوسلی کو مغالطہ ہو گیا ہے۔]

خود دعوت و ارشاد کا سلسلہ جاری کر دیا اور لوگ جوق در جوق آپ کے مرید ہونے لگے ؎

گفت سیدؒ کہ شیخ اندر ماست | شیخ جانست و جاں زِتن نہ جداست
عین شخم ز من نماند اثر | ہیچ دیدی شکر جدا از شکر

....

کرد آغاز و گفت جلوہ کناں | کہ منم شیخؒ بے گمان و خطا
خلق را بس بخویش دعوت کرد | گشت از جاں غلام او زن و مرد
شہر جملہ مرید او گشتند! | در درون تخم مہر او کشتند
ہمہ گفتند توئی بہار ولدؒ | بلکہ ہم ستر سرِ نورِ احد
در گماں شاں نبود ہیچ خطا | صد چناں بود آں شہ والا

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اگرچہ مولاناؒ اپنے والدؒ کے بجائے سجادہ نشین ہو گئے تھے مگر اپنے قیام قونیہ کے زمانہ میں سید برہان الدینؒ بھی خلافت کی خدمت انجام دیتے رہے، چنانچہ مولاناؒ کے علاوہ شیخؒ صلاح الدین زرکوب اور بعض دوسرے عالی مرتبت اصحاب بھی اسی دوران میں سیدؒ کے مرید ہوئے اور اس غیر متوقع صورت حال سے نفع اٹھا کر مولانا اپنا بیشتر وقت تکمیل علوم ظاہر و باطن میں صرف فرماتے رہے، اور اکثر اس دوران میں قونیہ سے باہر بھی رہے۔

خاص قونیہ میں سیدؒ کا قیام کتنی مدت رہا اس کے متعلق کوئی صریح و قطعی روایت کہیں نہیں ملتی مگر اس قدر متفق علیہ ہے کہ نو برس مولاناؒ سے آپ کی صحبت رہی ؎

بود در خدمتش بہم نہ سال | تا کہ شد او بقال و بحال (سلطان ولدؒ)

مدت نہ سال تمام صحبت می فرمودند۔ (سپہ سالار صفحہ ۲۱)

نہ سال تمام خدمت سیدؒ را بندگیہا نمود (افلاکیؒ صفحہ ۳۹)

سیدؒ ۶۲۹ھ میں قونیہ میں وارد ہوئے ہیں اور ۶۳۷ھ میں انتقال فرمایا ہے،
پس اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ اس نو برس سے مراد سیدؒ کے انتقال تک کا زمانہ ہے نہ یہ کہ سیدؒ نے نو برس قونیہ میں قیام کرکے مولاناؒ کو سلوک کی تعلیم دی، سلطان ولدؒ نے اس موقع پر اپنے بیان منظوم کے اوپر جو نثر عبارت تحریر فرمائی ہے اس میں لکھتے ہیں کہ

.... مدت نہ سال در صحبت او بودن
وبعد ازاں نقل کردن سید برہان الدینؒ..........
نظم میں اسے یوں ادا فرمایا ہے۔

بود در خدمتش بہم نہ سال	تا کہ شد مثل او بقال و بحال
ہم سر و سر شدند در معنی	زانکہ یک دل بدند در معنی
ناگہاں سیدؒ از جہانِ فنا	کرد رحلت سوئے سرائے بقا

....

"اور فیہ مافیہ" میں یہ شعر بالکل صاف ہوگیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ "مدت نہ سال در خدمت او بود تا سید برہان الدینؒ وفات یافت، [1]
سیدؒ اپنے انتقال سے کچھ دنوں پہلے قیصریہ میں اقامت پذیر ہوگئے تھے اور

---

[1] فیہ مافیہ صفحہ ۵

وہیں انتقال فرمایا، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ کا مسلسل قیام قونیہ میں نہیں تھا خود مولاناؒ کے حالات سے بھی آگے چل کر واضح ہوگا کہ آپ بھی اس دوران میں قونیہ میں بہت کم رہے، اس سے یہ مسئلہ بھی صاف ہو جاتا ہے کہ مولاناؒ ایک ہی وقت میں کیونکر ایک طرف سید سے استفادہ باطنی کرتے رہے اور دوسری طرف حلب و دمشق وغیرہ میں تحصیل کمالات ظاہری میں بھی مشغول رہے[1]

حضرت سلطان ولدؒ نے قونیہ سے سیدؒ کی روانگی کا کچھ حال درج نہیں فرمایا ہے مگر سپہ سالارؒ اور ان سے زیادہ افلاکیؒ نے ان حالات کو لکھا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ "جب سیدؒ نے یہ دیکھا کہ مولاناؒ دائرہ ولایت میں درجۂ کمال کو پہنچ گئے ہیں اور تمام لوگوں کو آپ سے غایت درجہ کا فیض پہنچ رہا ہے تو آپ نے مولاناؒ سے یہ اجازت چاہی کہ آپ قیصریہ کو چلے جائیں، کیونکہ شہر قیصریہ آپ کو بنہایت مرغوب تھا[2]، مولاناؒ راضی نہ ہوئے، آخر ایک دن بلا اطلاع بالا بالا روانہ ہو گئے، اتفاقاً سواری سے گر پڑے اور پاؤں میں

---

[1] ڈاکٹر نکلسن نے لکھا ہے کہ "افلاکیؒ کا بیان ہے کہ مولانا اس سے قبل حلب و دمشق میں بغرض تحصیل علم گئے تھے اور قونیہ میں واپس آکر سید برہان الدین کے زیر اثر تصوف کے مطالعہ میں منہمک رہے" (دیوان شمس تبریز صفحہ ۱۱ حاشیہ ۲ دیباچہ) یہی مفہوم انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا بھی ہے۔ مگر افلاکیؒ کے کلام سے تو مستنبط نہیں ہوتا کہ مولاناؒ سیدؒ سے ملنے کے قبل ہی حلب و دمشق سے ہو آئے تھے بلکہ صحیح یہ ہے کہ سیدؒ کے ورود قونیہ کے بعد مولاناؒ حلب و دمشق کو گئے۔

ڈاکٹر نکلسن کی رائے کے بالکل برعکس ریڈہاؤس نے اس واقعہ کو ایسی عبارت میں لکھا ہے جس سے بادی النظر میں یہ مترشح ہوتا ہے کہ مولاناؒ نے اپنے والدؒ کے انتقال کے بعد نو برس سیدؒ سے تعلیم حاصل کی، اس کے بعد حلب و دمشق کو گئے (دیباچہ صفحہ ۱)

[2] قیصریہ اس زمانہ میں بہت ہی مرفہ الحال شہر تھا اور مملکت روم کے اندر پایہ تخت قونیہ کے بعد اسی کا درجہ تھا۔ باجو خاں نے ۱۲۴۲ ۶۴۱ھ میں اسے تباہ کر دیا۔

چوٹ آگئی، مجبوراً واپس آئے۔ امام الدین سپہ سالارؒ کے باغ میں ٹھہرے، مولاناؒ اور اصحاب آپ کی یہ حالت دیکھ کر رنجیدہ ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ "زہے مرید کہ پائے شیخ را بشکند" آخرالامر مولاناؒ نے اجازت دیدی اور قیصریہ کو چلے گئے[1]۔

قیصریہ کس سنہ میں گئے اس کا صحیح تعین نہیں ہوتا مگر ۶۳۲ھ میں آپ کا قیصریہ میں ہونا معلوم ہوتا ہے[2]، اس کے سوا مناقب العارفین ہی کی روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولاناؒ جب اول بار بغرض تحصیل قونیہ سے حلب کو روانہ ہوئے ہیں تو سیدؒ بھی آپ کے ہمراہ تھے (اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا یہ روانگی اغلباً ۶۳۰ھ میں ہوئی ہے) سیدؒ قیصریہ میں صاحب اصفہانی کے پاس ٹھہر گئے اور جب مولاناؒ واپس آئے ہیں تو آپ کے ساتھ پھر قونیہ آئے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مولاناؒ کی غیبت قونیہ کے زمانہ میں سیدؒ کی آمد و رفت قیصریہ و قونیہ میں رہا کرتی تھی اور آخری بار مولاناؒ سے اس وقت رخصت ہوئے ہیں جب مولاناؒ مستقلاً قونیہ میں اقامت پذیر ہو چکے تھے (اور یہ ۶۳۴ھ یا ۶۳۵ھ میں ہوا)

مولانا جب دمشق سے واپس آتے ہوئے قیصریہ میں ٹھہرے تو شمس الدینؒ اصفہانی نے چاہا کہ مولاناؒ ان کے وہاں قیام فرمادیں مگر سیدؒ نے فرمایا کہ مولانائے بزرگ کا طریقہ یہ رہا ہے کہ ہمیشہ مدرسہ میں قیام فرمایا کرتے تھے، غرض مولاناؒ مدرسہ ہی میں ٹھہرے

---

[1] سپہ سالار صفحہ ۶۲

[2] مناقب صفحہ ۴۲

[3] مناقب صفحہ ۵۶

جب لوگوں کی کثرت آمد سے مولاناؒ پریشان ہوئے تو آپ نے تنہائی اختیار کی، اس وقت سیدؒ نے فرمایا کہ آپ ایک مرتبہ میرے سامنے خلوت اختیار کریں، سیدؒ نے سات دن کے روزے کے لئے کہا، مولانا نے فرمایا کہ کم ہے چالیس دن ہونا چاہیئے، اور آپ نے ایک چلّہ کے بجائے تین چلّے اسی طرح گزار دیئے۔ آخر جب تیسرے چلّہ کے بعد باہر نکلے تو سیدؒ نے فرمایا کہ "بسم اللہ اب روانہ ہوئیے اور دنیا کو اپنے پرتوِ فیض سے منور کیجے" اس کے بعد ہی مولاناؒ نے قونیہ میں آکر درس و تدریس کا مستقل سلسلہ جاری کیا، سیدؒ نے اس کے تھوڑے ہی زمانہ بعد انتقال فرمایا۔[1]

فصل اول کے مختصر اشارات اور مذکورۂ بالا روایات سے سید برہان الدینؒ کے پایہ بلند اور مولاناؒ سے آپ کے تعلقات کا حال واضح ہو چکا ہے، مناسب ہے کہ اس موقع پر سید برہان الدینؒ کے کچھ مختصر کوائف جو مذکورۂ بالا روایات میں نہیں آسکے ہیں درج کر دیئے جائیں جن سے سیدؒ کے سوانح حیات کا ایک سرسری خاکہ ذہن میں آجائے۔

سید برہان الدین ترمذ کے رہنے والے اور بڑے پایہ کے عالم تھے، اوایل حال میں اپنے وطن سے بلخ میں آئے اور وہاں مفتیانِ بلخ کا واقعہ خواب حضرت سلطان العلماء کے ہاتھ پہ مرید ہونے کا باعث ہوا، مرید ہونے کے بعد آپ پر شیخؒ کی خاص نظر عنایت رہتی تھی، خراسان، ترمذ، اور بخارا وغیرہ میں آپ سیدؒ "سرِدان"[2] کے لقب اور "محقق" کے خطاب سے مشہور ہوئے، جب حضرت سلطان العلماء نے بلخ سے ہجرت

---

[1] مناقب صفحہ ۵۶-۵۷ [2] اکثر تذکروں میں سید شیردانی ملتا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔

فرمائی ہے، اس وقت آپ وہاں موجود نہ تھے بلکہ حضرت سلطان العلماءؒ کے انتقال کے بعد آپ کا قونیہ آنا اور پھر قیصریہ میں جاکر قیام کرنا تفصیلاً بیان ہو چکا ہے کچھ دنوں بعد مولاناؒ کی اجازت سے قیصریہ میں جاکر قیام کرنا پڑا۔ اس وقت قیصریہ میں شمس الدین اصفہانی[۱] حاکم شہر تھے، انھوں نے آپ کی بہت خاطر ومدارات کی اور بالآخر مرید ہو گئے۔

جب آپ کی مدت عمر آخر ہوئی اور انتقال کا وقت قریب آیا تو آپ نے خادم سے گرم پانی طلب کیا اور اسے حکم دیا کہ باہر نکل کر دروازے بند کر دے اور لوگوں کو خبر کر دے کہ سیدؒ اس عالم سے گذر گئے، خادم کہتا ہے کہ میں دروازے کے کنارے کھڑا رہا کہ دیکھوں کیا کرتے ہیں، آپ نے وضو کیا، کپڑے پہنے اور پھر لیٹ گئے اور فرمایا کہ خدایا تو حاضر و ناظر ہے کہ ایک امانت تو نے میرے سپرد کی تھی لطف فرما کر آ اور اس امانت کو لے لے، یہ کہہ کر جان بحق ہو گئے، یہ واقعہ ۶۳۷ھ میں پیش آیا۔ انتقال کے وقت یہ اشعار آپ کی زبان پر تھے۔

۱؎ شمس الدین اصفہانی امرائے سلاجقہ میں سے تھے، غالباً اس زمانہ میں قیصریہ کے صوبائی (والی) رہے ہونگے، کیخسرو دوم (غیاث الدین) کے زمانہ میں نائب وزیر تھے، اور باجو خان کے حملہ کے بعد سلاجقہ کے مفید مطلب جو صلح ہوئی وہ زیادہ تر انھیں کی قابلیت وکاردانی کی وجہ سے وقوع میں آئی، بعد میں وزیر ہو گئے تھے۔ کیخسرو دوم کے انتقال کے بعد انھوں نے اس کے بڑے بیٹے عزالدین کیکاؤس کو بادشاہ بنایا، اسکی ماں سے عقد بھی کر لیا، اور اپنے کو مستحکم کرنے کیلئے متعدد امرائے روم کو قتل کرا دیا، مگر ملک پر مغلوں کی سیادت قائم ہو چکی تھی۔ عزالدین کا دوسرا بھائی رکن الدین خان مغول کے دربار میں پہنچا اور وہاں سے اپنے حسب خواہ فرمان لے آیا، اور اس کے ساتھ یہ حکم بھی لایا کہ شمس الدین کو امرائے مقتول کے اعزا کے حوالہ کر دیا جائے، سلطنت کی جنگ تو تینوں بھائیوں بہت دنوں تک جاری رہی

اے دوست قبولم کن و جانم بستاں — مستم کن و از ہر دو جہانم بستاں
با ہر چہ دلم قرار گیرد بے تو — آتش بمن اندر زن و آنم بستاں

شمس الدین نے آپ کے عرس میں بہت کچھ خرچ کیا اور آپ کی تربت پر عمارت بنوائی مگر وہ عمارت چند روز میں خراب ہو گئی اور شمس الدین نے خواب میں دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں کہ میری تربت پر کوئی عمارت نہ بناؤ، چلم کے بعد مولانا کو خبر پہونچائی آپ مع اصحاب زیارت قبر کے لئے تشریف لائے۔

شیخ شہاب الدین سہروردی جب روم میں تشریف لائے ہیں تو آپ سے بھی ملاقات فرمائی تھی، ملاقات کے بعد لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ

"دریا ئیست در معارف و حقائق پنہاں رو"

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اور کوئی طاعت و عبادت نہ ہو سکے تو روزے کو ہرگز ترک نہ کرو، روزے کی فضیلت پر آپ بہت زیادہ زور دیا کرتے تھے، یہ بھی آپ کا قول ہے کہ "آدمی کو اگر تین حالتوں سے باہر دیکھو تو سمجھو کہ فضولی ہے، کھانا اس قدر کھائے جس قدر ضروری ہو، لباس اس قدر ہو کہ گرمی سردی سے محفوظ رہے اور بزرگی اتنی ہی کافی ہے کہ لوگ اسے مسخرہ نہ بنالیں۔"

حضرت سلطان ولد نے رباب نامہ (ورق ۱۰۴ ب) میں آپ کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے معرفت کے متعلق آپ کے خیال یا مسلک کا اظہار ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۶)
گر شمس الدین کے دشمنوں نے اس حکم کی پناہ لیکر انھیں ۶۲۶ھ / ۱۲۲۹ء میں قتل کر ڈالا۔ [1] سپہ سالار صفحہ ۶۲

"سید برہان الدین محقق را پرسید ند کہ راہ را پایان ہست یا نہ فرمود کہ راہ را پایان ہست اما منزل را پایان نیست زیرا سیر دوست یکے تا بخدا و یکے در خدا آنکہ تا خدا ست پایان دارد زیرا گذر از ہستیست و از دنیا و از خود و ایں ہمہ را آخر ہست و پایان اما چوں بحق رسیدی بعد ازاں سیر در علم و معرفت خداست و ایں را پایان نیست"

حضرت بہاء الدین ولدؒ نے جب انتقال فرمایا ہے اس وقت مولاناؒ کی عمر چوبیس برس کی ہو چکی تھی، آپ علوم ظاہر و باطن میں اپنے والدؒ کے زیر سایہ کمال حاصل کر چکے تھے، مگر طلب علم کا شوق دامنگیر تھا، اس لئے کچھ مدت تک بالاستقلال قونیہ میں قیام نہیں رہا بلکہ تحصیل علم کے لئے، آپ برابر حلب، دمشق وغیرہ کا سفر کرتے رہے۔ حضرت بہاء الدین ولدؒ کے انتقال کے بعد مولاناؒ کا پہلا سفر لارندہ کی جانب ہوا، وہاں غالباً ایک برس تک قیام رہا، جب سید برہان الدین ۶۲۹ھ میں قونیہ میں وارد ہوئے تو آپ کی طلب پر مولاناؒ واپس تشریف لائے۔ چونکہ قونیہ میں سید برہان الدین نے سلسلۂ دعوت وارشاد جاری کر دیا تھا اور حضرت بہاء الدینؒ ولد کی خلافت کی خدمت بخوبی انجام دے رہے تھے، اس لئے مولاناؒ کو قونیہ سے باہر جانے کا موقع حاصل ہو گیا اور آپ نے دوسرے ہی سال شام کا ارادہ کر دیا اور اول حلبؑ میں وارد ہوئے، یہاں "سلطان صلاح الدین کے بیٹے الملک الظاہر نے قاضی ابوالمحاسنؒ کی تحریک سے ۵۹۱ھ

---

۱ حلب ۵۷۹ھ سے ۶۵۸ھ تک خاندان ایوبیہ یعنی اخلاف سلطان صلاح الدین کے ہاتھ میں رہا، مولاناؒ ۶۲۹ھ کے بعد حلب گئے تھے۔

میں متعدد بڑے بڑے مدرسے قائم کیے تھے، چنانچہ اس زمانہ سے حلب بھی دمشق کی طرح مدینۃ العلوم بن گیا تھا[ع۱]"

حلب میں مولاناؒ مدرسہ حلاویہ میں اقامت گستر ہوئے، یہاں آپ نے کمال الدین ابن عدیم سے استفادہ[ع۲] علوم کیا، لیکن رسالہ سپہ سالارؒ سے معلوم ہوتا ہے مولاناؒ نے صرف اسی ایک مدرسہ پر قناعت نہیں کی بلکہ مختلف مدارس میں تحصیل علم کی، البتہ ابن عدیم سے خصوصیت کے ساتھ استفادہ کیا، سپہ سالارؒ کے الفاظ یہ ہیں

"درعنفوان جوانی بمجروسہ حلب درچند مدرسہ بافادت واستفادت ازبندگی مولانا کمال الدین بن عدیم کہ در اصناف علوم وشہرت در عالم نظیر نداشت مشغول بود[ع۳]"

بقیہ حاشیہ صفحہ

مانہ الظاہر کے فرزند الملک العزیز غیاث الدین محمدؒ (۶۱۳ھ تا ۶۳۴ھ) کا تھا، غیاث الدین کے بعد اس کا خوردسال فرزند الملک الناصر یوسف دوم اپنی دادی کی تولیت میں فرمانروا ہوا، ۶۴۰ھ میں دادی کے انتقال کے بعد عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی، اور مملکت کو بہت وسعت دی، کل شام پر قابض ہو گیا مگر ۶۵۸ھ میں ہلاکو خان نے شہر کو تباہ کر دیا، اس کے بعد مولانا کے انتقال تک کبھی تاتاری، کبھی مصری حلب پر حکمراں ہوتے رہے۔

ع۱ ابوالمحاسن کا نام بہاءالدین ابن شداد تھا، بہاءالدین اور اتابک طغرل الظاہر کے دست و بازو تھے اور حلب کی ترقی میں الظاہر کے ساتھ ہی ساتھ ان دونوں کا بھی دخل تھا، بہاءالدین ۵۹۱ھ میں حلب میں آئے تھے اور ملک ظاہر اور ملک عزیز کے زمانہ میں بہت بااثر رہے، ۶۳۲ھ میں انتقال کیا، مدارس کی تعمیر غالباً ۵۹۱ھ کے بعد ہوئی ہے۔

ع۲ سوانح مولانا روم صفحہ

ع۳ کمال الدین ۵۸۸ھ میں حلب میں متولد ہوئے، دمشق، عراق، حجاز میں تحصیل علم کی، الملک العزیز اور ملک الناصر کے وقت میں حلب میں عہدۂ قضا اور اس کے بعد وزارت پر سرفراز ہوئے، ۶۵۸ھ میں جب تاتاریوں نے حلب

کمال الدین کے نسبت مناقب العارفین میں لکھا ہے کہ "ملک الامرا حلب کمال الدین ابن عدیم کہ ملک ملک حلب بود. فاضل و علامہ، کاردان و صاحب دل و روشن دروں..... [1] اور "سوانح مولانا روم" میں لکھا ہے کہ "اس مدرسہ (یعنی مدرسہ حلاویہ) کے مدرس مولانا کمال الدین ابن عدیم حلبی تھے..................[2]

ابن عدیم حلب کے بعض مدرسوں میں مدرس ضرور رہے ہیں مگر ملک العزیز ہی کے زمانہ میں آپ قاضی ہو گئے تھے اور پھر وزارت پر سرفراز ہوئے۔ آپ کی نسبت مناقب العارفین کے بعض فقرات "ملک الامرا" بتدریس مشغول می شد" "بعضے از نواحی او و طلبۂ علم" "بواب مدرسہ تا نواب ملک" سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ مولانا جب حلب میں تشریف لائے ہیں اس وقت ابن عدیم خدمت وزارت پر فائز تھے. اور یہ خدمت ایک عالم کے لئے مانع شغل تدریس نہیں ہے۔

مولانا اگرچہ تحصیل علم میں مشغول تھے مگر آپ کے کمال کا یہ حال تھا کہ بقول سپہ سالار "جو مشکل مسائل کسی سے حل نہ ہوتے تھے وہ آپ ہی حل کرتے تھے اور ایسے وجوہ بیان فرماتے تھے جو کسی کتاب میں درج نہ ہوتے تھے"[3]

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۹

کو تباہ کیا، الملک الناصر کے ساتھ دمشق چلے گئے، ہلاکو خاں نے انہیں شام کا قاضی القضاۃ مقرر کر کے بلایا مگر یہاں پہنچنے سے قبل ہی ۶۶۱ھ ۱۲۶۲ء میں بمقام قاہرہ انتقال کر گئے۔ [3] سپہ سالار صفحہ ۱۶

[1] مناقب صفحہ ۵۲۔

[2] سوانح مولانا روم صفحہ ۶

[3] سپہ سالار صفحہ ۱۲

حلب سے مولانا کی روانگی کے متعلق افلاکیؒ نے ایک طولانی روایت دی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ابن عدیم بدیں وجہ کہ مولاناؒ سلطان العلماء کے فرزند تھے، ہر طرح آپ کی خاطرداری کرتے تھے اور آپ کی فطانت وذکاوت کے باعث درس میں بھی آپ کو سب سے مقدم رکھتے تھے، اس سے ابن عدیم کے بعض خواص وطلبہ کو رشک ہوا، مدرسہ کے دربان نے کمال الدین سے شکایت کی کہ مولانا آدھی رات کو مدرسہ سے باہر چلے جاتے ہیں اور دروازہ بند کا بند رہتا ہے۔ کمال الدین کو اس سے تردد ہوا، ایک روز خود بھی چھپ کر مولانا کے ساتھ ہو گئے، شہر سے باہر پہنچ کر مسجد خلیل الرحمٰن کے قریب ایک سفید قبہ نظر پڑا اور وہاں سے غیبان سبز پوش نے نکل کر مولاناؒ کا استقبال کیا، کمال الدین اس ہیبت سے بے ہوش ہو گئے، جب اٹھے تو نہ قبہ تھا اور نہ کوئی نشان، سرگرداں پھرتے رہے، شہر میں ہلچل پڑ گئی، آخر مولاناؒ ہی کی نشاندہی سے لوگوں نے آپ کو پایا، اب کمال الدین کا اخلاص اور بڑھ گیا اور وہ مولاناؒ کے مرید ہو گئے۔[۱] [سپہ سالارؒ نے[۲] اس روایت کو قدرے تغیر کے بیان کیا ہے مگر اس موقع پر کمال الدین کے بجائے اکمل الدین کا نام لیا ہے لیکن اسے محض لغزش قلم سمجھنا چاہیے۔]

مولاناؒ نے جب دیکھا کہ شہرت بڑھتی جا رہی ہے تو اس اشتہار سے بچنے کے خیال سے آپ دمشق کو روانہ ہو گئے۔

---

[۱] مناقب صفحہ ۵۲، ۵۳

[۲] سپہ سالار صفحہ ۳۹

مولاناؒ کی روانگی کے چند ماہ بعد سلطان روم کی طرف سے ملک الادباء بدرالدین یحییٰ کمال الدین کے پاس اس غرض سے آئے کہ مولاناؒ کو واپس لے جائیں، مگر مولاناؒ دمشق کو جا چکے تھے، کمال الدین نے واقعہ مذکورہ بدرالدین سے بیان کیا اور بدرالدین نے واپس جاکر سلطان سے عرض کیا، اس سے سلطان اور اہل قونیہ کی عقیدت اور بڑھ گئی۔[۱]

مولاناؒ کس سنہ میں حلب سے روانہ دمشق ہوئے؟ اس کی کوئی قطعی تاریخ کہیں مذکور نہیں ہے مگر مناقب العارفین میں دو روایتیں ایسی موجود ہیں جن سے تاریخ کا تعین ہو سکتا ہے مگر وہ تاریخی حالات کے خلاف پڑتی ہے وہ دونوں روایتیں حسب ذیل ہیں۔

اکمل الدین کی روایت ہے کہ میں مولانا کے ساتھ حلب میں تھا ایک روز میں بازار گیا اور بقال سے کچھ خرید کیا، اس نے مجھے گالی دی، میں نے مولاناؒ سے شکایت کی، سخت رنجیدہ ہوئے، فرمایا کہ یہاں سے سفر کرنا چاہیے، مغلوں کا لشکر آرہا ہے اور حلب کو تباہ کرے گا۔ ہم لوگ فوراً دمشق کی طرف روانہ ہو گئے، اس کے بعد ہی مغلوں کا لشکر آیا اور حلب کو برباد کیا اور اس بقال کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

---

[۱] مناقب صفحہ ۵۳-۵۴۔ اس موقع پر صاحب مناقب العارفین نے سلطان روم کا نام عزالدین بتایا ہے۔ مگر سلاطین روم میں ایک عزیز الدین تو علاؤالدین سے قبل ہوا ہے۔ جس کا زمانہ ۶۱۶ھ کے پہلے تھا، دوسرا رکن الدین کا بھائی عزالدین تھا اور اس کا زمانہ ۶۴۳ھ سے ۶۵۵ھ تک سمجھنا چاہیے، پس ۶۳۰ھ کے قریب ان دونوں میں سے کوئی عزالدین سلطان روم نہیں تھا، ضرور ہے کہ علاؤالدین ہی رہا ہو، خود مصنف نے "گرم عزالدین" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کی نسبت فصل سوم میں مولانا کے آخری سفر دمشق سے واپس آنے کی کیفیت بھی دیکھنا چاہیے۔

اکمل الدین ہی کی دوسری روایت ہے کہ راہ شام میں مولاناؒ کی کرامت و شجاعت کا ایک دوسرا شاہدہ ہوا، ایک مقام پر ساربان نے منزل کرنا چاہی، مولاناؒ نے اجازت نہ دی، اس نے اصرار کیا، مولاناؒ نے ایک گھونسہ مارا اور اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر کندھے پر اٹھایا اور اسی طرح ایک کوس کے قریب چلے گئے اور ایک سبزہ زار میں قیام کیا، فرمایا کہ بیوقوف تجھے ہم پر رحم آیا، اپنے اونٹوں پر تو رحم آیا ہوتا کیونکہ وہ جگہ بالکل خشک تھی اور وہاں آج منزل قیام کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ان دونوں روایتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولاناؒ حلب سے اسی زمانہ کے قریب دمشق کو روانہ ہوئے ہیں جب مغلوں نے حلب پر قبضہ کیا ہے مگر واقعات سے کسی طرح اس کی مطابقت نہیں ہوسکتی۔

مولاناؒ کے قونیہ میں اقامت گستر ہونے کے بعد حلب دو مرتبہ تباہ ہوا ہے۔ اولاً ۶۳۸ھ میں خوارزمیوں نے اسے غارت کیا اور پھر ۶۵۸ھ میں مغلوں نے تاراج کیا، یہ دونوں سنین مولاناؒ کی روانگی دمشق سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ آگے چل کر معلوم ہوجائے گا کہ مختلف روایتوں کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مولاناؒ غالباً ۶۳۱ھ میں حلب سے دمشق کی طرف روانہ ہوئے ہیں، مغلوں کے حلب کو برباد کرنے کے زمانہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے مگر یہ زمانہ سخت فتنہ و آشوب کا زمانہ تھا، حلب کے قریب سے لشکروں کا عبور و مرور برابر جاری تھا[1]، ۶۲۹ھ میں الملک العزیز محمد بن الظاہر حلب کا فرمانروا ہوا ہے، اس کے دوسرے ہی سال (۶۳۰ھ میں) فاطمہ خاتون کو

---

[1] اس۔ ش کے لئے تاریخ ابوالفدا جزو ثالث صفحات ۱۵۱-۱۵۶ دیکھنا چاہیے۔

(جو الملک الظاہر سے منسوب تھی) لئے ہوئے حلب کی طرف آیا دوسرے سال ۶۳۰ھ ادھر سے واپس ہوا اور اسی ۶۳۰ھ میں الملک الظاہر حلب سے نکل کر شیراز پر حملہ آور ہوا۔ اور اس پر قبضہ کرلیا پھر دوسرے سال (۶۳۱ھ میں) الملک الکامل روم پر حملہ کرنے کے خیال سے مصر سے نکلا اور خاندان ایوبیہ کے دیگر فرمانروا بھی اس کے ساتھ شامل ہوتے گئے، جن میں حلب کی جانب سے توران شاہ شریک ہوا، ۶۳۲ھ میں ان لشکروں کی واپسی عمل میں آئی، دوسری طرف جلال الدین خوارزم شاہ کے بعد خوارزمی امرا خراسان کو اپنا مستقر بنا کر شام پر یورشیں کر رہے تھے، غرض کہ حلب کے قرب وجوار سے فوجوں کا عمل برابر جاری تھا، افلاکیؒ نے مذکورۂ بالا روایتیں ان کے وقوع سے تقریباً سو برس بعد سپرد قلم کئے ہیں، ان کا مقصود تاریخی جزئیات کی تحقیق سے نہیں تھا، مولاناؒ کی کرامات کا اظہار مد نظر تھا، "تباہی" اور "تاتاری" مرادف الفاظ ہو گئے تھے، ناقل روات نے تاتاریوں کا نام لے لیا، جامع روایات نے اسی طرح درج کر دیا، پس تاتاریوں کی قید کو حذف کر کے روایت دوم سے یہ نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے کہ مولانا جن دنوں حلب سے دمشق کو جا رہے تھے انھیں دنوں میں کوئی لشکر بھی اس راستہ سے گزر رہا تھا، اور قرائن متقاضی اس کے ہیں کہ یہ الملک الکامل یا اس کے معاونین میں سے کسی کا لشکر رہا ہوگا، جو دمشق وحلب کی جانب سے سرحد روم کی طرف بڑھ رہا یا واپس جا رہا تھا اور یہ ۶۳۱ھ (یا ۶۳۲ھ) کا واقعہ ہے۔

مولاناؒ حلب سے شام کے ایک قافلہ کے ساتھ روانہ ہوئے تھے، راستہ میں یہ قافلہ ایک کھوہ (مغارہ) کے پاس ٹھہرا، اس کھوہ میں چالیس راہب رہتے تھے! ان راہبوں نے اپنی کرامات دکھانا چاہی مگر آخر مولاناؒ کے سامنے اظہار عجز کرنا پڑا اور سب کے

سب مسلمان ہو گئے اور بحکم مولاناؒ وہیں رہ کر آیندہ روند کے خدمات بجا لاتے رہے[1] (اس کی تفصیل فصل چہارم میں منقول ہے)

مولاناؒ نے دمشق پہنچکر "مدرسہ مقدسیہ"[2] میں قیام فرمایا اور بجد تمام تحصیل علوم میں مشغول ہو گئے، مگر سپہ سالار[3] کی روایت ہے کہ آپ مدرسہ "برانیہ" میں رہتے تھے (لیکن اس مدرسہ کا کچھ حال بیہ معلوم نہیں ہوتا[4]) سپہ سالار نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس مدرسہ کا وہ حجرہ جسمیں مولاناؒ مقیم رہتے تھے اس وقت تک (یعنی سپہ سالارؒ کے زمانہ تک) خضرؑ سے منسوب ہے کیونکہ حضرت خضرؑ مولاناؒ سے ملنے کے لئے اس حجرہ میں تشریف لایا کرتے تھے، دمشق میں مولاناؒ کن کن علماء سے فیوض حاصل کئے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا ہے مگر اس قدر مسلّم ہے کہ اس زمانہ میں علمائے اسلام کا جو اجتماع دمشق میں تھا وہ کہیں اور نہیں تھا، ضرور ہے کہ مولانا نے ان میں سربرترین افراد سے استفادہ کیا ہوا اور یہ تو اغلب بلکہ یقین ہے کہ ان میں سے اکثروں کی صحبت میں رہے ہوں گے. دیگر علماء کے سوا، سپہ سالارؒ نے بالصراحت یہ لکھا ہے کہ دمشق میں

---

[1] مناقب صہ ۵۵

[2] مناقب صہ ۵۵

[3] سپہ سالار صفہ ۱۴

[4] سوانح مولانا روم صہ

شیخ محی الدینؒ عربی، شیخ سعد الدین حموی، شیخ عثمانؒ رومی، شیخ اوحد الدینؒ کرمانی، شیخ صدر الدین قونوی سے مولاناؒ کی صحبت رہا کرتی اور باہمدگر حقائق و معارف بیان ہوتے تھے ؏

حضرت شمس الدین تبریزی سے مولانا کی ملاقات کے مفصل واقعات آگے آئینگے، یہاں دمشق کے تعلق سے ایک روایت کا ذکر بے محل نہ ہوگا، وہ یہ کہ مولاناؒ ایک روز میدان دمشق میں سیر کر رہے تھے کہ ایک عجیب الہیئت شخص کو دیکھا کہ سیاہ نمد پہنے ہوے گھوم رہا ہے، جب مولاناؒ کے قریب پہنچا تو دست مبارک کو بوسہ دیکر کہا کہ "صراف عالم مرا دریاب" مولاناؒ جب تک ادھر متوجہ ہوں وہ لوگوں کے ہجوم میں غائب ہوگیا، کہتے ہیں کہ یہ شمس الدینؒ تبریزی تھے اور یہیں پہلی مرتبہ مولاناؒ نے آپ کو دیکھا تھا ؏۔

؏ سپہ سالار

(ان بزرگوں میں سے شیخ عثمان رومی کا حال معلوم نہو سکا، بقیہ اصحاب کے حالات کے لیے، فصل پنجم (عنوان مشائخ) دیکھنا چاہیے۔

؏ مناقب ص۵۹، لیکن مناقب ہی میں (ص۳۷۲ پر) بذیل حالات حضرت شمس الدین یہ درج ہے کہ روزے درمیان مردم در شہر دمشق حضرت مولاناؒ دست مبارک حضرت شمس الدینؒ را گرفت فرمود کہ صراف عالم مرا دریاب، تا از عالم استغراق مولاناؒ شمس الدین رحمۃ اللہ بخود آید مولاناؒ رفتہ بود۔"

قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مولانا نے دمشق میں کتنی مدت قیام فرمایا گر افلاکیؒ نے یہ لکھا ہے کہ "گویند کہ قریب ہفت سال مقیم دمشق بود و گویند چہار سال بود"[1] یہ معلوم ہے کہ مولاناؒ سید برہان الدینؒ سے قیصریہ میں ملتے ہوئے قونیہ آئے تھے اور سیدؒ بھی مولاناؒ کے ہمراہ یا آپ کے کچھ زمانہ بعد قونیہ آ گئے تھے اور پھر کچھ مدت بعد قونیہ سے آخری مرتبہ رخصت ہوئے ہیں، ۶۳۶ھ میں قیصریہ میں تھے اور جب ۶۳۸ھ میں سیدؒ کا انتقال ہوا ہے اس وقت مولاناؒ قونیہ ہی سے آپ کی زیارت قبر کے لئے روانہ ہوئے ہیں۔ ان تمام واقعات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ دمشق میں مولاناؒ کا قیام چار ہی برس رہا ہے، اور آپ ۶۳۶ھ یا ۶۳۵ھ تک قونیہ واپس آ گئے تھے۔

بہر حال تحصیل علم کی غرض سے دمشق میں مولاناؒ کا قیام ۶۳۱ھ اور ۶۳۵ھ کے درمیانی زمانہ میں رہا ہے۔ پھر (غالباً ۶۴۵ھ کے بعد) آپ حضرت شمس الدینؒ کی جستجو میں دمشق تشریف لے گئے تھے اور بقول سلطانؒ ولد دو مرتبہ گئے تھے، علاوہ ازیں جب آپ اپنے والدؒ کے ہمراہ (۶۱۰ھ۔ ۶۱۴ھ) حجاز سے ہوتے ہوئے آذربیجان وغیرہ کی طرف گئے، اور شام سے بھی گزر ہوا، اس وقت بھی دمشق میں قیام ہوا تھا، آ گے

---

[1] مناقب ص۵۵-۵۶ اس موقع پر مناقب العارفین کے مطبوعہ نسخہ قلمی کی غلطی وجہ سے ایک عجیب دشواری پیش آ گئی ہے، مطبوعہ نسخہ کی عبارت یہ ہے کہ "گویند قریب ہفت سال مقیم دمشق بود و گویند چہل سالہ بود" مولاناؒ کی ولادت ۶۰۴ھ میں مسلم ہے، پس آپ کی عمر ۶۴۲ھ میں چالیس برس کی پہنچی ہوگی۔ ۶۴۲ھ تک شمس تبریزی کی ملاقات اور غیبت اول کا زمانہ بھی گزر چکا تھا، صحیح عبارت قلمی نسخہ کی وہ ہے جو اوپر نقل ہوئی، اسی مطبوعہ نسخہ کی بنا پر سوانح مولاناؒ روم ص... میں یہ لکھ گیا ہے کہ مناقب العارفین کہتا ہے کہ "مولاناؒ نے سات برس تک دمشق میں رہ کر علوم کی تحصیل کی اور اس وقت تک مولاناؒ کی عمر چالیس برس کی تھی" لیکن یہ صریحاً واقعات کے خلاف ہے

چلکر (فصل چہارم) میں ایک کرامات کے ذیل میں ۶۵۰ھ کے قریب ظاہراً یا باطناً آپ کے دمشق میں ہونے کا ذکر آئے گا، مختلف واقعات سے یہ بھی ثابت ہے کہ دمشق سے مولاناؒ کی دلچسپی آخر تک قائم رہی۔

سلطان ولدؒ کے حالات میں مذکور ہے کہ مولاناؒ جب دمشق میں تحصیل علوم میں مشغول تھے تو سلطان ولدؒ کو بھی بغرض تعلیم اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ حضرت شمس الدینؒ جب پہلی بار قونیہ سے چلے گئے تھے تو سلطان ولدؒ ہی دمشق جاکر حضرت شمسؒ کو اپنے ہمراہ لائے تھے۔ اور حضرت شمسؒ کی دوسری غیبت کے بعد مولاناؒ کے ہمراہ (شاید تنہا بھی) دمشق کو گئے تھے۔

ان جملہ اعتبارات سے نامناسب نہ ہوگا کہ اس زمانہ میں دمشق کی جو کیفیت رہی ہے اس کا بھی کچھ مختصر ذکر کر دیا جائے، دمشق اس تمام دوران میں خاندان ایوبی کی مختلف شاخوں کے زیر حکومت رہا ہے، نورالدین محمود بن زنگی والیٔ حلب ۵۴۹ھ میں دمشق پر قابض ہوا اس کے بعد ۵۶۹ھ سے ۵۸۹ھ تک مشہور سلطان صلاح الدین بن ایوب دمشق پر حکمراں رہا، صلاح الدین کے بعد خاندان ایوبی مصر، دمشق، حلب، عراق، حماۃ، حمص، عرب سات شاخوں میں منقسم ہوگیا، ان خاندانوں میں باہم بہت خانہ جنگیاں رہیں اور دمشق کی حکومت مختلف ہاتھوں میں آتی جاتی رہی لیکن جس زمانہ سے ہمیں بحث ہے اس میں دمشق کی حکومت فرمانروایان ذیل کے ہاتھوں میں رہی۔

الملک الاشرف موسیٰ (عراق) ۶۲۶ھ/۱۲۲۸، الملک الصالح اسمٰعیل (دمشق) ۶۳۵ھ/۱۲۳۷، الملک الکامل (مصر) ۶۳۵ھ/۱۲۳۷، الملک العادل (مصر) ۶۳۵ھ/۱۲۳۸، الملک الصالح (مصر) ۶۳۷ھ/۱۲۴۰، الملک الصالح اسمٰعیل (بار ثانی) ۶۳۷ھ/۱۲۴۰، الملک الصالح (مصر) ۶۴۳ھ/۱۲۴۵، الملک المعظم (مصر) ۶۴۶ھ/۱۲۴۹، الناصر صلاح الدین یوسف (حلب) ۶۴۸ھ/۱۲۵۰،

۶۵۸ھ/۱۲۶۰ میں مغلوں نے دمشق کو تباہ کیا اور خاندان ایوبی کا خاتمہ ہوگیا مگر بہت جلد ملوکیوں سے شکست کھاکر مغلوں نے شہر کو خالی کردیا اور دمشق ملوکیوں کے مشہور سلطان الظاہر رکن الدین بیبرس (بندقدار) کے قبضہ میں آگیا اور مولاناؒ کے

بعد (یعنی ۶۶۲ھ/۱۲۶۴ء) تک اسی کے قبضہ میں رہا۔

لیکن ان تمام ردّ و بدل اور جنگہائے صلیبی کی پریشانیوں کے باوجود دمشق اندرونی اعتبار سے برابر ترقی کرتا گیا۔ خاصکر قیام مدارس کی کچھ ایسی ہوا چل گئی تھی کہ بادشاہ، شہزادے، شہزادیاں، امراسب کو قیام مدارس کی ایک دھن سی لگی ہوئی تھی، مشہور مدرسہ نوریہ جسمیں ابن عساکرؒ[1] درس دیتے تھے، نورالدین زنگی کی یادگار تھا، صلاح الدین کے زمانہ میں جب ابن جبیر دمشق میں آئے ہیں اسوقت بیس مدارس قائم ہو چکے تھے، صلاح الدین کے بعد خانہ جنگی کی ابتریوں کے باوجود قیام مدارس میں برابر سرگرمی رہی، یہ شوق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ اکثر ان فرمانرواؤں کی قبریں انھیں مدرسوں میں ہوتی تھیں، چنانچہ نورالدین مدرسہ نوریہ میں مدفون ہوا، صلاح الدین پہلے قلعہ کے اندر دفن ہوا اگرچہ ماہ بعد اس کی لاش مدرسہ عزیزیہ میں منتقل کر دی گئی۔

غرض کثرت مدارس اور اپنی جائے وقوع کی وجہ سے دمشق اس زمانہ میں دنیائے اسلام کا سب سے بڑا علمی مرکز بن گیا تھا، مولاناؒ کو دمشق سے جو الفت تھی اس کا اظہار اس غزل سے ہوتا ہے جس کا مطلع ہے ؎

اے عاشق دگشتہ سودائے دمشقیم   (اس غزل کی پوری بحث فصل سوم میں آئی ہے)

غرض ۶۲۴ھ یا ۶۲۵ھ میں دمشق سے واپس آکر قونیہ میں مستقل قیام اختیار کیا، اس کے بعد شمسؒ تبریزی کی جستجو میں نکلنے سے قبل صرف آپ نے ایک سفر قیصریہ کا ۶۲۷ھ میں کیا، صاحب اصفہانی نے جب آپ کو سید برہان الدینؒ کے انتقال کی خبر دی تو آپ مع اصحاب کے قیصریہ روانہ ہوئے، سیدؒ کے مزار کی زیارت کی، شمس الدین نے سیدؒ کی تمام چیزیں اور کتابیں آپ کے سامنے پیش کیں جو چیزیں مطلوب تھیں وہ لے لیں، کچھ

---

[1] ۴۹۹ھ/۱۱۰۵ء میں دمشق میں پیدا ہوئے اور وہیں ۵۷۱ھ/۱۱۷۶ء میں انتقال کیا، دمشق کی تاریخ اسّی جلدوں میں لکھی ہے جن میں سے دو جلدیں ۱۳۲۹، ۱۳۳۲ھ میں دمشق ہی میں طبع ہوئی ہیں۔ کتاب یکجا کہیں موجود نہیں ہے، مختلف اجزاء بعض بعض کتب خانوں میں ہیں۔

چیزیں یادگار کے طور پر شمس الدین کو دیدیں اور پھر قونیہ واپس آگئے۔

مولاناؒ جب دمشق سے واپس آکر قونیہ میں مستقل اقامت پذیر ہوئے ہیں، اس وقت علاؤالدین کا انتقال ہوچکا تھا اور اس کا بیٹا غیاث الدین (۶۳۴ھ تا ۶۴۲ھ) تخت سلطنت پر متمکن تھا، غیاث الدین کے عزالدین کیکاؤس حکمراں ہوا ہے، اس عزالدین کی نسبت مناقب العارفین میں منقول ہے کہ[1] "اس نے مولاناؒ کی جانب وہ التفات نہ کیا جو علاؤالدین کا تھا بلکہ وہ اپنے وزیر شمس الدین اصفہانی سے بھی تعرض کیا کرتا تھا کہ آخر مولاناؒ میں کیا ایسی بات ہے کہ تمام مشائخؒ کو چھوڑ کر تم ہمہ وقت انھیں کی طرف متوجہ رہتے ہو، اصفہانی نے جب سلطان کو مفصل سمجھایا تو خود سلطان کے دل میں بھی ارادت پیدا ہوگئی، اسی دن صحرائے قونیہ میں اپنے خواص کے ساتھ کوشک قلوبار میں سیر کو گیا، وہاں دریا کے کنارے سانپ کا ایک بچہ نظر پڑا اسے اٹھا کر پوشیدہ طور پر اپنے پاس رکھ لیا اور پھر ایک سونے کا ڈبہ منگا کر اس میں بند کیا، مجلس میں آکر اپنے وزرا و امرا سے کہا کہ قیصر استنبول نے دیگر تحائف کے ساتھ یہ ڈبہ بھی بھیجا ہے اور کہلایا ہے کہ اگر آپؐ کا دین برحق ہے تو آپ کے علما یہ بتائیں کہ اس ڈبہ میں کیا ہے، سب حیران ہوگئے، پھر پروانہ کو حکم دیا کہ اس ڈبہ کو شیوخ و قضاۃ قونیہ کے پاس لے جائے اور پوچھے کہ اس میں کیا ہے، کسی سے یہ معما حل نہ ہوا، آخر اصفہانی کی رائے کے بموجب خود سلطان اسے لے کر مولانا

---

[1] ذکر شیخ صلاح الدین نسخہ قلمی۔ مناقب العارفین میں سلطان روم عزالدین کیکاؤس فرزند علاؤالدین کیقباد" لکھا ہے مگر عزالدین، کیقباد کا بیٹا نہیں بلکہ پوتا تھا۔

کی خدمت میں آیا اس وقت شیخ صلاح الدینؒ مولاناؒ کے پہلو میں مراقب بیٹھے تھے۔ مولاناؒ نے انھیں کی طرف اشارہ کیا انھوں نے فرمایا کہ "اے سلطان اسلام" جانور بیچارے کو کیوں ڈبہ میں بند کیا ہے سانپ کے بچے کو اپنا یار بنایا ہے اور مردان خدا کا امتحان کرتا ہے، یہ طریق مروت سے بعید ہے، انھیں آسمان و زمین کے ذرے ذرے کی خبر ہے، یہ ایک ڈبہ کیا چیز ہے" سلطان اسی وقت مولاناؒ کا مرید ہو گیا اور پھر بغایت آپ کی تعظیم و تکریم کرنے لگا اور شمس الدین کا نہایت درجہ شکر گزار ہوا۔

مولاناؒ اگرچہ مرتبہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے مگر آپ کے حالات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی طبیعت میں یہ امر داخل تھا کہ آپ ہمیشہ کسی نہ کسی رفیق کے خواہاں ہوا کرتے تھے اور اس کے بغیر آپ کے دل کو نہایت درجہ پریشان و بے قرار رہنے لگے سلطان ولدؒ نے اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

ماند بے او جلال دیں تنہا	روز و شب کرد روے سوے خدا
خواب و خور را دراں ہوس بگذاشت	علم جست و جوے را افراشت
پنج سال اینچنیں ریاضت کرد	از سر صدق و سوز و نالہ و درد
عمل و درد را چوں کرد قریں	رفت ہمچو ملک بچرخ بریں
بے عدد شد کرامتش پیدا	پیش ہر پیر و نزد ہر برنا
دہ ہزارش مرید بیش شدند	گرچہ اول زصدق دور بدند
....	....
وعظ گفتے زجود بر منبر	گرم و گیرا چو وعظ پیغامبرؐ

....

درچنیں دعوت دبحق مشغول　　　عاشقاں را مراد از دخول

پس سید برہان الدین کے انتقال اور شمس الدینؒ تبریزی کی آمد کے ابین پانچ برس کا جو زمانہ گزرا یہ زمانہ مولاناؒ کے علمائے ظاہر کے لباس میں رہنے کا آخری زمانہ تھا، اس وقت تک علاء الدین کیقباد کا انتقال ہو چکا تھا، اس کا بیٹا غیاث الدین کیخسرو سریر سلطنت پر متمکن تھا، ملک روم پر مغلوں کی یورش شروع ہو گئی تھی مگر خود قونیہ ہنوز محفوظ تھا، اس اثنا میں ۶۳۸ھ میں شیخ محی الدین ابن عربی کا انتقال ہو گیا اور جو بزم علمی آپ کے گرد جمع تھی اس کے اکثر افراد قونیہ میں آ گئے تھے جن میں شیخ صدر الدین بھی تھے، مشرق کی طرف سے جو علما و فضلا وہاں کی تباہیوں سے پریشان ہو کر روم کا رخ کرتے تھے وہ بھی اکثر قونیہ ہی کو اپنا ملجا و ماوی بناتے تھے، اس طرح قونیہ اس زمانہ میں مدینۃ العلماء بن گیا تھا اور ان علماء میں مولاناؒ کی حیثیت سب سے بلند تھی۔

مولاناؒ نے علوم ظاہر میں انتہائی کمال بہم پہنچا لیا تھا، "الجواہر المضیئہ فی طبقات الحنفیہ" محی الدین ابو محمد عبدالقادر کی تصنیف اور نہایت درجہ مستند کتاب ہے۔ اس میں مشہور علماء حنفیہ میں مولاناؒ کو بھی شمار کیا ہے اور آپ کے نسبت یہ الفاظ تحریر فرمائے ہیں۔

"کانَ عالمًا بالمذہب، واسع الفقہ، عالمًا بالخلاف وانواع العلوم [1]"

اس زمانہ میں مولاناؒ کے وہی اشغال تھے جو علمائے ظاہر کے ہوتے ہیں، یعنی درس و تدریس، وعظ و تذکیر، اور فتویٰ نویسی۔

---

[1] مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن ۱۳۳۲ھ

مولاناؒ کا مدرسہ حضرت سلطان العلماء کے زمانہ ہی میں قائم ہو چکا تھا، مولاناؒ اسی مدرسہ میں درس دیتے تھے اور بقول علمائے یورپ چار مدرسوں میں پروفیسر (مدرس) تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولاناؒ بہت زیادہ وقت شغل تدریس میں صرف کرتے تھے۔ خود آپ کے مدرسہ میں چار سو سے زیادہ طلبہ تھے، بانی مدرسہ امیر بدرالدین گہرتاش نے مدرسہ کے لئے جو کچھ وقف کیا ہو وہ تو تھا ہی، سلاطین روم کے نزدیک مولاناؒ کا جو درجہ تھا اس سے لامحالہ مدرسہ کو بیش قرار مدد ملتی رہی ہوگی، سلاطین کے علاوہ امرا بھی حسب رفتار زمانہ مدارس کی امداد لازمۂ امارت سمجھتے تھے، چنانچہ اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ اس مدرسہ کا عامر خانہ امیر تاج الدین نے تین ہزار کے صرف سے بنوایا تھا۔

درس و تدریس کے علاوہ مولاناؒ کا دوسرا شغل یا فرض وعظ کہنا تھا، وعظ اکثر اپنے مدرسہ ہی میں فرمایا کرتے تھے، گاہ بگاہ دوسرے مقامات پر بھی لوگوں کی استدعا پر وعظ کہا کرتے تھے۔

"اس زمانہ میں وعظ کا طریقہ یہ تھا کہ قاری، قرآن کی چند آیتیں پڑھتا تھا اور واعظ انھیں آیتوں کی تفسیر بیان کرتا تھا"[۱] مولاناؒ کے وعظ کا بھی یہی طریقہ تھا۔ اس کے متعلق ایک واقعہ فصل چہارم میں مذکور ہے، اسے دیکھنا چاہئے کہ کیونکر ایک شخص کے دلی خطرے سے آگاہ ہو کر مولانا نے والضحیٰ کی تفسیر شروع کی اور صرف "واو" کی تفسیر میں عصر کا وقت ہو گیا مگر[۲] یہ واقعہ غالباً اس زمانہ کا ہے جب مولاناؒ علمائے ظاہر کا لباس ترک کر چکے تھے۔

---

[۱] سوانح مولانا روم صفحہ ۳۹

[۲] مناقب صفحہ ۱۰۶

اس روایت کے ساتھ ہی مناقب العارفین میں یہ بھی درج ہے کہ اس کے بعد سے مولانا رح نے اس طریق پر وعظ کہنا ترک کر دیا، اور دوسرے طریق پر تذکیر د تقریر جاری رکھی یعنی فیوض باطنی سے مستفید فرماتے رہے۔

مولانا کے والد رح کے حالات میں مذکور ہو چکا ہے کہ تمام انصائے خراسان سے مشکل فتادے آپ کی خدمت میں آتے رہے، یہی حال مولانا رح کا تھا جس زمانہ میں آپ حلب و دمشق میں تحصیل علوم میں مشغول تھے، اس زمانہ میں بھی یہ حال تھا کہ جو مسائل دوسروں سے حل نہ ہوتے تھے انھیں مولانا کی طرف رجوع کرتے تھے، قونیہ میں جب آپ نے مستقل اقامت اختیار کی تو فتوے نویسی کا شغل بھی مستقل ہو گیا، بیت المال سے مولانا کے لئے ایک دینار مقرر تھا، اسے اسی فتویٰ نویسی کا معاوضہ تصور فرماتے تھے اور اس معاملہ میں اس قدر سخت تھے کہ جب فقر کا رنگ غالب ہوا اور مجالس میں مستغرق رہنے لگے، اس وقت بھی یہ حکم تھا کہ جس وقت کوئی فتوے آئے فوراً خبر کی جائے، قلم دوات ہمہ وقت مہیا رہتا تھا، چاہے کیسے ہی عالم استغراق میں ہوں فتوے کا جواب فی الفور تحریر فرما دیتے تھے۔ اور یہ اہتمام اس لئے تھا کہ بیت المال سے جو رقم ملتی تھی وہ جائز ہو جائے (اس حالت استغراق میں جو فتادے لکھے ہیں ان میں سے بعض کا ذکر فصل چہارم میں ہوا ہے وہاں دیکھنا چاہئے)

ان تمام حالات کو اگر مولانا رح کے والد رح بزرگوار کے حالات سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے والد رح کے نقش قدم سے سر مو تجاوز نہیں فرماتے تھے، درس و تدریس، وعظ گوئی، فتویٰ نویسی، دعوت و ارشاد، ریاضات و مجاہدات، تعلق مدارس، شان علمائے ظاہر، یہ تمام باتیں وہی تھیں جو حضرت بہاء الدین رح ولد میں تھیں، یہ حالت ۶۴۲ھ تک قائم رہی۔ اس کے بعد مولانا کی زندگی میں وہ انقلاب

عظیم واقع ہوا جس نے مولاناؒ کو فقر و تصوف کی صف میں سب سے الگ نمایاں کر دیا اور آپ خود ایک سلسلہ (جلالیہ یا مولویہ) کے بانی ہوئے جو اس وقت تک قائم ہے اور الی یوم القیام قائم رہے گا۔ انشاء اللہ۔

فصل سوم

قِرانُ النَّیِّرَین

۶۴۲ھ میں مولانا کی حالت میں دفعۃً جو تغیر واقع ہوا اور آپ کی زندگی کے آخری تیس برس جس عالم میں گذرے اس کی ابتدا دلی دستور شمس الدین تبریزی کی ملاقات سے ہوئی ہے

چونکہ دورِ شورش انگیزی رسید　　دورۂ شمس تبریزی رسید

اس ملاقات کے متعلق روایتوں میں نہایت درجہ اختلاف ہے مگر تمام روایتوں کی تنقیح کرنے سے نفس واقعہ مستند طور پر برآمد ہو جاتا ہے اور اس میں کسی طرح کا شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔

لیکن مولانا اور شمس تبریز کی ملاقات کے بیان سے قبل مناسب ہے کہ خود حضرت شمس تبریز کا کچھ حال

مختصراً بیان کر دیا جائے۔

حسن بن صباح نے جب ۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء میں قلعہ الموت پر قبضہ کر کے فرقۂ اسمٰعیلیہ کی بنیاد مستحکم کر دی تو خود اپنے دونوں لڑکوں کو عدم اطاعت کے جرم میں قتل کر ڈالا۔ اور اپنے رفیق طریق کیا بزرگ امید کو اپنا جانشین مقرر کیا، اسی کیا بزرگ کی چوتھی پشت میں جب جلال الدین (۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء میں) منصب "امامت" پر فائز ہوا تو اس نے اپنے بزرگوں کا طریقہ ترک کر کے صحیح اسلامی عقائد اختیار کئے اور "نو مسلمان" کے لقب سے مشہور ہوا۔ حضرت شمس الدینؒ کے نسبت عام روایت یہی ہے کہ آپ اسی جلال الدین "نو مسلمان" کے فرزند تھے۔ ع۱ مگر نفحات الانس ع۲ میں آپ کے والد کا نام ملک داد تبریزی لکھا ہے اور یہی نام خزینۃ الاصفیا ع۳ میں بھی ہے اور صاحب مجمع الفصحا نے علی بن داؤد تبریزی لکھا ہے۔ مناقب العارفین نسخہ قلمی میں شمس الدین محمد بن علی بن ملک داود لکھا ہے اور بقول دولت شاہ بعض کا یہ خیال تھا کہ آپ تبریز کے کسی بزاز کے فرزند تھے۔

غرض آپ کا سلسلۂ نسب غیر متیقن ہے، سلطان ولدؒ کی مثنوی میں بھی اس کا اشارہ ملتا ہے کہ آپ کے مخالفین نے جہاں اور الزامات آپ پر لگائے تھے وہاں ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپ کا نسب نامعلوم ہے ؎

نے ورا اصل و نے نسب پیداست   می ندانیم ہم کہ او ز کجاست

تاریخوں میں جلال الدین نو مسلمان کے صرف ایک فرزند کا نام دیا ہے اور وہ علاء الدین ہے، جن لوگوں نے حضرت شمس الدینؒ کو علاء الدین کا فرزند قرار دیا ہے وہ اس پر صرف اتنا اضافہ کرتے ہیں کہ

ع۱ دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرہ میں حضرت شمس الدینؒ کو علاء الدین کا بیٹا بتایا ہے اور علاء الدین کے نسبت لکھا ہے کہ "از نژاد کیا بزرگ امید است کہ دلیل اسماعیلیان بود خواند علاء الدین از کیش آبا و اجداد تبرا نمود و دفتر و رسائل ملاحدہ را بسوخت و شعار اسلام از قلاع و بلاد ملاحدہ ظاہر ساخت" لیکن یہ صریح غلطی ہے، علاء الدین جلال الدین کا بیٹا تھا اور وہ ملحد ہو گیا تھا، نو مسلمان جلال الدین ہی تھا۔

جلال الدین نے آپ کو تحصیل علم کے لئے خفیہ طور پر تبریز میں بھیجدیا تھا اور چونکہ آپ غایت درجہ حسین تھے نااہلوں کی نظر سے بچانے کے لئے آپ کو عورتوں میں رکھا گیا اور ان عورتوں ہی میں آپ نے زردوزی کا کام سیکھا، اسی وجہ سے "زردوز" مشہور ہوا۔

علی ہٰذا آپ کے وطن کے نسبت بھی اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ آپ خاص تبریزی ہیں، بعض کہتے ہیں کہ آپ کی اصل خراسان سے ہے، آپ کے والد بسلسلۂ تجارت تبریز میں آئے تھے اور آپ وہیں متولد ہوئے۔ سپہ سالارؒ نے مجمل فقرہ لکھدیا ہے کہ "مسکن ایشان بہ تبریز بود"[۱]

مجمع الفصحا اور نفحات الانس میں خود آپ کے نام میں بھی اختلاف ہے۔ مجمع الفصحا میں شمس الدین محمد بن علی بن ملک داد تبریزی لکھا ہوا اور نفحات الانس میں شمس الدین علی بن ملک داد تبریزی ہے مگر مجمع الفصحا کی روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے کہ آپ کا نام محمد تھا، مناقب العارفین کی ایک روایت سے اس کی توثیق ہوتی ہے، وہ روایت یہ ہے کہ "مولانا بہاء الدین کا ایک مرید تھا، آپ اس سے کچھ ناخوش ہو گئے تھے مگر پھر معاف کر دیا تھا، لیکن وہ اثر اس سے زائل نہیں ہوتا تھا، ایک روز بازار میں مولانا شمس الدینؒ کا سامنا ہو گیا، اس شخص نے کہا کہ "لا الٰہ الا اللہ" "شمس الدین رسول اللہ" لوگوں نے ہجوم کر کے اسے گھیر لیا، اتفاق سے حضرت شمس الدینؒ بھی آنکلے، اس کا ہاتھ پکڑ کر علیحدہ لے

بقیہ حاشیہ ص ۱۲۸

اور اسی نے کتابیں جلائی تھیں۔ جلال الدین کا زمانہ ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ سے ۶۲۸ھ/۱۲۳۰ تک رہا۔ ملاحظہ ہو تاریخ گزیدہ صفحہ ۴۹۴/۴۹۵ تاریخ کامل (ابن اثیر) جلد ۱۲، صفحہ ۱۸۶، (دیکھئے المختصر فی احوال البشر (ابو الفدا) جلد ۳ صفحہ ۱۱۸ و صفحہ ۱۳۱

تعجب ہے کہ صاحب "سوانح مولانا رومؒ" نے بھی دولت شاہ کی تقلید میں یہ لکھ دیا ہے کہ شمس تبریزؒ کے والد کا نام علاء الدین تھا، وہ کیا بزرگ کے خاندان سے تھے جو فرقۂ اسماعیلیہ کا امام تھا لیکن انھوں نے آبائی مذہب ترک کر دیا تھا صفحہ ۱۲

[۱] ص ۳۰۲ ، [۲] ص ۲۶۸ [۳] ص ۹۳

گئے اور کہا کہ آخر میرا نام تو محمد ہی ہے، محمد رسول اللہ کہنا چاہیے تھا، لوگ غیر مسکوک سونا نہیں لیتے۔"[1]

قیاس یہ چاہتا ہے کہ شمس الدین محمد بن علی بن ملک داد میں الفاظ شمس تم ممکن ہے اور کسی نسخہ میں (محمد بن) دو لفظ چھوٹ گئے ہوں اور شمس الدین علی بن ملک داد لکھ گیا ہو، ان تمام اختلافات کے متعلق دولت شاہ کا فیصلہ ناطق سمجھنا چاہیے کہ "بندہ میگوید کہ از ہر کجا (بلکہ ہر کہ) باشد باش کار معنی دارد نہ صورت در آشنائی عالم ارواح است نہ در تولد اجساد ؎

آنکس کہ ز شہر آشنائیست — داند کہ متاع ما کجائیست[2]

بہرحال حسب و نسب کی بحث سے قطع نظر کرکے خود حضرت شمسؒ کے نسبت اتفاق عام ہے کہ آپ ولی مادرزاد تھے، مناقب العارفین میں خود آپ ہی کی زبانی منقول ہے کہ ابھی سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچے تھے کہ آنحضرت صلعم کے عشق میں تیس تیس چالیس چالیس روز تک آپ کو غذا کی خواہش نہیں ہوتی تھی علوم ظاہری سے فارغ ہونے کے بعد آپ شیخ ابوبکرؒ سلہ باف کے مرید ہوئے، بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ شیخ زین الدین سنجابی کے مرید تھے (جن کے مرید شیخ اوحدالدین کرمانی بھی تھے) بعض دوسری روایتوں سے پایا جاتا ہے کہ آپ بابا کمالؒ جندی کے مرید تھے (جن کے مرید شیخ فخرالدینؒ ابراہیم عراقی بھی تھے) مولانا جامیؒ نے نفحات الانس میں یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ ممکن ہے کہ ان سب بزرگوں سے آپ نے فیض حاصل کیا ہو۔

---

[1] صفحہ ۳۸۱

[2] راقم الحروف اس پر اتنا اضافہ کرتا ہے کہ دیوان شمس کے ایک شعر نے اس بحث کا فیصلہ کر دیا ہے اور یہ شعر غالباً خود حضرت شمسؒ کا ہے۔ "فخرم نہ ز مال و نسب خرم نہ از جاہ و حسب — ہستم دل و جاں پر عجب، ہذا جنون العاشقین (ص ۶۱۵)

جب آپ کو اس طرح سیری نہ ہوئی تو اطراف عالم میں مردانِ خدا کی تلاش میں پھرنے لگے، لیکن یہ سفر اس طرح کرتے تھے کہ خود آپ کی ولایت و کمال سے لوگ آگاہ نہیں ہوتے تھے۔ نمد سیاہ پہنتے اور جہاں جاتے سرائے میں قیام کرتے، دروازے میں قیمتی قفل لگا دیتے کہ لوگ سمجھیں کہ کوئی بڑا تاجر ہے، اگر اندر سوائے بوریئے کے کچھ نہ ہوتا، کثرت اسفار کی وجہ سے لوگ آپ کو "شمس پرندہ" کہنے لگے تھے، تبریز، بغداد، ارزن الروم، قیصریہ، دمشق، میں آپ کا باوقات مختلف ہونا ثابت ہے۔ معاش کا یہ طریقہ تھا کہ ازار بند بن لیا کرتے اور اسی کو بیچ کر کام چلاتے تھے، غذا کی کیفیت یہ یہ تھی کہ دمشق میں ایک برس رہے، ہفتہ میں ایک پیالہ سری کا شوربا اور وہ بھی بے روغن پی لیا کرتے تھے۔[۱] قونیہ میں جب پہلی بار آئے اور مولاناؒ کے ساتھ شیخ صلاح الدینؒ زرکوب کے مکان میں بیٹھے تو ایک مدت بے اکل و شرب گزار دی۔

اخفائے حال میں آپ کو سخت اہتمام تھا، ارزن الروم میں مدرسی کرنے لگے تھے۔ وہاں کے بادشاہ کا لڑکا کسی طرح تعلیم نہیں حاصل کرتا تھا، اسے ایک ماہ میں قرآن حفظ کرادیا اور لکھنا بھی سکھا دیا، لوگ سمجھ گئے کہ آپ ولی ہیں، فوراً وہاں سے غائب ہو گئے، اسی طرح دمشق سے بھی غائب ہو گئے تھے،[۲] اور جب تجلیات کا تحمل نہ ہوتا تو جاکر لوگوں کے کام کرنے لگتے، اجرت دی جاتی تو فرماتے کہ قرضدار ہوں یکجا لے لوں گا، کچھ مدت بعد غائب ہو جاتے،[۳]

کسی کو اپنی صحبت کا متحمل نہیں پاتے تھے، بغداد میں شیخ اوحدالدین کرمانی سے ملاقات ہوئی تو شیخ نے آپ کی صحبت میں رہنا چاہا مگر حضرت شمسؒ نے فرمایا "من مرید گیرم من شیخ میگیرم آنگاہ نہ ہر شیخ، بلکہ شیخ کامل محقق" آپ اکثر یہ دعا فرمایا کرتے تھے کہ "خدایا کوئی رفیق ایسا عطا کر جو میری صحبت کا متحمل ہو"

۱ـ سپہ سالار صفحہ ۲۳ ۲ـ مناقب صفحہ ۴۴ ۳ـ سپہ سالار صفحہ ۲۴

آخر یہ آرزو مولاناؒ کی ملاقات سے پوری ہوئی، سلطان ولدؒ کی روایت ہے کہ ایک روز حضرت شمس الدینؒ نے میرے والد سے فرمایا کہ تبریز میں ایک شخص ابو بکرؒ نامی تھے، میں نے تمام ولایت انھیں سے پائی مگر مجھ میں ایک شے تھی جسے یہ شیخؒ دیکھا نہ کسی اور نے۔ اب اسے خداوندگار نے معلوم کیا ہے۔[1]

اب ان مختلف روایات کو دیکھنا چاہیے جو مولاناؒ اور شمسؒ تبریزی کی ملاقات سے[2] متعلق مختلف کتابوں میں مذکور ہیں۔

سب سے اول سلطان ولدؒ کے بیان کو لینا چاہیے۔

آپ نے لکھا ہے کہ سید برہان الدینؒ کے انتقال کے بعد مولانا پانچ برس تک تنہا مضطرب و پریشان رہے، اس کے بعد ناگہاں شمس الدین تبریزی قونیہ میں وارد ہوئے۔ اور مولاناؒ کو ایک ایسے عالم کی طرف دعوت دی جسے کسی نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا ؎

ناگہاں شمس دیں رسید بوے   گشت فانی زتاب نورش نے

. . . .

دعوتش کرد در جہانِ عجب   کہ ندیدآں بخواب ترک و عرب

. . . .

سلطان ولدؒ نے اس سے زائد کچھ حالات درج نہیں کئے ہیں، سپہ سالارؒ نے کچھ مزید تفصیل دی ہے، وہ یہ کہ

حضرت شمس الدین نے ایک بار یہ مناجات کی کہ خدایا تیرے بندوں میں سے کوئی

---

[1] مناقب ص۲۲۹ (نسخہ قلمی) [2] فصل دوم میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ مولاناؒ جب دمشق میں تحصیل علوم میں مشغول تھے

سے جو میری صحبت کا متحمل ہو سکے۔ اشارہ ہوا کہ روم کو جاؤ۔ وہاں ایک شخص ایسا ہے،
اسی وقت روانہ ہو کر شہر بشہر تلاش کرتے ہوئے قونیہ میں پہونچے اور برنج فروشوں کی
سرائے میں ٹھہرے، سرا کے سامنے ایک چبوترہ تھا، اکثر معزز اشخاص وہاں بیٹھا کرتے
تھے، شمس الدینؒ بھی نکل کر وہاں بیٹھے، ادھر مولاناؒ کے دل پر بھی منکشف ہو گیا کہ "آفتاب
فلک ولایت، برج شرف میں آگیا ہے" اسی طرف کو روانہ ہوئے، راستہ میں لوگ
دست بوسی سے مشرف ہوتے جاتے تھے، جب سرائے کے سامنے پہونچے، سواری
سے اتر کر مقابل کے چبوترہ پر بیٹھ گئے۔ دونوں جانب سے خاموشانہ باتیں رہیں، اس
کے بعد حضرت شمس الدینؒ نے سر اٹھایا اور سوال کیا کہ بایزید قدس سرہٗ کی نسبت جو یہ
باتیں منقول ہے کہ حضرت بایزیدؒ کو چونکہ تواتر کے ساتھ یہ خبر نہیں معلوم ہوئی تھی کہ آنحضرتؐ
خربزہ کس طرح نوش فرماتے تھے۔ اسلیے آپنے تمام عمر خربزہ نہیں کھایا، دوسری طرف فرماتے تھے کہ "سبحانی
ما اعظم شانی" اور کبھی کہتے تھے کہ "لیس فی جبتی سوے اللہ" درآنحالیکہ آنحضرت صلعم کا ارشاد ہو کہ "انہ لیغان علی
قلبی وانی لاستغفر اللہ فی کل یوم سبعین مرۃ" ۔ آپ ان اقوال کی کیا تاویل فرماتے ہیں؟ جواب دیا کہ "بایزید اگرچہ
اولیائے کامل اور عرفائے واصل میں سے تھے مگر دائرۂ ولایت میں ایک مقام پر

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۲)

اس زمانہ میں ایک مرتبہ ہجوم عام میں سرسری طور پر حضرت شمس الدینؒ سے ملاقات ہو گئی تھی لیکن یہ ایسی
روا روی کی ملاقات تھی کہ اس کا کوئی اثر مولاناؒ کی زندگی پر نہیں پڑا۔

فہرست کتبخانہ بانکی پور میں لکھا ہے کہ "یہ شمس الدینؒ (مولانا) جلال الدینؒ کے والد کے گہرے
دوست تھے اور مولاناؒ نے نہایت خوشی سے انھیں اپنا مرشد روحانی بنایا تھا" (ص ۱۸۸-۱۹۱ھ) لیکن اسکی
مطلق کوئی اصلیت نہیں ہے یا تو یہاں برہان الدینؒ کے بجائے شمس الدینؒ لکھا گیا ہے یا شمس الدینؒ امداد اور

رک گئے، تھے اور اس مقام کی عظمت و کمال کی وجہ سے یہ کلمات آپ کی زبان سے صادر ہوتے تھے اور آنحضرت ؐ روزانہ ستر مقام پر عبور فرماتے تھے کہ ثانی کو دل سے کوئی نسبت نہوتی تھی اور اس سے آپ ہر دوسرے درجہ پر پہونچ کر درجہ اول پر قانع ہونے کے خیال سے استغفار فرماتے تھے۔"

اس سوال وجواب کے بعد دونوں بزرگوں نے چبوترے سے نیچے اتر کر معانقہ ومصافحہ کیا اور باہم شیر وشکر ہو گئے۔ [۱]

بادنیٰ تفاوت یہی روایت مناقب العارفین میں بھی ہے۔ اگرچہ تکرار روایات موجب بے لطفی ہے، مگر اس روایت کو بھی اس خیال سے نقل کر دیا جاتا ہے کہ دونوں روایتوں کا فرق خود لکھنے والوں ہی کے الفاظ میں معلوم ہو جائے، چنانچہ مناقب العارفین میں اسے یوں بیان کیا ہے کہ حضرت شمسؒ تبریز کی ملاقات کی ایک روایت یہ ہے کہ حضرت موصوف شہر تبریز میں شیخ ابوبکر تبریزیؒ زنبیل باف کے مرید تھے مگر اور زیادہ برتر مقام کے خواہاں تھے، اس طلب میں سالہا سال تمام دنیا میں گھومتے رہے اور "شمس الدین پرندہ" کے نام سے مشہور ہو گئے، آخرالامر ایک روز حالت استغراق میں یہ دعا کی کہ اے خدا اپنے محبوبانِ مستور میں سے کسی کو مجھے دکھا۔ خطاب ہوا کہ ایسا شخص فرزند سلطان العلماء بہاء الدینؒ ہے، ان کے دیدار کی دعا کی تو جواب ملا کہ کیا شکرانہ دیتا ہے، فرمایا کہ سر کو شکرانہ میں پیش کرتا ہوں، حکم ہوا کہ اقلیم روم میں جاؤ۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳۳)

ان کے پیر بہاء الدین عمر کے ناموں سے مغالطہ واقع ہو گیا ہے جو قریب ہی زمانہ میں تھے

[۱] سپہ سالار ص ۶۵۔۶۶

غرض روم کو روانہ ہوئے اور شنبہ ۲۶ جمادی الآخرہ ۶۴۲ھ (۱۲۴۴ء) کو قونیہ پہنچکر شکر فروشوں کے محلہ میں قیام کیا اور ایک حجرہ لے کر ایک قیمتی قفل لگایا اور کنجی گوشۂ دستار میں باندھ لی تاکہ لوگ سمجھیں کہ کوئی بڑا تاجر ہے گر خود حجرے میں صرف چند معمولی چیزیں تھیں اور بس۔

ایک روز حضرت موصوف سرا کے دروازے پر بیٹھے تھے کہ مولاناؒ آئینہ فروشوں کے[^1] مدرسہ سے باہر نکلے، مولاناؒ سوار تھے اور لوگ پاپیادہ ہمراہ رکاب تھے، شمسؒ نے آگے بڑھ کر لگام پکڑلی اور کہا کہ صراف نقود معانی و عالم اسماء یہ بتایئے کہ آنحضرتؐ زیادہ بزرگ تھے یا بایزیدؒ، مولاناؒ نے فرمایا کہ یہ کیا سوال ہے؟ آنحضرتؐ تمام انبیاءؑ و اولیاؒ کے سردار ہیں اور بزرگی اور بزرگواری تمام آپ ہی کی ہے، شمسؒ نے کہا کہ پھر اس کے کیا معنی کہ آں حضرتؐ فرمایا کرتے تھے کہ "سبحانک ما عرفناک حق معرفتک" اور بایزید کہتے تھے کہ سبحانی ما اعظم شانی وانا سلطان السلاطین" مولاناؒ سواری سے اتر پڑے اور سوال کی مہیبت سے ایک نعرہ مارا اور بے ہوش ہو گئے، ایک ساعت بعد ہوش میں آئے تو فرمایا کہ بایزیدؒ کی تشنگی ایک جرعہ سے ساکن ہو گئی تھی وہ سیراب ہو گئے اور ان کا ادراک پُر ہو گیا، مگر آنحضرتؐ کا استسقائے عظیم کب ساکن ہو سکتا تھا، آپ دمبدم زیادتی کے خواہاں تھے۔"[^2]

ان دونوں روایتوں میں کوئی امر فوق العادت نہیں ہے، نہ کسی خاص کرامات کا ذکر ہے، مگر عام تذکروں میں اس واقعہ کا حال دوسری طرح پر درج ہے، ان میں سے بعض حالات یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

---

[^1]: دوسرے موقع پر "مدرسہ پنبہ فروشان" ہے ص ۲۷۳
[^2]: مناقب ص ۵۸۔۶۱

ابن بطوطہ (۷۰۳ھ/۱۳۰۴ء – ۷۷۹ھ/۱۳۷۷ء) اپنے تیسرے سفر میں افلاکیؒ ہی کے زمانہ میں (یعنی آٹھویں صدی کے عشرۂ چہارم میں) روم میں پہنچے اور اس سلسلہ میں قونیہ میں بھی گئے، اس کا حال ان کے سفر نامہ میں زیرِ عنوان "ذکر سلطان میلاس" درج ہے[1]۔ انھیں حالات میں مولاناؒ کی نسبت "حکایت" کے طور پر یہ لکھا ہے کہ:

کہتے ہیں کہ مولاناؒ ابتدائے حال میں فقیہ و مدرس تھے اور قونیہ کے مدرسہ میں درس دیا کرتے تھے، ایک دن ایک شخص حلوا بیچتا ہوا مدرسہ کی طرف آ نکلا، حلوے کا طباق سر پر تھا اور حلوے کی سوراتیں بنی ہوئی تھیں، ایک ایک پیسہ میں ایک ایک سورات دیتا تھا جب وہ مجلس درس تک پہنچا، مولاناؒ نے فرمایا کہ ادھر لاؤ، اس نے طباق میں سے ایک سورات نکال کر پیش کی، مولاناؒ نے لے کر کھالی، حلوائی فوراً ہی وہاں سے نکل گیا اور مولاناؒ کے سوا اور کسی کو حلوا نہیں دیا۔ مولاناؒ بھی درس چھوڑ کر اس کے پیچھے چل کھڑے ہوئے۔ سلسلۂ درس بند ہو گیا۔ اور طلبہ کی تعلیم رک گئی۔ یہ لوگ دیر تک انتظار کرنے کے بعد خود مولانا کی تلاش میں نکلے مگر کہیں کچھ پتہ نہ چلا۔ چند سال بعد مولاناؒ خود ہی واپس آئے لیکن حالت یہ تھی کہ فارسی اشعار کے سوا کوئی بات زبان سے نہیں نکلتی تھی اور شعر بھی ایسے ہوتے تھے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتے تھے کہ کس امر سے متعلق ہیں۔ طلبہ ان کے پیچھے پیچھے پھرتے رہتے اور جو کچھ زبان سے نکلتا لکھ لیتے۔ اس طرح ان لوگوں نے ایک کتاب مرتب کر لی اور اس کا نام مثنوی رکھا۔ ان ممالک کے باشندے اس کتاب کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، اس کی تعلیم

---

[1] رحلت ابن بطوطہ (تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار) المطبعۃ الخیریہ مصر ۱۳۲۲ھ جزو اول ص ۲۱۹۔۲۲۱

دیتے ہیں اور اس سے عبرت و موعظت حاصل کرتے ہیں اور شب جمعہ کو اپنی خانقاہوں میں اسے پڑھتے ہیں۔ اسی شہر میں فقیہ احمد کی بھی قبر ہے جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ (مولانا) جلال الدین مذکور کے معلم تھے۔

اسی روایت کے متعلق مولانا شبلی مرحوم لکھتے ہیں کہ "ابن بطوطہ سفر کرتے کرتے جب قونیہ پہنچا ہے تو مولاناؒ کی قبر کی زیارت کی تقریب سے مولاناؒ کا کچھ حال لکھا ہے اور شمسؒ کی ملاقات کی جو روایت وہاں تواتراً مشہور تھی اسے نقل کیا ہے......" [1]

اس روایت میں اگرچہ حضرت شمسؒ کی کوئی تصریح نہیں ہے مگر باقتضائے حالات اس کا اشارہ اسی جانب سمجھا جائے گا، لیکن اس روایت کا تواتراً مشہور ہونا کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا، افلاکیؒ اس زمانہ میں مناقب العارفین کی تالیف میں مشغول تھے مگر اس قسم کی روایت کا ادنیٰ اشارہ بھی اس کتاب میں نہیں ملتا۔ خارجی شہادت کے علاوہ خود اس روایت ہی میں ایسی باتیں موجود ہیں جن سے یہ روایت ساقط عن الاعتبار ہو جاتی ہے۔

(۱) مولاناؒ کا کئی برس تک اس طرح گم ہو جانا کہ آپ کا پتہ نہ چلے قطعاً خلاف واقعہ ہے۔

(۲) مولاناؒ کے کوئی معلم "فقیہ احمد" نہیں تھے، (شمس الدین یا برہان الدینؒ دونوں میں سے کسی کا نام احمد نہیں تھا، اول الذکر کی قبر قیصریہ میں ہے اور ثانی الذکر کا مدفن غیر محقق ہے، نہ صلاح الدین یا حسام الدین کا نام احمد تھا البتہ مولاناؒ کے فرزند بہاء الدینؒ ولد کا نام احمد تھا)

---

[1] سوانح مولانا روم صفحہ ۱

(۳) مولاناؒ کا کلام ایسا مغلق نہیں ہوتا تھا جو ناقابل فہم ہو بلکہ اس کے برخلاف مولانا فارسی اشعار خاص اسی غرض سے کہتے تھے کہ لوگ انھیں بآسانی سمجھ سکیں، یہ بھی درست نہیں کہ کسی زمانہ میں مولاناؒ پر ایسا جذبہ طاری ہوگیا ہو کہ آپ نے بولنا ترک کر دیا ہو اور اگر زبان سے کچھ نکلتا ہو تو اشعار فارسی۔

(۴) مثنوی کے مرتب ہونے کی جو کیفیت دی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، البتہ مولاناؒ کے دیوان پر یہ صادق آتا ہے کہ آپ عالمِ وجد و استغراق میں جو اشعار فرماتے تھے لوگ انھیں لکھ لیا کرتے تھے اور انھیں اشعار سے دیوان مرتب ہوگیا۔

اس روایت میں تسامح کی بنا، یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابن بطوطہ اول تو اس ملک کی زبان سے واقف نہیں تھے، ممکن ہے کچھ غلط فہمی ہو گئی ہو، دوسرے یہ کہ ابن بطوطہ جب تمام سفروں سے فارغ ہو کر مراقش میں آئے ہیں اس وقت (تقریباً ۷۵۵ھ میں) اپنے حالات سفر اس طرح لکھائے ہیں کہ خود بولتے تھے اور محمد بن محمد خبری لکھتے تھے، قونیہ کے ورود اور ان حالات کی تحریر میں کم و بیش کا فرق ہے، بس اس روایت کو یک سے خارج سمجھنا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ممکن ہے کہ کسی حلوا بیچنے والے کا کوئی ایسا واقعہ بھی پیش آگیا ہو اور یہ تو مولانا کی معمولی عادت میں داخل تھا کہ یکسوئی و تنہائی کے خیال سے کبھی کبھی دو چار دن بلکہ ہفتہ عشرہ کے لئے بلا اطلاع اس طرح روپوش ہو جاتے تھے کہ کسی کو پتہ نہ چلتا تھا۔ اس طرح مختلف واقعات نے مل کر ایک خاص واقعہ کی صورت اختیار کر لی۔

[یہاں ایک اور امر کی طرف بھی خیال جاتا ہے، قونیہ و اطرافِ قونیہ میں ایک گروہ "رضی" کا تھا۔ ابن بطوطہ اکثر انھیں لوگوں کے مہمان ہوا کرتے تھے۔

اور فصل چہارم کی ایک روایت سے معلوم ہوگا کہ مولاناؒ ان کے ایک خاص گروہ سے ناخوش بھی ہو گئے تھے، ممکن ہے کہ انھیں میں سے کسی نے مولاناؒ سے متعلق کوئی روایت نادرست پیرایہ میں ابن بطوطہ سے بیان کر دی ہو]

مناقب العارفین کی تصنیف کا آغاز ۷۱۸ھ میں ہوا اور ۷۵۴ھ تک اس کا سلسلہ جاری رہا، اس سے قریب ہی زمانہ کی تصنیف "الجواہر المضیۃ" ہے[عہ]۔ اس میں شمسؒ کی ملاقات کا حال اس طرح درج ہے کہ "مولاناؒ جلال الدین کے انقطاع و تجرد کا سبب یہ ہوا کہ ایک دن آپ اپنے مکان میں تشریف فرما تھے، اور ارد گرد کتابیں رکھی تھیں اور طلبہ بیٹھے ہوئے تھے، اسی اثنا میں شمس الدینؒ تبریزی وارد ہوئے اور کتابوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ کیا ہیں اور آپ کس حال میں ہیں؟ مولاناؒ نے جواب دیا کہ آپ ان باتوں کو کیا جانیں؟ ابھی یہ الفاظ ختم بھی نہیں ہوئے تھے کہ مکان اور کتابوں میں آگ لگ گئی، مولاناؒ نے کہا کہ یہ کیا؟ شمسؒ نے جواب دیا کہ آپ اسے کیا جانیں؟ یہ کہہ کر کھڑے ہو گئے، اور باہر نکل گئے، مولاناؒ نے خان و مان کو ترک کر دیا اور ملکوں ملکوں گھومتے پھرتے اور بہت کثرت سے اشعار کہتے رہے مگر شمسؒ سے پھر ملاقات نہیں ہوئی۔ اور شمسؒ اس طرح غائب ہوئے کہ پھر ان کا پتہ نہ چلا، بعضوں کا قول ہے کہ مولاناؒ کے حواشی نے انھیں قتل کر ڈالا۔[عہ۲]

نفحات الانس ۸۸۳ھ کی تصنیف ہے، اس میں شمسؒ کی ملاقات کی دو روایتیں

عہ مصنف "الجواہر المضیۃ" کی ولادت ۶۹۶ھ/۱۲۵۶ء میں اور وفات ۷۷۵ھ/۱۳۷۳ء میں ہوئی۔ عہ۲ نفحات الانس ص ۴۶۳-۴۶۴

درج ہیں، ایک تو بادنیٰ تغیر وہی روایت ہے جو سپہ سالار اور افلاکی سے نقل ہوئی دوسری روایت "بعضے گفتہ اند" کی قید کے ساتھ یہ ہے کہ جب حضرت شمس الدینؒ قونیہ پہونچے اور مولانا کی مجلس میں آئے تو اس وقت مولانا ایک حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور چند کتابیں سامنے رکھی ہوئی تھیں۔ شمسؒ نے پوچھا کیا یہ کتابیں ہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ یہ قیل قال ہیں آپ کو اس سے کیا کام؟ حضرت شمس الدینؒ نے تمام کتابیں اٹھا کر پانی میں ڈال دیں۔ مولانا نے سخت رنجیدہ ہو کر فرمایا کہ یہ کیا کیا؟ اس میں میرے والدؒ کے بعض فوائد تھے جو اب نہیں مل سکتے، شمس الدینؒ نے ہاتھ بڑھا کر ایک ایک کتاب حوض سے باہر نکال کر رکھ دی، کتابوں پر پانی کا اثر تک نہ تھا۔ مولانا نے کہا کہ یہ کیا راز ہے؟ شمس الدینؒ نے جواب دیا کہ یہ ذوق وحال ہے، آپ کو اس سے کیا مطلب؟ اس کے بعد وہی واقعات پیش آئے جو اوپر گذر چکے ہیں[۱]۔

تذکروں میں سے آتشکدہ آذر، خزینۃ الاصفیا اور تذکرہ نوشتہ وقار میں کتابوں کے پانی میں ڈالدینے کی روایت ہے اور بعض دوسرے تذکروں میں کتابوں میں آگ لگنے کی روایت ہے، ان سب کی تفصیل کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے، ماحصل سب کا ایک ہے۔

ان کے سوا ایک اور روایت بھی تذکروں میں منقول ہے کہ حضرت شمس الدینؒ کے پیر شیخ رکن الدین سجاسی نے آپ سے فرمایا کہ "روم میں جاؤ، وہاں ایک دل سوختہ ہے، اسے روشن کراؤ" آپ وارد قونیہ ہوئے۔ ایک روز دیکھا کہ مولانا سوار

---

[۱] الجواہر المضیئہ جلد دوم ص ۱۲۴ و ۱۲۵

چلے آر ہے ہیں اور لوگ گرد و پیش استفادہ کر رہے ہیں، شمسؒ نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ ریاضات و علوم سے غرض کیا ہے۔ مولاناؒ نے کہا کہ آداب شریعت کا جاننا، شمس نے کہا کہ نہیں، غرض یہ ہے کہ معلوم تک رسائی ہو جائے اور حکیم سنائیؒ کا یہ شعر پڑھا۔

علم کز تو ترا نہ بستاند　　　جہل ازاں علم بہ بود بسیار

مولاناؒ اس سے متیر اور متحیر ہوے اور تیر نشانہ پر بیٹھ گیا[1]

(یہ روایت مناقب العارفین میں حضرت شمسؒ کے حالات میں ایک دوسری طرح پر منقول ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے علماء کے ایک مجمع میں فرمایا کہ یہ علم حاصل کرنا اور اس کے لئے زحمتیں برداشت کرنا سب اس لئے ہے کہ نفس سرکش مطیع و منقاد ہو جائے، جیسے بیل کی گردن پر جوا رکھ دیتے ہیں کہ وہ سیدھی طرح کام کرے، پس اگر علم سے یہ نفع نہ حاصل ہو تو وہ علم رنج و زحمت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

علم کز تو ترا نہ بستاند　　　جہل ازاں علم بہ بود صد بار[2]

ان تمام روایات پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قونیہ میں مولاناؒ سے شمس تبریزیؒ کی ملاقات کی صورت وہی ہوئی ہے جو سپہ سالارؒ اور افلاکیؒ نے نقل کی ہے، خود مولاناؒ کی ایک غزل میں اشارہ ملتا ہے ؎

مرا بگرفت روحانی نگارے　　　کنارے و کنارے و کنارے

نبرد با من میانِ راہ تنگے　　　دو چارے دو چارے و دو چارے

. . . .

---

[1] آتشکدۂ آذر ص۲۲۳: دقار نے اس کو نظم کیا ہے جو مثنوی کے اکثر نسخوں میں ضم ہے۔

[2] حالات شمسؒ (نسخۂ قلمی)

گسست آں گرہ تندِ دلِ من　　　　فسارے وفسارے وفسارے

....

فتادہ در سرشس از شمس تبریز　　　　خمارے وخمارے وخمارے[۴۷]

حضرت بایزیدؒ کے متعلق جو سوال وجواب ہوا اس میں جزدی فرق قابل اعتنا نہیں دوسرا سوال جو مقصدِ علم سے متعلق ہے، ممکن ہے کہ یہ بھی اسی موقع پر ہوا ہو، مگر کتابوں میں آگ لگ جانے یا انھیں حوض میں ڈالدینے کی صورت بالکل جداگانہ ہے، مناقب العارفین کی بعض روایات مابعد پر جب لحاظ کیا جاتا ہے تو اس کی ایک اور ہی توجیہ خیال میں آتی ہے۔

مولاناؒ اور شمسؒ کی صحبت جب گرم ہوئی اور مولاناؒ نے ہر بات میں شمس کا اتباع شروع کیا تو شمسؒ نے مولاناؒ کو کتابوں کے دیکھنے سے بار بار منع کیا۔[علہ] چنانچہ اس کے متعلق ذیل کی روایتیں مناقب العارفین میں منقول ہیں۔

خود مولاناؒ کا قول ہے کہ جب حضرت شمس الدینؒ سے ملاقات ہوئی اور میرے دل میں آتش عشق شعلہ زن ہوئی تو آپ نے بحکم تمام یہ فرمایا کہ "آیندہ اپنے والد کے کلام کا مطالعہ

علہ اس قسم کی روایتیں دو بڑے بزرگوں کی نسبت کرامات ومرات منقول ہیں، چنانچہ خود حضرت نجم الدینؒ کبری کی نسبت یہ تحریر ہے کہ علوم ظاہر میں آپ کا یہ درجہ تھا کہ جس سے مناظرہ ومباحثہ کرتے اس پر غالب آجاتے تھے، اسی وجہ سے آپ کا لقب طامۃ الکبریٰ ہوگیا (جو بعد میں صرف کبریٰ رہ گیا) جب آپ بابا فرج کے مرید ہوئے" انھوں نے کتاب کے مطالعہ سے منع کیا، آپ ان دنوں میں شرح السنۃ کا مطالعہ کیا کرتے تھے سوچا کہ اسے تو تمام ہی کرلوں۔ کتاب لے کر بیٹھے ہی تھے۔ (دیکھئے بقیہ حاشیہ ص ۱۴۳ پر)

نہ کیا تیجہ "کچھ دنوں تک میں نے ایسا ہی کیا[۱]"

ایک مرتبہ اسی حال میں مولانا شمس الدینؒ آنکلے اور فرمایا کہ نہ پڑھے، نہ پڑھے، نہ پڑھے (تین مرتبہ تکرار کی)[۲]

انتہا یہ ہے کہ خود مولانا نے ایک روز بیان فرمایا کہ اوائل حال میں میں اپنے والدؒ کی کتابوں کا برابر مطالعہ کیا کرتا تھا اور ہمیشہ جیب میں رکھتا تھا، مولانا شمس الدینؒ نے ان کتابوں کے مطالعہ سے منع فرمایا اور میں نے ان کی خاطر سے ترک کر دیا۔ ایک روز خواب میں دیکھا کہ مدرسہ قراطائی میں ایک جماعت کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں اور اس کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوں، جب جاگا تو دیکھا کہ مولانا شمس الدینؒ تشریف لائے اور فرمایا کہ پھر اس کتاب کا مطالعہ کیوں شروع کر دیا، میں نے کہا کہ میں نے تو مدت سے اس کا مطالعہ ترک کر دیا ہے، فرمایا کہ مدرسہ قراطائی میں ایک جماعت کے ساتھ بیٹھے ہوئے آپ اس کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے، کیونکہ خواب اکثر فکر ہی کا نتیجہ ہوتا ہے، پھر مولانا شمس الدینؒ کی زندگی تک اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا[۳]

اسی طرح دیوان متنبی کے پڑھنے کو بھی منع کیا مگر مولاناؒ اس دیوان کا مطالعہ کیا کرتے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۱)
کہ بابا فرجؒ نے نمودار ہو کر فرمایا کہ "میں منع کر چکا ہوں اور پھر کتاب دیکھتے ہو" کتاب کا دیکھنا چھوڑ دیا، پھر خیال آیا کہ نقل کر لوں، مبادا ذہن سے زائل ہو جائے، لکھنے بیٹھے تو بابا فرجؒ پھر ظاہر ہوئے اور فرمایا کہ شیطان نے تمہیں تشویش میں ڈال رکھا ہے، "غرض قلم دوات بھی پھینک دی۔

۱؎ مناقب صفحہ ۲۷۰، ۲؎ مناقب صفحہ ۲۷۶

۳؎ مناقب صفحہ ۲۹۷، ۳۱۵

تھے ایک روز دیوان کو پڑھ کر سو رہے، خواب میں دیکھا کہ مدرسہ میں علماء و فقہا سے بحث کر رہے ہیں کہ ان لوگوں کو قائل کریں، خواب ہی میں پشیمان ہوئے کہ کیوں ایسا کیا، جب بیدار ہوئے دیکھا کہ مولانا شمس الدینؒ آ رہے ہیں اور آتے ہی فرمایا کہ "آپ نے دیکھ لیا کہ آپ نے ان فقیہوں کا کیا حال کیا، یہ سب دیوان متنبی کے مطالعہ کی بدبختی ہے۔"

ایک مرتبہ اور اسی طرح خواب میں دیکھا کہ مولانا شمس الدین متنبی کی ڈاڑھی پکڑے ہوئے مولانا کے سامنے لائے کہ اسی کے کلام کو آپ پڑھتے ہیں؟ متنبی نے التجا کی کہ مجھے مولانا شمس الدینؒ کے ہاتھ سے خلاص دلایئے اور آئندہ اس دیوان کے درپے نہ ہوئے رعلہ

ان تمام روایات سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ ممکن ہے کہ کسی ایسے ہی موقع پر حضرت شمسؒ نے کتابوں کو حوض میں پھینک دیا ہو، یا ان میں آگ لگا دی ہو، اور بمرور ایام یہی واقعات شمس الدین کی ابتدائے ملاقات کی طرف منسوب ہو گئے ہوں۔

[منازل فقر کے طے کرنے کے بعد دفاتر و کتب کے متعلق خود مولانا کے جو خیالات قائم ہو گئے تھے انھیں مثنوی شریف میں بکرات و مرات ظاہر کر دیا ہے اور پہلے ہی دفتر میں اپنے خیال کو رومیوں اور چینیوں کی حکایت کی تمثیل سے بہت خوبی کے ساتھ روشن فرما دیا ہے ؎

اہل صیقل رستہ اند از بو و رنگ	ہر دمے بینند خوبی بے درنگ
نقش و قشر علم را بگذاشتند	رایت عین الیقیں افراشتند

علہ مناقب ص ۲۷۶

رفت فکر و روشنائی یافتند   بر و بحر آشنائی یافتند

گرچہ نحو و فقہ را بگزاشتند   لیک محو و فقر را بر داشتند   ص۴۷

دوسرے موقع پر اصول کلی کے طور پر فرما دیا ہے کہ

دفتر صوفی سواد و حرف نیست   جز دل اسپید ہمچو برف نیست

ایک موقع پر خود حضرت شمسؒ الدین کی نسبت سے دیوان میں بھی یہ اشارہ کر دیا ہے کہ ؎

تا یک ورق از عشق تو حاصل کردم   ہی صد ورق از علم فراموشم شد

(اس کے متعلق مزید اشعار در الحکم میں تحت عنوان پیر اور صوفی دیکھنا چاہیے)

غرض، حضرت شمسؒ کی ملاقات کی صحیح و قرین قیاس صورت وہی ہے جسے سپہ سالارؒ اور افلاکیؒ نے بیان کیا ہے اور جو دوسری حکایتیں اس باب میں مشہور ہو گئی ہیں وہ بظن غالب دوسرے واقعات سے پیدا ہو گئی ہیں۔

سلطان ولدؒ نے یہ لکھا ہے کہ سید برہان الدینؒ کی وفات کے پانچ برس بعد شمس الدینؒ قونیہ میں وارد ہو کر مولاناؒ سے ملاقی ہوئے، سید برہان الدینؒ کی وفات ۶۳۷ھ میں ہوئی، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شمس الدینؒ ۶۴۲ھ میں قونیہ آئے۔ افلاکیؒ نے شمسؒ کی آمد قونیہ کی قطعی تاریخ ۲۶ جمادی الآخر ۶۴۲ھ (دسمبر ۱۲۴۴ء) متعین کر دی [۱] ہے، پس مولانا کی زندگی کا یہ دور ثانی ۶۴۲ھ سے سمجھنا چاہیے۔ مولاناؒ حضرت شمسؒ کو ہمراہ لے کر اپنے مقام پر آئے تو اس کے بعد بقول افلاکیؒ چالیس [۴۰] روز تک

---

[۱] مناقب ص۵۵۔ ڈاکٹر نکلسن نے (دیوان شمس تبریز ص۱۹ دیباچہ) یہ تاریخ دی ہے اور حاشیہ میں یہ اضافہ کیا ہے کہ رضا قلی کے قول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولاناؒ باسٹھ [۶۲] برس کی عمر میں شمسؒ تبریز سے پہلی بار

حضرتِ شمسؒ کے ساتھ ایک حجرے میں رہے جس میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا، ایک دوسری روایت ہے کہ تین ماہ حجرے میں رہے۔ سپہ سالارؒ نے لکھا ہے کہ چھ ماہ تک صلاح الدینؒ زرکوب کے حجرے میں دونوں بزرگ عزلت نشیں رہے، سوائے شیخ صلاح الدینؒ کسی کی مجال نہ تھی کہ حجرے میں داخل ہو سکے ؏

مولاناؒ کے دل میں شمسؒ کی جو قدر و منزلت قائم ہو گئی تھی اس کا اندازہ واقعاتِ مابعد سے پوری طرح ہو جائے گا، اور اس میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہے کہ مولاناؒ کے غزلیات

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۵

قونیہ میں ملے ہیں۔ اس تاریخ ۶۴۲ھ کی توثیق بظاہر دیوان کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے کہ ؎

باندیشہ فرو برد مرا عقل چہل سال — بہ شصت و دو شدم صید تدبیر بجستیم

رضا قلی نے دیوان کے دیباچہ میں یہ ضرور لکھا ہے "در شصت و دو سالگی چوں بہ شمس الدین رسید۔۔۔ مگر تمام واقعات مسلمہ کے خلاف اسے قبول کرنا دشوار و محال ہے، اس کے نسبت سمجھ لینا چاہیے لغزش قلم ہے، ذاکرؒ صاحب نے اس کی توثیق دیوان کے جس شعر سے کی ہے وہ قابلِ سند اس وقت سمجھا جاتا کہ اس شعر کے سوا کوئی دوسرا شعر اس مفہوم کا دیوان میں نہ ہوتا مگر اس مفہوم کے ایک دو نہیں سینکڑوں شعر دیوان میں موجود ہیں، اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ شعر مولاناؒ نے باسٹھ برس کے سن میں کہا ہے اور قیاس ہی سے کام لینا ہے تو خود اس غزل ہی سے اس قیاس کا بطلان ہوتا ہے کہ مولاناؒ اس عمر میں پہلی بار شمس تبریزؒ سے ملے اور شکار ہو گئے۔ غزل کا مطلع ہے ؎ دگر بار دگر از زنجیر بجستیم ؛ ازیں بند و ازاں دام زبوں گیر بجستیم۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سے قبل بھی بار بار اس دام میں پھنسے اور اس سے چھوٹ چکے تھے۔ دوسرا شعر ہے ؎

فلک پیر دوتائے، بر از سحر دو غائے — باقبالِ جوانِ تو ازیں پیر بجستیم

اس شعر سے صاف مترشح ہے کہ اس غزل کے مخاطب چلپی حسام الدینؒ ہیں۔ اس پر ایک دلیل یہ بھی ہے

نے شمسؒ کو حیات جاوید عطا کر دی، یہاں صرف ایک غزل کا مطلع و مقطع درج کیا جاتا ہے جس میں کمال عقیدت کے ساتھ انتہائی امتنان کا اظہار فرمایا ہے،

ماسر و پنجۂ قوت نہ ازیں جا داریم ما کر و فر سعادت نہ زکیواں داریم

. . . .

شمسؒ تبریز بمارا رہ حقیقت بنمود ما ز فیض قدم اوست کہ ایماں داریم

جلال الدین قراطائی نے جب اپنا مدرسہ مکمل کیا تو ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا، اس جلسہ میں اکابر و علماء کے درمیان یہ بحث چھڑی کہ صدر کہاں ہوتا ہے، سب نے اپنی اپنی رائے دی، آخر میں سب نے مولاناؒ کی طرف رجوع کیا، آپ نے فرمایا کہ علماء میں صدر صفہ کے درمیان ہوتا ہے، عارفوں میں کنج خانہ، صوفیوں میں کنار صفہ، عاشقوں کے مذہب میں صدر کنار یار ہے. یہ کہہ کر شمس الدینؒ کے پہلو میں جا بیٹھے۔ اسی روز اکابر قونیہ میں حضرت شمس الدین کی شہرت ہوئی (افلاکیؒ نے لکھا ہے کہ صدر کی یہ بحث پروانہ کے زمانہ میں دوسری مرتبہ ہوئی تھی۔)

شمسؒ کی صحبت نے مولاناؒ پر جو اثر کیا اور جو کیفیت پیش آئی، اسے سلطان ولدؒ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

بقیہ حاشیہ ص ۱۴۶

کہ شمسؒ جن غزلوں کے مخاطب ہیں ان میں "شمس" کا لفظ کسی نہ کسی طرح ضرور آیا ہے، مگر اس غزل میں شمسؒ کا نام نہیں ہے (یہ غزل رضا قلی ہدایت کے شائع کردہ انتخاب دیوان میں ہے، مگر کلیات مطبوعہ نولکشور میں نہیں ہے۔ خود غزل معرض بحث میں ہے) ۱؎ سپہ سالار ص ۲۶ ۲؎ مناقب ص ۔۔

شیخ استاد گشت نو آموز | درس خواندے بخدمتش ہر روز
گرچہ در علم فقہ کامل بود | علم نو بود کو بوے بنمود

یہ دوسرے کی زبان سے ہے خود مولانا کی زبان سے سنئے کہ کس لطف سے فرماتے ہیں۔

زاہد بودم، ترانہ گویم کردی | سرفتنۂ بزم و بادہ جویم کردی
سجادہ نشین باوقارے بودم | بازیچۂ کودکاں کویم کردی (لارباعیات)

دوسرے موقع پر غزل میں فرماتے ہیں کہ:۔

زاہد کشورے بدم واعظ منبرے بدم | کرد قضا دل مرا عاشق کف زنان تو (نسخہ قلمی حالات شمس)

ایک دوسرے موقع پر اپنی تغیر حالت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

بدیدم عشق را چو برج نورے | درون برج نورے ادچہ نارے
زدور استاد جانم در تماشا | بہ پیش آمد مرا خوش شہسوارے
یکے روے چو ماہی ماہ سوزے | یکے مریخ چشمے پر خمارے
ہمی تازید عقلم اندک اندک | ہمی پرید از سر چو طیارے
ہمی دانم دگر از من میپرس | کہ صد من نیست آنجا در شمارے
من آں آبم کہ ریگ عشق خوردش | چہ ریگے ملک بحرے کنارے

(د ۱۳۔ ص ۸۳۵)

نتیجہ یہ ہوا کہ شمسؒ کی ملاقات کے بعد مولاناؒ نے درس و تدریسؒ وعظ گوئی وغیرہ سب یک قلم ترک کردی[۱]۔ خود فرماتے ہیں،

---

[۱] مناقب ص ۲۰۔

عطار دو اردفتر پارہ بودم　　　زدست او زمانے می نشستم
چو دیدم لوح پیشانی ساقی　　　شدم مست و قلمہا را شکستم

شیخ صلاح الدینؒ کے ذکر میں افلاکیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت شمس الدینؒ کی ملاقات کے بعد سے مولاناؒ نے درس وتذکیر بالکل ترک کردی تھی اور کبھی وعظ نہیں کہا تھا۔ صرف ایک مرتبہ اپنے محبان مخلص اور شیخ صلاح الدینؒ کے اشارے سے وعظ فرمایا "وتذکیر آخر خود ہماں بود، دیگر بر بالائے منبر نرفت[1]"

لیکن یہ معاملہ صرف "ترک" تک نہیں رہا بلکہ "اخذ" کو بھی دخل ہوگیا، یعنی حضرت شمسؒ کے رغبت دلانے سے مولاناؒ سماع کی طرف متوجہ ہوگئے اور اس میں مولاناؒ کا انہماک آخر تک برابر بڑھتا گیا

حضرت بہاء الدینؒ کے متعلق یہ مذکور ہوچکا ہے کہ سلطان علاء الدینؒ چنگ سنا کرتا تھا، اس لئے آپ اس سے ملنے سے محترز رہے، مولاناؒ جس سختی سے اپنے والدؒ کے نقش قدم پر چلتے تھے وہ ظاہر ہے، خود جس پایہ کے عالم تھے وہ بھی عیاں ہے، ابتدائے حال میں آپ کا سماع سے منکر ہونا یقینی ہے، چنانچہ حضرت سلطان ولدؒ فرماتے ہیں کہ ـــ

"پیش از خدمتش ہرگز در سماع شروع نکردہ بود، و آں تجلیہا و مقامات کہ ہیچ وے را نبود در صورت نماز و تقوی بوے می رسید ؎

پیشتر از وصل شمس الدینؒ بجاں　　　بود در طاعات روز ان و شباں

---

[1] ذکر شیخ صلاح الدین، نسخہ قلمی

سال دمہ پیوستہ آں شاہ گزیں ، بود مشغولِ علوم و زہد و دیں !
آں مقاماتش ازاں ورزش رسید باتقی و زہد رہ راہی برید
اندراں مظہر بدش جلوہ ز حق ہر دمے می برد از حق نو سبق

سپہ سالارؒ نے آغاز توجہ فرمائی کی کیفیت اس طرح دی ہے :-

"مولاناؒ ابتدائے حال سے اپنے والد حضرت بہاء الدین کے طریق پر کاربند تھے درس و تدریس وعظ و تذکیر اور پابندی ریاضت میں مشغول رہتے ، جب مولانا شمس الدینؒ تبریزی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ "سماع اختیار کرو تاکہ جس طلب میں ہو وہ اور زیادہ ہو" (در سماع درآ کہ آنچہ می طلبی در سماع زیادہ خواہد شدن ، واقعی ایسا ہی ہوا ، پھر تو آخر عمر تک اس پر قائم رہے اور اسی کو اپنا طریق بنا دیا[۱] ۔"

مگر ان دونوں روایتوں کے خلاف افلاکیؒ کی ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شمسؒ کے آنے کے قبل مولاناؒ سماع کی طرف مائل ہو چکے تھے ، چنانچہ بقول افلاکیؒ سلطان ولدؒ نے ایک روز بیان کیا کہ میرے والد جوانی میں نہایت ہی زاہد اور بہت ہی پاکدامن شخص تھے ، ہرگز سماع کے قریب نہیں جاتے تھے ، میری نانی حضرت کرائے خاتون بزرگ نے میرے والدؒ کو سماع کی ترغیب دی ۔ آپ اس کے بعد سماع میں ہاتھ ہلایا کرتے تھے ، (دست افشانی می کردند) جب حضرت شمس الدینؒ پہونچے تو انھوں نے قلابازی (او را چرخ ازن نمود) مناقب ص۴۲۰ (نسخہ قلمی)

اس روایت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مولاناؒ فی نفسہ سماع سے منکر نہیں تھے ، عالمانہ شان کے ساتھ گاہ بگاہ مجلس سماع شرکت فرماتے رہے ہونگے ، حضرت شمسؒ کی صحبت نے دوسرا رنگ پیدا کر دیا ۔

---

[۱] سپہ سالار ص۳۲ ،

بہر حال اب یہ عالم ہوا کہ بغیر سماع کے مولاناؒ کو چین نہیں پڑتا تھا اور سماع آپ کا اور آپ کے اصحاب کا "دین و آئین" بن گیا۔

شد سماعش مذہب و راہِ درست　　　از سماع اندر دلش صد باغ رست
ہم شدند اصحابِ مشغولِ سماع　　　تا شد ایشاں را براں رہ اطلاع
ماند تا اکنوں براں سنت سماع　　　گشت یاراں را بہر جا اجتماع
جملگاں دیدند سودِ خود دریں !　　　شد سماع در قصدشاں آئین و دیں

سماع کے اختیار کرنے کے علاوہ، شمسؒ کے اثرِ صحبت سے مولاناؒ نے شاعری بھی شروع کر دی۔ سلطان ولدؒ فرماتے ہیں کہ ؎

شیخ مفتی ز عشق شاعر شد　　　گشت خمار اگرچہ زاہد بُد

خود مولاناؒ نے بھی ایک غزل میں اس طرف اشارہ کیا ہے اور نہایت لطیف پیرایہ میں اس تغیرِ حالت کا اظہار فرمایا ہے:-

ز بود عشق تو تسبیح دادلب بس زد　　　لبے بگردم لاحول و توبہ دل نستود
غزل سرا شدم ز دستِ عشق و دست زناں　　　بسوخت عشق تو ناموس و شرم ہر چہ بُود
عفیف و زاہد و ثابت قدم بدم چوں کوہ　　　کدام کوہ کہ بادِ تو اش چو کہ بربود
گر کہم ہم از آوازِ تو صدا دارم　　　دگر کہم ہمہ در آتشِ تو ام کہ دود
ز نورِ فخر آفاق شمسِ تبریزی　　　جہان دہر چہ در دہر ہست گشت ازو بوجود

(۱۵ ص ۳۲۲)

مولاناؒ کی شاعری کی مفصل بحث باب دوم میں آئے گی۔ یہاں صرف اس قدر اشارہ کر دینا کافی ہے کہ مولاناؒ کی شاعری حقیقی جذبات کا نتیجہ تھی۔ محض قافیہ پیمائی نہیں تھی اور علوم

ایسا ہوتا ہے کہ حضرت شمسؒ کو بھی شعر گوئی کا ذوق تھا اور اسی کا عکس مولاناؒ پر بھی پڑا جس کا آغاز اس انداز سے ہوا کہ پچاس ہزار اشعار کا دیوان حضرت شمسؒ کی یادگار رہ گیا اور سرانجام اس پر ہوا کہ تقریباً ستائیس ہزار اشعار کی وہ صوفیانہ مثنوی جس کی نظیر سے دنیا کی تاریخ ادب خالی ہے، اہل دل کا سرمایہ وجد و ذوق بنی ہوئی ہے۔

مولاناؒ جب اس طرح ہر بات میں حضرت شمسؒ کی پیروی کرنے لگے اور تمام تعلقات منقطع ہونے لگے تو یہ امر مولاناؒ کے شاگردوں اور مریدوں پر سخت شاق گزرا، ایک شورش کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس برہمی کے ساتھ گونہ حیرت بھی شامل تھی، شمسؒ کے حالات سے لوگ واقف نہ تھے، مریدوں کا خیال یہ تھا کہ "ہم نے عمریں مولاناؒ کی خدمت گزاردیں، مولاناؒ کی کراموں کو دیکھا، تمام اطراف واکناف میں آپ کی شہرت کا باعث ہوئے، اب ایک بے نام و نسب شخص آیا اور مولاناؒ کو سب سے الگ کر لیا کہ آپ کی صورت تک دیکھنا نصیب نہیں ہوتی، درس و تدریس، وعظ و تذکیر سب بند ہو گئی، ضرور یہ کوئی ساحر یا مکار شخص ہے ورنہ اس کی کیا ہستی ہے کہ ایسے پہاڑ کو یوں تنکے کی طرح بہا لیجائے"[ع۱]

غرض سب کے سب شمسؒ کے دشمن ہو گئے، مولاناؒ کے سامنے کچھ کہہ نہ سکتے تھے۔ ادھر ادھر مل جاتے تو برا بھلا کہتے اور رات دن اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے کہ کسی طرح حضرت شمسؒ کو وہاں سے نکالیں کہ پھر حسب سابق مولاناؒ کی صحبت سے فیضیاب ہو سکیں

حضرت شمس الدینؒ ان لوگوں کی گستاخیوں پر تحمل کرتے رہے اور سمجھتے رہے کہ

ع۱ ملخص رباب نامہ

مولاناؒ کے وفورِ عقیدت کی وجہ سے یہ لوگ اس طرح آزردہ ہیں مگر جب معاملہ حد سے تجاوز کر گیا اور آپ نے سمجھ لیا کہ اب انجام اس کا فتنہ و فساد پر ہوگا تو آپ ایک دن خاموشی کے ساتھ قونیہ سے نکل گئے[۱]۔ افلاکیؒ نے اس غیبت اول کی تاریخ روز پنجشنبہ یکم شوال ۶۴۳ھ دی ہے[۲]، آپ کی آمد قونیہ کی تاریخ اوپر مرقوم ہو چکی ہے کہ ۲۶ جمادی الآخر ۶۴۲ھ تھی، پس اس طرح بار اول قونیہ میں آپ کا قیام سوا برس رہا۔

شمسؒ کی جدائی مولاناؒ پر سخت شاق و گراں گزری، مریدوں نے جو کچھ سوچا تھا اس کے برعکس وقوع میں آیا ؎

چوں حزیں شد ز ہجر مولاناؒ — گشت مُعرض ز جملہ آں دانا!

دوستی را ازاں نفر ببرید — مرغ مہرش ز لانہ شاں بپرید

چونکہ آں رائے شاں نیامد راست — عکس شد آنچہ ہر یکے می خواست

گفتہ بودند اگر رود زیں جا — ماند آں شاہ و ماہ ماتنہا

ہمچو اول ازو عطا ببریم — بے لب و کام قند ہاش خوریم

. . . .

نشد ایں واں قدر کہ بود نماند — زاں دل باخت تار و پود نماند

(رباب نامہ)

سپہ سالارؒ نے بھی لکھا ہے کہ "بعد از ہجرت ایشاں خداوندگار از تمامت اصحاب

---

[۱] سپہ سالار ص ۹۶

[۲] مناقب ص ۶۰

انقطاع و عزلت اختیار کرد، چنانکہ باقی اصحاب و عزیزان نیز از افعال آں جمع در فراق آنحضرتؒ در ماندند و مدتے ازاں ورود غصہ بسر می بردند ......" عل

غرض ان لوگوں نے جو کچھ سوچا تھا، اس کے برعکس واقع ہوا، اس کے بجائے کہ شمسؒ کے چلے جانے کے بعد مولاناؒ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے، جو کچھ توجہ تھی وہ بھی جاتی رہی، اور ان ناقصوں کی وجہ سے اصحاب صدق و وفا بھی مولاناؒ کی صحبت سے محروم ہو گئے۔

اوپر یہ ذکر ہو چکا ہے کہ مولاناؒ کی شاعری کا آغاز بھی شمسؒ کی ملاقات کے بعد سے ہوا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمسؒ کے چلے جانے کے بعد مولاناؒ نے شعر کہنا بھی ترک کر دیا تھا، چنانچہ جو خط بعد میں شمس الدینؒ کو لکھا ہے اُس میں ارقام فرماتے ہیں کہ

یک غزل بے تو ہیچ گفتہ نشد   تا رسید آں مشرفۂ مفہوم

بقول سپہ سالارؒ انقطاع کلی کی یہ حالت اُس وقت تک قائم رہی کہ دمشق سے شمس الدینؒ کا خط مولاناؒ کے نام آیا، یہ خط بلا شان و گمان دفعۃً آ گیا تھا۔ عل اس خط کے پانے کے بعد مولاناؒ کی حالت کچھ بدلی، اور شمسؒ کے شوق و عشق میں سماع کی جانب متوجہ ہوئے، غزلیں بھی کہنے لگے، اور جن لوگوں نے حضرت شمسؒ کے خلاف حرکات میں شرکت نہیں کی تھی ان پر حسب سابق عنایت فرمانے لگے، لیکن جن لوگوں نے اس شرارت میں حصہ لیا تھا، ان کی جانب اب بھی مطلق التفات نہیں کرتے تھے۔ عل

معلوم ہوتا ہے کہ خط کے آنے اور خود حضرت شمسؒ کے تشریف لانے کے درمیانی زمانہ

عل سپہ سالار صـ ۶۲   عل "ناگاہ از حضرت شمس الدین بخداوندگار از محروسۂ دمشق مکتوب آمد"

سپہ سالارؒ صـ ۶۲   عل سپہ سالار ص ۶۷

میں مولاناؒ اور حضرت شمسؒ میں مراسلت جاری ہو گئی تھی مگر شورش کے کلیۃً محو نہ ہو جانے کی وجہ سے مولاناؒ نے حضرت شمسؒ کے بلانے میں ہنوز تامل کیا۔ افلاکیؒ نے چار خطوط نقل کئے ہیں، ان میں آخری خط سلطان ولدؒ کے ذریعہ سے روانہ فرمایا تھا اور بقیہ تین خط اس سے قبل بھیجے تھے۔ تینوں خطوط غزل کی صورت میں ہیں اور یہ غزلیں دیوان میں موجود ہیں۔ یہاں ابتدائی تین خطوط میں سے ہر ایک خط کے چند اشعار دیئے جاتے ہیں، پورا خط دیکھنا ہو تو دیوان کی طرف رجوع کیا جائے۔

نامۂ اول

ایّھا النّور فی الفواد تعال	غایت الجد و المراد تعال
ایھا السابق الذی سبقت	منک مصدوقۃ الوداد تعال
چوں بیائی زہے گشاد مراد	چوں نیائی زہے کساد تعال
انت کالشمس اذ دنت نارت	یا قریبا علی البعاد تعال

(۱۱-ص ۴۵۵)

نامۂ اول

اے ظریف جہاں سلام علیک	ان دائی و صحتی بیدیک
دارد ے درد بندہ چیست بگو	قبلۃ لو رزقت من شفتیک
گر بخدمت نمی رسم بہ بدن	انا الروح و الفواد لدیک

عہ مناقب العارفین میں دو شعر زیادہ یعنی تیرہ شعر ہیں (نسخہ قلمی)

گر خطا بے نیر سد بے حرف | پس جہاں پُر چرا شد از لبیک
شمس دین عیش دو دست نوشت یا | زانکہ پیدا شدہ است فی عینیک

(، ص ۴۴۴ ع۱)

نامہ سوم

زندگانی صدر عالی باد | ایزدش پاسبان وکالی باد

ع۱ اسی صفحہ پر گیارہ شعروں کی ایک دوسری غزل اور بھی ہے جس کا ردیف "سلام علیک" ہے۔
اس میں شیخ صلاح الدین کا بھی ذکر کیا ہے۔

اے شریف جہاں سلام علیک | وے غریب زماں سلام علیک

....

اے صلاح جہاں صلاح الدینؒ | بر تو تا جاودان، سلام علیک
شمسؒ تبریز راحتِ دل ماست | راحت روح و جاں، سلام علیک

(۹ ، ۱۱ ص ۴۴۴)

اس غزل کے علاوہ اور بھی دو غزلیں ہیں جنمیں حضرت شمسؒ کو سلام بھیجا گیا ہے مگر معلوم ہوتا ہے
کہ یہ دونوں غزلیں حضرت شمسؒ کی موجودگی میں کہی ہیں۔

از اول روز اے جان صد بار سلام علیک | در گفتن و خاموش صد بار سلام علیک
شمس الحق تبریزی دیدیم رخ خوبت | گفتیم زجان و دل کانوار سلام علیک

(۱۶ ، ص ۴۳۹)

آیا برائے تو در جان ما سلام علیک | غلام تیحری از ان بیا سلام علیک
چہ شہر مسارم از انعام شمس تبریزی | کہ لحظہ لحظہ در دو دست با سلام علیک
(۱۵-۴۴۲)

هرچہ بنہ است مقبلاں را عیش | پیش و نقد وقت حالی باد
بخت نقد است شمس تبریزی | او بسم غیر او حالی باد

(ص۔ ۷، ۲۴۳)

ان خطوط سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مولانا نے شمسؒ کو قونیہ آنے کی ترغیب دی ہے مگر قطعی کچھ نہیں لکھا ہے اور اس کی وجہ غالباً یہی ہوگی کہ سرکشوں کا فتنہ بالکل فرو نہ ہوا ہوگا، مکتوب اول کے آخری دو شعر واد طلب ہیں کہ کس خوبی سے اپنا اشتیاق بھی ظاہر فرمایا ہے اور قطعی التجا بھی نہیں کی ہے، آنا باعث کشاد ہے، نہ آنا موجب کساد ہے، آپ کا آنا آفتاب کا قریب آجانا ہے کہ سب کو جلا کر راکھ کر دے۔

دوسرے خط میں یہ ظاہر فرمایا ہے کہ اگرچہ جسماً بعید ہوں مگر روحاً قریب ہوں اور اس حرمان اور اس کے انقطاع کی تدبیر بھی خود ہی بتائی ہے۔

تیسرے خط میں زیادہ صراحت کر دی ہے کہ اب ہجر کو زیادہ طول نہ دیجیے،

چوتھے خط میں صاف لکھ دیا ہے کہ۔ ؎

آں عناں را بدیں طرف برتاب | زفت کن پیل عیش را خرطوم!

اس اثنا میں سوزش بہت کچھ فرد ہو گئی، کیونکہ منکرین و مفسدین نے جب یہ دیکھا کہ وہ بالکل مبغوض و محجوب ہوئے جاتے ہیں تو بہ و استغفار کیا اور مولاناؒ کی خدمت میں آکر عذر خواہی کی ؎

پیش شیخ آمدند راہ کنساں | کہ بجا آنہ کمن دگر ہجراں
تو بہامی نعیم رحمت کن | گر دگر ایں کنیم لعنت کن
چہ سر سارم از انعام شمس تبریزی | تحفہ لحظہ در دست با سلام علیک

جب مہینوں اس طرح گریہ وزاری کرتے رہے تو مولاناؒ نے بھی درگذر سے کام لیا اور آپ کا دل ان لوگوں کی طرف سے صاف ہو گیا۔

یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ اب لوگوں نے شمسؒ کی مخالفت ترک کر دی ہے۔ مولاناؒ نے شمسؒ کو واپس بلانے کی تدبیر کی۔ سلطان ولدؒ نے اس تمام کیفیت کو بہت تفصیل سے دیا ہے۔ ہم اسی نظم کو نثر کئے دیتے ہیں۔

"مولاناؒ ظاہراً و باطناً مجھ پر (سلطان ولدؒ) حد سے زیادہ عنایت فرماتے تھے، بلا کر کہا کہ تم میری طرف سے اس شاہ مقبول کے پاس جاؤ، یہ روپیہ لیجا کر ان کے قدموں پر نثار کرو، اور میری جانب سے کہو کہ جن مریدوں نے گستاخی کی تھی وہ سب صدق دل سے توبہ کرتے اور یہ التجا کرتے ہیں کہ جو خطا ہوئی درگذر فرمایئے اور اس جانب قدم رنجہ فرمایئے، میں نے والدؒ کی گفتگو سن کر سر جھکا دیا، خدا کا شکر کیا اور کہا کہ میں جاتا اور انھیں لاتا ہوں، نہایت ذوق و شوق سے روانہ ہوا، راستہ کی صعوبتوں کا کچھ خیال دل میں نہ لایا، آخر دمشق پہونچکر حضرت شمس الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سر نیاز زمین پر رکھا، آپ نے لطف و عنایت فرمایا اور بہت کچھ حقائق و معارف بیان فرمائے، جب اصل مقصود رسالت کو سنا تو خوشی سے قبول فرمایا، اور دمشق سے روم کی جانب روانہ ہوئے، میں کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے صدق و ادب کے خیال سے آپ کی رکاب میں پیدل روانہ ہوا، حضرت نے فرمایا کہ تم بھی فلاں گھوڑے پر سوار ہو جاؤ، عرض کیا کہ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ شاہ بھی سوار ہو اور بندہ بھی سوار ہو مجھے اس سے معذور رکھئے، مجھے آپ کی رکاب میں پیادہ چلنا ہی زیب دیتا ہے، غرض اسی طرح ایک ماہ سے زائد کا راستہ پیاپیا طے کیا، راستہ اگرچہ دشوار گزار تھا مگر حضرت کے

حقائق و معارف کے بیان سے سب سختیاں بھول جاتی تھیں، اس راستہ میں ایسے ایسے اسرار منکشف ہوئے کہ یہ سعادت کسی کو نصیب نہ ہوئی ہوگی ،

سلطان ولدؒ کی اس روئداد میں سپہ سالارؒ[1] کے بیان سے جو اضافے ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ مولاناؒ کے تمام اصحاب نے جمع ہوکر سلطان ولدؒ سے یہ التماس کی کہ کچھ لوگوں کو لے کر مولانا شمس الدینؒ کی طلب میں دمشق کی طرف روانہ ہوں، اور انھیں لوگوں نے بہت کچھ سیم و زر شکرانہ اور خرچ راہ کے لئے دیا، مولاناؒ نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا اور آپ کا اشارہ پاکر سلطان ولدؒ دمشق کو روانہ ہوئے ۔

مولاناؒ نے ذیل کی غزل حضرت سلطان ولدؒ کے ذریعہ سے روانہ فرمائی ۔ یہ چوتھا خط تھا جو حضرت شمسؒ کو دمشق میں بھیجا۔[2]

---

[1] سپہ سالار ص ۶۷-۱۸

[2] زین العابدین شروانی نے اپنے دیباچہ مثنوی (ص ۶) میں لکھا ہے کہ جب سلطان ولدؒ کو دمشق روانہ کیا تو (منجملہ دیگر ہدایات کے یہ بھی) فرمایا کہ یہ ابیات پڑھنا۔

بروید اے حریفاں بکشید یار ما را	بمن آورید حالا صنم گریز پا را
(بہ ترانہائے شیریں بہ بہانہائے زرّیں	بکشید سوئے خانہ مہ خوب خوش لقا را)
اگر او بوعدہ گوید کہ دمِ دگر بیاید	مخورید مکر او را بفریبد او شما را
دم سخت گرم کہ بہ جادوئے و افسونے	بزند گرہ بر آب و ببندد او ہوا را

سوانح مولاناؒ (ص ۱۶) میں بھی ہے کہ "ان اشعار (یعنی خط منظومہ) کے علاوہ ایک غزل بھی ۱۵ شعر کی تھی جسکے دو شعر دیباچہ مثنوی میں نقل کئے ہیں (دیباچہ مثنوی کی مراد یہی زین العابدین کا دیباچہ ہے) اور صاحب

بخدائے کہ در ازل بودست — حیّ و دانا و قادر و قیوم
نور او شمع ہائے عشق افروخت — تا بشد صد ہزار سر معلوم
از یکے حکم او جہاں پُر شد — عاشق و عشق و حاکم و محکوم
در طلسمات شمسؒ تبریزی — گشت گنج عجائبش مکتوم
کہ ازاں دم کہ تو سفر کردی — از حلاوت جدا شدیم چو موم
ہمہ شب ہمچو شمع می سوزیم — ز آتشِ جفت و از انگبیں محروم
در فراقِ جمالِ تو مارا — جسم ویران و جان ہمچوں بوم
آں عناں را بدیں طرف برتاب — زفت کن پیل عیش را خرطوم
بے حضورت سماع نیست حلال — ہمچو شیطاں طرب شدہ مرجوم
یک غزل بے تو ہیچ گفتہ نشد — تا رسید آں بہ مسترقہ مفہوم
پس بذوق سماع نامۂ تو — غزلے پنج و شش بشد منظوم
شام و نور صبح روشن باد — اے بتو فخر شام و ارمن و روم

دمشق پہنچکر ہر طرف جستجو کی، چند روز کے بعد حضرت شمس الدینؒ کا پتہ چلا، وہاں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۹)
سوانح مولانا روم نے اسی کو سند قرار دیا ہے۔)

سپہ سالارؒ اور افلاکیؒ نے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا ہے مگر اقتضائے حالات کے اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل اسی موقع پر کہی گئی ہے۔

(زین العابدین نے لکھا ہے کہ یہ غزل پندرہ شعروں کی ہے مگر کلیات (ص ۶۵) میں گیارہ ہی شعر ہیں دو ہرا شعر جو نوسین میں ہے وہ زین العابدین کے دیباچہ میں نہیں ہے)

لوگوں کو حضرت شمس الدینؒ کے موجود ہونے کا علم نہیں تھا۔

حضرت شمس الدینؒ نے مولاناؒ کا پیغام سُن کر فرمایا کہ سیم وزر سے مجھے کیا فریب دیتے ہو، مولانا سے محمدی سیرت کا پیغام کافی ہے، مولاناؒ کے اشارت سے کیونکر تجاوز کر سکتا ہوں۔[علہ]

سامان سفر کے درست ہونے تک دمشق میں قیام رہا، اور اس تمام دوران میں مجالسِ سماع گرم رہیں۔

قونیہ پہنچنے پر حضرت شمس الدینؒ نے مولاناؒ سے سلطان ولدؒ کی بہت ستائش کی، اور آپ کے پیادہ چلنے کا حال بیان کیا۔ مولاناؒ بنہایت خوش ہوئے۔ اور سلطان ولدؒ کے حسن ادب کی بہت تعریف کی۔

افلاکیؒ سے جو مزید حالات معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ

"مولاناؒ نے جب سلطان ولدؒ کو شمسؒ تبریزی کی جستجو میں دمشق بھیجا تو یہ فرمادیا تھا کہ انھیں جبل صالحیہ کی سرائے میں ایک فرنگی بچہ کے ساتھ نرد کھیلتے ہوئے پاؤ گے، جب شمس الدینؒ جیتتے ہیں تو اس سے کچھ رقم لیتے ہیں اور جب وہ لڑکا جیتتا ہے تو مولانا شمس الدینؒ کو چپت مارتا ہے۔ غلطی میں نہ پڑنا اور منفعل نہ ہونا کہ وہ لڑکا بھی اولیاء اللہ سے ہے مگر اپنے کو جانتا نہیں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، جب مولانا شمس الدینؒ قونیہ کو روانہ ہوئے تو وہ فرنگی بچہ اپنے ملک کو چلا گیا اور وہاں مولاناؒ کی نیابت

علہ "ما را بسیم وزر چہ می فریبد، ما را طلب مولانائے محمدی سیرت کفایت است و از سخن و اشارت او تجاوز چگونہ تواں کردن" سپہ سالار ص ۷۲

کرتا رہا[1]"

جبل صالحیہ میں حضرت شمس الدینؒ کا قیام ضرور رہا ہے کیونکہ مولانا نے اپنی غزل میں بھی اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے ؎

اندر جبل صالح کانیست ز گوہر　　　　زاں گوہر ما غرقہ دریائے دمشقیم

مگر یہ تصریح سپہ سالارؒ کے اس بیان کے خلاف واقع ہوتی ہے کہ دمشق پہونچکر ہر طرف جستجو کی اور چند روز بعد حضرت شمس الدینؒ کا پتہ چلا" ممکن ہے کہ جب سلطان ولدؒ حضرت شمس الدینؒ کی خدمت میں پہنچے ہوں اس وقت آپ نرد کھیل رہے ہوں، اور اسی روایت میں کچھ اضافہ مابعد ہوگیا اس سے اصل مقصود پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

[شمس الدینؒ کے پہلی بار ناراض ہو کر چلے جانے اور پھر واپس آنے کے متعلق "سوانح مولانا روم" میں ایک عجیب عبارت درج ہے کہ

"مثنوی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ شمسؒ اول دفعہ جب ناراض ہو کر چلے گئے تو اپنے وطن تبریز پہونچے، اور مولانا خود جا کر ان کو تبریز سے لائے چنانچہ خود مثنوی میں اس واقعہ کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا ہے۔

ساربانا! بار بکشا ز اشتراں　　　　شہر تبریز است و کوئے دلستاں

فر فردوس است ایں پالیز را　　　　شعشعۂ عرش است ایں تبریز را

ہر زمانے فوج روح انگیز جاں　　　　از فراز عرش بر تبریزیاں[2]"

مثنوی شریف کے قلمی و مطبوعہ نسخے چالیس سے کم اس عاجز کی نظر سے نہ گزرے ہونگے مگر

---

[1] مناقب نسخہ قلمی ورق ۱۷،

ان میں سے کسی مثنوی کے دیباچہ سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ مولاناؒ تبریز جا کر حضرت شمس الدینؒ کو وہاں سے واپس لائے تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ "مثنوی کے دیباچہ" سے مراد زین العابدین شروانی کا وہ دیباچہ ہے جو کشف الابیات والے نسخۂ مثنوی کے ساتھ شامل ہے اور شروانی کا ماخذ دولت شاہ کے یہ الفاظ معلوم ہوتے ہیں کہ "شمس الدینؒ از مولانا پنہاں بجانب تبریز گریخت .... و مولاناؒ بطرف تبریز آمد و باز .... شمسؒ را ہمراہ بروم برد"[1]

جن اشعار کا اس جانب اشارہ بتایا جاتا ہے وہ دفتر ششم کے اختتام کے قریب کی اس حکایت میں ہیں جنمیں ایک قرضدار اپنے ادائے قرض کی امید میں بدرالدین تبریزی سے ملنے کے خیال سے تبریز گیا ہے۔ مولانا نے تبریز کی مدح میں اسی شخص کی زبان سے چھ اشعار ادا کئے ہیں جنمیں پہلے تین شعر عربی کے ہیں اور آخری تین شعر وہی ہیں جو اوپر درج ہوے۔ اس سے خود مولاناؒ کا تبریز جانا کسی طرح ثابت نہیں ہوتا اور خود مصنف "سوانح مولانا روم" (وہی صفحۂ قبل) سلطان ولدؒ کے دمشق جانے اور شمسؒ کو لانے کے حالات تفصیل کے ساتھ درج کر چکے ہیں، پس اس تناقض کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ مصنف ممدوح سے اتفاقاً سہو گیا۔

مثنوی شریف کے ان اشعار سے تو نہیں مگر دیوان کی بعض غزلوں سے کچھ اشارہ اس امر کا ملتا ہے کہ شمسؒ کی غیبت اول خواہ دوم کے بعد مولاناؒ کو یہ خیال تھا کہ آپ تبریز میں ہونگے چنانچہ اشعار ذیل سے اس کی توثیق ہوتی ہے۔

---

[1] تذکرۃ الشعراء صفحہ ۔ اکثر علمائے یورپ نے بھی یہ خیال ظاہر کیا ہے چنانچہ .... نے لکھا ہے کہ حضرت شمسؒ تبریز کو بھاگ گئے، مولاناؒ بھی ان کے پیچھے پیچھے پہنچے اور انہیں تزک و احتشام کے ساتھ واپس لے گئے۔

فاش بگو کہ شمس دینؒ ... وشہ یقیں — در تبریز ہمچوں دین اوست نہان و مستتر

(۸ ۔ ص ۲۶۲)

ہلا اے شاہد رعنا ز در حجرہ بیا — تا بروے تو شود شاد دلِ غمگینم
وقت صحبت بر آر سوے تبریز در بیا — ہلا اے یکِ صبا نامۂ شمس الدینم

(ص ۵۴۳)

شمسؒ تبریز کہ بنمود بہر دیدہ عیاں — حاضر است او و نہانم تنّا ہا یا ہو
شمسؒ تبریز کہ دانندۂ اسرار دل است — غیر از و ہیچ ندانم تنّا ہا یا ہو
شمسؒ تبریز کہ غائب شد ازیں چرخ کبود — کن نشانش بنشانم تنّا ہا یا ہو
شمسؒ تبریز کہ تبریز از و معمور است — اوست نورِ دل و جانم تنّا ہا یا ہو

(۷ ۔ ص ۱۵ے)

ایک اور غزل کے بعض اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین شمسؒ کی طرف سے مولاناؒ سخت غصہ میں بھرے ہوئے ہیں اور مقطع سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ تبریز جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔

بادہ نمی بایدم، فارغم از درد و صاف — تشنۂ خونِ خودم، آمد وقتِ مصاف

بقیہ حاشیہ ص ۱۶۳:
مگر اس کے بعد ہی پھر لوگوں نے انھیں (حضرت شمسؒ کو) ستانا شروع کیا اور وہ دمشق کو چلے گئے، جہاں دو برس رہے" یہ صحیح ہے کہ حضرت شمسؒ جب قونیہ سے پہلی بار گئے ہیں تو تقریباً دو برس دمشق میں رہنے کے بعد پھر قونیہ واپس آئے ہیں مگر یہ غیبت اول تھی۔ غیبت ثانی کے بعد پھر حضرت شمسؒ کا کچھ پتہ نہ چلا، پس دمشق جانے سے قبل تبریز کا جانا اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ غیبت اول سے قبل کسی وقت تبریز گئے ہوں مگر اس کا کوئی ثبوت کہیں سے نہیں ملتا۔ ۱ ایک لفظ نہیں پڑھا گیا۔

برکش شمشیر تیز، خونِ حسوداں بریز | تا سرِ بے تن کند گردِ تنِ خود طواف
گوش بوعا کن بیچ می باسکن | سلطنتِ قہرمان نیست چنیں دست باف

....

ہیں بزن اے فتنہ جو سرِ سنگ ایں سبو | تا نکشم آب جو تا نکنم اعتراف
ترک سقائی کنم غرقۂ دریا شوم | دور ز جنگ و خلاف بیمی از اعتراف
خیز بہ تبریز رو در طلبِ شمس دیںؒ | تا دل و جانت شود در رہ اخلاص صاف

(۱۸۔ ص ۴۲۳-۴۲۴)

ایک دوسری غزل میں ارشاد ہوتا ہے کہ

چونکہ بہ تبریز روم شمسؒ بود ہمدم من | با خبرم از نظرش، با خبرم با خبرم

(۵۔ ص ۵۱۹)

ایک اور غزل ہے جس میں ایسے اشارات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے گویا تبریز سے کوئی شخص مولاناؒ کو طلب کر رہا ہے۔

یوسفی از چاہ و زنداں چارہ نیست | سوئے زہر قہر چوں شکر بیا

....

در صفاتِ دل گرفتی در سفر | ہمچو دل، بے پا بیا، بے سر بیا
چوں لبِ لعلش صلائے میدہد | گر نئی چوں خارۂ مرمر بیا
چوں ز شمسؒ الحق جہاں پُر نور شد | سوئے تبریز اے دلا زو تر بیا

(۹۔ ص ۷۳)

ایک دوسری غزل ہے جس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولاناؒ کسی وقت خود تبریز میں

موجود تھے۔

بر سر کوئے تو دلم زار و نزار خفت دوش　　کرد خیال تو گزر دید بداں صفت ورا
گفت چگونہ ازیں عارضۂ گراں بگو　　کز تنگی زدیدہا رفت تن تو در قفا
گفت چو گذشت او ز من لیک از ذوق آن سخن　　صحت یافت این دلم از ہمہ علت و عنا
سوئے شراب خانہ رو جرعۂ عشق نوش کن　　تاکہ ز فیض فضل او باز رسد ترا شفا
در تبریز تا شدم از مئے عشق بیخودم　　بادۂ صاف خوردہ ام از کف ساقیٔ صفا

(١٢۔ ص٥٠)

ایک پوری غزل گیارہ شعروں کی تبریز کے وصف میں ہے اگر محض قیاس سے کام لیا جائے تو اس غزل کے اشعار سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مولاناؒ نے تبریز کا عزم فسخ کر دیا تھا۔

دیدہ حاصل کن دلا، وانگہ ببیں تبریز را　　بے بصیرت کے تواں دیدن چنیں تبریز را
نفس تو عجل سمیں و تو مثال سامری　　چوں شناسد دیدۂ عجلِ سمیں تبریز را
چوں درختے را ببینی مرغ کے بینی درو　　بس چہ گویم با تو جانِ جاں ایں تبریز را

(١١۔ ص٦٠)

اصل یہ ہے کہ تبریز کے متعلق اشارات مولاناؒ کی غزلوں میں بہت ہی کثرت سے ملتے ہیں۔ اور ان غزلوں میں بہت سی وہ فراقیہ غزلیں بھی ہیں جو شمسؒ کی غیبت کے زمانہ میں کہی گئی ہیں، اور یہ معلوم ہے کہ شمسؒ کی غیبت اول کے بعد مولاناؒ شعرگوئی سے بالکل خاموش ہو گئے تھے، اس کے برخلاف شمسؒ کی غیبت دوم کے بعد آپ نے نہایت کثرت سے ان کے فراق میں غزلیں کہیں، پس جن فراقیہ غزلوں میں تبریز کا ذکر آیا ہو وہ وہی ہیں جو شمس کی غیبت دوم کے بعد لکھی گئی ہیں، پس اگر ان غزلوں کے اشارات و کنایات سے مولاناؒ کا تبریز جانا مترشح ہو تو اسے اس غیبت دوم کے بعد سمجھنا چاہئے، لیکن اسے ظن د

گمان سے زیادہ وقیع نہیں قرار دے سکتے۔ قطعاً کہیں سے ثابت نہیں ہے کہ مولانا شمسؒ کی جستجو میں کسی وقت تبریز گئے ہوں۔

ان تمام اشارات وکنایات کی حقیقت کو مولاناؒ نے خود ایک رباعی میں صاف واضح کردیا ہے اس کے بعد کسی بحث کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ؎

از عشق تو ہر طرف یک شبخیزے | شب گفتہ ز زلفین تو عنبر بیزے
نقاش ازل نقش کند ہر طرفے | از بہر قرار دلِ من تبریزے

اصل یہی ہے کہ حضرت شمسؒ کے تعلق سے تبریز کا ایک خیال مولاناؒ کے دل جاگزیں ہوگیا تھا، عالم تصور میں طرح طرح کی صورتیں اختیار کرتا رہتا اور مختلف طریقوں سے دل سے نکل کر زبان پر آتا رہتا تھا، ورنہ واقعتًا مولاناؒ تبریز نہیں گئے تھے۔

حضرت شمسؒ کے قونیہ پہنچنے پر مولاناؒ کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہی، جن لوگوں سے گستاخیاں سرزد ہوئی تھیں سب نے آآ کر معافی مانگی۔ پھر تو یہ دستور ٹھہرا کہ لوگوں نے باری باری سے مجلس سماع منعقد کرنا شروع کی اور ایک مدت تک یہ صحبت بے کدورت اسی طرح برقرار رہی، اسی اثنا میں شمسؒ کے ساتھ مولاناؒ کا اخلاص واتحاد پہلے سے زیادہ بڑھتا گیا۔

۶۴۳ھ میں شمسؒ پہلی بار قونیہ سے گئے تھے اور پھر واپس آنے کے بعد دوسری مرتبہ ۶۴۵ھ میں اس طرح غائب ہوئے کہ پھر آپ کا پتہ نہ چلا۔ شمسؒ کی اس غیبت اول کے زمانہ میں مولاناؒ نے زیادہ غزلیں نہیں کہیں، مولانا کی فراقیہ غزلیں جس قدر ہیں وہ زیادہ تر شمسؒ کی غیبت دوم کے بعد کی ہیں لیکن وصالیہ غزلیں زیادہ تر انھیں دو برسوں میں کہی گئی ہیں، ان غزلوں میں جس جوشِ عقیدت اور ولولۂ قلبی کا

اظہار ہوا ہے اس کا اندازہ تو دیوان کے دیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے یہاں صرف نمونۃً دو غزلوں کے چند اشعار دیئے جاتے ہیں جن سے ایک خفیف سا تصور مولانا کی فرحت و انبساط کا ہو سکتا ہے۔ پہلی غزل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو شمسؒ کے دمشق میں ہونے کا علم ہو چکا ہے اور آپ حضرت شمسؒ کی آمد کے متوقع ہیں، دوسری غزل اس وقت کی معلوم ہوتی ہے جب حضرت شمسؒ آ گئے ہیں اور رنج و حرمان عیش و شادکامی سے مبدل ہو چکے ہیں۔

(۱)

امروز خندانیم و خوش، کاں بخت خنداں میرسد　　سلطان سلطانان ما، از سوئے میداں میرسد

امروز توبہ بشکنم، پرہیز را برہم زنم　　کاں یوسفِ خوبانِ ما، از سوئے کنعاں میرسد

مست و خراماں میروم، پوشیدہ چوں جاں میروم　　پرسان و جویاں میروم، آنسو کہ سلطاں میرسد

فرمان ما کن اے پسر، بادہ وفا کن اے پسر　　نسیہ رہا کن اے پسر، کامروز فرماں میرسد

ہاں اے پسر ہاں اے پسر، خود را ببیں در من نگر　　زیرا ز بوے زعفراں گریندہ خنداں میرسد

باز آمدی کف میزنی، تا خانہا ویراں کنی　　زیرا کہ بر ویرانہا خورشید رخشاں میرسد

خونی و خونخوارہ گہ خستگاں را چارہ،　　چارہ کن بیچارہ، کز سوئے ایشاں میرسد

امروز مستاں را بجو، عیبم مبیں، عیبم مگو　　زیرا ز مستیہاے او حرفِ پریشاں میرسد

بینا شدم، بینا شدم، در گفت ناپروا شدم　　کز شمسؒ دینم ہر زماں نزلِ فراواں میرسد

(۱۲۔ ص ۲۵۱)

(۲)

باز شیرے با شکر آمیختند　　عاشقاں با ہم گر آمیختند

روز و شب را از میاں بر داشتند — آفتابے با قمر آمیختند
رنگِ معشوقان و رنگِ عاشقاں — جملہ ہمچو سیم و زر آمیختند
چوں بہارِ سرمدی حق رسید — شاخِ خشک و شاخِ تر آمیختند
رافضی انگشت و در دنداں گرفت — ہم علیؓ و ہم عمرؓ آمیختند
بر یکے تخت اندر آیند ہر دو شاہ — بلکہ خود در یک کمر آمیختند
ہر شرابے کز کفِ ساقی خوری — جملہ با قند و شکر آمیختند
من دہاں بستم تو باقی را بداں! — کایں نظر با آں نظر آمیختند
بہر نورِ شمسؒ تبریزی تنم — شمع دارش با شرر آمیختند

(۱۳ - ص ۲۹۰)

ایک روایت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس مرتبہ قونیہ پہونچکر حضرت شمسؒ الدین لوگوں سے ملنے جلنے میں محتاط رہتے تھے تا آنکہ لوگ خود آپ کی نسبت شک میں پڑ گئے تھے، مناقب العارفین کے الفاظ یہ ہیں کہ

"لوگوں میں سخت غلغلہ مچا ہوا تھا کہ مولانا شمسؒ الدین وہی ہیں یا نہیں، لوگ جتنا ہی چاہتے تھے کہ ان سے ملیں اور ان کی حالت کا پتہ لگائیں وہ اتنا ہی گریز کرتے تھے" اتفاقاً اگر کوئی موقع ایسا آجاتا اور لوگ آپ کی شان میں کچھ سوادبی کرتے تو آپ نہایت لطف و حلم سے جواب دیتے تھے، چنانچہ ایک روز فرمایا کہ "جو لوگ میرے کلام میں دخل دیتے ہیں وہ تاریک پانی میں گرتے ہیں، میں ولی ہوں یا نہیں ہوں تمہیں اس سے کیا، میری دعا یہی ہے کہ خدا تمہیں اس سے بہتر کوئی شغل عطا کرے، مثلاً یہ کہا کہ ایک مرتبہ لوگوں نے کسی بھوکے سے کہا کہ دیکھو خوان لے جا رہے ہیں،

اس نے کہا کہ مجھے کیا، لوگوں نے کہا تمہارے ہی گھر کو لے جا رہے ہیں، کہا تو پھر تمہیں کیا؟ اسی وجہ سے میں لوگوں سے بھاگتا ہوں کہ وہ اس تشویش سے محفوظ رہیں[1]

علیٰ ہذا کسی شخص نے ایک مجمع میں مولانا کی مدح کی کہ ان میں بنہایت شان نور ہے اور مولانا شمس الدین میں یہ بات نہیں ہے، (یعنی مولانا شمس الدین سے انکار کیا) مولانا شمس الدین نے جواب دیا کہ "جو باطل کا معتقد ہوا اور اس کی پیروی کرتا ہو اس میں یہ شان دلنور کہاں سے ہوگا بلکہ وہ ہر دو حق کی اقتدا کرتا ہوگا نہ کہ باطل کی۔ تم اولیاء اللہ کا نشان نہیں جانتے، آدمی جب عاجز ہوتا ہے تو اس عجز سے روشنی پیدا ہوتی ہے یا تاریکی، ابلیس عجز سے تاریکی میں پڑا، ملائکہ کو روشنی حاصل ہوئی[2]

اکابر و عظام کو جب حضرت شمس الدین کی ملاقات کی آرزو ہوتی تو اول چلپی سے عرض کرتے اور آپ ہی کی سفارش سے لوگوں کا وہاں گزر ہوتا، حضرت شمس الدین ایسے موقعوں پر فرمایا کرتے کہ اگر فلاں شخص کی نیت صادق ہے تو دس ہزار دینار دے یا بیس ہزار دینار دے، ایک روز امین الدین میکائیل (نائب السلطان) نے حضرت شمس الدین سے ملنے کی استدعا کی، فرمایا کہ چالیس ہزار درم دیں تو آویں، آخر تیس ہزار درم قرار پایا، امین الدین جب حاضر خدمت ہوئے تو حضرت شمس الدین نے اس قدر حقائق، دقائق بیان فرمائے کہ امین الدین تشکر کرتے ہوئے باہر نکلے، اور دس ہزار درم مزید بطور شکرانہ کے پیش کئے، حضرت شمس الدین نے سب حضرت

---

[1] مناقب صـ۱۸۷

[2] ” صـ۱۸۶

حسام الدین کو حوالہ کیے کہ لوگوں میں تقسیم کر دیں۔

مولانا کی حرم محترم کی پروردہ ایک لڑکی کیمیا خاتون تھی، حضرت شمسؒ نے اس کی خواستگاری کی، مولاناؒ نے بدل وجان قبول کیا، اور یہ معلوم ہونے لگا کہ اب حضرت شمس الدینؒ زیادہ اطمینان کے ساتھ قونیہ میں قیام کریں گے۔

مگر اس دور خرمی کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ پھر آزردگی کے اسباب پیدا ہو گئے، جس کی ظاہری صورت یہ پیش آئی کہ حضرت شمسؒ کا جب عقد ہوا ہے وہ جاڑے کا زمانہ تھا۔ مولاناؒ نے تابخانہ (   ) کے قریب ہی دالان (صفہ) میں ایک طرف کو شمسؒ کے قیام کا انتظام کر دیا[علہ]۔ مولانا کے فرزند متوسط (منجھلے صاحبزادے) چلپی علاء الدین جب مولانا اور اپنی والدہ سے ملنے جاتے تو اسی طرف سے ہو کر گزرتے، مولانا شمس الدینؒ کو یہ بات ناگوار ہوتی، کئی مرتبہ مشفقانہ طور پر سمجھایا کہ اس طرح بے تکلف ادھر سے نہ گزرا کریں، علاء الدین کو یہ بات شاق گزری، اور ان کے دل میں کچھ اس بات سے بھی کدورت تھی کہ حضرت شمس الدینؒ سلطان ولدؒ پر زیادہ نظر عنایت رکھتے تھے، انھوں نے اس کا چرچا لوگوں سے کیا، جو لوگ اس قسم کے موقع کے متلاشی تھے، انھوں نے اور بھی حاشیے چڑھائے اور کہنے لگے کہ یہ بھی خوب رہی کہ ایک بے گانہ نے آکر خداوندگار کے مکان پر قبضہ کر لیا ہے اور خداوندگار کے فرزند کو گھر میں آنے نہیں دیتا، اس طرح ایک بات ہاتھ آگئی اور مفسدوں نے پھر

علہ سپہ سالار ص ۶۸

(تردید سوانح دوم کہ مناقب میں اس کا ذکر بھی ہے)۔

موقع ہموقع شمسؒ کے خلاف زہرافشانی شروع کی[1]

یہ تفصیل سپہ سالار نے دی ہے، سلطان ولدؒ نے صرف ایک اشارہ کردیا ہے، کوئی تفصیل نہیں دی ہے،

باز شیطاں بصورت دیگر ‏ ‏ زد در ایشاں کہ درتے دیگر

. . . .

باز گشتند ہمچو اول بار ! ‏ ‏ مے دستی گزشت و ماند خمار

روشنی شد بدل بتاریکی ‏ ‏ صحت تن برنج باریکی !

حضرت شمس الدین نے محض لطف و حلم کی وجہ سے مولاناؒ سے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا، مگر جب معاملہ حد سے گزر گیا تو سلطان ولدؒ سے برسبیل حکایت یہ فرمایا کہ ان لوگوں کے حرکات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ میں اس طرح غائب ہوں گا کہ پھر کسی کو میرا پتہ نہ چلے گا۔[2] مگر خود سلطان ولدؒ نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ آپ نے صریحًا کہا اور مکرر کہا،

گفت شہ با ولدؒ کہ دیدی باز ‏ ‏ چوں شدند از شقہ ہمہ دمساز

کہ مرا از حضور مولاناؒ ‏ ‏ کہ چو او نیست ہادئ دانا

فگنندم جدا و دور کنند ‏ ‏ بعد من جملگاں سرور کنند

خواہم ایں بار آنچناں رفتن ‏ ‏ کہ نداند کسے کجا ام من

ہمہ گردند در طلب عاجز ‏ ‏ ندہد کس ز من نشاں ہرگز

---

[1] سپہ سالار ص ۶۸ - ۶۹ -

[2] برسبیل حکایت بخدمت سلطان ولدؒ تقریر فرمود کہ ایں نوبت از حرکات ایں جمع معلوم گردد کہ چناں غیبت خواہم کرد کہ اثر مرا ہیچ آفریدہ نیابد (سپہ سالار ص ۶۹)

سالہا بگذرد چنیں بسیار | تا نیابد ز گردِ من آثار
چوں کنائم دراز گویند ایں | کو وراد شمنے بکشت یقیں
چند بار ایں سخن مکرر کرد | بہر تاکید را مقرر کرد

سلطان ولد اور سپہ سالارؒ کے بیانات سے اگرچہ یہ واضح نہیں ہوتا کہ مولاناؒ کو بھی حضرت شمسؒ کے اس ارادے کی کچھ خبر تھی یا نہیں مگر مولاناؒ کی بعض غزلوں سے یہ استنباط ہو سکتا ہے کہ مولاناؒ بھی اس سے بالکلیہ بے خبر نہیں تھے۔

مولاناؒ کی غزلوں کی نسبت یہ مسلم ہے کہ بیشتر غزلیں واقعات پر مبنی ہیں اور ان غزلوں سے مولاناؒ کے حالات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ دیوان میں چار غزلیں ہیں، جن کا ردیف "میکنی مکن" ہے۔ ان غزلوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت شمسؒ کے اس ارادے کا کچھ اشارہ مولاناؒ کو بھی مل گیا تھا اور مولاناؒ نے اول کنایۃً اور بعد ازاں صراحتہً حضرت شمسؒ کو اس ارادے کے بدلنے کی جانب مائل کرنا چاہا۔

پہلی غزل چودہ شعروں کی ہے، اس میں باتوں ہی باتوں میں حضرت شمسؒ کی ناگواری کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے کہ چہرے سے آثار ملال کا اظہار ہوتا ہے۔ ہم لوگوں سے کنارہ کش ہوا چاہتے ہیں، اپنے نفع کی فکر ہے میرے نقصان کی کچھ پروا نہیں۔ میری خوشی ناخوشی سے غرض نہ ہو نہ سہی مگر معلوم نہیں اب کس کی رضا جوئی کا خیال ہے؟ ایسا نہ کیجئے، اور آفتاب کو زیر ابر پوشیدہ نہ فرمایئے۔

اے آنکہ از میانہ کراں میکنی مکن | بر ما زخشم روے گراں میکنی مکن
در بند سود خویش داندر زیان ما | کس زیں نکرد سود، زیاں میکنی مکن
راضی شدی کہ بیش نجوئی رضائے ما | ایں از پئے رضائے کیاں میکنی مکن

مخدوم شمس دیں شہ تبریز نازنیں　　　چوں شمس زیر ابر نہاں میکنی مکن

اس کے بعد دوسری غزل صرف چھ شعروں کی ہے اور راقم الحروف کا قیاس یہ ہے کہ یہ غزل حضرت شمسؒ کی ہے[1] اور مولاناؒ کی مذکورۂ بالا غزل کے جواب میں ہے۔ اس میں بعض تلمیحات ایسے صاف و صریح ہیں گویا واقعات آیندہ کی پیشین گوئی کر دی ہو کہ لوگوں کے حرکات پر نظر کیجئے، میری جان کو بلا میں نہ پھنسائیے، میں ہر طرح آپ کا نیاز مند ہوں مگر آپ مجھے شیروں کے جنگل میں چھوڑ دیتے ہیں، آپ کے ارادتمند گبر و مومن سب ہی ہیں، مجھ مردے پر عزا کرنے کی کیا ضرورت ہے، آپ کو چاہیئے کہ مردوں کو زندہ کیجئے، اپنے فرزند کو ہلاکی میں نہ ڈالئے۔

اعمال خلق مرا چو بہا میکنی مکن　　　جاں را چہ در بلا و فنا میکنی مکن

در بیشۂ نیاز، ہزبران خشمگیں　　　اندر پیم شہا چہ رہا میسکنی مکن

گر گبر و مومن است چو گشتہ ہوائی تو　　　بر شخص مردہ چہ عزا میسکنی مکن

رو پاک شو چو عیسیٰ دوہ مردہ زندہ کن　　　فرزند را بمرگ فنا میسکنی، مکن

شمس الحق اے نظام زمین و فلک زتو　　　با یار مختلف چہ دغا میسکنی، مکن

(۶۔ ص ۶۷۰)

اس کے بعد تیسری غزل سترہ شعروں کی ہے، اس میں مولاناؒ نے بہت صاف و صریح فرمادیا ہے کہ سنتے ہیں کہ سفر کا ارادہ ہو رہا ہے، کسی اور یار و حریف کی محبت دل میں جاگزیں ہو گئی ہے۔ مجھ سے جو عہد و پیمان ہوئے تھے وہ کیا ہوئے اور اب جو نئے قول و

---

[1] اس کے متعلق حصہ دوم میں بحث "تحریر دیواں" دیکھنا چاہیئے۔

وقرار ہو رہے ہیں ان پر کیا اعتماد ۔

بشنیده ام عزم سفر میکنی، مکن	مهر حریف و یار دگر میکنی، مکن
تو در جهان غریبی، در غربت چه میکنی	قصد کدام خسته جگر میکنی مکن
کو عهد و کو وثیقه که با ما تو کرده	از قول و عهد خویش عبر میکنی مکن
چه وعده میدهی و چه سوگند میخوری	سوگند و عشوه را چه سپر میکنی، مکن

(۱۷۔ ص ۶۷۱)

ان غزلوں کے بعد چوتھی غزل سات شعروں کی ہے، جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت شمسؒ کا ارادۂ سفر کچھ پختہ ہو چکا ہے اور مولاناؒ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اب ایسا ہو کر رہے گا۔ چنانچہ اس غزل میں "بشنیده ام" کے بجائے "بینمت" ہے۔

می بینمت که عزم جفا میکنی، مکن	عزم عتاب و فرقت ما میکنی، مکن
همچو که شیر شرزه، خونخواره ای نگار	در خونِ دل چرا تو چرا میکنی مکن،
بختِ مرا چو کلکِ نگونسار میکنی	پشت مرا چو دال دوتا میکنی مکن
ای تو تمام لطف خدا و عطای تو	خود را تمام قهر خدا میکنی مکن
از چهره که نور گرفت از چه رخت	میکنی مکن
پیوند کرده کرم و لطف یاد لم	پیوند کرده را چه جدا میکنی مکن
آں بنده که شاه شد از رخ تو بست	او را بمات غم چه گدا میکنی مکن

(۷۔ ص ۶۷۲)

۱؎ مناقب ص ۲۸۸

بہر نوع، ان غزلوں سے جو ترتیبی نتائج اخذ کئے گئے ہیں وہ بعینہٖ صحیح ہوں یا نہ ہوں مگر اتنا ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت شمسؒ کی آزردگی اور ترک قونیہ کے ارادے سے مولاناؒ لاعلم نہیں تھے اور جب غزلوں میں اس طرح پر اپنے خیال کا اظہار فرمایا ہے تو عملاً بھی ہر طرح پر حضرت شمسؒ کی آزردگی کو رفع کرنے اور عزم سفر سے باز رکھنے کی فکر کی ہوگی

مناقب العارفین میں حضرت شمس الدینؒ کی ناخوشی کی ایک اور وجہ یہ بھی درج ہے کہ ایک روز کیمیا خاتون مکان سے باہر چلی گئی تھیں، حضرت شمس الدینؒ جب مکان میں آئے اور انھیں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ سلطان ولدؒ کی دادی اور چند دوسری عورتوں کے ساتھ باہر سیر کو گئی ہیں۔ آپ نہایت آزردہ خاطر ہوئے، کیمیا خاتون جب مکان میں آئیں تو درد سے بیتاب ہو کر گر پڑیں اور تین دن بعد انتقال کر گئیں، اس کے سات روز بعد حضرت شمس الدینؒ دمشق کو روانہ ہو گئے اور یہ واقعہ، شعبان ۶۴۴ھ میں پیش آیا۔[1] لیکن (جیسا کہ آگے چل کر ثابت ہوگا کہ) حضرت شمس الدینؒ کی غیبت ثانی ۶۴۵ھ میں وقوع میں آئی اور فی نفسہٖ بھی یہ رنجش ایسی نہیں معلوم ہوتی کہ آپ اس کی وجہ سے مولاناؒ سے جدا ہو جاتے، ممکن ہے کہ کیمیا خاتون کے انتقال کے بعد چند روز کے لئے کسی طرف چلے گئے ہوں۔[2]

بہر حال لوگوں میں حضرت شمس الدینؒ کے خلاف خیالات پھر جوش زن ہو گئے، اور آپ خود بھی آزردہ خاطر ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ آپ دفعتہً غائب ہو گئے۔

---

[1] مناقب ص ۲۸۸

[2] خود افلاکی کے الفاظ بھی اس موقع پر ایسے ہیں جن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ مولاناؒ سے دائمی مفارقت نہیں تھی۔

"بمچنان چو بگذشت باز بسوی دمشق روانہ شد در ماہ شعبان سنہ ۶۴۴ اربع واربعین وستمایہ" ص ۲۸۸

ناگہاں گم شد از میان ہمہ — تا روند از دل اندہان ہمہ

مولاناؒ جب صبح کو مدرسہ میں تشریف لائے اور شمسؒ کو گھر میں نہ دیکھا تو چیخ اٹھے اور سلطان ولدؒ کے خلوت خانے پر جاکر آواز دی کہ "بہاء الدین چہ خفتہ، برخیز و طلب شیخت کن کہ باز مشام جانم از فوائح لطف او خالی می یابم[علہ]"

دو تین روز ہر طرف جستجو کرتے رہے مگر کہیں حضرت شمسؒ کا پتہ نہ چلا۔ اس مرتبہ شمسؒ کی غیبت سے مولاناؒ کا حال پہلے سے بھی زیادہ متغیر ہو گیا۔

شیخ گشت از فراق او مجنوں — بے سر و پا ز عشق چوں ذوالنونؒ

جو لوگ حضرت شمسؒ کی آزردگی کا باعث ہوئے تھے مولاناؒ نے ان سب کو قطعاً اپنی صحبت سے خارج کر دیا۔ لیکن سابق کے برخلاف اس مرتبہ آپ نے غزل گوئی اور سماع میں اپنا وقت صرف کرنا شروع کیا۔

شمسؒ کے ہجر میں مولاناؒ پر جو کچھ حالت گزری اس کا ذکر بعد کو ہوگا اولاً ان روایات کی تنقید ہونی چاہیے جو حضرت شمسؒ کی غیبت کے متعلق عام طور پر رائج ہو گئی ہیں۔

حضرت سلطان ولدؒ اور سپہ سالارؒ نے تو اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھا ہے کہ حضرت شمسؒ دفعۃً غائب ہو گئے اور پھر ہر طرح کی تلاش و جستجو کے باوجود کہیں آپ کا سراغ نہ ملا۔ لیکن عام تذکروں میں

(۱) ایک روایت تو یہ مشہور ہو گئی ہے کہ کچھ لوگوں نے آپ کو زخمی کر دیا اور آپ اسی وقت نظروں سے غائب ہو گئے۔

علہ سپہ سالار ص ۶۹

(۲) دوسری روایت یہ رواج پا گئی کہ لوگوں نے واقعی آپ کو قتل کر ڈالا' اس آخری روایت کی بھی دو شاخیں ہیں (الف) ایک مشرقی اور (۲) ایک مغربی'

مگر جب صحیح واقعات کی روشنی میں ان روایات کی تحقیق کی جاتی ہے تو ان میں سے کوئی روایت بھی کال الیبار نہیں ثابت ہوتی اب ان روایات پر سلسلہ وار نظر کیجئے' اور عقلاً و نقلاً ان کے پایۂ ثقاہت کا اندازہ فرمایئے۔

حضرت شمس الدینؒ کے زخمی ہونے اور نظروں سے غائب ہو جانے کی روایت پورے وثوق کے ساتھ 'آتشکدۂ آذر' میں درج ہے اور وقار کی نظم میں بھی جواب تقریباً مثنوی شریف کا جزو بن گئی ہے' یہی روایت دی گئی ہے 'خزینۃ الاصفیا' میں بھی یہی روایت درج ہے اور دوسرے تذکروں میں بھی موجود ہے۔ اس کی بنائے اصلی مناقب العارفین کی یہ روایت معلوم ہوتی ہے کہ :۔

حضرت سلطان ولدؒ سے "اصح روایت" یہ ہے کہ حضرت مولاناؒ شمس الدینؒ اوائل حال میں بہت ہی تضرع وابتہال کے ساتھ یہ دعا کیا کرتے تھے کہ خدایا اپنے مستوران جمال عزت میں سے کسی ایک کو مجھے دکھا دے۔ الہام ہوا کہ جب اس قدر الحاح و شغف ہے تو شکرانہ کیا دیتے ہو' کہا سر' عاقبت الحال جب وہ وصال میسر آیا اور اس صحبت سے محظوظ ہوئے تو ایک رات مولاناؒ کے پاس تنہا بیٹھے ہوئے تھے' باہر سے کسی نے برآمد ہونے کو کہا' فوراً اٹھے اور مولاناؒ سے فرمایا کہ مجھے قتل کرنے کے لئے بلاتے ہیں' بہت

عہ ص

عہ جلد دوم صفحہ ۲۶۹

توقف کے بعد مولانا نے فرمایا "الالہ الخلق والامر مصلحت است"

کہتے ہیں کہ سات نااہل اس کام پر متحد ہوئے تھے اور تاک میں لگے ہوئے تھے۔ موقع پاکر چھری چلائی، حضرت شمس الدینؒ نے اس زور کا نعرہ مارا کہ سب بیہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئے تو چند قطرۂ خون کے سوا کچھ نہ دیکھا، اس کے بعد سے پھر آپ کا کچھ پتہ نہ چلا ؎

خود ہماں بد دیگر او را کس ندید　　　چوں پری از آدمی شد ناپدید

چوں ز چشم خویش و خلقاں دور شد　　　ہمچو عنقا در جہاں مشہور شد

جب اس واقعہ کی خبر مولاناؒ کو ملی تو فرمایا کہ یفعل اللہ ما یشاء و یحکم ما یرید ؎

جز کہ تسلیم و رضا کو چارہ،　　　در کفِ شیر نر خونخوارہ،

میں اس معاملہ میں کیا کر سکتا ہوں، انھوں نے وہاں قول و قرار کیا تھا اور سر کو شکرانہ میں پیش کیا تھا، لاجرم تقدیر الٰہی نے ایک صورت پیدا کر دی، اور حکمت جف القلم ظہور میں آئی، وکان ذٰلک فی الکتاب مسطوراً ؎

از عہدۂ عہد اگر بروں آید مرد　　　ہر چہ گماں بری فزوں آید مرد[۲]

ہم نے پوری تفصیل کے ساتھ اس روایت کو اس وجہ سے نقل کر دیا ہے کہ اس سے جو

---

[۱] انھیں میں مولاناؒ کے فرزند علاء الدین بھی تھے اور اسی بنا پر بعض تذکرہ نویسوں نے یہ لکھ دیا ہے کہ علاء الدین کے ہاتھ سے قتل ہوئے چنانچہ مجمع الفصحا (جلد دوم ص ۲۸۶) میں ہے کہ "بالآخر بدست علاء الدین محمد فرزند مولوی بشہادت رسید"

[۲] مناقب العارفین ص　نسخہ قلمی)

نتیجہ مستنبط ہوتا ہے وہ خود سامنے آجائے۔

اس روایت سے یہ تو کسی طرح ثابت نہیں ہوتا ہے کہ لوگوں نے حضرت شمس الدینؒ کو واقعی قتل کر ڈالا تھا۔ صرف اتنا محقق ہوتا ہے کہ آپ کسی قدر زخمی ہو گئے تھے اور اس کے بعد غائب ہو گئے، مگر واقعات و قرائن سب اس کے خلاف ہیں۔

(۱) سلطان ولدؒ اور سپہ سالارؒ جن کی آنکھوں کے سامنے کا یہ واقعہ ہے وہ زخمی (اور قتل) ہونے کے نسبت بالکل ساکت ہیں، اگر ایسا ہوتا تو اس کے اظہار میں کوئی وجہ مانع نہ تھی، افلاکیؒ کے بیانات سماعی ہیں جو اصل واقعہ سے کچھ کم ایک صدی کے بعد لکھے گئے ہیں اور مذکورہ بالا دونوں بزرگوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ چشم دید ہے۔ وہ خود ان معاملات و واقعات میں شریک تھے۔

سلطان ولدؒ نے پوری صراحت سے یہ لکھا ہے کہ حضرت شمس الدینؒ نے بار بار مجھ سے یہ کہا کہ ان نااہلوں کی حرکت کی وجہ سے میں چلا جاؤں گا، اور آخر ایک روز دفعۃً غائب ہو گئے، سپہ سالارؒ نے اس واقعہ غیبت کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے کہ "ہم دراں مدت ناگاہ غیبت فرمود، حضرت خداوندگار علی الصباح چوں از مدرسہ آمد خانہ را از ایشاں خالی یافت چوا زگرشید و در خلوتخانہ سلطان ولدؒ آمدہ بانگ زد کہ بہاء الدینؒ چہ خفتہ، برخیز و طلب شیخت کن کہ باز مشام جاں از فوائح لطف او خالی می یابیم[۱]"۔ اگر حضرت شمسؒ لوگوں کے بلانے پر مولاناؒ کے پاس سے اٹھ کر باہر جاتے، لوگ آپ کو زخمی کر دیتے اور آپ اسی وقت نعرہ مار کر غائب ہو جاتے تو صبح کو مدرسہ پہونچنے تک مولانا کے اس واقعہ سے ناواقف ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی؟

---

[۱] سپہ سالار ص ۶۹

ماسوا ازیں روایت پر کتنا ہی اعتماد بلکہ اعتقاد کیوں نہ رکھا جائے مگر درایت کا پہلو اس موقع پر اسقدر قوی ہے کہ اسے نظر انداز کر دینا ناممکن ہے۔ حضرت شمسؒ نے قول و قرار جو کچھ بھی کیا ہو، عقل اسے کسی طرح باور نہیں کرتی کہ حضرت شمسؒ مولاناؒ کے پاس بیٹھے ہوں، لوگ قتل کرنے کے ارادے سے حضرت شمسؒ کو باہر بلائیں اور مولاناؒ چپکے سے فرمادیں کہ ہاں جایئے، قتل ہو جایئے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جس طرح مولاناؒ سے شمسؒ کی ملاقات کے واقعہ میں مختلف روایتیں مخلوط ہو گئی ہیں، اسی طرح شمسؒ کی گم گشتگی کے معاملہ میں بھی مختلف روایتیں ایک دوسرے میں مل گئی ہیں، شمسؒ کے خلاف لوگوں میں شورش برپا تھی، ممکن ہے کہ زبانی طعن و تشنیع اور سخت کلامیوں کے علاوہ کسی وقت کوئی جسمانی آزار دہی بھی وقوع میں آگئی ہو، اور زمانہ مابعد میں یہی امر آپ کی غیبت کا سبب بلاواسطہ مشہور ہو گیا ہو۔

روایت مذکورۂ بالا میں مولاناؒ کے جو اقوال منقول ہیں وہ غالباً اس وقت کے ہونگے جب مولاناؒ حضرت شمسؒ کے ملنے سے بالکلیہ مایوس ہو چکے تھے اور شاید آپکے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ حضرت شمسؒ کہیں قتل ہو گئے ہیں۔

بہر نوع حضرت شمسؒ کے زخمی ہو کر دفعۃً ہمیشہ کیلئے غائب ہو جانے کی روایت دوسری قوی تر روایتوں کے مقابلہ میں پایۂ استناد سے گری ہوئی ہے۔

اب ان روایتوں کو دیکھنا چاہیے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شمسؒ کسی نہ کسی وقت قتل ہو گئے تھے، اس سلسلہ میں مشرقی روایتیں جسقدر ہیں وہ سب ظنی حیثیت کی ہیں قطعی نوعیت کسی میں نہیں ہے؛ ان روایتوں کا ماخذ بھی افلاکیؒ ہی ہیں۔ چنانچہ ایک موقع پر لکھا ہے کہ "بعض اصحاب کا اس پر اتفاق ہے کہ مولانا شمس الدینؒ اس جماعت سے زخم کھا کر غائب

ہو گئے' اور بعضوں نے یہ روایت کی ہے کہ مولانائے بزرگ کے پہلو میں آپ ہی مدفون ہیں[1]
(یعنی اسی موقع پر قتل ہو گئے)

اس کے بعد ہی دوسری روایت یہ ہے کہ امیر عارف کا بیان ہے کہ ان کی والدہ فاطمہ خاتونؒ نے ان سے یہ کہا کہ شمس الدینؒ کی شہادت کے بعد ان کے قاتلوں نے ان کی لاش کو کنویں میں ڈال دیا تھا' سلطان ولدؒ نے خواب میں دیکھا کہ مولانا شمس الدین فرماتے ہیں کہ میں فلاں کنوئیں میں پڑا ہوا ہوں' سلطان ولدؒ نے آدھی رات کو اپنے یاران محرم کے ساتھ جاکر آپ کے جسم مبارک کو کنوئیں سے نکالا اور مولاناؒ کے مدرسہ میں امیر بدرالدین بانئ مدرسہ کے پہلو میں دفن کیا یہ ایک راز ہے جس سے ہر شخص واقف نہیں ہے[2]

دونوں روایتوں میں آپ کے مدفن کے متعلق سخت اختلاف ہے اور دوسری روایت میں کوئی خفیف سا اشارہ بھی اس جانب نہیں ہے کہ یہ قتل کا واقعہ کب پیش آیا' پس اس

---

[1] ہمچناں بعضے اصحاب متفق اند کہ مولانا شمسؒ الدین ازاں جماعت زخم خوردہ ناپیدا شد و بعضے روایت کردند کہ در جنب مولانائے بزرگ مدفون است (نسخہ قلمی)

[2] مناقب العارفین (نسخہ قلمی) ان اقوال کے سوا دولت شاہ نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ قونیہ کے لوگ حضرت شمس الدین کے دشمن ہو گئے تھے' ان لوگوں نے مولاناؒ کے ایک فرزند کو آمادہ کیا اور انھوں نے حضرت شمس الدینؒ کے سر پر دیوار گرادی' مگر خود دولت شاہ نے اس قول کو بے اصل قرار دیا ہے' یہی ایک تاویل اس ہنگامہ کی ہے جو ۶۴۵ھ میں حضرت کے خلاف ظہور پذیر ہوا' معلوم نہیں کس ذریعہ سے ایک روایت یہ مشہور ہو گئی ہے کہ حضرت شمسؒ تبریزی کی کھال کھنچوائی گئی تھی' اگر شمس تبریزی یہی مولاناؒ شمس الدین تبریزی ہیں تو یہ بالکل غلط ہے' اگر کوئی اور شمس تبریزی ہیں تو ان کا علم مجھے نہیں ہے۔

بنا پر واقعاتی حیثیت سے قطعاً یہ قرار دینا کہ اسی زمانہ میں مفسدین نے حضرت شمسؒ کو قتل کر کے کنوئیں میں ڈال دیا تھا، کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ اگر بالفرض کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے تو یہ کسی زمانہ مابعد کا واقعہ ہے جس کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملتا۔

دولت شاہ نے اپنے تذکرۃ الشعراء میں لکھا ہے کہ "قبر شاہ شمس الدینؒ تبریزی در قونیہ است و وفات شاہ شمس الدینؒ بعد از رحلت مولاناؒ بودہ[1]" اگر تمام اسانید قطعی کے خلاف اسے صحیح مان لیا جائے، تو قیاس یہ چاہتا ہے کہ شاید مولاناؒ کے بعد حضرت شمس الدینؒ کو بعض لوگوں نے قتل کر ڈالا ہو اور سلطان ولدؒ نے آپ کی لاش کو مدرسہ میں دفن کیا ہو، مگر یہ محض ظن ہے۔ حضرت شمسؒ کے سال وفات کی ایک روایت سنہ ۶۹۰ھ کی بھی ہے، اگرچہ یہ بھی صریحاً غلط ہے مگر بر بنائے استدلال یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید سنہ ۶۹۰ھ میں یہ واقعہ پیش آیا ہو۔

لیکن ان بعید از قیاس تاویلات میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، خود افلاکیؒ نے حضرت شمسؒ کے زخمی ہونے کی روایت کے عین بعد ہی جو کچھ لکھا ہے اس سے صریحاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ افلاکیؒ بھی اس موقع پر حضرت شمسؒ کے قتل ہو جانے کے قائل نہیں ہیں، ان کے الفاظ یہ ہیں "کان تاریخ الغیبۃ والاستتار فی سنۃ خمسین واربعین وستمایۃ" (یعنی حضرت شمسؒ سنہ ۶۴۵ھ میں غائب و پوشیدہ ہو گئے۔)

جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، حضرت شمسؒ کے غائب ہو جانے کے بعد مولانا نے کئی برس آپ کی جستجو کی، اس سے یہ مسلم ہے کہ اس وقت خود مولاناؒ اور آپ کے اصحاب خاص کو حضرت شمسؒ کے قتل ہو جانے کا کوئی تیقن نہیں تھا بلکہ اس کے خلاف یہ یقین تھا کہ

---

[1] تذکرۃ الشعراء صفحہ ۸۹

آپ کسی طرف کو چلے گئے ہیں لیکن ساتھ ہی افلاکیؒ کی ایک اور روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کا خیال یہ ضرور تھا کہ حضرت شمسؒ قتل ہو گئے ہیں اور مولاناؒ اس کے برعکس خیال رکھتے تھے وہ روایت یہ ہے کہ

جب حضرت شمسؒ نظروں سے پوشیدہ ہو گئے[1] تو مولاناؒ کو کسی طرح قرار نہیں آتا تھا آپ مدرسہ کے صحن میں پھرا کرتے اور یہ رباعیاں پڑھا کرتے تھے۔

از عشق تو ہر طرف شب خیزے ❊ شب گشتہ ز زلفین تو عنبر بیزے
نقاش ازل نقش کند ہر طرفے ❊ از بہر قرار دلِ من تبریزے

کہ گفت کہ آں زندۂ جاوید بمرد ❊ کہ گفت کہ آفتاب امید بمرد
آں دشمن خورشید برآمد بر بام ❊ دو چشم بہ بست و گفت خورشید بمرد

اس کے بعد ایک مجمع اکابر میں یہ فرمایا کہ

کہ گفت کہ روح عشق انگیز بمرد ❊ جبرئیل امیں زخنجر تیز بمرد
آنکس کہ چوں ابلیس بمرد ❊ او پندارد کہ شمس تبریز بمرد

ان رباعیات سے دو باتیں صریحاً مستنبط ہوتی ہیں' اوّلاً یہ کہ عوام میں یہ چرچا ضرور تھا کہ حضرت شمس الدینؒ کہیں قتل ہو گئے ہیں اور اس کے نسبت حضرت سلطان ولدؒ نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ مولانا شمس الدینؒ نے اپنے غائب ہو جانے کے قبل یہ فرما دیا تھا کہ میری غیبت کے بعد لوگ یہ کہیں گے کہ انھیں کسی دشمن نے قتل کر ڈالا۔

---

[1] چوں صورت مبارک دمعنی متبرک مولانا شمس الدین از حسودان بچشم پر خشم شدہ محجب بود۔

چوں کشانم دراز گویند ایں　　　　کہ ورا دشمنے بکشت یقیں

دو سرے یہ کہ مولاناؒ کو اس کا یقین نہیں تھا "زندہ جاوید" اور "روح عشق انگیز" کے الفاظ سے ذہن اس طرف جاسکتا ہے کہ مولاناؒ کی مراد حیات باقیہ اولیا اللہ سے رہی ہو مگر تمام شواہد و واقعات کے خلاف اس قدر دقیقہ سنجی کی ضرورت نہیں ہے) اور مولانا کو یقین نہ ہونا دلیل اس کی ہے کہ کوئی ثبوت قطعی یا قرینہ قویہ موجود نہیں تھا۔

ان رباعیوں کے متعلق سب سے زیادہ قابل قبول قیاس یہ ہے کہ مولاناؒ نے یہ رباعیاں اُس وقت کہیں ہوں جب آپ ہر طرح پر حضرت شمسؒ کی تلاش سے عاجز آگئے ہوں، اور (جیسا کہ حضرت شمسؒ نے خود پیشین گوئی کر دی تھی) لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہو کہ کسی نے حضرت شمسؒ کو قتل کر ڈالا ہے، اور اس گمان کی وجہ بھی بہت قوی تھی، ممالک روم میں مولانا کا اثر بہت کافی وسیع تھا' آپ نے حضرت شمسؒ کی تلاش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا' خود حضرت شمسؒ کو بھی مولاناؒ کو عقیدت و ارادت تھی۔ آپ اگر ناخوش ہوے تھے تو مولانا کے نااہل مریدوں سے' خود مولاناؒ کو اپنے متعلق اس طرح مطلقاً لاعلم رکھنا آئین وداد کے خلاف اور مکارم اخلاق کے منافی تھا' پس اس حالت میں لوگوں کا یہ سمجھ لینا کہ حضرت شمسؒ کہیں قتل ہو گئے ہیں کچھ بعید از قیاس نہیں ہے، اور مولاناؒ نے ان رباعیوں میں اسی خیال کا بطلان کیا ہے۔

بہر حال مشرقی تذکروں میں حضرت شمسؒ کے قتل ہونے کا بیان ظن و قیاس سے زیادہ کچھ اصلیت نہیں رکھتا، لیکن اہل مغرب نے اسے ایک ایسے امر واقع کے طور پر بیان کیا ہے کہ وہ اس میں شک کی گنجائش ہی باقی نہیں چھوڑتے۔

چونکہ اہل مغرب میں یہ خیال سلسلاً ایک دوسرے سے منتقل ہوتا چلا آیا ہے! اس

لیے یہاں باعتبار تقدم و تاخر زمان ان کے بیانات کو نقل کر دیا جاتا ہے، اس سے آخر درجہ پر پہونچکر خود یہ روشن ہو جائے گا کہ یہ غلط بر غلط خیال یورپ میں کس طرح شائع ہوا۔

(۱)

حضرت شمس الدین ۶۴۵ھ / ۱۲۴۷ء تک برابر (مولانا) جلال الدین کی صحبت میں رہے، اسی سال ایک ہنگامہ میں جس میں مولانا کے بڑے فرزند علاء الدینؒ قتل ہوئے، آپ (شمسؒ الدین) گرفتار اور غالباً قتل ہوئے۔

(فہرست کتبخانہ بانکی پور)

(۲)

شمسؒ تبریز ۱۲۴۴ء میں قونیہ آئے اور ۱۲۴۶ء میں پراسرار طریق پر غائب ہوگئے، ایک روایت کے بموجب ایک ہنگامہ میں مارے گئے۔

(انسائیکلو پیڈیا آف ایلجرز اینڈ اتھکس جلد ۷ ص ۴۷۲، ۱۹۱۴ء نوشتہ ڈاکٹر نکلسن)

(۳)

حضرت شمس الدینؒ کی اشتداد پسند طبیعت کی وجہ سے قونیہ کے لوگ ان کے خلاف ہو گئے اور ایک ہنگامے میں جس میں مولانا کے بڑے فرزند علاء الدین مارے گئے، پولیس نے انھیں (شمس الدینؒ کو) گرفتار کر لیا اور غالباً قتل کر دیا۔ کم از کم یہ کہ پھر ان کا کچھ ذکر سننے میں نہیں آیا۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹینکا ۱۹۱۱ء)

(۴)

مولاناؒ کے بڑے بیٹے علاء الدین قونیہ میں ایک شورش میں مارے گئے، جس کا انجام شمسؒ تبریزی کی موت پر ہوا (براؤن، ادبی تاریخ ایران، جلد دوم ص۵۱۶ ۱۹۰۶ء)

شمسؒ تبریزی سے دسمبر ۱۲۴۴ء میں قونیہ میں ملاقات ہوئی اور روز افزوں اختلاط کے ساتھ پندرہؔ مہینے تک قائم رہی اور مارچ ۱۲۴۶ء میں شمسؒ تبریزی کی پر اشتداد موت کے باعث دفعۃً ختم ہو گئی۔

(براؤن، ادبی تاریخ ایران، جلد دوم صفحہ ۵۱۷-۵۱۸

۱۹۰۶ء)

(۵)

(دمشق سے) واپس آنے کے بعد (شمسؒ تبریزی) جلد تر پُر اسرار طور پر غائب ہو گئے، اکثر اسناد اس پر متفق ہیں کہ قتل کر دیے گئے، صرف قتل کے سبب اور اس کی صورت وقوع میں اختلاف ہے (اس کے بعد رڈ ہاؤس کا وہ قول نقل کیا ہے جو نیچے شمارہ (۶) میں درج ہے۔)

یہ واقعہ ۶۴۵ھ میں پیش آیا۔

(ڈاکٹر نکلسن، دیوان شمس تبریز ص دیباچہ ۱۸۹۸ء

(۶)

معلوم ہوتا ہے کہ شمس الدین تبریزی نہایت ہی متشدد و تحکم پسند شخص تھے، یہی باعث ہوا کہ لوگوں کو ان سے سخت عناد پیدا ہو گیا جس کا انجام ایک شورش پر ہوا، اسی ہنگامہ میں مولانا کے خلف اکبر علاء الدین مارے گئے یا مہلک طور پر زخمی ہوئے، لہٰذا مقامی پولیس نے مولاناؒ شمس الدین کو گرفتار کر لیا، اس کے بعد پھر ان کے دوستوں

نے انھیں زندہ نہیں دیکھا۔

(رڈہاؤس، دیباچہ ص۱ ۱۸۸۱ء)

مولانا کے فرزند (علاءالدین) اس فساد میں مارے گئے جس میں ان کے والدؒ کے دوست شمس الدین تبریزی قتل ہوئے۔

(رڈہاؤس شجرہ نسب ص۱۲۳، ۱۲۴)

اس سلسلہ کی آخری کڑی رڈہاؤس کا بیان ہے اور اس کی بنا انھوں نے مناقب العارفین کی ایک روایت پر رکھی ہے چنانچہ (شمارہ ۱۷، ص۱۰ پر) مناقب العارفین سے ایک روایت نقل کی ہے، جسکے انگریزی ترجمے کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"قونیہ کے وزیر نے ایک مدرسہ بنایا تھا، مدرسہ کے مکمل ہو جانے پر وزیر نے اس مدرسہ میں بہت بڑی ضیافت کی اور مجلس سماع منعقد ہوئی، جس میں تمام علماء شہر جمع تھے۔ اول ختم قرآن ہوا، اس کے بعد سماع کا آغاز ہوا، وزیر اور شمس الدینؒ دونوں کو حال آیا، اور ان دونوں میں بار بار تصادم ہوتا رہا یہ ہوا کہ وزیر کا دامن شمسؒ کو جالگا کیونکہ حالت وجد میں انھیں احتیاط نہیں تھی۔

(مولانا) جلال الدینؒ نے اپنے مہمان اور دوست کے ساتھ اس بے ادبی پر سخت غصہ کا اظہار کیا، انھوں نے شمسؒ کا ہاتھ پکڑ لیا کہ انھیں علیحدہ لے جائیں، اکابر نے اس غصے کو فرد کرنے کی کوشش کی مگر ان کی التجائیں بیکار رہیں، پس سلطان کی پولیس بلائی گئی اور پولیس نے آکر فوراً شمسؒ کو گرفتار کر لیا اور انھیں ہر طرح کی ذلت کے ساتھ لے گئی اور کسی مزید تحقیقات یا ضابطہ کے بغیر انھیں قتل کر ڈالا۔"

اب رڈہاؤس کے اس ترجمہ کے مقابلہ میں مناقب العارفین کی اصل عبارت ملاحظہ

ہو،

نقل است از اصحاب قدیم کہ چوں نصیر الدین وزیر طاب ثراہ خانقاہ خود را تمام کردہ اجلاس عظیم کرد، علما و شیوخ را کابر جمع آمدہ بودند بعد از ختم قرآن سماع شروع کردہ دمبدم نصیر الدین وزیر در سماع بحضرت مولانا شمس الدین آسیب می کرد دست بدامن مولانا شمس الدین میرسانید و نگہداشت ارباب بصیرت نداشت۔ ہمانا کہ حضرت مولانا انفعال عظیم نمودہ دست مولانا شمس الدینؒ را بگرفت و از سماع بیرون آمد، چندانکہ اکابر کرام لابہا کردند ممکن نہ شد، بعد از فرود اشت سماع، ہماں ساعت سرہنگان سلطان بیدہ باباانت تماش بردند و در حال شہیداش کردند۔

پند مرداں نشنوی شوخی کنی — خویشتن بر تیغ پولادی زنی[۱]

---

[۱] ۶۴۵ (نسخہ قلمی)

نصیر الدین وزیر کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا مگر اس زمانہ میں سلطنت روم میں کچھ عجب آشوب بپا تھا، ہر طرف بازار فتنہ و فساد گرم تھا، ایک طرف مغلوں کی جانب سے نئے نئے احکام قتل جاری ہوتے رہتے تھے، دوسری طرف کیخسرو دوم (　　) کے بعد اس کے تینوں بیٹوں میں سلطنت کے لئے جنگ جاری تھی، اور جسے غلبہ ہو جاتا تھا وہ دوسرے کے حامیوں کے قتل میں دریغ نہیں کرتا تھا، تقریباً اسی زمانہ میں وزیر شمس الدینؒ نے (جن کا ذکر اس سے قبل تحت حالات سید برہان الدینؒ ترمذی ہو چکا ہے) متعدد امرا کو قتل کرا دیا تھا، ممکن ہے کہ اسی آشوب میں نصیر الدین وزیر بھی قتل ہوئے ہوں، بہر حال نصیر الدین کے حالات کی لاعلمی سے اصل بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ افلاکی کے بیان سے نصیر الدین کا گرفتار و قتل ہونا ثابت ہوتا ہے نہ کہ مولانا شمس الدینؒ کا۔

مناقب العارفین کی عبارت میں کسی قسم کا ابہام و اغلاق نہیں ہے، صاف عبارت ہے۔

جس کا مفہوم یہ ہے کہ مولانا کے ناخوش ہو کر چلے جانے کے بعد جب سماع ختم ہو گیا۔ شاہی پولیس نے آ کر وزیر نصیر الدین کو گرفتار کر لیا اور لے جا کر قتل کر ڈالا، نہ کہ مولانا شمس الدینؒ کو قتل کر دیا۔

ادنیٰ تامل سے ذہن میں آ سکتا ہے کہ افلاکیؒ کو مولانا اور حضرت شمس الدینؒ کے مناقب کا بیان مدنظر ہے، اگر حضرت شمس الدینؒ کے نسبت یہ فعل ظہور میں آیا ہوتا تو یہ مناقب میں کب شمار ہو سکتا تھا، ختم حکایت کے بعد افلاکیؒ نے جو شعر لکھا ہے وہ خود اس کی صریح دلیل ہے کہ افلاکیؒ کا مقصود کیا ہے، اگر یہ حضرت شمس الدین کے قتل کا واقعہ ہوتا تو افلاکیؒ اس حکایت کے بعد کوئی مرثیہ یا نوحہ تحریر فرماتے نہ کہ اور اس طرح کی تعریض عائد کرتے[1]

یہ ساری غلطی صرف ایک "تامش" کے "ش" کے غلط سمجھنے سے واقع ہوئی، "ش" کا اشارہ صریحاً وزیر کی طرف ہے، اسے غلطی سے شمس الدین کی طرف منعطف کر دیا، اور ایک مرتبہ ریڈ ہاؤس کے اس طرح غلط ترجمہ کر دینے کے بعد علمائے یورپ میں سے کسی نے اصل کی طرف رجوع نہ کیا، اسی پر حاشیہ چڑھاتے اور اسی کی تاویلیں کرتے گئے تا آنکہ ان کے دہاں یہ مسلّم ہو گیا کہ حضرت شمس الدینؒ کو پولیس والوں نے قتل کر ڈالا۔

---

[1] یہاں ایک نکتہ اور بھی مدنظر رہنا چاہئے، مناقب العارفین میں اگرچہ واقعات قطعی تاریخی ترتیب سے نہیں لکھے گئے ہیں۔ گر پھر بھی ایک حد تک تقدم و تاخر واقعات کو مرعی رکھا گیا ہے، روایت مذکورۂ بالا کے بعد حضرت شمس الدینؒ کے دمشق واپس آنے کا ذکر روایت مذکورۂ بالا کے بعد ہوا ہے۔ اس سے کیا کچھ نتیجہ نکلتا ہے؟ (یعنی یہ واقعہ حضرت شمس الدینؒ کی غیبت اول کے قبل پیش آیا ہے۔)

[افلاکیؒ نے جو شعر لکھا ہے وہ مثنوی شریف کا ہے اور دفتر سوم کی حکایت "استدعائے شخصے از موسیٰؑ آموختن زبان بہائم" میں ہے، مثنوی شریف کی اس حکایت کو اگر افلاکیؒ کی روایت پر منطبق کیا جائے تو بالکل ٹھیک اترتی ہے، چونکہ مولانا نے یہ بار بار فرمایا ہے کہ مثنوی شریف کی حکایتیں میرے اور میرے مریدین ہی کے حالات ہیں، ممکن ہے کہ اس حکایت میں اس واقعہ کا اشارہ مضمر ہو]

خلاصہ کلام یہ کہ

(۱) یہ امکانات سے ہے کہ کسی ہنگامے میں حضرت شمسؒ کو کوئی آزار جسمانی پہونچ گیا ہو۔

(۲) مگر یہ کہ زخمی ہو کر آپ اسی وقت ہمیشہ کے لئے نظروں سے پوشیدہ ہو گئے" اس میں جائے کلام ہے۔

(۳) آپ کے قتل ہو جانے کے متعلق مشرقی روایتیں جتنی ہیں سب محل شک میں ہیں اور ان سے کسی خبر قطعی کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

(۴) مغربی روایتیں ایک غلط ترجمہ کی بنار پر قائم ہو گئیں اور مسلسل چلی آرہی ہیں۔ مگر کسی قابل وثوق سند سے یہ ثابت نہیں ہے کہ کسی وقت میں پولیس نے حضرت شمسؒ کو گرفتار کر لیا ہو اور گرفتار کرنے کے بعد آپ کو قتل کر دیا ہو یا کہیں خفیہ بھیجدیا ہو۔

(۵) اسی ضمن میں اہل مغرب جو یہ کہتے ہیں کہ اس ہنگامے میں مولاناؒ کے فرزند اکبر علاءالدین مارے گئے، یہ بھی صحیح نہیں، علاءالدین نے حضرت شمس الدینؒ کی مخالفت میں حصہ ضرور لیا مگر ان کا انتقال حضرت شمسؒ کے چلے جانے کے بعد ہوا ہے (یہ بھی قطعاً غلط ہے کہ علاءالدین مولاناؒ کے خلف اکبر تھے، مولانا کے خلف اکبر سلطان ولدؒ تھے۔)

اب یہ تسلیم کر کے کہ حضرت شمسؒ ... دوسری بار قونیہ سے دفعتہً غائب ہو گئے

سلسلۂ حکایت اس طرح آگے بڑھتا ہے کہ حضرت شمسؒ کے غائب ہو جانے کے بعد، مولاناؒ نے دو ایک روز ہر طرف آپ کی تلاش کی مگر جب کسی طرح آپ کا کچھ پتہ نہ چلا، تو مولاناؒ کی حالت متغیر ہونا شروع ہوئی، طریق سماع تو آپ پہلے ہی اختیار کر چکے تھے، اب یہ حالت ہوئی کہ ایک دم سماع کے بغیر نہیں گزرتا تھا۔

خود اس حالت کو غزل میں اس طرح ظاہر فرماتے ہیں۔

دلم را نالۂ سرنائے باید — کز آں سرنائے بوئے یار آید
بجاں خواہم کہ نالم عاشقانہ — کزاں نالہ جمالِ جاں نماید
ہمی نالم کہ از غم بار دارم! — عجب زیں جانِ نالاں تا چہ زاید

....

چو نالہ مونسِ رنجور گردد..! — گرش گوئی خمش کن میکشاید

۸۔ ص ۲۲۳

قوال ایک ایک کر کے عاجز ہو گئے، مگر مولاناؒ کو سیری نہیں ہوتی تھی، مدرسہ میں ٹہلا کرتے تھے اور آشکارا و نہاں شور و فریاد کرتے تھے۔ تمام شہر میں غلغلہ پڑ گیا کہ ایسا عالم دین و مفتی اسلام اس طرح سماع و رقص کے پیچھے دیوانہ و سرگرداں ہو رہا ہے، ہر طرف ایک شورش برپا ہو گئی، لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ مولاناؒ اور اصحاب مولاناؒ نے سب کچھ چھوڑ کر صرف عاشقی اختیار کی ہے، دین و مذہب کوئی چیز نہیں ہے، جو کچھ ہیں، شمس ہیں، ؎

عاشقی شد طریق و مذہب شاں — غیر عشقت ہمیش شاں ہذیاں
کفر و اسلام نیست زرہ شاں — شمسؒ تبریز شد شہنشہ شاں

کار شان ستیست دب خویش ؎ ملتِ عشق ہست بے کیشی

(رباب نامہ)

اسی زمانہ میں مولاناؒ نے حضرت شمسؒ کے فراق میں بہت کثرت سے اور نہایت ہی دلدوز غزلیں کہیں، اسی محل پر سلطان ولدؒ نے لکھا ہے کہ۔

شیخ مفتی ز عشق شاعر شد ؎ گشت خمّار اگرچہ زاہد بد

نہ ز خمرے کہ آں بود ز انگور ؎ جان نوری نخورد جز مے نور

سپہ سالار کے الفاظ یہ ہیں کہ "روز و شب در فراق آنحضرتؒ غزلیات بیان می آوردند" [1]

مولاناؒ کے کلام کا سب سے زیادہ شور انگیز و ولولہ خیز حصہ وہی ہے جو اس زمانہ میں کہا گیا ہے، لیکن چونکہ تیقن کے ساتھ یہ معلوم نہیں ہے کہ خاص اس زمانہ کی غزلیں کون کون سی ہیں اس لئے قطعی طور پر ان کا تعین نہیں ہو سکتا، تاہم اتنا ضرور ہے کہ آپ کی درد انگیز فراقیہ غزلیں زیادہ تر اسی زمانہ کی ہیں، اس قسم کی غزلوں سے سارا دیوان بھرا پڑا ہے۔ یہاں صرف ایک غزل کے چند اشعار نمونتہً دیے جاتے ہیں جن سے مولانا کے ہیجان و بیتابی کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔

اے یوسفؑ آخر سوائے ایں یعقوبؑ نابینا بیا

اے عیسیٰؑ پنہاں شدہ در طارمِ بینا بیا

---

[1] صہ ۶۹

از ہجر روزم قیر شد، دل چوں کماں تن تیر شد
یعقوبؑ مسکیں پیر شد، اے یوسفؑ برنا بیا

رخ زعفراں رنگ آمدم، خم دادہ چوں چنگ آمدم
در گور تن تنگ آمدم، اے جانِ با پہنا بیا

چشم محمدؐ باتست، در شوق گفتہ داغمت
زاں طرۂ آں در ہمت اے سرّ ِ اسلٰنا بیا

ای تاب قوسین مقدمت وای دولت با مکرمت
کس نیست جاناں محرمت، در قرب اوادنٰی بیا

اے خسرو ہوش بیا ای نوشتراں از صد خوشش بیا ۱
اے آب وائے آتش بیا ای دُرد وائے دریا بیا

مخدوم جانم شمسؒ دیں، از جاہت اے روح الامیں
تبریز شد عرش مکیں، از مسجد اقصا بیا

(۱۳۔ ص ۳۱)[۱]

مولاناؒ کے سوز فراق اور درد ہجراں کا کچھ اندازہ اشعار مرقومۂ بالا سے ہو گیا ہو گا اب محبت حقیقی کا ایک نمونہ بھی ملاحظہ ہو، اس تمام جانگدازی و بے قراری کے باوجود مولاناؒ کے دل سے یہ خیال محو نہ ہو سکا کہ رومیوں کی خانہ جنگی، مصریوں کی ترک تازی اور تاتاریوں کی تاراجی کے باعث سارا ملک تہ و بالا ہو رہا ہے، معلوم نہیں اس عالم آشوب میں خود حضرت شمسؒ کیا گزری ہو، بیتاب ہو کر فرماتے ہیں۔

خوشی آخر بگو اسے یار چونی   ازیں ہموار ناہموار چونی ....

بروز و شب مرا اندیشۂ تست | کزیں روز و شب خونخوار چونی
ازیں آتش کہ در عالم فتادہ است | ز دود لشکر تاتار چونی
دریں دریا و تاریکی و صد موج | تو اندر کشتئ پر بار چونی
منم بیمار و تو ما را طبیبے | بپرس آخر کہ ای بیمار چونی
منت پرسم اگر تو می نپرسی | کہ اے شیریں شیریں کار چونی
وجودش بیں کہ بے چون چگونہ است | مگو دیگر مگو بسیار چونی!
بگو در گوش شمس الدینؒ تبریز | کہ اے خورشید خوب اسرار چونی

(۹ ۔ ص ۸۳۸)

لباس کی وہ خاص وضع جو مولاناؒ کی جانب منسوب اور خرقہ مولویہ کا شعار ہے، اسکی ابتدا اسی وقت سے ہوئی 'افلاکیؒ' نے لکھا ہے کہ :۔

"منقول ہے کہ چہلم کے بعد مولانا نے دستار خانی سر پر باندھی اور اس کے بعد پھر کبھی سفید دستار نہیں باندھی' اور بردیمنی دہندی سے فرجی بنائی' آخر وقت تک آپ کا لباس یہی رہا۔" [۱]

---

[۱] مناقب ص ۔ "منقول است کہ بعد از چہلم روز حضرت مولاناؒ دستار خانی بر سر نہادہ دیگر دستار سفید بر سر نبست و از بردیمنی و ہندی فرجے ساخت ، تا آخر وقت لباس ایشاں آں بود۔"

انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا (جلد ۲۲ ص ۹۵۰) میں لکھا ہے کہ "غضب عوام کے شکار ہو جانے والوں کی یادگار میں مولاناؒ نے سلسلۂ مولویہ قائم کیا جو اپنے تقوی اور اپنے خاص لباس عزا کے لئے مشہور ہے ...... "شکار ہو جانے والوں سے مراد حضرت شمس الدینؒ اور علاء الدینؒ

"فرجی" کی وجہ تسمیہ کے متعلق مولاناؒ نے خود مثنوی شریف میں لکھا ہے کہ :-

صوفیٔ بدرید جبہ در حرج — پیشش آمد بعد بدریدن فرج

گشت نام آں دریدہ فرجی — آں لقب شد فاش ازاں مرد نجی

ایں لقب شد فاش و صافش شیخ برد — ماند اندر طبع خلقاں حرف درد

ایک وقت آیا کہ اسے بھی زیادہ سمجھے اور ایک روز فقر نبوی کی شرح کرتے ہوئے فرمایا کہ اب خواہش یہ ہے کہ "ہو قائے بک پہنوں، فرجی" نہ پہنوں اور حضرت عمرؓ کی طرح پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنوں اور ہر طرح فارغ ہو جاؤں" چلپی حسام الدینؒ نے سر جھکا کر کہا کہ صدارت و امارت اور لباسہائے فاخرہ کو چھوڑ کر اس جامۂ ہندوباری اور کلاہ نمدیں پر اکتفا کیا اور خطائی کو چھوڑ کر برد یمنی اختیار کیا، بر دیمنی میں موافقت رسول اللہ صلعم ہے، اب اس کے بعد اور کیا کریں، مولاناؒ نے تبسم کر کے فرمایا کہ "جامہ ہندوباری، دستار خانی کلاہ نمدیں، کفش و موزہ نارنجی کچھ زیادہ نہیں ہے"[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۵)

(فرزند مولاناؒ) ہیں گزرا لا تو اس ہنگامہ میں علاء الدین کا قتل ہونا ہی غلط ہے، دوسرے مولاناؒ کے اس لباس کے اختیار کرنے میں علاء الدین کے غم کو کوئی دخل نہیں تھا، یہ صرف حضرت شمسؒ کے غم میں ہوا تھا

[1] مناقب نسخہ قلمی ص ___

لیکن افلاکیؒ ہی نے مولانا شمسؒ کی غیبت اول کے بعد بھی یہ لکھا ہے کہ :-

شمس الدینؒ کے غائب ہو جانے کے بعد جب ایک ماہ تک پتہ نہ چلا تو مولانا نے فرمایا کہ "از ہندیارے فرجے ساختند و کلاہے از پشم عسلی بر سر نہاد و گویند دراں ولایت ہندباری را اہل عزا می پوشند ہمچناں پیراہن را نیز باز کردہ پوشیدہ و کفش و موزہ مولوی در پا کردند و دستار را با سکر آویز پیچیدند" (مناقب ص ۱۱)

اس زمانہ میں فرقہ مولویہ میں جو لباس رائج ہے اس کے نسبت صاحب "سوانح مولانا رُوم" تحریر فرماتے ہیں کہ "میں نے سفر کے زمانہ میں اس فرقہ کے اکثر جلسے دیکھے ہیں۔ یہ لوگ نمد کی ٹوپی پہنتے ہیں جسمیں جوڑ یا درز نہیں ہوتی، مشائخ اس ٹوپی پر عمامہ بھی باندھتے ہیں، خرقہ یا کرتے کے بجائے ایک چُنت دار جامہ ہوتا ہے" [1]

شمس الدینؒ کے غائب ہو جانے کے بعد آپ کے اشتیاق میں مولاناؒ کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص جھوٹوں بھی کہہ دیتا کہ میں نے حضرت شمس الدینؒ کو فلاں جگہ دیکھا ہے تو مولاناؒ لباس تک اتار کر اس کی نذر کر دیتے، شکرانہ دیتے اور بہت کچھ اظہار تشکر کرتے، ایک مرتبہ ایک شخص نے آکر کہا کہ میں نے مولانا شمس الدینؒ کو دمشق میں دیکھا ہے، مولانا اس قدر سرور ہوئے کہ جو کچھ پہنے ہوئے تھے سب اسے بخشدیا، موزے تک اتار کر دیدیئے اس کے بعد کسی نے عرض کیا کہ اُس نے دیکھا نہیں ہے، یہ خبر غلط دی ہے مولاناؒ نے فرمایا کہ اگر خبر صحیح ہوتی تو میں لباس کے بجائے جان کیوں نہ دیدیتا، اور اُس پر فدا کیوں نہ ہو جاتا" [2]

اپنی اس حالت کا اظہار خود ایک غزل میں کیا ہے، فرماتے ہیں۔

ماند و شد است گوش من از پئے انتظار آں . . . . .

کز طرفے صدائے خوش در دسوے بہ ناگہاں

خوئے شد است گوش را، گوش ترانہ نوش را

گر شنود سماع خوش ہم زمیں، ہم آسماں

(۸ - ص ۶۲۲)

---

[1] سوانح مولانا رُوم ص ۲۰ [2] مناقب ص ۲۹۱

اسی اضطراب و بے قراری میں شاید کوئی شعاع امید کسی طرف سے نظر آگئی تھی۔

اور بقول افلاکی مولاناؒ نے جب سفر شام کا ارادہ کیا ہے تو ایک غزل میں کہا ہے کہ

خبر رسید بشام است شمسؒ تبریزی   چہ صبحہا کہ نماید اگر بشام بود

مگر اس عاجز کا خیال یہ ہے کہ یہ غزل شمسؒ کے پہلی مرتبہ غائب ہو جانے کے بعد جب آپ کے دمشق میں ہونے کی خبر ملی ہے اسوقت کہی ہوگی، اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہ پیش تو چہ زند جان و جاں کدام بود   کہ جان توئی و دگر جملہ نقش و نام بود

اگرچہ ماہ بدو دست روئے خود شوید   چہ زہرہ دارد کاں چہرہ را غلام بود

بجان عشق کہ تا ہر دو جاں نیامیزد   جدائیست و ملاقات بے نظام بود

رفیق گشتہ دو چشمش میان خوف و رجا   برائے پختن ہر عاشقے کہ خام بود

ہزار خانہ بتاراج برد و خوشش   سلامتی ہمہ تاراج آں سلام بود

رسید مژدہ بہ شام است شمسؒ تبریزی   چہ صبحہا کہ نماید اگر بشام بود

(ص ۳۲۸)

کچھ تو شمسؒ کے فراق سے بیتاب ہو کر اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ مولاناؒ کی تغیر حالت کی وجہ سے لوگوں میں ایک شور برپا ہو گیا تھا، آپ نے سفر شام کا ارادہ کیا لیکن افلاکیؒ نے یہ لکھا ہے کہ "باز نوبت دوم چوں غیبت فرمود حضرت مولاناؒ بفرزند دلبند خود از غایت عنایت کہ داشت ۱؎ اشارت فرمود با بست نفر درویش بسفر شام فرستاد بطلب مولاناؒ شمس الدین عظم اللہ ذکرہٗ۔

۱؎ سلطان ولد

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید اپنی روانگی سے قبل مولاناؒ نے سلطان ولدؒ کو چند شخصوں کے ہمراہ حضرت شمسؒ کی تلاش میں شام کی طرف بھیجا تھا، مگر خود سلطان ولدؒ نے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا ہے اور نہ رسالہ سپہ سالار میں کوئی اشارہ ملتا ہے، غالباً سلطان ولد کا بھیجنا اسی طرح کار ہا ہوگا جس طرح مولاناؒ نے ہر طرف جستجو میں آدمی بھیجے تھے، شام کی طرف سلطان ولد کو روانہ کیا ہوگا، اور سلطان ولدؒ کے واپس آجانے کے بعد خود سفر شام کا ارادہ کیا ہوگا، ایک غزل میں اپنے سفر شام کا اشارہ اس طرح فرماتے تھے۔

بجان عشق کہ بر شہر شوق دانہ ودام　　عزیمتِ سفرم زردم تا سوئے شام

نماد ولولہ در شہر از ضمیر حسود　　کہ بازگشت فلانے زدست دشمن کام

دوسرے شعر سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس عزم سفر سے شاید دوسرے سفر شام کی طرف اشارہ ہے، یا پہلا سفر ہی ہو جو سلطان ولد کی واپسی کے بعد اختیار کیا گیا، شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل شہر میں کسی ناکام واپسی کا چرچا تھا خواہ سلطان ولدؒ کے واپس آنے کے بعد ایسا ہوا ہو یا خود مولاناؒ کے پہلے سفر سے واپسی کے بعد۔

سلطان ولد نے مولانا کے سفر کا جو حال دیا ہے وہ یہ ہے کہ "اسی جوش وخروش کے عالم میں مولاناؒ نے سفر کا ارادہ کیا اور شام کی طرف روانہ ہوگئے۔ آپ کے اصحاب بھی آپ کے ساتھ چل کھڑے ہوئے، اسی طرح دمشق پہونچے اور وہاں بھی لوگوں کے دلوں میں آتش عشق بھڑکادی، تمام لوگ حیران تھے کہ ایسا عالم وفاضل شخص کیوں اس طرح دیوانہ ہو رہا ہے، شمس تبریز کیا چیز ہیں۔ جو ایسا فرد فریدان کے پیچھے یوں مارا پھر رہا ہے۔ یہ راز کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

جب دمشق میں شمسؒ کا کچھ پتہ نہ چلا، اس وقت مولاناؒ نے یہ فرمایا کہ میں اور شمسؒ دو نہیں ہوں، وہ اگر آفتاب ہیں تو میں ذرہ ہوں، وہ اگر دریا ہیں تو میں قطرہ ہوں، ذرہ

کی ہستی آفتاب ہی سے ہے اور قطرہ کی تری دریا ہی سے ہے، پس فرق کیا ہوا۔

مدح خود کردنم ازیں رویست — کہ خم پر ز آب آں جویست

پس ہمہ مدح اوست در تحقیق — اصل را گیر و بگذر از تفریق

جب دمشق میں حضرت شمسؒ کا کچھ پتہ نہ چلا تو مولاناؒ نے چند روز بعد شام سے روم کی جانب مراجعت فرمائی

چند برس قونیہ میں قیام فرمایا، مگر پھر عشق نے جوش کیا اور کچھ لوگوں کو لے کر دمشق کی طرف روانہ ہوئے، اس مرتبہ چند ماہ دمشق میں ٹھہرے رہے۔ آخر پھر قونیہ تشریف فرما ہوئے اور اس مرتبہ یہ خیال لے کر آئے کہ میں خود عین شمسؒ ہوں شمسؒ کی جستجو کیا تھی، درحقیقت خود اپنی ہی جستجو کر رہا تھا

گفت چوں من دیم، چہ می جویم — عین ادیم کنوں ز خود گویم!

وصف حسنش کہ میفزودم من — خود ہماں حسن و لطف بودم من

خویش را بودہ ام یقیں جویاں — ہمچو شیرہ درون خم جوشاں

غرض اس مرتبہ قونیہ اس خیال کے ساتھ واپس آئے کہ شمسؒ میں جو کچھ تھا وہ خود مجھ میں موجود ہے [1]

سپہ سالارؒ نے مولانا کے اس سفر کا بیان بہت مختصر دیا ہے۔ اس سے صرف اتنا اضافہ ہوتا ہے کہ اس سفر میں تمام عزیزوں اور مقربوں کو ہمراہ لے کر دمشق گئے تھے [2]، مگر افلاکی کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف چند اصحاب کو لے کر دمشق کی طرف

---

[1] ملخص رباب نامہ [2] با تمامت عزیزان و مقربان بحروسۂ دمشق رفتہ ص ۲۹

گئے تھے جن میں سلطان ولدؒ بھی تھے۱؎۔ اس سفر میں حلب پہونچنے سے پہلے ایک جگہ تین سو قزاقوں سے سابقہ پڑا اگر وہ سب مطیع و معتقد ہو گئے۔

اسی سفر شام میں مولاناؒ نے یہ غزل کہی تھی۲؎

ما عاشق گشتۂ و شیدائے دمشقیم — جاں دادہ و دل بستۂ سودائے دمشقیم

بر بام پریدیم چو از باب پریدیم — زاں جامع عشاق بہ خضرائے دمشقیم

از باب فرج دوری و از باب فرادیس — کے دانی کاندر چہ تماشائے دمشقیم

اندر جبل صالح۳؎ کانیست ز گوہر — زاں گوہر ما غرقۂ دریائے دمشقیم

کے بے مزہ مانیم چو در مزہ در آئیم — دروازۂ شرقی و سویدائے دمشقیم

از روم بتازیم دگر بار سوئے شام — کز طرۂ چوں شام مطرائے دمشقیم

از چشمۂ سواس گر آب نخوردی — ما عاشق آں ساعد سقائے دمشقیم

از سکن معلوم چو بگرفت دل ما — ما طالب تالیف ز ابنائے دمشقیم

مخدومی شمس الحق تبریز چو آنجاست — مولائے دمشقیم چہ مولائے دمشقیم

(۱۵۔ ۴۷۷-۴۷۸)

خلاصہ یہ کہ مولاناؒ نے اس مرتبہ شمسؒ کی جستجو میں دو بار دمشق کا سفر اختیار کیا، پہلی مرتبہ غیبت شمسؒ کے چند روز بعد یا زیادہ سے زیادہ چالیس۴؎ روز بعد روانہ ہوئے اور اپنی عدم موجودگی میں حضرت حسام الدینؒ چلپی کو قونیہ میں اپنا جانشین کر گئے تھے۔

۱؎ بعضے اصحاب و اعقاب را برگرفتہ آہنگ دیار شام کرد ص ۱۲۵

۲؎ مناقب نسخہ قلمی — ۳؎ بنائے جبل صالحیہ ابو الفدا؍

[مگر افلاکیؒ نے اس سفر کو سیوم[1] بار قرار دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس مرتبہ ایک سال سے کچھ کم یا زیادہ دمشق میں مقیم رہے، لیکن افلاکی سے یہ نہیں واضح ہوتا کہ پہلے دو سفر کون سے تھے.

سلطان ولدؒ کا بیان بہت صاف و قطعی ہے کہ مولاناؒ نے دو بار دمشق کا سفر کیا، اول شمسؒ کے غائب ہو جانے کے چند روز بعد روانہ ہوئے اور دمشق میں تھوڑے ہی دنوں قیام کر کے واپس آ گئے تھے ۔

پس یہ سفر ۶۴۳ھ میں ہوا ہوگا۔

دوسرا سفر چند برس بعد اختیار کیا اور اس مرتبہ دمشق میں قیام بھی زیادہ کیا اور افلاکیؒ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک دمشق سے واپس نہیں آئے جبتک کہ خود قونیہ کے امرا و علمار نے باتفاق تمام آپ کی اور حضرت شمس الدینؒ کی واپسی کی استدعا نہ کی۔ افلاکیؒ کی عبارت کا ملخص حسب ذیل ہے۔

جب تمام اہالی قونیہ اور اکابر روم مولاناؒ کی جدائی سے تنگ آ گئے تو سلطان روم اور امرائے عظام کے سامنے کیفیت حال عرض کی اور ایک محضر مولانا اور حضرت شمس الدینؒ کی طلب میں مرتب کیا اور تمام علمار و شیوخ و قضاۃ اور امرا و اعیان نے اس پر دستخط ثبت کئے اور قضاۃ "عقیل" کو آپ کی خدمت میں روانہ کیا اور وطن واپس آنے کے لئے بڑے اشتیاق و آرزو کا اظہار کیا، مولاناؒ نے ازراہ اخلاق قبول فرمایا اور وطن کو واپس آئے۔"

اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس دوسری مرتبہ کا سفر بھی اسی وجہ سے ہوا تھا کہ لوگ حضرت شمس الدینؒ کی طرف سے صاف نہیں ہوئے تھے اور حضرت شمسؒ کے فراق میں مولاناؒ کی پریشانی جس قدر بڑھتی جاتی تھی اور لوگ ان کے فیض سے محروم ہوتے جاتے تھے، اسی قدر شورش میں

---

[1] شاید افلاکی نے مولانا کے اس سفر کو بھی شمار کر لیا ہو جو آپ نے بغرض تحصیل علم ۶۳۴ھ سے قبل کیا تھا۔

بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ آخر الامر جب لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ شمسؒ کی دوری سے نہیں بلکہ قربت سے مولانا کی تسکین ہوگی اور اس طرح بالواسطہ مولاناؒ سے استفادہ کا موقع ملے گا، اس وقت ناچار اس تدبیر کے اختیار کرنے پر مجبور ہوئے کہ حضرت شمسؒ کے قیامِ قونیہ کو گوارا کریں۔

[اس زمانہ میں عزالدین کیکاؤس ثانی (بشمول برادران) روم کا فرمانروا تھا، افلاکیؒ نے دوسرے موقع پر جو روایت نقل کی ہے کہ جب مولاناؒ حلب میں تھے، سلطان عزالدین نے کمال الدین کو حلب بھیجا تھا کہ مولاناؒ کو واپس لائیں، اگر اس واقعہ اور تاریخ سے ملایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہی موقع تھا اور قرائن بھی اسی کے مقتضی ہیں، کیونکہ مولاناؒ جس زمانہ میں حلب میں تحصیل علوم میں مشغول تھے اس وقت تک نہ تو ذاتی حیثیت سے مولاناؒ کا اس قدر اثر قائم ہوا تھا کہ آپ کا چند روزہ فراق اس قدر شاق ہو جاتا اور نہ کوئی خاص وجہ آپ کو اس طرح واپس بلانے کی تھی اور نہ وہ زمانہ سلطان عزالدین کا تھا بلکہ اس زمانہ میں سلطان علاء الدین بدستور حکمراں تھا، بہرحال یہ ایک ظنی قیاس ہے اور ممکن ہے کہ اس وقت سلطان (علاء الدین) نے آپ کو طلب کیا ہو اور افلاکیؒ نے سہواً عزالدین کا نام لکھ دیا ہو]

مولاناؒ کے شام کے یہ دونوں سفر ۶۴۵ھ اور ۶۴۷ھ کے درمیان واقع ہوئے ہوں گے، کیونکہ شیخ صلاح الدین کے حالات میں یہ درج ہے کہ آپ دس برس مولاناؒ کی صحبت میں خلیفہ کی حیثیت سے رہے۔ شیخ کا انتقال ۶۵۷ھ میں ہوا ہے اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ شیخ صلاح الدین کو شمسؒ کے بجائے اپنا ہمدم و ہمراز بنانے کے بعد مولاناؒ کی طبیعت میں سکون پیدا ہو گیا تھا۔ اور اس کے بعد آپ نے شمسؒ کی تلاش میں کوئی سفر نہیں کیا ہے، پس ضرور ہے کہ یہ شور و ہیجان کا زمانہ ۶۴۷ھ

میں ختم ہو چکا ہو۔

[لیکن اوپر یہ بھی ذکر ہو چکا ہے کہ پہلے سفر سے واپس آنے کے چند سال بعد پھر دمشق کو گئے تھے، مگر واقعات کو تاریخ سے ملانے پر یہ واضح ہوتا ہے کہ اس شور دیجاںؒ کا زمانہ دو ہی برس رہا ہے اور یہ سفر اس دو برس کے اندر وقوع میں آئے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب]

اس مرتبہ دمشق سے واپس آنے کے بعد مولاناؒ حضرت شمسؒ کے ملنے سے بالکل مایوس ہو گئے تھے، مگر جس کیفیت کو آپ شمسؒ میں ملاحظہ فرماتے تھے اسے اب خود اپنے میں ملاحظہ فرمانے لگے تھے، سلطان ولدؒ کے الفاظ یہ ہیں کہ "اگرچہ مولانا قدسنا اللہ سرہٗ شمس الدین تبریزی را اعظم اللہ ذکرہٗ بصورت در دمشق نیافت بمعنی در خود بیافت زیرا آں حال کہ شمس الدین رابود حضرتش را ہماں حاصل شد"

اسی کو افلاکیؒ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ "اگرچہ حضرت مولاناؒ شمس الدینؒ را بصورت در دمشق نیافت اما بمعنی عظمت اورا چیزے دیگر در خود یافت و عشقبازی خود می کرد [1]"

خود مولانا نے مختلف غزلیات میں اس کا اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک غزل

---

[1] چنانکہ می گفت

دست بکشا دامنِ خود را بگیر | مرہم ایں ریش جز ایں ریش نیست

و در غزل دیگر فرمودہ۔

شمس تبریز خود بہانہ ایست | مائیم بحسن ولطف مائیم (مناقب ۲۵۱ نسخہ قلمی)

میں فرماتے ہیں:۔

عاشقاں را جستجو از خویش نیست — در جہاں جوئندہ جز او بیش نیست

اے دمت عیسیٰ دم از دوری مزن — من غلام آنکہ دور اندیش نیست

گر بگوئی پس روم نے پس مرد — در بگوئی پیش نے رہ پیش نیست[۱]

دست بکشا دامن خود را بگیر — مرہم ایں ریش جز ایں ریش نیست[۲]

ہر کہ از جا رفت جائے او دلست — ہیچ دل اندر جہاں جائیش نیست

کوس سلطانی زند در ملک خضر — کو ز گنج معنوی درویش نیست

(۸ ۔ ص ۱۵۹)

دوسری غزل میں ارشاد ہوتا ہے۔

ما زندہ بنور کبریائیم — بیگانہ و سخت آشنائیم

....

شمس تبریز خود بہانہ ایست — مائیم بلطف و حسن مائیم

۱؎ شیخ فریدالدینؒ عطار کے دیوان میں ایک غزل مسلسل اٹھارہ شعروں کی ہے اور اس میں انھیں دونوں شعروں کے مفہوم کو تشبیہات و تمثیلات سے واضح کیا ہے یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ مولانا نے تفصل کا اجمال دو شعروں میں پیش کر دیا ہے موقع کے اعتبار سے چار شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

پیش رفتن راچہ پیشاں بستہ اند — باز گشتن راچہ پایاں بستہ اند

پس نہ از پس راہ داری نے ز پیش — کز دو سو رہ بر تو حیراں بستہ اند

پس ترا حیراں میانِ ایں دو راہ — عالمے زنجیر در جاں بستہ اند

با خلق بگو برائے ردپوش | کو شاہ کریم و ما گدائیم
ما را زچہ شاہی و گدائی | شادیم کہ شاہ را سزائیم
بجویم بنور شمسؒ تبریز | در محو نہ او بود نہ مائیم

(۱۱۔ ص ۴۹۵)

اسی وزن و قافیہ میں ایک دوسری غزل بھی ہے، اس میں بھی کچھ اسی قسم کے اشارات ملتے ہیں۔

ہر گہ کہ ز نور باخود آئیم | وانگہ بخدا کہ باخود آئیم
دانم کہ بجز خدا نہ داند | سر سخناں کہ ماسرائیم
با ذرہ دوست آفتاب است | تا ظن نہ بری کز و جدائیم
گر شمسؒ فرورود ز بالنے | ما با تو چو ماہ خوش برائیم

۱۳۔ ص ۵۰۰

اس کے بعد کسی نہ کسی وقت میں مولاناؒ کو حضرت شمسؒ کی وفات کا یقین ہو گیا تھا۔ مختلف اشعار میں ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے مولاناؒ کے اس یقین کا انکشاف ہوتا ہے۔

چونکہ روح شمسؒ تبریزی مرا | برد باخود جان بے تن میردم

ص ۵۵۱

سلطان ولدؒ کے ایک شعر سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ ضرور ایسا یقین

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۵)

چوں رسی درخود شود روشن ترا | پردۂ کز کفر و ایماں بستہ اند

ہو گیا تھا ؎

گشت غائب زیں جہانِ خاکداں — بے بدن اندر جہانِ جاوداں

مولاناؒ کے کلیات میں شمسؒ کا ایک مرثیہ بھی ملتا ہے، نہایت دل دوز و درد انگیز مرثیہ ہے، ایک ایک شعر دل پر تیر و نشتر کا کام دیتا ہے مگر اس میں بھی مولانا نے صراحت کے ساتھ شمسؒ کی وفات کا ذکر نہیں کیا ہے، مجمل اشارات کئے ہیں، غالباً یہ مرثیہ اُس وقت کہا ہے جب شمسؒ کی وفات کا خیال یقین کے درجہ تک پہنچ گیا ہے۔[۱] یہ مرثیہ انتیسؔ شعروں کا ہے، ذیل میں نو شعر نقل کئے جاتے ہیں :۔

قدرِ غم گر چشم سر بگریستے — روز و شبہا تا سحر بگریستے

آسماں گر واقفستے زیں فراق — انجم و شمس و قمر بگریستے

گر گلستاں واقفستے زیں خزاں — ہر گل و ہر شاخ تر بگریستے

ایں اجل کر است، نالہ نشنود — ورنہ با خونِ جگر بگریستے

مادر فرزند خوار آمد زمیں — ورنہ بر مرگ پسر بگریستے

گر جنازہ واقفستے زیں کفن — ایں جنازہ بر گذر بگریستے

زیر خاکم آنچناں گر ایں جہاں — شاید از زیر و زبر بگریستے

شمسؒ تبریزی برفت از کو کسے — تا براں فخرِ بشر بگریستے

---

[۱] آگے چل کر خود مولاناؒ کے انتقال کے واقعات میں یہ منقول ہوگا کہ مولاناؒ نے اپنے انتقال کے قریب یہ فرمایا تھا کہ "میرے اصحاب ادھر کھینچتے ہیں اور مولانا شمس الدین ادھر بلا رہے ہیں" اس سے یہ ثابت ہے کہ مولاناؒ کو اپنے انتقال سے قبل حضرت شمسؒ کی وفات کا تیقن ہو گیا تھا۔

عالمِ معنی عــــرد ی یافت زد   یک سبے اداین صور گریستے
(۹۲۱ ص ۲۹)

تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے ۶۴۵ھ کو حضرت شمس الدین کی تاریخ وفات قرار دیا ہے مگر جیسا کہ اوپر کے بیانات سے واضح ہو چکا ہے جن کتابوں کو اصل بنا قرار دیا جا سکتا ہے، ان سے یہ سنہ غیبت و استتار کا قرار پاتا ہے۔ نہ کہ وفات کا[1]، لیکن غیبت و استتار ہو یا وفات تمام تذکروں میں بلا استثنا یہ لکھا ہے کہ ۶۴۵ھ کے بعد پھر حضرت شمسؒ کو کسی نے کہیں نہیں دیکھا، کسی خاص کتاب کے حوالہ کی ضرورت نہیں ہے، صرف دولت شاہ نے ایک شبہ ظاہر کیا ہے کہ حضرت شمسؒ نے مولانا کے انتقال کے بعد (یعنی ۶۷۲ھ کے بعد) وفات پائی' (اس کا ذکر ہو چکا ہے) البتہ فہرست کتب خانہ بانکی پور میں حضرت شمسؒ کا سال وفات ۶۶۰ھ دیا ہے[2] اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ماخذ فہرست کتب خانہ شاہانِ اودھ مرتبۂ اسپرنگر ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ "بعض مصنفین آپ کا سال وفات زیادہ صحیح طور پر ۶۶۰ھ میں قرار دیتے ہیں" لیکن اسپرنگر نے یہ نہیں بتایا کہ وہ مصنفین کون ہیں؟

---

[1] تاریخ الغیبت والاستتار مولانا شمس الدین تبریزی قدس اللہ سرہ العزیز یوم الخمیس سنہ خمس اربعین وستمایۃ مناقب (نسخہ قلمی)

[2] اگر یہ خود چھاپے کی غلطی نہیں ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی فارسی کتاب سے مغالطہ ہوا ہے۔ ایرانی خط میں (   ) اور ۶ (   ) کے ہندسوں میں ایسا خفیف فرق ہے کہ سرسری نظر میں بسا اوقات دھوکہ ہو جاتا ہے اور ۵ کا ہو جانا کچھ دشوار نہیں ہے ٬ال

[اوپر حضرت شمسؒ کے قتل ہوجانے کی روایت پر بحث کرتے ہوئے ان دونوں سنین کو پیش کیا گیا ہے مگر صرف بر بنائے فرضی ایسا کیا گیا ہے، راقم الحروف انھیں صحیح نہیں تسلیم کرسکتا]

مولاناؒ اور حضرت شمسؒ میں باہمدگر جو خلوص و اتحاد تھا اور ایک کے دل میں دوسرے کی جو قدر و منزلت تھی وہ واقعات مذکورۂ بالا سے خوب واضح و روشن ہو چکی ہے، توضیح مزید کی ضرورت نہیں ہے مگر پھر بھی دونوں بزرگوں کے چند اقوال نقل کیے جاتے ہیں، جن سے تخصیصاً یہ عیاں ہو جائے کہ حضرت شمس الدین مولاناؒ کی نسبت کیا خیال رکھتے تھے اور مولاناؒ کے دل پر حضرت شمس الدین کی محبت کا نقش کیسا گہرا جما ہوا تھا۔

سب سے اول خود حضرت شمس الدینؒ کا ایک قول ملاحظہ ہو جس سے دونوں بزرگوں کے تعلقات فیما بین کا اظہار نہایت خوبی سے ہوتا ہے۔ مولانا شمس الدینؒ نے ایک روز فرمایا کہ "غواص دریائے معانی مولاناؒ ہیں اور تاجر میں ہوں، پس موتی ہم دونوں کے درمیان ہے[1]"

اسی معنی میں سلطان ولدؒ کی روایت ہے کہ "ایک مرتبہ مولاناؒ نے حضرت شمس الدینؒ کی مدح میں بغایت مبالغہ فرمایا، میں نہایت ہی مسرور ہوا اور جاکر حضرت شمس الدینؒ کے حجرے کے دروازے سے سر نکال کر ان کی طرف دیکھنے لگا، فرمایا کہ یہ کیا مذاق ہے؟ میں نے کہا کہ

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۸)
طرح ممکن ہے کہ ۶۴۵ ( ) کا ۶۰۶ ہو گیا ہو۔ فہرست کتب خانہ بہار کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ عبدالمقتدر خاں مرتب فہرست کو اس پر اصرار ہے، وہاں بھی یہی لکھا ہے]

[1] مناقب ص ۱۸۶

والدؒ نے آج آپ کے اوصاف عظمت بے انتہا بیان کئے ہیں، فرمایا کہ میں تمہارے والدؒ کے دریائے عظمت کا ایک قطرہ ہوں مگر جو کچھ کہا ہے اس سے ہزار گونہ زائد ہوں" سلطان ولدؒ پلٹ کر پھر مولانا کے پاس گئے، اور اس واقعہ کو بیان کیا، فرمایا کہ "اس قول سے حضرت شمس الدینؒ نے اپنی مدح کی ہے اور جو کچھ کہا ہے اس سے سو گونہ زیادہ ہیں[1]"

ایک روز مولانا شمس الدینؒ نے ایک مجمع میں فرمایا کہ "اگر تمہیں یار وفادار نہیں ملا تو مجھے ل گیا ہے" اور حضرت مولانا کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ "آپ تنہا عالم میں آئے اور تمام عالم سے بازی لے گئے اور سب کو اپنے عشق میں مست کر دیا[2]۔

حضرت شمس الدینؒ نے ایک مرتبہ مدرسہ میں یہ فرمایا کہ "جو شخص انبیا کو دیکھنا چاہتا ہو وہ مولانا کو دیکھے کہ ان میں سیرت انبیاؑ کی موجود ہے، اگر چاہتے ہو کہ "العلماء ورثۃ الانبیاء" کے معنی معلوم ہوں تو مولاناؒ کو دیکھ لو[3]۔"

نیز ایک روز فرمایا کہ "اس وقت اصول، فقہ، نحو، منطق کسی فن میں مولانا سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں ہے، اگر میں سو برس بھی کوشش کروں تو اس حد کو نہیں پہنچ سکتا اور پھر کمال لطف یہ ہے کہ میرے سامنے ان سب کو نادانستہ سمجھتے ہیں[4]۔"

اب اس کے بالمقابل مولاناؒ کے اقوال ملاحظہ ہوں:۔

کسی نے مولانا کی خدمت میں یہ کہا کہ "حضرت دنیا سے فارغ ہیں مگر مولانا شمس الدینؒ کو دوست نہیں رکھتے اگر دوست رکھتے ہوتے تو پھر ایسا نہ معلوم ہوتا[5]"

---

[1] مناقب ص ۲۰۴ — [2] مناقب ص ۱۸۵ — [3] مناقب ص ۱۸۴

[4] ، ص ۱۸۶ — [5] ، ص ۱۸۶

ایک شخص نے مولانا شمس الدین تبریزی کی موجودگی میں مولانا سے کہا کہ میں تو آپ کو دوست رکھتا ہوں"
مولانا نے فرمایا کہ اگر "دوسروں" سے مراد مولانا شمس الدین تبریزی ہیں
تو یہ غلط ہے، اگر مجھے ان کے لئے دوست رکھو تو یہ افضل و بہتر ہے [۱]"
ایک روز کوئی شخص مدرسہ کی دیوار میں ایک میخ ٹھونک رہا تھا، مولانا نے فرمایا کہ
"میرا یہ مدرسہ اولیاء اللہ کا مسکن ہے اور یہ حجرہ مولانا شمس الدین کا ہے، لوگوں کو خوف نہیں معلوم ہوتا کہ اس جگہ میخ ٹھونکتے ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میخ میرے جگر میں ٹھونک رہے ہیں [۲]"
مولانا کا یہ بھی قول تھا کہ علمائے ظاہر واقف اخبار رسول ہیں اور حضرت شمس الدین واقف اسرار رسول تھے۔

شمس تبریزی تو ئی واقف اسرار رسول ۔۔۔ نام شیریں تو ہر دل شدہ رادرمان باد

مثنوی شریف کی تصنیف حضرت شمس الدین کے غائب ہو جانے کے تیرہ چودہ برس بعد شروع ہوئی ہے، مگر مولانا کے دل میں حضرت شمس الدین کا خیال اس طرح جاگزیں تھا کہ "شمس" کا اشارہ بھی کہیں آجاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیتاب ہو گئے ہیں، پہلے دفتر کے اوائل ہی میں یہ شعر آیا ہے ؎

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب ۔۔۔ گر دلیلت باید از وے رو متاب

ایک لفظ "آفتاب" کی وجہ سے تیئس شعر "شمس" کی مدح میں لکھ گئے اور آخر میں اس

---

[۱] مناقب ص۱۸۱
[۲] مناقب ص۲۰۶

طرح ختم کیا جیسے مجبور ہو کر دل کی بات دل ہی میں رہ گئی ہو ے

فتنہ و آشوب و خونریزی مجو　　　　بیش ازیں از شمسؒ تبریزی مگو

دفتر دوم غیبت حضرت شمسؒ سے سترہ برس بعد شروع ہوا ہے، اس میں پادشاہ کے دو غلاموں کی حکایت کے ضمن میں یہ شعر آیا ہے ے

چوں نمی آیند اینجا کہ منم !　　　　کاندریں غم آفتاب روشنم

یہاں بھی دس شعر لکھ گئے ہیں اور ختم اس طرح کیا ہے ۔

تو مرا باور مکن کز آفتاب　　　　صبر دارم من و یا ماہی زآب

در شوم نومید نو میدی من　　　　عین صنع آفتاب است ای حسن

یہی حال دوسرے مواقع کا ہے اور دیوان کے متعلق تو کچھ کہنا ہی بیکار ہے ۔

حضرت شمسؒ الدین اور مولاناؒ کے اس قسم کے اقوال " من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو " کے مفہوم میں داخل نہیں تھے بلکہ نفس الامر میں دونوں بزرگوں کے خیالات ایک دوسرے کی طرف سے، ایسے ہی تھے جس کی وجہ بھی صاف ظاہر ہے کہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کی طرف استفادۃً نظر کرتے تھے اور اس لئے ہر ایک اپنے کو کمتر اور دوسرے کو برتر سمجھتا تھا، اور یہ بھی رموز اولیا میں سے ایک رمز ہے، اس سوال کے جواب میں کہ ہر ایک مرید اپنے پیر کو سب سے برتر کیوں سمجھتا ہے، کسی بزرگ نے فرمایا ہے کہ یا اس وجہ سے ہے کہ خدا کو منظور ہوتا ہے کہ وہ مرید اس پیر سے فائدہ پائے اس لئے اسے جملہ کمالات اپنے پیر ہی میں نظر آتے ہیں، دوسرے میں اسے وہ کمالات نظر نہیں آتے، کچھ ایسی ہی کیفیت مولاناؒ اور حضرت شمسؒ کی بھی تھی کہ یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کو سب سے افضل و برتر سمجھتے تھے، اور اس میں شک بھی نہیں کہ اپنی اپنی جگہ پر ہر ایک ایسا ہی تھا۔

اہل یورپ کے عوائد میں یہ بھی داخل ہے کہ بہتی ۔ قات کسی خاص وجہ سے کوئی خاص خیال ان

کے ذہن میں آتا ہے اور پھر اس تصور کو وہ نقش کر لیتے اور اسے واقعہ کی صورت دیدیتے ہیں، اس قسم کے تصورات مثلاً بلا مجسمہ میں سے ایک تصور یہ بھی ہے کہ حضرت شمس الدینؒ ایک لاعلم شخص تھے۔ اس خیال کی ابتدا ڈاکٹر نکلسن کے دیباچہ "دیوان شمس تبریز" سے ہوئی اور اسکے بعد دوسرے ارباب قلم بھی تا ایندم آمنا وصدقنا کہتے چلے آئے، ان اقوال کو نقل کرکے کتاب کو گندی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، صرف اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ مستند تذکرے جو اس باب میں سند ہو سکتے ہیں سب حضرت شمسؒ کی فضیلت علمی کے معترف ہیں۔ سلطان ولدؒ نے مخالفین کی زبان سے جو یہ ادا کیا ہے کہ ع نے ورا علم و نے نسب پیداست، اس سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ابتداءً مخالفین حضرت شمس کی علمی فضیلت سے آگاہ نہیں تھے اور یہ ابتدائی آمد کا حال تھا، دوسرے موقع پر خود سلطان ولد ہی نے انھیں مخالفین کے قول کو بنوع دیگر نقل کیا ہے کہ

اینکہ آمد ز اولیں بستر است	اولین نور بود دیں شر است
داشت او ہم بیان و ہم تقریر	فضل و علم و عبارت و تحریر
بیش ازیں خود نبود کان شہ را	بود از و بیشتر بعلم و صفا

(رباب نامہ)

مناقب العارفین میں مولانا سے ایک روایت منقول ہے اور اسے اس باب میں قول فیصل سمجھنا چاہیے۔ روایت یہ ہے کہ مولانا اکثر فرمایا کرتے تھے کہ شمس الدین کو تسخیر نفوس ونسی میں اور سرا اسمائے قدس و اسرار اشیا میں ید بیضا حاصل تھا، علم کیمیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ فلکیات وریاضیات، الٰہیات، حکمیات، نجوم، منطق اور خلاف (فن بحث) میں ید طولےٰ حاصل تھا، مگر جب مردان خدا کی مصاحبت حاصل ہوئی سب ترک کر دیا (مناقب ص ۳۰۶)

علی ہذا یہ خیال بھی اہل یورپ میں متوارث چلا آتا ہے کہ حضرت شمس الدین نہایت درجہ تشدد پسند وسخت گیر شخص تھے اور یہی وجہ لوگوں کے آپ سے مخالف ہو جانے کی تھی، یہ بھی جس طرح اہل یورپ سمجھتے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ آپ صفت جلالی کے زیر اثر تھے اور جو اولیاء اللہ اس صفت کے تحت میں ہوتے ہیں ان کی کیفیت "جمالیوں" سے جداگانہ ہوتی ہے مگر اسے خشونت، تشدد اور سخت گیری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ "جمالیوں" میں لطف عیاں ہوتا ہے۔ جلالیوں میں لطف نہاں، اس میں شک نہیں کہ حضرت شمس الدینؒ کے مزاج میں جلال زیادہ تھا مگر یہ جلال بھی جمال سے خالی نہیں تھا اس بارے میں ایک شخص کا قول بہت ہی صحیح واقع ہوا ہے۔ "مولانا ہمہ لطف است، مولانا شمس الدینؒ ہم صفت لطف است وہم صفت قہر"[1]

امر واقعی یہ ہے کہ مولاناؒ کے بالمقابل آکر حضرت شمس الدینؒ کی صفت جلالی زیادہ نمایاں ہو گئی جو لوگ مولاناؒ کے لطفِ عمیم کے عادی تھے، ان کو حضرت شمس الدین کا انداز سخت معلوم ہوا ورنہ فی نفسہ حضرت شمس الدینؒ میں کوئی غیر معمولی تشدد پسندی نہیں تھی، بلکہ اس کے برعکس حضرت شمس الدینؒ کے خلاف لوگوں سے جس قسم کی نالائق حرکتیں سرزد ہوئیں اور آپ نے ان پر جس طرح تحمل کیا اس سے آپ کے غایت حلم کا اظہار ہوتا ہے، زیادہ سے زیادہ آپ کے خلاف جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ صرف اس قدر کہ آپ بعض اوقات حد مصلحت سے متجاوز صاف گوئی سے کام لیتے تھے، جس سے لوگوں کے باطنی عیوب و نقائص روشن ہو جاتے تھے اور یہ لوگوں پر گراں ہوتا تھا اور اس کی بھی خاص وجہ ہے، وہ یہ کہ آپ اولیائے مستورین میں سے تھے مامور للہدایت نہیں تھے اور اس لئے آپ کو ان مصالح پر خیال کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی جس کی ضرورت مامورین کو ہوتی ہے۔

ایک "مثنوی "مرغوب القلوب" کے نام سے حضرت شمس الدین کی طرف منسوب ہے، اس میں

---

[1] مناقب صـ ۲۶۴ (نسخہ قلمی)

تقریباً ڈیڑھ سو شعر ہیں جن میں شریعت و طریقت، توبہ و سلوک، وضو، ترکِ دنیا، طلب مرشد، تفرید و تجرید، معرفت، عشق، فنا و بقا، سفر سے متعلق صوفیانہ اشعار ہیں۔ یہ مثنوی چھپی ہوئی عام طور پر ملتی ہے[۱] کتب خانۂ آصفیہ میں اس کے تین قلمی نسخے موجود ہیں۔

شمارہ (۹۰۵) میں تاریخ تصنیف ۹۷۸ھ دی ہے۔

زہجرت نہ صد و ہفتاد و ہشت است　　حساب عاسیاں تاریخ وقت است

شدہ اتمام دیں منظوم موزوں !　　بہ مرغوب القلوب اتمام اکنوں

مرقوم سلخ ذیقعدہ ۱۲۵۶ھ از نصف حضرت شمس تبریز؟ ' اس کا انداز یہ ہے کہ اول ایک شعر ہے اس کے بعد اس کی مناسبت سے کوئی آیت قرآنی یا کوئی حدیث نبوی دی ہے جس کا مقصود یہ ہے کہ مطالب اشعار کو آیات قرانی و احادیث نبوی سے ثابت کیا جائے۔

شمارہ (۹۷۹) میں شعر آخر یہ ہے:-

زہجرت ی صد و پنجاہ و ہفت

تمام مختصر منظوم شد خوب　　کہ مثل او بجود آورد مرغوب

شمارہ (۹۲۳) کے آخر میں اردو کا بھی ایک شعر ہے اور لکھا ہے کہ سید مخدوم علی بادشاہ حسینی (ساکن شاہ علی نگر عرف السور ؟) نے اقوال صوفیہ سے جمع کیا اور ۱۲۸۳ھ میں اتمام کو پہنچایا۔ اس میں احادیث وغیرہ کے مطالب کو نثر میں مفصلاً بیان کیا ہے

---

[۱] مطبع نولکشور میں ۱۲۱۵ھ/۱۸۹۹ء میں بار سوم) یہ مثنوی "گنجینۂ عرفان" کے شمول میں طبع ہوئی ہے جس میں چار مثنویاں اور ہیں اس کا طرز یہ ہے کہ اول ایک یا دو شعر دیئے ہیں، اس کے بعد اسی کے حسب خواہ آیات و احادیث نقل کئے ہیں (کتب خانۂ آصفیہ کے نسخہ شمارہ (۹۰۵) اور شمارہ (۹۷۹) کا بھی یہی انداز ہے)

مطبوعہ نسخوں میں سے مطبع نولکشوری میں ہے کہ

مدیں رہ کار ہر مہ بود بر اصل | مرتب کرد شمس الدین بہ فصل
ز ہجرت ہفت صد و پنجاہ ہفت است | حساب حاسباں تاریخ و قت است

مطبع مجیدی میں شعر اول نہیں ہے اور شعر دوم اس طرح ہے

ز ہجرت ہفت صد و پنجاہ و ہفت | حساب حاسباں تاریخ در وقت

ان تاریخوں میں سے کتب خانۂ آصفیہ کی شمارہ (۹۷۹) کے سنہ ۳۵۷ھ کو قطعاً یہ سمجھنا چاہیے کہ ہفت صد کے بجائے سی صد لکھا گیا ہے، صحیح ۷۵۷ھ ہے مگر ۷۹۰ھ کی کوئی توجیہ مرجح نہیں ہو سکتی

بہر حال یہ مثنوی ۷۹۰ھ کی تصنیف ہو یا جیسا کہ متعدد نسخوں سے پایا جاتا ہے کہ ۷۵۷ھ کی تصنیف ہو، کسی صورت میں بھی حضرت شمس الدینؒ تبریزی کی جانب اسے منسوب نہیں کر سکتے کیونکہ حضرت شمس الدینؒ کا زمانہ ساتویں صدی کے اواسط میں تھا نہ کہ آٹھویں صدی کے نصف آخر میں۔ اس تضاد تاریخی کے علاوہ کسی مستند کتاب میں بھی اس کا تی اشارہ نہیں ملتا، پس اسے بالکل خارج از بحث سمجھنا چاہیے۔ یہ چند سطریں صرف اس ضرورت سے لکھی گئیں کہ یہ مثنوی جو عام طور پر مولاناؒ کے دوست حضرت شمس الدینؒ کی جانب منسوب ہو گئی ہے یہ غلط ہے۔

[اولیاء اللہ کے تذکروں میں بہت جستجو کی کہ اواسط آٹھویں صدی میں کسی شمس الدین کا پتہ چلے مگر اس نام کا کوئی شخص نہ ملا۔ البتہ آٹھویں صدی کے اواسط میں ایک شاعر شمس الدین محمد عصار تبریزی ہوئے ہیں۔ یہ سلطان شیخ اویس کے مداحوں میں تھے، جس کا عہد حکومت سنہ ۷۵۷ھ (۱۳۵۶) سے سنہ ۷۷۶ھ (۱۳۷۴) تک رہا [1]

---

[1] مطبع مجیدی کانپوری (سنہ ۱۳۳۲ھ) یہ مثنوی حضرت فریدالدینؒ عطار کی ایک مختصر مثنوی کے ساتھ طبع ہوئی ہے، اس میں ہر شعر کا اردو ترجمہ دیا ہے، آیات و حدیث نہیں دیے ہیں۔

ہے، اور خود ان شمسؒ کا انتقال ۷۸۳ھ (۱۳۸۲) میں ہوا ہے، ان کی ایک مثنوی "مہر و مشتری"[۱]، جس کا سنہ تصنیف ۷۸۱ھ یا ۷۴۸ھ ہے۔ باغلب وجوہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ "مرغوب القلوب" بھی انھیں شمس الدین تبریزی کی تصنیف ہے اور غلطی سے حضرت شمس تبریزؒ کی جانب منسوب ہو گئی ہے، یہ غلطی صرف اہل ایشیا سے نہیں ہوئی بلکہ ریوؔ[۲] نے لکھا ہے کہ فلوگلؔ[۳] نے بھی غلطی سے اسے حضرت شمسؒ تبریزی کی جانب منسوب کر دیا ہے، لیکن خود ریوؔ نے اس کا کوئی اشارہ نہیں کیا ہے کہ آخر یہ مثنوی

بقیہ حاشیہ ص ۲۱۶۔

[illegible] اس تلاش میں ۶۵۵ھ سے قریب ترین زمانہ کے بزرگوں میں شمس الدین مکی ہیں جنھوں نے ۶۴۲ھ میں انتقال کیا، ذرا نیچے ہٹ کر شیخ شمس الدین صفی اردبیلی ہیں جن کا سال وفات ۷۳۵ھ ہے، اس کے بعد امیر خسرو کے بھانجے خواجہ شمس الدین کا زمانہ ہے جن کا انتقال ۷۲۲ھ میں ہوا، ان کے علاوہ یہ ترتیب سنین شمس الدین کے نام کے مفصلۂ ذیل بزرگوں کا ذکر کتابوں میں ملا مگر ان میں سے کسی کے زمانہ کی تطبیق اس کتاب سے نہیں ہوتی، العلم عند اللہ۔

(۱) سید شمس الدین عبدالعزیز (فرزند شیخ عبدالقادر جیلانی) ۵۸۹ھ۔

[illegible] خواجہ شمس الدین محمد کوسوی م ۸۶۳ھ

[illegible] شیخ شمس الدین طاہر م ۸۰۱ھ

(۴) مولانا شمس الدین محمد رومی م ۹۰۴ھ (۵) شاہ شمس الدین قادری لاہوری م ۱۰۲۱ھ

[۱] فہرست کتب قلمی فارسی دار النوادر برطانیہ جلد دوم صفحہ ۶۲۶ فہرست کتب خانہ بہار، کلکتہ ص ۲۲۶

[۲] حسب بالا ص ۶۲۶۔

[۳] فہرست کتب خانہ دانش جلد اول ص ۵۲۹۔

کس کی ہے]

حضرت شمس الدینؒ کے ذکر کو ختم کرنے سے قبل مناسب ہے کہ آپ کے چند اقوال نقل کر دیئے جائیں جن سے آپ کے اخلاق اور آپ کے پُر از حکمت خیالات کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

آپ کا قول تھا کہ "مرید کو تین طرح پر میرا قرب حاصل ہوتا ہے، اول مال سے، دوم حال سے، سوم نیاز و ابتہال سے[1]" مگر مال سے مقصد یہ نہیں تھا کہ آپ خود مال لے لیتے تھے بلکہ غرض یہ تھی کہ اس سے مرید کے حُبِّ مال کا امتحان ہو جاتا تھا۔ واقعۂ حضرت حسام الدین ملاحظہ ہو،

یہ بھی آپ کا ارشاد ہے کہ "سچا دوست وہ ہے جو کروہات اور تمام برائیوں کے متحمل ہونے میں خدا کے مانند محرم ہو۔ خدا تمام عیوب و نقائص کو دیکھتا ہے۔ اور پھر بھی بندہ پر شفقت و رحمت کرتا ہے[2]"

ایک روز کچھ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ توحید کیا ہے، فرمایا کہ شیخ سے سوال کرنا بدعت ہے، پھر ارشاد ہوا کہ "توحید یہ ہے کہ تمام چیز ملک خدا ہے اور خدا سے ہے اور خدا کے ساتھ ہے اور خدا کی طرف جانے والی ہے"، پھر ہر ایک کی تشریح کی کہ ملک خدا اس وجہ سے ہے کہ "للّٰہ ملک السمٰوٰت والارض وما فیہن" خدا سے اس وجہ سے کہ "وما بکم من نعمۃ فمن اللہ، فلکل من عند اللہ" خدا کے ساتھ اس وجہ سے "ان تقوم السمٰوٰت والارض بامرہ" خدا کی طرف جانیوالی اس وجہ سے کہ الی اللہ ترجع الامور، و الیہ ترجع الامر کلہ والیہ المصیر[3]

---

[1] مناقب ص۳۷۸

[2] مناقب ص۳۰۳

[3] ایضاً ص۳۹۰

ایک مرتبہ کچھ لوگ قدم عالم پر بحث کر رہے تھے حضرت شمس الدین نے فرمایا کہ "قدم عالم سے تمہیں کیا غرض، یہ معلوم کرو کہ تم قدیم ہو یا حادث، جو کچھ تھوڑی بہت عمر ہے اسے اپنے تفحص حال میں خرچ کرو، قدم عالم کے تفحص میں نہ خرچ کرو"[1]

موت کے آپ اس درجہ شائق تھے کہ ایک روز ایک جنازہ سامنے سے گزرا تو فرمایا کہ "اسے کہاں لئے جا رہے ہیں، میں سالہا سال سے اس فکر و حسرت میں خون جگر کھا رہا ہوں کہ یہ مراد حاصل نہیں ہوتی۔"

مرگ اگر مرد است، آید پیش من — تا کشم من در کنارش تنگ تنگ
من از و جانے برم بے رنگ و بو — او ز من دلقے ستاند رنگ رنگ[2]

جب کسی سے رنجیدہ ہوتے تو دعا کرتے کہ "خداوندا اس کی عمر دراز کر اور اسے مال زیادہ دے"[3]۔

سلطان ولدؒ کی روایت ہے کہ اکثر اپنے مریدوں سے خربزہ منگاتے، وہ لوگ شیریں خربزہ لاتے، آپ کھاتے جاتے اور چھلکے ان لوگوں کے سروں پر پھینکتے جاتے اور فرماتے کہ یہ کیا لائے ہو، اس سے مریدوں کو عجب کشف عجیب و خرق عجب حاصل ہوتا[4]

---

[1] مناقب ص ۴۲۹ (نسخہ قلمی)

[2] " ص ۳۸۹

[3] " ص ۳۸۶

[4] " ص ۳۸۹

دمشق سے دوسری مرتبہ واپس آنے کے بعد مولاناؒ کچھ دنوں ساکن رہے۔ اس کے بعد آپ نے شیخ صلاح الدین کو اپنا ہمراز و خلیفہ بنایا[1]۔ اس حیثیت میں حضرت صلاح الدین کی ملاقات مولاناؒ سے دس برس رہی، شیخؒ کا انتقال ۶۵۷ھ میں ہوا ہے، پس اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۶۴۷ھ میں مولاناؒ نے آپ کو اپنا جلیس خاص بنایا اور حضرت شمس الدینؒ کے بجائے آپ کو اپنا معین و دمساز قرار دیا ؎

شہ صلاح الدین زبعد شمس دینؒ | گشت او را اندراں ورزش معین

حال و قالش از وجودش میفزود | سرہائے نادر از وے می شنود

موقع کے اعتبار سے مناسب ہے کہ یہاں شیخ صلاح الدینؒ کے کچھ مختصر حالات درج کر دیئے جائیں تا کہ مولاناؒ کے ساتھ آپ کے تعلقات پوری طرح واضح ہو جائیں۔

شیخؒ کا اسم گرامی فریدون تھا اور آپ کے نام کے ساتھ بعض کتابوں اور خود مناقب العارفین[2] میں "بن باغستان" لکھا ہے۔ اس سے زیادہ آپ کے اسلاف کا کچھ پتہ نہیں چلتا مگر اتنا معلوم ہے کہ آپ غریب والدین کی اولاد سے تھے اور آپ کے والدین قونیہ کے قریب ہی ایک گاؤں میں رہتے تھے اور حوالی قونیہ میں ماہی گیری کیا کرتے تھے، شیخؒ جب قونیہ میں آکر ٹھہرے تو آپ نے خود زرکوبی کا پیشہ

---

[1] مولاناؒ نے جس شان و انداز سے اپنے اصحاب کی مدح کی ہے، اس سے ہر وہ شخص جو مولاناؒ اور آپ کے اصحاب کے مراتب باہمی سے واقف نہ ہو، مغالطہ میں پڑ جائے گا اور بالضرور یہی سمجھے گا کہ مولانا ان حضرات کے مرید تھے۔ چنانچہ بعض تذکرہ نویس بھی اس مغالطہ میں پڑ گئے ہیں، آتشکدۂ آذر (صفحہ ۳۲۲) میں صاف لکھا ہے کہ حضرت مولانا حسام الدینؒ اور شیخ صلاح الدینؒ کے مرید تھے اور نظم و قار میں بھی یہی درج ہے بلکہ اسے اس ترتیب سے لکھا ہے کہ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں اصحاب سے مرید ہونے کے بعد حضرت شمس الدینؒ

اختیار کر لیا اور ابتدائے حال سے امانت و دیانت میں مشہور تھے، اور مناقب العارفین سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا کاروبار وسیع تھا، آپ کا سلسلۂ باطنی (بقول لطف علی آذر) شیخ ابونجیب سہروردیؒ سے ملتا ہے[1]، سید برہان الدینؒ جب قونیہ میں آئے تو آپ ان کے مرید ہو گئے اور سید کی نظروں میں آپ نے اس حد تک اختصاص پیدا کر لیا کہ بقول فاطمہ خاتون (بنت شیخ صلاح الدین) سید نے یہ فرمایا کہ "قالم را بہ مولانا جلال الدین بخشیدم و حالم را بہ شیخ صلاح الدینؒ دادم"۔

سید جب قیصریہ گئے تو آپ بھی ان کے ہمراہ قیصریہ چلے گئے، سید کے انتقال کے بعد اپنے والدسے ملنے آئے، یہاں آپ کا عقد ہو گیا، مولاناؒ کے ایک وعظ میں شریک ہوئے اور اس درجہ متاثر ہوئے کہ اسی وقت مولانا سے بتجدید بیعت کی،

شیخ مولانا کے پیر بھائی تو پہلے ہی سے تھے، اب قونیہ کے مستقل قیام اور خود مولانا کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے سلسلۂ آمد و رفت بڑھا،

مولانا واقف تھے کہ سید کے نزدیک شیخ کا رتبہ کیا تھا، مولانا نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور آپ سے صحبت گرم رہنے لگی، جب حضرت شمس الدینؒ قونیہ تشریف فرما ہوئے تو شیخ ان کی صحبت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۰) سے ملاقات ہوئی، یورپی تذکرہ نویس بھی اس مغالطہ سے نہیں بچے، چنانچہ سرگور اوسلی نے بھی اپنے تذکرۂ شعرائے فارسی (ص ۱۱۴ و ۱۱۵) میں یہی سب کچھ لکھا ہے، اس کہنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ یہ قیاسات مشرقی ہوں، یا مغربی ہر حال میں غلط ہیں، حضرت شمس الدینؒ کو مولانا کا نہ پیر کہہ سکتے ہیں نہ مرید، شیخ صلاح الدینؒ اگرچہ سید برہان الدینؒ کے مرید تھے، مگر مولانا سے بھی بیعت کی تھی، اور چلپی حسام الدین تو خاصۃً مولانا ہی کے مرید تھے، اور بعد میں آپ کے جانشین ہوئے،

[1] آتشکدۂ آذر ص ۳۰۲، یہ تو ظاہر ہے کہ شیخ صلاح الدینؒ شیخ ابونجیب کے زمانہ سے بہت بعید ہیں، ممکن ہے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی جب غالباً ۶۲۲ھ یا ۶۲۷ھ میں) روم آئے اور قونیہ میں کچھ دنوں فروکش رہے ہیں،

سے بھی مستفید ہوئے بلکہ مرید بھی ہو گئے، انتقال سے دس برس قبل مولاناؒ سے آپ کو وہ قرب حاصل ہوا جس کا اشارہ قبل ازیں ہو چکا ہے تفصیل آیندہ آتی ہے، اس دہ سالہ مدت میں آپ مولاناؒ کے خلیفۂ خاص رہے، مولانا نے اپنے فرزند سلطانؒ ولد کی شادی شیخ کی دختر فاطمہ خاتونؒ سے کر دی تھی اور اس طرح قرابت داری بھی قائم ہو گئی، شیخ نے یکم محرم ۶۵۷ھ (۲۸ دسمبر ۱۲۵۸ء) کو انتقال فرمایا،

غرض شیخ صلاح الدین مولاناؒ کے مرید اور زمرۂ اصحاب میں تو بہت پہلے سے تھے، مگر اب جو درجۂ خاص مولاناؒ کی صحبت میں آپ کو حاصل ہوا، اُس کا واقعہ اس طرح مذکور ہے کہ مولاناؒ ایک روز کچھ عجیب عالمِ استغراق میں تھے، اسی حالت میں شیخ کی دوکان کی طرف سے گذر ہوا، شیخ حسبِ عادت ورق کوٹنے میں مشغول تھے، مولانا ہتوڑی کی آواز پر وجد میں آگئے، شیخ نے بھی ہاتھ نہ روکا، بہت کچھ سونا خراب ہو گیا، مگر کچھ پرواہ نہ کی، تھوڑی دیر بعد مولاناؒ شیخ کو لئے ہوئے باہر آئے، اور کچھ دنوں مولاناؒ کی صحبت میں رہنے کے بعد شیخ نے جب اپنی حالت میں تغیر دیکھا تو سمجھ لیا کہ مولاناؒ کے اثر سے ہے، اور آخر کاملین سے ہو گئے،[۱]

یہ بیان سپہ سالار کا ہے، افلاکیؒ نے اس قدر اضافہ ہوتا ہے، کہ مولاناؒ جب شیخ کی دکان پر پہونچے اور وجد میں آئے ہیں، تو شیخ خود باہر نکل آئے اور مولاناؒ کے ساتھ وجد میں شریک ہو گئے اور اپنے شاگردوں کو اشارہ کر دیا کہ کتنا ہی سونا چاندی ضائع ہوتا جائے، ہاتھ نہ روکیں، یہ حالت ظہر سے عصر تک قائم رہی،[۲] اسی اثنا میں کچھ قوال آگئے، اور مولانا

---

[۱] اکثر کتابوں میں اس واقعہ کا ذکر اس طرح آیا ہے، گویا شیخ صلاح الدین سے مولاناؒ کی یہ پہلی ملاقات تھی، مگر واقعۃً ایسا نہیں تھا، بیان مذکورۂ بالا سے واضح ہو چکا ہے، کہ شیخ اس سے بہت قبل مولانا کے زمرۂ اصحاب میں داخل ہو چکے تھے، [۲] سپہ سالار ص ۰۰

نے یہ غزل شروع کی،

یکے گنجے پدید آمد ازیں دکانِ زرکوبی ۔ زہے صورت زہے معنیٰ زہے خوبی زہے خوبی

شیخ نے دیکھا کہ ساری دکان ورقِ زر سے بھری ہوئی ہے، آلات تک سونے کے ہو گئے ہیں، آپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، دکان لٹا دی، اور مولانا کے ساتھ روانہ ہو لیے، اس وقت سے مولانا نے حضرت شمس الدینؒ کے بجائے شیخ صلاح الدینؒ کو اپنا خلیفۂ خاص بنالیا، سلطان ولدؒ فرماتے ہیں کہ ؎

گفت آں شمسِ دیں کہ می گفتیم ۔ باز آمد بما چہ را خفتیم

او بدل کرد جامہ او آمد ۔ تا نماید جمال دِ بخرامد

اب شیخ صلاح الدینؒ کی صحبت سے مولانا کی طبیعت میں سکون پیدا ہو گیا، ؎

شورشِ شیخ گشت ازو ساکن ۔ واں ہمہ رنج وگفت گو ساکن

جو درجہ مولانا کی نظر میں حضرت شمس الدینؒ کا تھا، وہی درجہ اب شیخ صلاح الدینؒ کا ہو گیا، سلطان ولدؒ پر مولانا کی نظر عنایت سب سے زیادہ تھی، آپنے انھیں بلا کر فرمایا کہ بس اب شمس الدینؒ یہی ہیں، انہی کو سب کچھ سمجھو اور ان کی نظر کیمیا اثر سے فائدہ اٹھاؤ" سلطان ولدؒ نے صدق دل سے قبول کیا اور مدارجِ ترقی میں برابر بڑھتے گئے،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۲) ۳؎ یہ وقت شیخ صلاح الدین کے حال میں درج ہے، (نسخہ قلمی)
خود مولینا کے مناقب میں ص ۲۰۵ پر مندرج ہے کہ یہ حالت صبح تک رہا، اس کے سوا دونوں روایتوں میں کچھ خفیف سا جزوی فرق اور بھی ہے، مگر وہ چنداں قابلِ اعتنا نہیں،
۵؎ مناقب ص ۲۰۵،

جانِ من بود قطرہ دریا شد | دلم از پست سوئے بالا شد
فکرہا در زماں مصور گشت | روح صافی بہ شکل پیکر گشت[1]

مولانا نے اب پھر کسی قدر انقطاع اختیار کیا، شیخ صلاح الدین کے سوا اور کسی کی طرف آپ کو التفات نہیں تھا، در ہمہ وقت اِن ہی سے صحبت گرم رہتی تھی اس سے پھر لوگوں میں برہمی پیدا ہوئی، سلطان ولد نے اس تمام کیفیت کو نہایت تفصیل سے تحریر فرمایا ہے[2] یہ تمام اشعار سپہ سالار نے نقل فرمائے ہیں، اور سپہ سالار ہی سے دوسری کتابوں میں بھی نقل ہوئے ہیں،

کل اشعار نہایت ہی دلچسپ ہیں، فصل ششم میں دیکھنا چاہئے، یہاں نفس مطلب درج کیا جاتا ہے ا۔

مریدوں نے یہ دیکھکر کہ مولانا شیخ صلاح الدین کے سوا اور کسی طرف التفات نہیں فرماتے اور ان کی عزت و وقعت حد سے زیادہ کرتے ہیں پھر شورش برپا کرنا چاہی، کہنے لگے کہ شمس کے

---

[1] ملخص رباب نامہ،

[2] بازمنکراں غریو افتاد | باز درہم شدند اہل فساد
بازآغاز کرد جوششِ حسد | زانکہ بودند غرقِ نفس وجد
.... | ....
.... | ....

(رباب نامہ)

نکل جانے کے بعد ہم نے تو یہ سمجھا تھا کہ اب رہائی ملی مگر دیکھتے ہیں تو اسی بلا میں پھنسے ہوئے ہیں، یہ اب جو صاحب آئے ہیں یہ تو پہلے سے بھی بدتر ہیں۔ ان میں تو علم و فضل بھی تھا، زیادہ سے زیادہ یہ کہ مولاناؒ علم و فضل میں ان سے بڑھے ہوئے تھے، یہ صاحب تو یہیں کے رہنے والے ہیں، سب جانتے ہیں کہ ایک عامی آدمی ہیں، فاتحہ تک درست نہیں پڑھ سکتے ہیں، عمر بھر ورق کوٹتے رہے، اب مولاناؒ کے رفیق بنے ہیں، حیرت ہے کہ مولانا اس رتبہ دبایہ کے باوجود ایک ایسے شخص کی تعظیم و تکریم میں یہ مبالغہ کرتے ہیں، غرض آپ کی شان میں اسی طرح کے ہفوات بکا کرتے تھے، آخر سب نے مل کر یہ رائے قرار دی کہ ایک دن ان کا خاتمہ ہی کر دیا جائے، ان میں سے ایک مرید نے آکر مولاناؒ سے کہہ دیا کہ یہ لوگ ایسا ارادہ فاسد رکھتے ہیں، شیخ صلاح الدینؒ نے سنا تو بہت ہنسے اور فرمایا کہ یہ نادان اتنا نہیں سمجھتے کہ بے حکم خدا ایک پتی بھی نہیں ہلتی، پہاڑ کیسے ہلے گا، یہ لوگ مجھے قتل کیسے کر سکتے ہیں، یہ میری رحمت ہے کہ میں خاموش ہوں ورنہ بامر خدا ایک سانس میں سب کو ہلاک کر دوں، ان لوگوں کو ملال اس کا ہے کہ مولانا نے مجھے سب میں مخصوص کیوں کر لیا ہے، مگر اصل بات کو نہیں سمجھتے کہ مولاناؒ خود اپنے پر عاشق ہیں، میں تو محض ایک حیلہ ہوں ؎

عاشق او بر جمال خوب خود است ~~~ بردگر کس گماں مبر کہ بداست

میں ہر طرح پر ان لوگوں کی خیر خواہی کرتا ہوں اور یہ لوگ اس کے عوض میں مجھے تکلیف دینا چاہتے ہیں۔

غرض مولاناؒ اس طرح کی گستاخیوں سے کشیدہ خاطر ہو گئے، اور شیخ کے سوا سب سے ملنا چھوڑ دیا، حکم خدا سے ان لوگوں کے باغ اور کھیت وغیرہ سب خشک ہو گئے، دل نور معرفت سے خالی ہو گئے، مولاناؒ کی زیارت سے بھی محروم ہو گئے، پھر تو گھبرائے کہ اگر یہی

حال رہا تو انجام کیا ہوگا، آخر مولانا کی خدمت میں آکر توبہ کی، مولاناؒ نے معاف کر دیا اور سب نے شیخ صلاح الدین کے سامنے سر جھکا دیئے، شیخ نے ہر طرح کی عطا و بخشش سے انھیں سرفراز کیا۔[1]

اس خلش کے رفع ہو جانے کے بعد پھر کوئی نئی شورش نہیں پیش آئی اور دس برس تک شیخ صلاح الدینؒ مولاناؒ کی خلافت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

"سلطان ولدؒ جب حد بلوغ کو پہونچے" تو مولاناؒ نے یہ چاہا کہ شیخ صلاح الدینؒ کی دختر فاطمہ خاتون سے سلطان ولدؒ کا عقد کر دیں تاکہ "اختصاص باطنی کے ساتھ ظاہری تعلقات بھی مستحکم ہو جائیں"[2]

شیخ صلاح الدینؒ کی دو لڑکیاں تھیں، فاطمہ خاتونؒ اور ہدیہ خاتونؒ، یہ دونوں شیخ کی زوجہ لطیفہؒ خاتون کے بطن سے تھیں جن کی نسبت مولانا کا یہ قول تھا کہ ان کی ذات آئینہ خدا ہے، فاطمہ خاتون کو خود مولاناؒ نے کتابت اور قرآن شریف کی تعلیم دی تھی، فرمایا کرتے تھے کہ "فاطمہ خاتون میری داہنی آنکھ ہے اور ہدیہ خاتون بائیں آنکھ"

غرض مولاناؒ کی تجویز کے بموجب یہ عقد ہو گیا اور اس عقد سے مولاناؒ کو جیسی مسرت اور شادمانی ہوئی، اس کا اظہار کچھ آپ کی ان غزلوں سے ہوتا ہے جو اس موقع پر کہی ہیں، عقد کے دن یہ غزل ارشاد فرمائی۔

---

[1] ملخص رباب نامہ [2] یہ بیان افلاکیؒ کا ہے، صفحۂ آئندہ پر اس کے متعلق دیکھنا چاہیے۔

[3] سوانح مولاناؒ روم ص ۲۲ [چوں از روے باطن خداوندگار را با شیخؒ تعلقے و مواستے تمام بود در ظاہر بہ نسبت خواست کہ مواصلت متصل گردد .... سپہ سالار ص ۱۴۲]

بادا مبارک در جہاں سور و عروسیہائے ما — سور و عروسی را خدا ببرید ہ بر بالائے ما

زہرہ مقارن با قمر طوطی قرین شد با شکر — ہر شب عروسی دگر از شاہ خوش سیمائے ما

بسم اللہ امشب بر نوی سوی عروسی می روی — داماد خوبان میشوی اے خوب شہر آرائے ما

رقصے کنید اے عارفاں چرخے زنید اے صوفیاں — در دولت شاہ جہاں آں شاہ جاں افزائے ما

(۱۵ - ص ۴۰)

اس کے بعد دوسرے روز یہ غزل کہی

مبارکی کہ بود در ہمہ عروسیہا — دریں عروسی ما باد اے خدا تنہا

مبارکی شب قدر و ماہ روزہ و عید — مبارکی ملاقات آدمؑ و حواؑ

مبارکی ملاقات یوسفؑ و یعقوبؑ — مبارکی ملاقات وامق و عذرا

مبارکی دگر کاں بگفت در ناید — نثار شادی اولاد شیخ و مہتر ما

ندیدہ چشم عروسی چنیں عروس لطیف — جہاں شگفتہ شدہ است و جہانیان شیدا

(۱۲ - ص ۹۴)

کسی بیان سے یہ صاف معلوم نہیں ہوتا کہ یہ عقد کس سنہ میں ہوا، فحوائے کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت شمسؒ کے بعد شیخ صلاح الدینؒ کو مولاناؒ نے اپنا مخصوص ہمراز و دمساز بنا لیا تھا اس کے بعد یہ عقد ہوا ہو، مگر دو امور کسی قدر اس قیاس کے خلاف واقع ہوتے ہیں، اول تو ۶۴۷ھ تک سلطان ولدؒ کی عمر پچیس برس سے متجاوز ہو چکی تھی اور اس زمانہ کے عام تمدن کے اعتبار سے عقد میں اس قدر تاخیر زیادہ معلوم ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ ان دونوں غزلوں کے مقطع میں مولانا نے شمسؒ کا ذکر اس طرح سے کیا ہے گویا وہ موجود تھے۔

غزل اول کا مقطع ہے۔

شمس الحق تبریزِ من، ایں شہد شکر ریزِ من   صد شور و شر انگندہ اندر دلِ شیدائے ما

دوسری غزل میں اس سے بھی زیادہ صاف فرماتے اور خود شمسؒ کو مبارک باد دیتے ہیں ؎

عزیز مفخرِ آفاق شمس تبریزی   ترا رسد عشرت از دم گیرا

پس اگر شمسؒ کی موجودگی میں یہ عقد ہوا ہے تو لامحالہ ۶۴۵ھ قبل ہونا چاہیے لیکن اگر ایک دوسری روایت سے قیاس قائم کیا جائے تو تاریخ عقد کو ۶۴۵ھ سے بھی آگے بڑھانا پڑے گا، شیخ کے حالات میں ابھی ابھی یہ مذکور آچکا ہے کہ خود شیخ صلاح الدینؒ نے سید برہان الدینؒ ترمذی کے انتقال کے بعد عقد کیا تھا اور سیدؒ کا انتقال ۶۳۷ھ میں ہوا ہے، پس شیخ کی دختر فاطمہ خاتون کی عمر ۶۴۵ھ تک نو دس برس سے زیادہ نہ رہی ہوگی، لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ مناقب العارفین کے یہ الفاظ کہ "چوں حضرت سلطان ولدؒ مراہق شد و بدرجہ بلوغ رسید"[1] رسمًا لکھ گئے ہیں یا یہ کہ فاطمہ خاتونؒ کا عقد زیادہ کم عمری میں ہو گیا تھا۔

[سلطان ولدؒ کے عقد کے نسبت کوئی خفیف سا اشارہ بھی اس امر کا نہیں ملتا کہ مولاناؒ نے اس موقع پر کسی قسم کی شان ظاہری کا بھی اظہار فرمایا ہو، مگر جب ہدیہ خاتون کے نکاح کا وقت آیا تو مولاناؒ نے ظاہری شان و تجمل کو بھی روا رکھا، ہدیہ خاتون مولانا ہی کے مکان میں رہتی تھیں، سلطان ولدؒ اور حسام الدین چلبی یہ چاہتے تھے کہ ان کا عقد سلطان الکتاب مولانا نظام الدین خطاط سے ہو جائے، مگر شیخ صلاح الدینؒ کے پاس جہیز کا سامان کم یا زیادہ کچھ بھی نہ تھا، آخر حضرات مذکور نے یہ معاملہ مولانا کے گوش گزار کیا، آپ نے اسی وقت کرجی خاتون (ملکۂ سلطان وقت) کے وہاں سے استاد خاتون کو بلوایا جو ایک ولیہ و عالمہ اور شہزادیوں کی معلمہ تھیں اور فرمایا کہ جاکر کرجی خاتون سے صورت حال بیان کرو اور کہو کہ شیخ

---

[1] مناقب   (نسخۂ قلمی)

صلاح الدینؒ کی عنایت سے مستفید ہونے کا موقع بھی ہے، استاد خاتون نے محل شاہی میں جاکر کیفیت عرض کی، سب نے مولانا کے اس اشارۂ امداد کو ایک احسان عظیم سمجھا اور بلا توقف اتنا سامان جمع ہوگیا کہ صرف چاندی کے سامان کی قیمت ستر ہزار درم سے زیادہ تھی، مولاناؒ بنایت خوش ہوئے اور شیخ بھی مسرور ہوئے اور ان لوگوں کے حق میں دعائیں کیں، مولاناؒ نے فرمایا کہ کل سامان کا دو حصہ کرکے نصف فاطمہؒ خاتون کو دیدو اور نصف ہدیہ خاتونؒ کو۔

غرض ہدیہ خاتونؒ کا عقد مولانا نظام الدینؒ کے ساتھ پورے ساز و سامان کے ساتھ ہوگیا۔

مولاناؒ نے اس موقع پر جو غزل مبارک باد ارشاد فرمائی اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

مبارکباد بادا این عروسی — خجستہ باد بادا ایں عروسی

چو حوران بہشتی باد خنداں — ابد امروز فردا ایں عروسی

نشان رحمت و توقیع دولت — ہم آنجا و ہم ایں جا عروسی

نکو نام و نکو روئے و نکو فال — چو ماہِ چرخ خضرا ایں عروسی

(۷۔ ص ۸۴۷۔۸۴۸)

شیخ صلاح الدین کو مولاناؒ کی صحبت و خدمت میں جب اس طرح دس برس گزر گئے، تو آپ ناگہاں بیمار ہوگئے، سپہ سالارؒ نے اس بیماری کی وجہ یہ لکھی ہے کہ کوئی واردات قلبی آپ کو پیش آئی تھی اور اس سے آپ کی حالت میں ایک اضطراب پیدا ہوگیا کہ برابر بڑھتا گیا اسی میں بیمار ہوگئے، بیماری نے طول پکڑا، مولاناؒ برابر عیادت فرماتے رہتے تھے، آپ کی صحت کے لئے ایک غزل دعائیہ بھی لکھی تھی ؎

رنج تن دور از تو بادا ای راحت جانہائے ما — چشم بد دور از تو بادا اے دیدۂ بینائے ما

صحتِ تو صحتِ جان و جہان است ای قمر — صحت جسم تو بادا، اے قمر سیمائے ما

عافیت بادا تنت را اے تنِ تو جاں صفت — کم مبادا سایۂ لطفِ تو از بالائے ما
گلشن رخسار تو سرسبز بادا تا ابد — کاں چراگاہ دل است و سبزۂ صحرائے ما
رنج تو بر جان ما بادا، مبادا بر تنت — تا بود آں رنجِ تو چوں عقل جان آرائے ما

(۵۔ ص ۶۱)

شیخ کی تکلیف جب زیادہ بڑھی تو آپ نے مولاناؒ سے یہ استدعا کی کہ اب دنیا سے نقل کرنے کی اجازت ہو، مولاناؒ نے اسے قبول کیا اور اب کے جو آپ کے پاس سے اٹھ کر گئے، تو دو تین روز تک عیادت کو نہیں آئے، شیخ نے سمجھ لیا کہ اب دار فنا سے نقل کرنے کا وقت آگیا ہے ؎

اینکہ نامد اشارتست کہ رو — اہل دل را بشارتست کہ رو

مولاناؒ اس اثنا میں شیخ کے لئے دعا میں مشغول رہے[۱]۔

آخر یکم محرم سنہ ۶۵۷ھ کو آپ نے نہایت طمانیت قلب کے ساتھ اس "دار غرور سے دار سرور" کی طرف سفر کیا، انتقال سے قبل یہ وصیت کر گئے تھے کہ میرے جنازے کو باجا بجاتے ہوئے اور رقص کرتے ہوئے قبرستان کو لے جانا تاکہ معلوم ہو کہ اولیا اللہ شاداں و خنداں دنیا سے جاتے ہیں۔

شیخ فرمود در جنازۂ من — دہل آرید و کوس باد فِ و زن
سوئے گورم برید رقص کناں — خوش و شاداں و دست افشاں

۱؎ سپہ سالار ص ۷۲

۲؎ سوانح مولانا روم ص ۶۲

تا بدانند کاولیائے خدا — شاد و خنداں روند سوئے بقا [علہ]

آپ کی وصیت کے بموجب عمل کیا گیا، اور اسی شان سے آپ کا جنازہ تربت سلطان العلمار کی جانب روانہ ہوا اور آپ حضرت بہاالدینؒ کے جوار میں دفن ہوئے۔
حضرت شمسؒ کے بعد مولاناؒ نے شیخ صلاح الدینؒ کی زندگی میں اپنے غزلیات میں زیادہ تر آپ ہی کو مخاطب کیا ہے اور مقطعوں میں پہلے جس طرح حضرت شمسؒ کی مدح کیا کرتے تھے اسی طرح اس زمانہ میں شیخؒ کی مدح کرتے رہے۔ چند مقطعے اس قسم کے حصۂ دوم میں نقل کئے گئے ہیں، یہاں مولاناؒ کے اس مرثیہ کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں جو آپ نے شیخؒ کے انتقال کے بعد لکھا تھا، یہ مرثیہ بھی دلگیری میں فرد ہے ؎

اے زہجرانت زمین و آسماں بگریستہ — دل میان خوں نشستہ جان و دل بگریستہ
چوں بعالم نیست یک کس مر مکانت را عوض — در عزائے تو مکان و لامکاں بگریستہ

علہ رباب نامہ۔

شیخ صلاح الدینؒ کے اس مقصود کو مولاناؒ نے ایک غزل میں اسطرح بیان فرمایا ہے۔

زخاک من اگر گندم بر آید — ازاں گر ناں پزی مستی بر آید
خمیر و نانوا دیوانہ گردد — تنورش بیت مستانہ سرآید
اگر بر گور من آئی بہ زیارت — ترا خرپشتہ ام رقصاں نماید
میا بے دف بگورم اے برادر — کہ در بزم خدا غمگیں نشاید

. . . .

(۱۱ ـ ص ۲۲۵)

جبریئل وقدسیاں را بال وپر ارزق شدہ   انبیا و اولیا را دیدگاں بگریستہ

. . . .

شہ صلاح الدینؒ اسے ہمائے گرم رد   ہم کسے باید کہ داند بر کساں بگریستہ
بر صلاح الدینؒ چہ داند ہر کسے بگریستن   از کمان جستی چو تیرو داں کماں بگریستہ

(۱۴۱ - ص ۵۶)

مولاناؒ کی نظر میں شیخؒ کی جو وقعت تھی اس کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی غلط لفظ بھی شیخؒ کی زبان سے نکل جاتا تو خود مولانا بھی اتباعاً وہی غلط لفظ استعمال کرتے، شیخ قونیہ کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے عربی یا فارسی آپ کی مادری زبان نہیں تھی، ایک مرتبہ آپنے "قفل" کو "قلف" کہدیا، مولانا نے بھی یہی لفظ استعمال کیا، کسی نے کہا کہ "قفل" کہنا چاہیئے مولانا نے فرمایا کہ بیشک موضوع یوں ہی ہے مگر ایک عزیز کی رعایت خاطر سے میں نے ایسا کہا، اسی طرح شیخ نے ایک روز "مبتلا" کے بجائے "مفتلا" فرمایا، ایک دن خم کو خنب کہدیا مولاناؒ نے بھی ایسا کہا، کسی نے کہا کہ خم صحیح ہے، آپنے گونہ ناگواری کے ساتھ جواب دیا کہ میں بھی اتنا جانتا ہوں مگر جب شیخ صلاح الدینؒ نے یوں کہا تو اولیٰ یہی ہے،[۱] دیوان ومثنوی تک میں خم کے بجائے خنب نظم کر دیا ہے۔

تو آں خنبے کہ من دیدم ندیدی   مرا خنبک مزن اسے یار میرد

این چنیں مے را بخور زیں خنبہا   مستیش نہ بود زکوتہ دنبہا

---

[۱] سپہ سالار ص ۱۰۷، مناقب نسخہ قلمی حالات شیخ صلاح الدینؒ

زانکہ ہر مشوق چوں خنب است پُر ۔۔۔ آں یکے درد و دگر صافی چو دُر

مولانا کو شیخؒ کا پاس خاطر اس درجہ تھا کہ آپ کی دختر فاطمہ خاتون کے لئے خاص ایک وصیت نامہ تحریر فرمایا تھا۔ ایک مرتبہ سلطان ولدؒ اور فاطمہ خاتون میں کسی قدر شکر رنجی سی ہو گئی تھی مولانا نے ایک طولانی خط فاطمہ خاتون کو لکھا، اس میں ارقام فرماتے ہیں کہ

"خدائے را جل جلالہ، بگواہی می آرم و سوگند می خورم بذات پاک قدیم حق تعالیٰ کہ ہرچہ خاطر آں فرزند مخلص ازاں خستہ شود دہ چنداں غم شما غم ماست و اندیشۂ شما اندیشۂ ماست و حقوق و احسان و خداوندیہا سلطان المشائخ مشرف انوار حقائق صلاح الحق والدین قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز برگردن اس داعی ام است کہ ہیچ شکر و ہیچ خدمتے نتواند گزاردن، شکر اینہا ہم خزینۂ حق تعالیٰ تواند ساخت، توقع من ازاں فرزند آنست کہ ازیں پدر ہیچ پوشیدہ ندارد از ہر کہ رنجد تا منت دارم و دریاری بقدر امکان انشاء اللہ تقصیر نکنم، اگر فرزند عزیز بہاؤالدین در آزار شما کوشد، حقا ثم حقا دل ازو برکنم و سلام او را جواب نگویم و بجنازہ نخواہم و ہمیں غیر او ہر کہ باشد ...."

اس سلسلہ میں اگر شیخ صلاح الدین کے چند اقوال نقل کر دیئے جائیں تو بے محل نہ ہوگا، آپ کے اقوال سراسر حال ہوتے تھے، اہل قال کو ان میں قیل و قال کی گنجائش نہیں تھی، ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ "اس ولایت میں کوئی ہے جو میری باتوں کو سمجھے" مولاناؒ نے فرمایا کہ، یں اور "شکستگان و درویشاں" ہیں (مراد اس سے اپنی ذات سے رہی ہو گی)

ایک روز حضرت سلطان ولدؒ سے فرمایا کہ "میرے سوا اور کسی شخص پر نظر نہ کرو، شیخ راستین میں ہوں، دوسروں سے نقصان پہونچے گا۔ تمہارے لئے میری نظر مثل آفتاب کے ہے، دوسروں کی نظر مثل سایہ کے ہے، پتھر آفتاب سے لعل بنتا ہے، سایہ سے لعل نہیں بنتا" (رباب نامہ ۲۷ ب)

ایک روز فرمایا کہ "اس بات کو اچھی طرح جان لو کہ ولی خدا کان رحمت ہوتا ہے، تمام لوگ ذوق،

رحمت و راحت اسی کے وجود شریف سے حاصل کرتے ہیں اور اسی کے نور سے زندہ رہتے ہیں اور اس کا نور کم نہیں ہوتا" جس میں یہ صفت نہ ہو وہ ولی خدا نہیں ہے۔"

شیخ صلاح الدین کے انتقال کے بعد مولانا نے چلپی[1] حسام الدین ابن اخی ترک کو اپنا نائب و خلیفہ

---

[1] "چلپی" ایک ترکی لفظ ہے مگر اسکا اشتقاق نہایت ہی مختلف فیہ ہے، علمائے مشرق نے تو بہت کم لکھا ہے مگر علمائے مغرب نے بہت موشگافیاں کی ہیں، تاہم متفق اللفظ ہو کر کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ سکے ہیں، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (جلد اول صفحہ ۸۲۱۔۸۲۲) میں اس لفظ کے متعلق ایک طولانی مضمون موجود ہے۔ اس میں احمد واقف پاشا کی رائے بھی درج ہے، میں نے اس کل مضمون کی نسبت ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی سے دریافت کیا تو موصوف نے فرمایا کہ "احمد واقف پاشا نے جو کچھ لکھا ہے وہ درست معلوم ہوتا ہے" مضمون مذکور کا ملخص ذیل میں درج کیا جاتا ہے، اس میں احمد واقف پاشا کی رائے بھی شامل ہے، لیکن لفظ کا اشتقاق اور اس کے معنی لغوی (جو کچھ بھی قرار پائیں) اس قدر مسلم و متفق علیہ ہے کہ سب سے پہلے اس لفظ کا استعمال حضرت حسام الدینؒ ہی کے نام کے ساتھ ہوا اور اس کے بعد تمام سجادہ نشینانِ سلسلہ مولویہ اس لفظ سے ملقب ہوتے آئے۔ خلاصۂ مضمون ملاحظہ ہو:۔

"مولانا قاسم انوار (م ۸۳۵ھ ۱۴۳۲ء) کے تصانیف میں لفظ "چلپی" معشوق کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے، جس سے مراد معشوق حقیقی ہے "خلاصہ عباسی" میں "صاحب قلم" کے معنی میں آیا ہے۔ احمد واقف پاشا نے "لہجۂ عثمانیہ" میں اس کی تائید کی ہے اور اس کے ماخذ کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ چنگیز خاں کے زمانہ میں تاتاریوں اور مشرقی ترکوں نے عیسائی قسیسوں سے تعلیم حاصل کی تھی، انھیں

بنایا۔ چلبی حسام الدین مولانا کے ممتاز مریدوں میں سے تھے، اور مولانا کے انتقال کے بعد گیارہ برس مولانا کی خلافت کے فرائض انجام دیئے۔

آپ اصلاً ترک اور وطناً ارموی تھے اور روم کے مشہور و ذی اثر خاندان اخی[1] سے تعلق رکھتے تھے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے، تمام اکابر و اعیان آپ کی دلداری کرتے تھے، کیونکہ روم کے تمام معزز

بقیہ حاشیہ صـ۲۳۴

سے لفظ "چلبیا" "صلیب" لیا اور اسے خدا کا اسم قرار دیا اور اس معنی میں ان قسیسوں کو "چلبی" یعنی خدا پرست کہنے لگے۔ دوسری صاف و صریح توجیہ یہ ہے کہ کردی زبان میں "چلب" (جس کا تلفظ ایشیائے کوچک میں "چلپ" ہوتا ہے) خدا کے معنی میں ہے۔ پس چلبی کے معنی ابن اللہ کے ہوے۔ یہی توجیہ سب سے زیادہ صحیح اور قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

گیارہویں صدی ہجری (سترہویں صدی عیسوی) تک شہزادوں، اعلیٰ مذہبی عہدہ داروں (خاصکر درویشوں کے شیوخ) اور مصنفوں کے ناموں کے ساتھ تعظیمی لفظ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مگر اب اس کے بجائے آفندی مستعمل ہو گیا ہے اور چلبی کا لفظ غیر مسلموں سے مخصوص ہو گیا ہے۔ مگر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ مولویہ کے شیوخ بدستور "چلبی" کہلاتے ہیں۔"

ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں "ذکر سلطان قل حصار" کے تحت میں اس لفظ کی مختلف تشریح اور بقدر حاجت نہایت جامع تشریح کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ

سلطان محمد چلبی و چلبی (بکیم سعقودہ لام مفتوحین وباء موحدہ دیار تفسیر بلسان الروم "سیدی"

رحلۃ ابن بطوطہ جزو اول صـ۲۱۷

(المطبعۃ الخیریہ، مصر، ۱۳۲۲ھ)

[1] "اخی" ایک خاندان کا لقب ہو گیا تھا، خود مناقب العارفین میں متعدد ناموں کے ساتھ یہ اضافت آئی

اشخاص آپ کے آباد اجداد کے تربیت یافتہ تھے، حضرت حسام الدینؒ سب کی محبتوں کا اندازہ کر کے مولاناؒ کی خد آئے، آپ نے تمام لازموں اور غلاموں کو حکم دیدیا کہ اپنے طور پر کام کریں۔ آہستہ آہستہ اپنا کل ملو کہ مولاناؒ کی خدمت میں صرف کر دیا۔ آخر میں غلاموں کو بھی آزاد کر دیا۔ مولاناؒ کا پاس ادب اس قدر ملحوظ رکھتے کہ مولاناؒ کے وضوخانہ میں کبھی وضو نہ کرتے، سخت سے سخت سردی ہوتی، برف پڑتی ہوتی مگر گھر جا کر وضو کر کے آتے تھے، دوسری طرف مولاناؒ بھی آپ سے اس طرح پیش آتے تھے کہ دیکھنے والے کو گمان ہوتا تھا کہ مرید ہیں۔ آخر مولاناؒ کی خدمت میں آپ کو یہ قرب حاصل ہوا کہ جو کچھ فستوح مولاناؒ کو حاصل ہوتی سب آپ کے پاس بھیجدیتے مگر آپ کا بھی یہ حال تھا کہ اس میں سے ایک گھونٹ پانی دپیتے، سب کچھ مریدوں کے مصارف میں خرچ کر دیتے، اتقا کا یہ حال تھا کہ جب زیارت تربت شیخ کے لئے آتے تو پانی ساتھ لاتے تھے اور اسی سے وضو کرتے اور اسی میں سے پیتے تھے، اس پانی کو کام میں نہ لاتے تھے جو وقف مزار سے خریدا جاتا تھا۔

حضرت شمس الدین تبریزی اور شیخ صلاح الدین سے بھی آپ کو ارادت تھی، اور ان بزرگوں کے فیض سے بھی آپ بیش از بیش متمتع ہوئے تھے۔

بقیہ حاشیہ ص ۲۳۵

ہے اور رڈہاؤس نے لکھا ہے کہ "یہ ایک بہت ہی باا‌ثر خاندان تھا جو قونیہ اور ایشیائے کوچک کے دوسرے شہروں میں بھی سکونت پذیر تھا" اس لفظ کی ترکیب میں قدرے امکان اختلاف ہے "اخ" تو مسلّم طور پر عربی لفظ ہے اور بھائی کے معنی میں ہے، غور طلب ہے "ی" رڈہاؤس نے اسے فارسی کی یائے نسبت قرار دی ہے اور اس کے معنی "بھائی سے قرابت رکھنے والا" بتایا ہے مگر خود ترکی میں "ی" "غائب کا فائدہ بھی دیتی ہے، اگر اس "ی" کو ترکی فرض کیا جائے تو اس کے معنی ہوئے "آپ کا بھائی" لیکن صاف یہ ہے کہ اس "ی" کو عربی کی "ی" قرار دینا چاہیے، اور لفظ کے معنی "میرے بھائی" کے سمجھنا چاہیے۔ اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس قسم کے لاحقے غیر زبان والوں کے نزدیک اپنے اصل معنی پر قائم نہیں رہتے چنانچہ

حضرت چلپی حسام الدینؒ مذہباً شافعیؒ تھے۔ ایک روز مولاناؒ سے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کی اقتدا کروں کیونکہ خداوندگارؒ کا مذہب یہی ہے فرمایا کہ نہیں بدستور شافعی مذہب پر رہو، لیکن میرے طریقہ پر چلو اور لوگوں کو میرے جادۂ عشق پر چلاؤ۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چلپی حسام الدینؒ حضرت مولاناؒ کی زندگی ہی میں ایک خانقاہ کے شیخ بھی ہو گئے تھے، وہ روایت حسب ذیل ہے۔

خواجہ نفیس الدین سیواسی کی روایت ہے کہ ایک بہت بڑے بزرگ تھے جو دو خانقاہوں کے شیخ تھے، جب ان کا انتقال ہو گیا تو امیر تاج الدین نے یہ چاہا کہ وزیر ضیاء الدین کی خانقاہ کا شیخ حضرت حسام الدینؒ کو بنا دیں، سلطان سے اس مقصد کا فرمان بھی حاصل کر لیا، ایک اجلاس عظیم منعقد کیا اور مولاناؒ کو اطلاع دی کہ خانقاہ ضیاء الدین کا تعلق چلپی حسام الدینؒ سے ہوگا۔ مولانا اپنے تمام اصحاب کے ساتھ روانہ ہوئے، نفیس الدین حضرت چلپی کا سجادہ اپنے کندھے پر لئے ہوئے تھے، مولاناؒ نے ان سے لے کر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ جب خانقاہ میں پہنچے اور چاہا کہ سجادہ صدر میں بچھا دیں تو اخی احمد نے (جوان حساد کا سرگروہ تھا جو چاہتے تھے کہ چلپیؒ اس خانقاہ کے شیخ نہوں) کہا کہ ہم ایک ایسے نوجوان شخص کو شیخ نہیں بناتے اور سجادے کو لپیٹ کر ایک شخص کے ہاتھ میں دیدیا سخت فتنہ برپا ہو گیا اور اخی ترک اور اخی شارو کے خاندان کے لوگوں نے تلواریں کھینچ لیں، مولاناؒ خاموش رہے کچھ نہ بولے، آخر میں یہ فرمایا کہ "یہ لوگ کفران نعمت کرتے ہیں اور اس نعمت بے نقمت کی قدر نہیں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۶۔

(جیسا کہ شروع کتاب میں ذکر ہو چکا ہے) ہماری زبان میں مولانا کا لفظ موجود ہے کہ "نا" کے ہوتے ہوئے لوگ "ہمارے مولانا" کہتے ہیں، پس اسی طرح "اخی" بھی ایک لفظ بن گیا اور ایک خاندان کا لقب ہو گیا تھا)   ؏ سپہ سالار ص ۱۴۲

جانتے، اس تعصب کا کچھ نتیجہ نہ ہوگا سب پائمال ہونگے، اور میرا سلسلہ سب پر غالب رہے گا۔ یہ کہہ کر وہاں سے پا برہنہ روانہ ہوگئے، لوگوں نے ہرچند روکا نہ رکے، سلطان کو جب اس واقعہ کی خبر پہونچی تو اس نے اخی احمد کو قتل کی سزا دینا چاہی مگر مولانا نے اسے روا نہ رکھا، مولانا سے لوگوں نے اس کی سفارش کی مولانا نے فرمایا کہ وہ ہماری جنس سے نہیں ہے، لوگوں نے اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور آخر میں دیوانہ وار حالت میں وہ انتقال کر گیا، (اس کا بیٹا اخی علی باخلاص تمام سلطان ولدؒ کا مرید ہو گیا) انجام کار میں چلپی حسام الدین ہی اس خانقاہ کے مستقل شیخ مقرر ہوئے۔

ترتیب حالات کو سرسری نظر سے دیکھنے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شیخ صلاح الدینؒ کے انتقال کے بعد ہی مولانا نے حضرت حسام الدین کو اپنا خلیفہ بنا لیا تھا[1]۔ مگر اس کے قبول کرنے میں ایک دشواری یہ پیش آتی ہے کہ سلطان ولدؒ نے نظم و نثر دونوں میں صاف طور پر یہ تحریر فرمایا ہے کہ حضرت حسام الدینؒ نے مولانا کی زندگی دس برس کار خلافت انجام دیا۔

دربیان مصاحبت کردن چلپی حسام الدین قدس اللہ سرہ مدت دہ سال تنگا تنگ با حضرت مولانا قدس اللہ سرہٗ بروجہ یاران واصحاب از حضرت ہر دو بے حد مستفید شدن و بعد ازاں نقل فرمودن مولانا قدس اللہ سرہ العزیز۔

. . . .

حوس ہمیں بودہ ہمچنیں دہ سال | پاک وصافی مثال آب زلال
بعد ازاں نقل کرد مولانا | زیں جہان کثیف بر زعنا

---

[1] چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں بھی لکھا ہے کہ "حضرت حسام الدین ۶۵۵ھ ۱۲۵۸ء میں مولانا کے مددگار خاص ہوگئے۔

سپہ سالارؒ نے اس مدت کو ایک جگہ نو ہی برس قرار دیا ہے[1] مگر دوسرے موقع پر انھوں نے بھی دس لکھا ہے[2]

افلاکیؒ نے بھی دس برس لکھا ہے۔

"دہ سال تمام بے انقطاع وانقضاع تنگاتنگ مصاحبت میکردند"

مولانا کا انتقال سنہ ۶۷۲ھ میں ہوا ہے، پس اس طرح چلپی حسام الدینؒ کی خلافت کا آغاز سنہ ۶۶۲ھ سے ہونا چاہئے مگر شیخ صلاح الدینؒ کی وفات سنہ ۶۵۷ھ میں واقع ہوئی تھی، پس حل طلب یہ رہ جاتا ہے کہ اس پانچ برس کے درمیانی زمانہ میں حضرت حسام الد ینؒ کی حیثیت کیا تھی؟

یہ مسلّم ہے کہ مثنوی شریف کی تصنیف کی تحریک حضرت حسام الدین کی جانب سے ہوئی۔ اور اس کا آغاز باغلب وجوہ سنہ ۶۵۸ھ سے ہوا ہے، اس سے یہ ثابت ہے کہ اس زمانہ میں حضرت حسام الدینؒ کو اختصاص خاص حاصل تھا۔

پس تمام روایات کی تطبیق کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ شیخ صلاح الدینؒ کے انتقال کے بعد مولاناؒ نے اپنی صحبت و ہمنشینی کے لئے حضرت حسام الدینؒ کو مخصوص کر لیا تھا مگر آپ کو اپنا مستقل خلیفہ سنہ ۶۶۲ھ میں بنایا[3]

---

[1] سپہ سالار ص۷۳

[2] ” ص۷۵

[3] غالباً اسی سے بعض اشخاص کو مغالطہ ہو گیا ہے چنانچہ مولوی عبد الماجد الفلسفی ثم الصوفی نے "فیہ مافیہ" کے دیباچہ میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ شیخ صلاح الدینؒ کا انتقال سنہ ۶۶۲ھ میں ہوا (الناظر لکھنو)

مولاناؒ نے جب حضرت حسام الدینؒ کو اپنا خلیفہ بنایا تو جملہ مریدوں کو یہ نصیحت کی کہ تمام وکمال ان کی اطاعت کریں، مریدوں کو سرکشی کا تجربہ پہلے متعدد بار ہوچکا تھا، اس لئے اس مرتبہ کسی نے چوں چرا نہ کی اور سب نے سر جھکا دیئے۔

خوردہ بودند زخمہا ز انکار　　ہمہ کردند ازاں خطر احراز
زاولیں ضربت قوی خوردند　　درد و م فتنہ کمترک کردند
درسوم نرم وبا ادب گشتند　　بے حسد رام مرد رب گشتند
کس ازاں قوم سرکشی نہ نمود　　ہر یکے امر را زجاں بشنود
سالہا شادماں بہم بودند　　کامراں جملہ بے ستم بودند

سلطان ولدؒ نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے کہ مولاناؒ کے کسی مرید نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے تینوں نائبوں میں سے اعلیٰ کون تھا، مولاناؒ نے جواب دیا شمسؒ بمنزلہ آفتاب کے تھے، صلاح الدین بمنزلہ ماہتاب کے اور حسام الدینؒ بمنزلہ ستارہ کے ہیں لیکن حقیقت میں تینوں صاحبوں کو یکساں سمجھنا چاہیئے ؎

ہمہ رایک شناس چونکہ ترا　　می رسانند ہر یکے بخدا
دامن ہر یکے کہ گیری تو　　زندہ گردی، وگر نمیری تو

لیکن حق یہ ہے کہ مثنوی شریف میں مولاناؒ نے حضرت حسام الدینؒ کی مدح جس شان سے کی ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے، اگر حالات واقعیہ سے واقفیت نہ ہو تو ان مدائح کو پڑھ کر

بقیہ حاشیہ صـ۲۳۹

اور ان کا ماخذ بظاہر "سوانح مولانا روم" ہے کیونکہ اس میں بھی سنہ ۶۶۲ھ کو شیخ صلاح الدینؒ کے انتقال کا سنہ قرار دیا گیا ہے (صـ۲۲-۲۳) مگر یہ قطعاً غلط ہے۔

کوئی شخص یہ گمان بھی نہ کرے گا کہ مولانا پیر اور حسام الدین مرید تھے بلکہ اس کے برعکس کا یقین اور یقین قطعی دل میں پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ بعض تذکرہ نویسوں تک نے مغالطہ کھایا ہے (جیسا کہ شیخ صلاح الدین کے حال میں اوپر مذکور ہو چکا ہے)

چلپی حسام الدین کی اصابت رائے اور حقیقت شناسی کی نسبت مولانا کا جو کچھ خیال تھا اس کا اندازہ روایت ذیل سے ہو سکتا ہے۔

چلپی حسام الدین کی ایک عجیب عادت یہ تھی کہ غیروں کے سامنے ایسے لوگوں کی تعریف کرتے جو فسق و فجور میں مشہور ہوتے اور کہتے کہ یہ لوگ بڑے زاہد و متقی ہیں اور جو لوگ زہد و تقویٰ میں مشہور ہوتے ان کی نسبت کہتے کہ یہ اچھے لوگ نہیں ہیں، اس سے لوگوں کو سخت حیرت ہوتی، ایک دفعہ لوگوں نے مولانا کے سامنے یہ ذکر کیا کہ چلپی حسام الدین ایسا کہتے ہیں، فرمایا کہ حق ہے، وہ جن فاسقوں کی مدح کرتے ہیں وہ ظاہر میں فاسق و بے ادب ہیں مگر باطن میں طاہر و مؤدب ہیں اور زاہدوں کی جس جماعت کی قدح کرتے ہیں وہ باطن میں منافق و فاسق ہیں۔

یہ اسی قسم کے خیالات کا اثر تھا کہ مولانا نے یہ معمول کر لیا تھا کہ امراء و ملوک و اکابر و مریدان متمول جو کچھ اسباب و اموال دنیاوی بھیجتے تھے۔ آپ سب کا سب فی الفور چلپی حسام الدین کے پاس بھیج دیتے تھے، ایک روز امیر تاج الدین نے آقسرا سے سات ہزار دینار بھیجے اور لکھا کہ یہ وجہ حلال سے ہے، مولانا نے فرمایا کہ لے لو اور چلپی حسام الدین کے پاس لے جاؤ، حضرت سلطان ولد نے عرض کیا کہ گھر میں کچھ نہیں ہے اور جو کچھ آتا ہے سب حسام الدین کے پاس بھیج دیا جاتا ہے، ہم لوگوں کا کام کیسے چلے، مولانا نے فرمایا کہ "بہاء الدین واللہ باللہ اگر لاکھ زاہد کامل مستحق حالت مخمصہ میں پڑے ہوں اور میرے پاس

ایک روٹی ہو تو بھی کسی کا خیال نہ کروں گا اور اسے بھی حسام الدین ہی کے پاس بھیج دوں گا۔ خواہ ان کے پاس دنیا بھر کا مال جمع ہو کیونکہ وہ مرد خدا ہیں اور ان کا سارا کام خدا کے لئے ہے۔ ان کو مال دنیا سے نقصان نہیں ہوتا، ان کو مال دنیا میں تصرف حلال ہے، اور دوسروں کو حرام کیونکہ دوسروں میں یہ بات نہیں ہے۔"[1]

(یہ رقم حضرت حسام الدینؒ کے پاس پہونچی تو اس میں سے ہزار درم سلطان ولدؒ کے پاس ہزار درم کرا خاتون کے پاس، اور پانچ سو درم چلپی امیر عالمؒ کے پاس بھیجے اور خود کچھ نہ لیا)

مولاناؒ کے اس زمانہ کا سب سے بڑا کارنامہ مثنوی شریف کی تصنیف ہے۔ اور اس میں حضرت حسام الدینؒ کی تحریک کو بہت بڑا دخل ہے بلکہ یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ مثنوی شریف کا وجود میں آنا آپ ہی کی وجہ سے ہوا[2] اسکی مفصل بحث مثنوی شریف کے تبصرے کے تحت میں آئے گی، یہاں صرف اس قدر اشارہ کر دینا کافی ہے کہ مولاناؒ کی زندگی کے آخری چودہ برس (ایک مختصر وقفہ کے علاوہ) تصنیف مثنوی شریف میں صرف ہوئے، اس زمانہ میں غزل کی طرف التفات کم رہا، اور یہی وجہ ہے کہ دیوان میں حضرت حسام الدین کا نام بہت کم آیا ہے مگر مثنوی شریف میں مولاناؒ نے جس زور و شور سے حضرتؒ حسام الدین کی مدح کی ہے، اس نے اس کمی کی تلافی ضرورت سے زائد کر دی ہے۔

اس فصل کے تمام کوائف کو اول سے آخر مطالعہ کرنے کے بعد ایک خاص اثر دل پر پڑتا ہے کہ مولاناؒ کو کسی نہ کسی رفیق کے بغیر راحت نہیں ملتی تھی شمس الدینؒ کے بعد صلاح الدینؒ اور صلاح الدینؒ کے

---

[1] مناقب ذکر چلپی حسام الدینؒ

[2] تمامت مثنویات بالتماس ایشان مؤلف گشتہ است، سپہ سالار صـ

بعد حسام الدینؒ آپ کے ہمراز و دمساز رہے بلکہ سلسلۂ خیال کو اگر اور آگے بڑھایئے تو صاف نظر آتا ہے کہ سید برہان الدین ترمذی بھی اسی زمرے میں داخل تھے، اگرچہ دوسری حیثیت سے تھے اور سید موصوف کے انتقال اور شمسؒ کی آمد کے درمیان پانچ برس کا زمانہ مولاناؒ نے اس طرح گزارا گویا اس دوران میں آپ کچھ کمی سی محسوس کرتے تھے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مولاناؒ کے باطن میں جو کمالات مخفی تھے ان کے اظہار کے لئے کسی نہ کسی محرک کی ضرورت تھی، دیوان و مثنوی انھیں اصحاب کی تحریک باطنی کے شواہد ظاہری ہیں، صرف حسام الدین کی عدم فرصت کی وجہ سے مثنوی شریف کی تصنیف دو برس معلق رہی، مولاناؒ خود اس تاخیر کی توجیہ اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

ایں سخن شیر است در پستان جاں　　　　بے کشندہ خوش نمی گردد رواں

ایک دوسرے موقع پر فرمایا ہے کہ ہر نبی کیلئے ایک ابو بکرؓ لازم ہے ۔

سلطان ولدؒ نے اس نکتہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ "چنانکہ موسیٰ با قوت نبوت وعظمت رسالت جویائے خضر گشتہ بود مولانا قدسنا اللہ بسرہ العزیز نیز باوجود چندیں فضائل وخصائل ومقامات وکرامات وانوار واسرار کہ در دور طور خود بے نظیر بود دشمس نداشت طالب شمس الدینؒ تبریزی عظم اللہ ذکرہ گشتہ بود"

غرض اسے مولاناؒ کے خصوصیات میں سے سمجھنا چاہیئے کہ آپ کو بغیر کسی نہ کسی رفیق کے راحت نہیں ملتی تھی، اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان رفقا کے انتخاب میں کیا خاص نکتہ مد نظر رہتا تھا، اس میں زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ نکتہ بہت صاف عیاں ہے۔

مولانا نے جن اصحاب کو اپنی ہمنشینی خاص کے لیے منتخب کیا، ان کے انتخاب کی وجہ کشف وکرامات نہیں تھی، آپ کا قول اور مسلک یہ تھا کہ محبت کا سبب جنسیت ہوا

کرتی ہے، شیخ صلاح الدینؒ مولاناؒ سے برابر یہ کہا کرتے تھے کہ میں نے عجیب عجیب نور دیکھے اور اس اس رنگ کے نور دیکھے، سلطان ولدؒ نے مولانا سے سوال کیا کہ شیخ صلاح الدینؒ کو آپ اسی وجہ سے دوست رکھتے ہیں کہ وہ آپ کے انوار کا تفرج کرتے ہیں، فرمایا نہیں بلکہ مناسبت جنسیت کی وجہ سے انھیں خاص طور پر دوست رکھتا ہوں، اس کے بعد اس کی متعدد مثالیں بیان کیں اور فرمایا کہ جو محبت مناسبت کی وجہ سے ہوتی ہے، اس کا نتیجہ پشیمانی نہیں ہوتا اور اگر نتیجہ پشیمانی و پریشانی ہو تو وہ محبت تذویر ہے جو غرض و غرض پر مبنی ہوتی ہے کیونکہ حقیقی محبت و مناسبت سے دنیا و آخرت کہیں بھی پشیمانی نہیں ہوتی، چنانچہ اہل غرض دوستوں کو آخرت میں یہ تمنا ہوگی "یالیتنی لم اتخذ فلانًا خلیلاً" محبان ستقی کی صفت یہ ہوگی کہ "الاخلاء یومئذٍ بعضہم لبعض عدو الا المتقین" خود مولانا نے مثنوی شریف میں جا بجا اس پر زور دیا ہے۔

چیست جنسیت یکے نوع نظر　　کہ بداں یابند رہ در ہمدگر

موجبِ ایماں نباشد معجزات　　لیک جنسیت بود جذبِ صفات

ہم ز جنسیت شود یزداں پرست　　چون بہشتی جنس جنت آمدہ است

مولاناؒ کے زمانہ (۶۲۶ھ - ۶۷۲ھ) میں قونیہ و روم میں جو سیاسی واقعات پیش آئے مثلاً مغلوں کا حملہ، سلطان رکن الدین کا قتل، پروانہ کی وزارت بلکہ سلطنت، باجو خاں کا محاصرہ قونیہ (جس کی مدافعت میں مولاناؒ نے بذات خود شرکت کی) یہ سب نہایت اہم واقعات

ہیں اور ان میں سے بعض واقعات سے مولاناؒ کا کچھ نہ کچھ تعلق بھی ہے مگر ان تمام واقعات کو بیان کر کے کتاب کو سیاسی تاریخ بنانا موضوع بحث سے خارج ہے۔ تاہم یہ واقعات بالکل حذف نہیں ہو گئے ہیں بلکہ مختلف طریق پر اپنے اپنے محل پر بیان کر دیئے گئے ہیں۔ مولاناؒ کے زمانہ کے سلاطین روم کا ذکر یکجائی طور پر لاحقہ دوم فصل اول میں مل جائے گا، باجو خاں کے محاصرے کا حال فصل چہارم میں "امداد اہل اسلام" کے تحت میں مذکور ہے، رکن الدین کے قتل کی تفصیل فصل چہارم نیز حصہ دوم بحث "ترتیب دیوان" میں مندرج ہے اور فصل پنجم (زمان و اہل زمان) کی تمہید کو درحقیقت اسی موجودہ فصل کا ایک جزو سمجھنا چاہیئے۔ چونکہ ان مواقع پر ان واقعات کا لانا زیادہ بامحل تھا، اس لئے یہاں ان کا ذکر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ

در مکرر بستن مضمون رنگیں لطف نیست   کم دہد رنگ ار کسے بندد حنا بستہ را

فصل چہارم کے مطالعہ سے واضح ہو گا کہ مولانا نہ صرف تا حد امکان علائق دنیا سے بے تعلق رہتے تھے بلکہ دنیاوی زندگی سے بھی بیزار تھے کبھی اس زندگی حبس سے تعبیر کرتے، کبھی فرماتے کہ مصلحتاً چند روز اس دنیا میں ہوں، چنانچہ ایک مرتبہ مولاناؒ کی حرم محترم نے کہا کہ "خدا کرے کہ مولاناؒ کی عمر تین چار سو سال کی ہو کہ دنیا حقائق و معانی سے بھر جائے" فرمایا "کیوں، کیوں؟ کیا میں فرعون ہوں؟ کیا میں نمرود ہوں؟ مجھے عالم خاک سے کیا تعلق؟ یہ چند روز کی قید حیات تو صرف اس لئے ہے کہ چند عزیزوں کو جو اس قید خانہ میں قید ہو گئے ہیں خلاص دلاؤں، امید ہے کہ جلد تر جنت کی طرف رجوع کروں۔ اگر میرے رہنے میں ان بیچاروں کی مصلحت نہ ہوتی تو اس نشیمن خاکی میں ایک دم بھی نہ ٹھہرتا ؎

ما از برائے مصلحت در حبس دنیا آمدیم   من از کجا، حبس از کجا، مالِ کرا دزدیدہ ام

جب آپ کے وصال کا زمانہ قریب آیا تو آپ پہلے ہی سے اس باب میں کچھ نہ کچھ اشارات کرنے لگے اور یہ ایک ایسا امر ہے، جس میں مولاناؒ منفرد نہیں ہیں، اکثر بزرگانِ دین کی نسبت اس قسم کی روایتیں منقول ہیں۔

اسی قسم کی ایک روایت ہے کہ مولاناؒ اپنے آخر زمانہ میں اکثر مدرسہ میں گھومتے پھرتے اور آہ آہ کرتے رہتے، گھر میں ایک بلی تھی وہ سامنے آکر رونے لگی، مولاناؒ نے تبسم فرما کر کہا کہ "جانتے ہو یہ بلی کیا کہتی ہے؟ لوگوں نے کہا، نہیں، فرمایا "کہتی ہے کہ آپ کو مبارک ہو کہ آپ اپنے وطن اصلی کو جا رہے ہیں، میں غریب کیا کروں گی" لوگ رونے لگے (مولاناؒ کے انتقال کے بعد اس بلی نے سات روز تک کچھ کھایا پیا نہیں اور آخر مر گئی)[۱]

کسی روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انتقال سے قبل مولاناؒ کتنے دنوں علیل یا صاحبِ فراش رہے مگر مختلف بیانات سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ زمانہ علالت کچھ طولانی رہا۔

سپہ سالارؒ کا قول ہے کہ مولانا کے انتقال سے قبل قونیہ میں چالیس روز تک زلزلہ آتا رہا،[۲] افلاکیؒ کا بیان ہے کہ مولانا ہنوز صاحبِ فراش تھے کہ سات روز برابر زلزلہ رہا تمام لوگ عاجز آ گئے، مولاناؒ سے طلبِ امداد کی، فرمایا کہ "زمین بھوکی ہو گئی ہے لقمہ چرب چاہتی ہے، جلد کامیاب ہو جائے گی اور یہ زحمت تم لوگوں سے رفع ہو جائے گی" اور

حاشیہ ص ۲۴۵

۱۔ مناقب ص ۲۲۴

۲۔ " ص ۲۴۸

۲۔ " ص ۵۰

اسی زمانہ میں یہ غزل ارشاد فرمائی ہے

با ایں ہمہ مہر و مہربانی	دل می دہدت کہ خشم رانی
ویں جملہ شیشہائے جاں را	در ہم شکنی بہ لن ترانی
در زلزلہ است دارِ دنیا	کز خانۂ تو رخت مے کشانی
نالاں ز تو صد ہزار رنجور	بے تو نزنید میں تو دانی[1]

مگر حضرت سلطان ولدؒ نے لکھا ہے کہ مولاناؒ کے انتقال کے بعد زلزلہ آیا تھا ۔ ہے

لرزہ افتاد در زمیں آں دم[1]	گشت نالاں فلک دراں ماتم

(ممکن ہے دونوں صورتیں واقع ہوئی ہوں یا سلطان ولدؒ کا قول بطور استعارہ کے ہو)

جب مولاناؒ کی طبیعت میں کسر و اضمحلال بڑھا تو اکمل الدین اور غضنفر کہ اپنے وقت کے جالینوس تھے، علاج کی فکر میں ہوئے، نبض دیکھ کر باہر آتے اور کتابوں کی طرف رجوع کرتے، تحقیق کے لیے جب پھر جا کر نبض دیکھتے تو نبض کی حالت بالکل ہی دوسری پاتے، آخر تشخیص سے عاجز آ گئے اور خود مولاناؒ سے استدعا کی کہ اپنا حال بیان فرمائیں، مگر مولاناؒ نے کچھ بیان نہ کیا، سمجھ لیا کہ اب کچھ اور ہی ارادہ ہے۔[3]

---

[1] سپہ سالار صہ۵۸ [2] سپہ سالار نے اس مصرع کو اس طرح نقل کیا ہے، ع خشم مکن چنیں بہ سید آں دم
مگر رباب نامہ مخزونہ کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی میں یہ مصرع اسی طرح ہے جس طرح اوپر نقل ہوا ہے۔
[3] اس موقع پر "حیات وارث" سے چند سطریں نقل کر دینا بے موقع نہ ہوگا، جن سے واضح ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ کی حالت اس معاملہ میں بھی دوسرے لوگوں کی حالت سے جداگانہ ہے۔

(۱) حضرت حاجی وارث علی شاہ صاحبؒ کی آخری علالت میں آپ کی نبض کی جو حالت تھی اس کی نسبت (صـ۲ حصہ دوم) پر رقم ہے کہ "ابتدائی بیماری سے کسی وقت نبض کی رفتار بالکل ضعیف ہو جاتی

چلپی حسام الدینؒ کی روایت ہے کہ ایک روز شیخ صدرالدینؒ اکابر درویشوں کے ساتھ مولاناؒ کی عیادت کو آئے تھے، مولانا کی حالت دیکھ کر رنجیدہ ہوئے اور فرمایا کہ خدا شفاء عاجل عطا فرمائے، امید ہے کہ صحتِ کلی حاصل ہو جائیگی"، مولانا نے فرمایا" اب شفا آپ ہی کو مبارک ہو، عاشق و معشوق میں بال کا پیراہن رہ گیا ہے، کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اٹھ جائے اور نور نور سے مل جائے،

گفت لبش گر ز شعر و شستر است | اعتناقِ بے حجابے خوشتر است
من شدم عریاں زتن او از خیال | می خرامم در نہایات الوصال

شیخ اور تمام اصحاب روتے ہوئے چلے گئے اور مولانا نے یہ غزل شروع کی،

چہ دانی تو کہ در باطن چہ شاہے ہمنشیں دارم | رخِ زریں من منگر کہ پائے آہنیں دارم

مولانا کے [illegible] م علالت میں شہر کے تمام امراء و شیوخ عیادت کے لئے آتے اور حالت دیکھ دیکھکر [illegible] دس کرتے تھے، ان ہی میں سے ایک شخص نے پوچھا کہ جانشینی کے لئے موزوں کون ہے اور کسے مقرر فرمایا ہے؟ فرمایا کہ خلیفۃ الحق جنید الزماں چلپی حسام الدینؒ، تین مرتبہ سوال کیا اور تینوں مرتبہ یہی جواب ملا، چوتھی مرتبہ لوگوں نے کہا کہ مولانا بہاء الدینؒ کے متعلق کیا ارشاد ہے، فرمایا کہ وہ پہلوان ہے، اسے وصیت کی حاجت نہیں ہے،

(بقیہ حاشیہ ص۲۴۷) تھی، اور کسی وقت ایسی رفتار ہوتی تھی کہ کسی اچھے جوان کی بھی ایسی قوی نبض نہ ہو گی" اس کیفیت کو خود مولانا نے بیان فرمادیا ہے،

نبضِ عاشق بے ادب بر می جہد | خویش را در کفۂ شہ می نہد

(۲) حاجی صاحب کے اسی سلسلۂ علالت میں حکیم عبدالعزیز مرحوم نے دواؤں کا اثر نہ دیکھ کر کہا کہ" نہیں معلوم حضور کو کیا منظور ہے، جو دوا کا اثر تک نہیں ہونے دیتے، اس کا اثر ہی بالکل اڑا دیا ہے" (ص۳۵) ؎ مناقب ص ۲۴۸ و ۲۴۹،

ولدؒ را نیست حاجت لاف و دعوے — کہ در سیمائے او چوں نور عیان است [1]

آخر ایام میں حضرت بہاء الدین ولدؒ کی پریشانی کی کوئی انتہا نہ تھی، کئی راتوں سے سوئے نہ تھے۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ "میں اچھا ہوں تم جاکر سو رہو اور ذرا آرام کرلو"

جب وہ سو رہے تو مولاناؒ نے یہ غزل شروع کی، حسام الدینؒ چلپی لکھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے ؎

رو، سر بنہ بہ بالیں تنہا مرا رہا کن — ترک من خراب شب گرد مبتلا کن

مائیم و موج سودا، شب تا بروز تنہا — خواہی بیا ببخشا، خواہی برو جفا کن

بر شاہ خوبرویاں واجب وفا نباشد — اے زرد روئے عاشق، تو صبر کن وفا کن

خیرہ کشیست ما را دارد دلے چو خارا — بکشد کسے نگوید تدبیر خوں بہا کن

دردیست غیر مردن او را دوا نباشد — پس من چگونہ گویم کیں درد را دوا کن

در خواب دوش پیرے در کوئے عشق دیدم — با دست اشارتم کرد کہ عزم سوئے ما کن

آخری غزل یہی ہے [2]

انتقال سے کچھ دن قبل ایسا ہوا کہ تین روز تک کسی سے گفتگو نہ کی اور نہ کسی کو یہ ہمت ہوئی کہ کچھ گفتگو کرے، آخر مولاناؒ کی حرم محترم نے آکر پوچھا کہ انقباض کا باعث کیا ہے۔ فرمایا کہ "موت کے خیال میں ہوں کہ کس طرح واقع ہوتی ہے [3]۔"

---

[1] مناقب ص۳۵۱

[2] ایضاً ص۳۵۲ گر بیہ سالارؒ نے لکھا ہے کہ جب زلزلہ کے رفع ہونیکی خبر آئی تھی اسوقت میں یہ غزل کہی تھی اور ان دنوں زرد رنگ پہنے ہوئے تھے ص۵۸۔ [3] مناقب ص۳۴۸

آخر وقت میں مولاناؒ پر پچاس دینار قرض تھے، فرمایا کہ جو کچھ ہو دیکر قرضخواہ سے معاف کرالیں۔ اس نے قبول نہ کیا اور قرض معاف کردیا۔ فرمایا الحمدللہ اس عقبہ سہناک سے بھی رہائی ہوئی۔[1]

آخری لمحات۔

انتقال سے کچھ قبل قاضی سراج الدین زیارت کو آئے ہوئے تھے، اسی اثنا میں چلپی حسام الدینؒ نے شربت کا پیالہ مولاناؒ کے سامنے پیش کیا کہ شاید ذرا سا پی لیں، مگر کچھ توجہ نہ کی، انھوں نے پیالہ قاضی صاحب کو دیا کہ شاید ان کے ہاتھ سے پی لیں، پھر بھی کچھ التفات نہ کیا، قاضی صاحب کے جانے کے بعد مولاناؒ صدرالدین آئے اور پیالہ چلپی حسام الدین کے ہاتھ سے لے کر پیش کیا اس وقت ذرا سا نوش فرمایا۔[2]

چلپی حسام الدینؒ نے پوچھا کہ آپ کی نماز جنازہ کون پڑھائے گا، فرمایا، مولانا صدرالدینؒ اولیٰ تر ہیں۔[3]

عین انتقال کے قریب فرمایا طشت پانی سے بھر کر لاؤ، پانی پیشانی پر ملتے تھے[4] اور فرماتے تھے کہ ؎

---

[1] مناقب ص۲۴۸

[2] ؍ ؍

[3] مناقب ص۲۵۰

[4] درحقیقت یہ بھی سنت نبوی کی پیروی تھی، آنحضرت صلعم کی نسبت بروایات صحیحہ منقول ہے کہ عین عالم نزاع میں آپ پانی کے پیالے میں بار بار ہاتھ ڈالتے اور پانی چہرہ پر ملتے تھے (سیرۃ النبیؐ)

گر مومنی و شیریں ہم مومنست مرگت   در کافری و تلخی ہم کافراست مردن

اسی حال میں قوال آگئے، اور انھوں نے یہ رباعی شروع کی،

دل از تو گمان بد برد، دور از تو   واں نیز ز ضعف خود برد، دور از تو

تلخی بدہاں بر دلِ صفراے   خود بر تو شکر حسد برد دور از تو

فرمایا کہ "میرے احباب ادھر کھینچتے ہیں اور مولانا شمس الدین ادھر بلا رہے ہیں

اجیبوا داعی اللہ وآمنوا   اللہ کی طرف بلانے والے کو مانو اور

بہ،   اس پر یقین لاؤ،

ناچار رجانا ہے"،[1]

اپنے مریدین و متعلقین کی تسکین خاطر کے لئے یہ فرمایا کہ

"اس دنیا میں میرے دو تعلق ہیں، ایک تم سے اور ایک اپنے جسم سے اور جب خدا کی عنایت سے اس جسم سے بھی مجرد ہو جاؤں گا اور عالم تجرید و توحید میں پہونچ جاؤں گا تو پھر وہ دوسرا تعلق بھی تمھارے ہی لئے ہو جائے گا"[2]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۰)

۵ حصہ اول مجلد دوم ص ۴۳۳ (معارف) (۱) خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم (ص ۵۲۶) (دلگداز)

[1] مناقب ص ۳۵۲،

[2] مناقب ص ۳۴۹،

انتقال کے قبل مولانا نے اپنے اصحاب کو جو وصیت فرمائی تھی، وہ حسب ذیل ہے،

"اوصیکم بتقوی اللّٰہ فی السر والعلانیۃ وبقلۃ الطعام وقلۃ المنام وقلۃ الکلام وھجران المعاصی والآثام ومواظبۃ الصیام ودوام القیام وترک الشہوات علی الدوام واحتمال الجفاء من جمیع الانام وترک مجالسۃ السفہاء والعوام ومصاحبۃ الصالحین والکرام وان خیر الناس من ینفع الناس وخیر الکلام ما قل ودل والحمد للّٰہ وحدہٗ،

(نفحات الانس مطبوعہ مطبع منشی نولکشور لکھنؤ، ص ۴۶۲)

(میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ سرًّا و علانیۃً خدا سے ڈرتے رہو کھانے، سونے اور گفتگو میں کمی کرو، گناہوں سے دور رہو، روزے برابر رکھو، قیام شب کی مداومت کرو، شہوتوں کو ہمیشہ ترک کرتے رہو، ہر طرح کے لوگوں کی جفاؤں کو برداشت کرو، نادانوں اور عامیوں کی ہمنشینی چھوڑ دو، نیکوں اور بزرگوں سے مصاحبت رکھو، بہترین شخص وہ ہے، جو لوگوں کو نفع پہونچائے، اور بہترین کلام وہ ہے جو قلیل و دل ہو، ؎

سرز ہوا تافتن از سروریست
ترکِ ہوا قوتِ پیغمبریست،

تمام تعریف و توصیف خدائے واحد ذوالجلال کے لئے ہے اور اس کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام ہو،

آخرالامر ۵ جمادی الآخر ۶۷۲ھ[۱] کو بوقت غروب آفتاب حقائق و معارف بیان فرماتے ہوئے[۲] انتقال فرمایا۔

پنجم ماه در جمادی آخر — بود نقلان آں شہ فاخر
سال ہفتاد و دو بدہ بعدد — شش صد از عہد ہجرت احمدؐ[۳]

پس انتقال کے وقت مولاناؒ کی عمر اڑسٹھ برس تین ماہ کی تھی۔[۴]

رات میں تجہیز و تکفین کا سامان درست کیا گیا، مولانا امتیاز الدین نے غسل دیا۔ جنازہ کو جب باہر لائے قیامت کا ازدحام برپا ہوا، ہر قوم و ملت کے لوگ ساتھ تھے اور سب روتے جاتے تھے، یہودی و عیسائی توریت و انجیل پڑھتے جاتے تھے۔ مسلمان ان کو ہٹاتے تو وہ باز نہیں آتے تھے، فساد کا اندیشہ ہوا، جب یہ خبر پروانہ کو پہونچی تو اس نے راہبوں اور قسیسوں سے پوچھا کہ تمہیں اس امر سے کیا تعلق

---

۱ ۱۶ ردسمبر ۱۲۷۳ء (براؤن ص ۱۸ حاشیہ)
۱۷ ردسمبر ۱۲۷۳ء (انسائیکلوپیڈیا برٹینکا)

"فہرست کتب خانہ بہار" (مشمولہ امپریل لائبریری کلکتہ) میں تاریخ وفات ۱۰ ر رجب ۱۷۱۲ھ دی ہے، یہ سلطان ولدؒ کی وفات کی تاریخ ہے، غلطی سے اسے مولاناؒ کی تاریخ وفات قرار دیا۔

مراۃ الخیال (مصنفہ شیر خاں لودی) میں ہے کہ وفات مولوی در شہور ستہ احدے وستین وستمائۃ (۶۶۱ھ) و بقولے در سنہ اثنا و سبعین و ستہ مأۃ در زمان ایغافان بن ہلاکو خان واقع شد" "نور اللہ مرقدہ" تاریخ وفات اوست (ورق ۲ ص) ۶۷۱ھ قطعی غلط ہے (سرگور اوسلی اور بعض دوسرے اشخاص نے بھی اس کی اقتدا کی ہے) ایک دوست کے پاس ایک نہایت ہی نادرالوجود کتاب "مشاہد الاصفیا" مصنفہ محمد ہاشم بن محمد قاسم ہروی ہے، اس میں یہ اہتمام کیا ہے کہ ہر سنہ کے تحت میں ان بزرگوں کے نام

انھوں نے کہا کہ ہم نے انبیائے سابقین کی حقیقت کو انھیں کے بیان سے سمجھا اور اولیائے اکمل کی روش کو انھیں کی روش سے جانا، اگر وہ مسلمانوں کے محمدؐ وقت تھے تو ہمارے موسٰئ وقت اور عیسائے زماں تھے، مسلمان جس درجہ ان کے مخلص و محب ہیں ہم اس سے زیادہ ہیں، غرض، وہ لوگ اسی طرح تابوت کے ساتھ رہے، ہجوم کی حالت یہ تھی کہ تابوت مبارک صبح سویرے مدرسہ سے روانہ ہوا تھا اور شام کے قریب قبرستان میں پہونچا، راستہ میں چھ مرتبہ بیرونی تابوت بدلا گیا اور لوگ لکڑیاں توڑ توڑ کر تبرک کے طور پر لے گئے۔[۱۰]

جنازہ جب نماز کے لئے رکھا گیا تو معروف نے شیخ صدر الدینؒ کے لئے آواز دی، اور حسب عادت "ملک المشائخ" کے لفظ سے خطاب کیا، مولانا اکمل الدین نے فرمایا کہ ادب

(بقیہ حاشیہ صــ ۲۵۳)

دیئے ہیں جن کا انتقال اس سنہ میں ہوا ہے، اس میں سنہ سبعین و ستہ مایۃ کے تحت میں مولانا کا اسم گرامی بھی درج ہے، "سبعین و ستہ مایۃ۔ بین العرفاء الکبار جامع العلوم والاسرار مولانا المعظم جلال الدین محمد البلخی ثم الرومی کان ولادتہ بلخ فی ستہ اربع و ستہ مایۃ و وفاتہ بقونیہ و بہا دفن ولہ مصنفات منظومۃ و منثورۃ وکلہا مشہورۃ۔" (مجھے اس کتاب پر بہت وثوق ہے مگر ۶۷۰ھ میں مولانا کے انتقال کی تاریخ غلط ہو گئی ہے)

عـ۹ "دربیان تقریر حقائق و معارف" سپہ سالار صـ ۵۹ عـ۱۰ سپہ سالار صـ ۶۰ اندرباب نامہ عـ۱۰ و ۹۶ برس (سرگزشت صـ ۱۱۲)

عـ۱۰ مناقب صـ ۲۴۲، "سپہ سالار" (صـ ۶۹) نے لکھا ہے کہ تابوت جب مختلف محلوں سے گزرتا تھا تو لوگ اسے بدلتے تھے، یہ نہیں لکھا کہ تابوت کتنے بار بدلا گیا۔

کو نگاہ رکھو، ملک المشائخ مولانا ہیں، شیخ صدر الدینؒ جب نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھے تو چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے، آخر قاضی سراج الدین نے نماز پڑھائی [شیخ صدر الدین سے لوگوں نے جب اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میں جب آگے بڑھا تو دیکھا کہ ملائکہ صف باندھے کھڑے ہیں اور نماز و زیارت میں مشغول ہیں، اس ہیبت سے میرے ہوش زائل ہو گئے[1]] آخر بوقتِ شام یہ آفتاب فقر و تصوف دیدہ ظاہر سے نہاں ہو گیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

چالیس روز تک زیارت کا سلسلہ جاری رہا ؎

ہمچناں ایں کشید تا چہل روز — ہیچ ساکن نشد ایں تف و سوز
بعد چہل روز سوئے خانہ شدند — ہمہ مشغول ایں فسانہ شدند
روز و شب بود گفت شاں ہمہ ایں — کہ شد آں شیخ زیر خاک دفین

(رباب نامہ)

مولاناؒ کے اصحاب اور شعرائے وقت نے مولانا کے مرثیے بہت کچھ کہے ہونگے مگر وہ محفوظ نہیں ہیں، قانعی کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی مولانا کا مرثیہ کہا تھا، لیکن ان کا کلیات عنقا صفت ہے، ہاتھ نہ آسکا کہ کچھ نقل کیا جاتا، سپہ سالارؒ نے صرف ملک الادبا بدر الدین یحیٰؒ کے مرثیے سے دو شعر نقل کئے ہیں وہ حاضر ہیں ؎

کو دیدہ کہ در غم تو نمناک نشد — یا جیب کہ در ماتم تو چاک نشد

---

[1] سپہ سالار ص۵۹–۶۰، مناقب ص۲۱۰ پر یہ روایت درج ہے کہ شیخ صدر الدینؒ جب نماز جنازہ پڑھانے کیلئے آگے بڑھے اور چیخ مار کر بیہوش ہو گئے، تو پھر بعد چندے نماز پڑھائی (تا ساعتے بعد ازاں نماز کرد) گر سپہ سالار کی روایت زیادہ مسلّم ہے۔

سوگند بردے تو کہ از پشت زمیں — بہتر ز توئی در شکم خاک نشد

یہ سالارؔ ہی نے لکھا ہے کہ ایک عزیز نے یہ دو شعر موزوں کیے تھے اور انھیں پڑھا کرتے تھے ؎

کاش آں روز کہ در پائی تو شد خار اجل — دست گیتی بزدے تیغ ہلاکم بر سر

تا دریں روز جہاں بے تو ندیدے چشمم — ایں منم بر سر خاک تو کہ خاکم بر سر

مرثیہ کا مقصود اصلی یہ ہوا کرتا ہے کہ اس ذریعے سے مرنے والے کی کچھ یادگار باقی رہے، مگر یہاں دیوان اور مثنوی کے ہوتے ہوئے کسی اور یادگار کی حاجت ہی کیا ہے۔

بہر حال شعرائے وقت نے مولانا کے مرثیے کہے ہوں یا نہ کہے ہوں وہ محفوظ ہوں یا نہ ہوں، مگر مولاناؒ خود اپنے انتقال کے متعلق "مرثیہ" نہیں بلکہ "تہنیت" لکھ گئے ہیں، جس سے بدرجۂ اتم یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عارف حقیقی کا "مرثیہ" کیسا ہوا کرتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ؎

بروز مرگ چو تابوت من رواں باشد — گماں مبر کہ مرا درد ایں جہاں باشد

برائے من مگری و مگو "دریغ دریغ" — بدام دیو درافتی دریغ آں باشد

جنازہ ام چو بہ بینی مگو "فراق فراق" — مرا وصال و ملاقاتِ آں زماں باشد

مرا بگور سپاری مگو "وداع وداع" — کہ گور پردۂ جمعیتِ جناں باشد

فرو شدن چو بدیدی بر آمدن بنگر — غروب شمس و قمر را چرا زیاں باشد

ترا غروب نماید و لے شروق بود — لحد چو حبس نماید، خلاص جاں باشد

کدام دانہ فرو شد در زمیں کہ نرست — چرا بدانۂ انسانت ایں گماں باشد

کدام دلو فرو شد کہ پر بروں نامد — ز چاہ یوسفؑ جاں را چرا فغاں باشد

ترا چناں کہ بنماید من بخاک شدم	بزیر پائے من ایں ہفت آسماں باشد
دہان چو بستی ازیں سوئے آنطرف میکشائے	کہ ہائے ہوی در جہ لامکاں باشد
جمال مفخر آفاق شمس تبریزی	کہ نور دیدہ و عقل و دل روان باشد[1]

(۱۱ - ص ۳۲۷)

مولانا اپنے والد کے مقبرے کے اندر ہی مدفون ہوئے۔ مولانا کے انتقال کے بعد علم الدین قیصر نے یہ ارادہ کیا کہ مولانا کی تربت مقدس پر ایک نادر عمارت بنائیں، مشورۃً سلطان ولد سے ذکر کیا، آپ نے فرمایا کہ تمہارے پاس کس قدر رقم ہے، عرض کیا تیس ہزار درم، فرمایا! یہ کیونکر سرانجام ہوگا، عرض کیا خداوند گار غیب سے دینگے، فرمایا اگر ایسا ہی ہے تو صدق تمام اور اخلاص تمام سے ارادہ کردو، علم الدین نے اسی شب میں سلطان کے بالا خانہ پر جاکر اسقدر مناجات آمیز و عشق انگیز اشعار پڑھے کہ پروانہ اور کرجی خاتون بے حد خوش ہوئے، صبح کو علم الدین کو بلا کر بہت تعریف کی اور اسی ہزار درم عطا کئے اور محاصل قیصریہ سے پچاس ہزار درم مقرر کئے کہ تربت مبارک کی عمارت تیار کریں۔ غرض اس طرح علم الدین نے عمارت کو انجام کو پہونچایا اور اس کے

---

[1] سلطان ولد نے بھی اسی وزن و قافیہ میں تیرہ شعروں کی ایک غزل کہی ہے، پانچ شعر اسکے بھی نقل کئے جاتے ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سلطان ولد نے ہر امر میں مولانا کے اتباع کو کس حد تک پہونچ دیا تھا ؎

برو ز مرگ کہ جاں از تنم جہاں باشد	ورائے ملک جہانم دو صد جہاں باشد
بہر جہاں کہ روی شادماں در دگوئی	زہے جہاں کہ در و عیش جاوداں باشد

بعد مولاناؒ کے اصحاب کو بہت کچھ شکرانہ دیا۔ چھ ہزار درم سلطان ولدؒ کو دیئے اور اسی قدر چلپی حسام الدینؒ کی خدمت میں پیش کئے۔

مناقب العارفین صفحہ ۵۰۳ میں ایک روایت کے ضمن میں یہ فقرہ آیا ہے کہ "بدر الدین تبریزی کہ معمار معمورہ تربت مبارک بود" اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت بدر الدین تبریزی کے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔]

بعد میں جس قدر زمانہ گزرتا گیا اس مقبرے کی عمارت اور اس کی شان اعلےٰ وارفع ہوتی گئی۔

مولاناؒ نے ایک مرتبہ یہ فرمایا تھا کہ "میرے دوستو میری تربت کو بلند بنانا تاکہ دور سے دکھائی دے، جو لوگ میری تربت کو دور سے دیکھ کر اعتقاد لائیں گے اللہ تعالےٰ ان پر رحمت کرے گا اور ان کے مقاصد دینی و دنیاوی بر آئینگے" چنانچہ مولٰنا کی تربت مقدس تمام ممالک عثمانیہ میں اس وقت تک سب سے زیادہ مرجع انام ہے، اسی طرح ایک روز فرمایا کہ "میری تربت کو سات مرتبہ بنائیں گے آخری مرتبہ ایک متمول ترک اس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۷)

جہاں ورائے جہانست ایں جہان عجیب | ورائے حور و جنانست ایں جاں باشد
برون ز ساحل تن چوں رسی دریں دریا | ز جوش جان تو ہر موج درافشاں باشد
دگر مپرس من درون گور روم ! | دلم چو مرغ پراں سوئے آشیاں باشد

عـــہ علم الدین بہت بڑے پایہ کے امراء میں سے تھے، ہلاکو خاں نے جب ۶۵۸ھ میں حلب میں قتل عام کیا تو جن چند اکابر کے مکانوں میں پناہ لینے والوں کیلئے امن کا اعلان کیا ان میں ایک علم الدین قیصر الموصلی بھی تھے۔ حلب کی تباہی کے بعد وہاں کے اعاظم و اکابر جو بچ رہے تھے ان میں سے اکثر روم میں چلے گئے تھے، انھیں میں علم الدین قیصر بھی تھے (ابوالفدا جلد سوم صفحہ ۲۰۱)
علہ مناقب صفحہ ۲۴۳

کی تعمیر کرے گا اور میری تربت کے گرد ایک بڑا شہر آباد کرے گا اور تربت شہر کے وسط میں ہوگی اور اس زمانہ میں مثنوی شیخ کا کام دے گی۔[۱]

اس پیشین گوئی کا لفظاً لفظاً ثابت کرنا تو دشوار ہے مگر "انسائیکلوپیڈیا برٹینکا" میں قونیہ کی تعمیر و تخریب کا جو حال دیا ہے اس سے بالاجمال اس کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کی عبارت کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"شہر کے جنوب جانب عمارتوں کا ایک وسیع سلسلہ موجود ہے جو فرقہ مولویہ کا خاص مستقر ہے۔ ....

سلجوقی سلطنت کے شکست ہونے اور عثمانی سلطنت کے قائم ہونے پر قونیہ پر زوال آگیا، اس کی آبادی گھٹ گئی اور قدیم شاندار عمارتیں تباہ ہوتی گئیں۔ حصار شہر اور محل انیسویں صدی کے آغاز تک اچھی حالت میں تھے، مگر تعمیر کی ضرورت سے ان کا ملبہ کام آتا گیا، تاآنکہ ۱۸۸۲ء میں دیوار کا ایک مختصر حصہ باقی رہ گیا اور محل بالکل تباہ ہوگیا، اس زمانہ میں اور اس کے کچھ زمانہ بعد تک قونیہ کا ایک بڑا حصہ مردوں کے شہر کے مانند تھا مگر ۱۸۹۵ء میں اناطولیہ ریلوے کے بننے سے اس کی خوش حالی پھر قائم ہوگئی، فرید پاشا نے جو اس زمانہ میں اس ولایت کے والی تھے، آب نوشیدنی کا وافر سامان کیا جو ترک عمارتیں اور مسجدیں بالکل تباہ نہیں ہوئی تھیں، ان کی مرمت کی ۱۹۰۴ء میں اناطولیہ ریلوے کے کچھ حصص کے بن جانے کے بعد شہر کی حالت بہتر ہوگئی[۲] "اور اب

---

[۱] مناقب صـ۲۴۵

[۲] جلد ۱۴ صـ۲۷۲

اس ریلوے کا سلسلہ حلب ودمشق ہوتا ہوا مدینہ منورہ تک پہونچ گیا ہے اور قونیہ جنکشن بھی ہوگیا ہے، نقشہ کے دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ریلوے شہر کے جنوبی جانب سے آگے بڑھی ہے اور اس طرح جدید آبادی کی وجہ سے مولانا کی تربت مقدس شہر کے ایک جانب میں ہونے کے بجائے آبادی کے وسط میں آجائے گی اور یہ پیشین گوئی پوری ہوجائیگی، کہ تربت کے گرد ایک بڑا شہر آباد ہوگا اور تربت شہر کے وسط میں ہوگی۔

یورپ کی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء ۔ ۱۹۱۸ء) کے بعد جب ترکوں نے مصطفےٰ کمال پاشا کی قیادت میں بمقام لوزان کامیاب صلح کی اور خلافت کو اسلام کی ایک فرسودہ نشانی سمجھ کر اپنے ملک سے خارج کردیا اور قابو یافتہ فریق نے اپنے استبداد کو یورپ کی محبوبۂ عام "جمہوریت" کے لباس میں نمایاں کرکے دنیا کو اپنی شائستگی کا یقین دلانا چاہا اس وقت سے "اصلاح" کے نام سے تمدن اسلامی کو ظاہراً و باطناً نیاً منیاً کرنے کی جو سرگرم کوششیں شروع ہوگئیں، انھیں کوششوں میں ایک کوشش خانقاہوں کے مسدود کرنے کی بھی تھی، یورپ اور بالخصوص یورپ کے پروٹسٹنٹ ممالک میں اب خانقاہوں کا وجود باقی نہیں رہا ہے اس کا اقتدا بھی ضروری تھا، چنانچہ ایک حکم عام سے تمام خانقاہوں کی جائدادیں ضبط کر کے انھیں ویران وتباہ کردیا گیا، اس تباہی عام سے مولانا کا مزار مقدس بھی محفوظ نہ رہ سکا، اس مزار کے متعلق ایک مضمون البشیر[۱] میں بحوالہ ہمدرد طبع ہوا ہے، اس کے ضروری اقتباسات یہاں درج کئے جاتے ہیں جن سے مزار کی گزشتہ وموجودہ حالت کا کچھ اندازہ ہوسکے گا۔

---

[۱] مؤرخہ ۲۲ مارچ ۱۹۲۶ء

"قونیہ میں کئی مزار نہایت اہم خیال کئے جاتے ہیں .... ان میں مولانا رُوم کا مزار سب سے زیادہ متبرک خیال کیا جاتا تھا، لاکھوں کی جائداد اس کے متعلق تھی، اس کی نذر و نیاز کی آمدنی بھی سالانہ کئی لاکھ پونڈ تھی، پانچ ہزار درویش اس آمدنی پر گزارہ کرتے تھے اور متولی و سجادہ نشین تو ترکی کے بڑے رئیسوں میں شمار کئے جاتے تھے، ان کا جلوس جب نکلتا تھا تو اچھا خاصہ بادشاہ کا سا جلوس معلوم ہوتا تھا، ان کا اثر بھی ایک گورنر کے اقتدار سے کم نہ تھا، یہانتک کہ خانقاہ کے متعلق ان کے کچہریاں بھی موجود تھیں جہاں ان کے نائب اپنے طریقے پر مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔ اگر اس فیصلہ کے بعد بھی کوئی عدالت سرکاری میں جانے کا ارادہ کرتا تھا تو اس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا جاتا تھا۔

اب تمام املاک متعلقہ پر حکومت نے قبضہ کر لیا ہے .... متولیوں کے تھوڑے تھوڑے وظائف مقرر کر دیئے گئے ہیں، لیکن ان میں سے جو لوگ سابقہ حالت کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے کوشاں ہوئے اور اس بنا پر موجودہ حکومت کے خلاف سازش میں شریک ہوئے، ان کے وظیفے ضبط کر لئے گئے۔ اب صرف تھوڑے ہی باقی رہ گئے ہیں جن کو وظیفہ ملتا ہے۔

مزار کی متعلقہ عمارات میں کئی عجائب خانے اور ایک مدرسہ قائم ہوا ہے، ایک عجائب خانہ میں صرف وہ چیزیں رکھی گئی ہیں جن کا تعلق حضرت مولاناؒ روم مرحوم کی یادگار سے ہے، مثلاً حضرت کی استعمال کردہ بعض اشیا ہیں جن سے مولاناؒ علیہ الرحمۃ کی طرز زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے، آپ کے پانی پینے کے مٹی کے پیالے کا ایک ٹکڑا ہے جو اب تک محفوظ چلا آتا ہے۔ ایک آپ کا کرتہ ہے اور اسی قسم کی بعض دیگر اشیا ہیں جو اس

بزرگ ہستی کی یادگار ہیں۔ دوسرے عجائب خانہ میں وہ اشیاء متبرکہ ہیں جن کا تعلق صاحبِ مزار کی ذات سے نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی طرح وہ زمانہ گزشتہ میں خانقاہ کی تحویل میں آگئی ہیں، مثلاً صحابۂ کرامؓ کے بعض قرآن کے پارے ہیں، بعض رسول کریم صلی اللہ وسلم کی یادگار ہیں۔ یہ قیمتی تحفے ایک عجائب خانے میں جمع کردیے گئے ہیں، ایک کتب خانہ بھی قائم کردیا گیا ہے۔ جس میں ایک حصہ حضرت مولانائے روم کے متعلق کتابوں پر مشتمل ہے، اس وقت سات "سو چھیاسٹھ" کتابیں موجود ہیں جن میں دنیا کی تمام زبانوں کی کتابیں شامل ہیں۔

ایک مدرسہ قائم ہوا ہے جس میں علوم دینی و دنیوی دونوں کی تعلیم ہوتی ہے۔ حدیث کا اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام ہوتا ہے اور تصوف کی تعلیم کا بھی انتظام ہے لیکن اس تصوف میں اور قبل از جنگ والے تصوف میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔"

[تصوف میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے، معلوم نہیں حدیث میں بھی فرق ہوا ہے یا نہیں؟]

یہ قوت مادی کا مظاہرہ ہے، اب قوت باطنی کا مکاشفہ بھی ملاحظہ ہو، سلطان ولدؒ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ عید کے دن میں اپنے والدؒ کے ساتھ عید گاہ کو جارہا تھا، جس کوچہ و محلہ سے گزر ہوتا تھا لوگ جوق جوق آکر سلام کرتے، سوار جو راستہ میں ملتے سواری سے اتر پڑتے تھے، والدؒ کی اس عظمت کو دیکھ کر میں حیران ہو گیا، والدؒ کا دامن پکڑے ہوئے چل رہا تھا اور دل میں کہتا جاتا کہ خدایا یہ کیسے بزرگ شخص ہیں اور ان کی قوت و قدرت اس قدر ہے، والدؒ نے پوچھا کہ بہاء الدین یہ حالت تمھیں اچھی معلوم ہوتی ہے؟ عرض کیا کہ بہت اچھی معلوم ہوتی ہے فرمایا کہ بتو بخشیدم، از تو میراث بفرزندانت خواہد رسیدن و تا روز قیامت مسجود

عالمیان خواہند بودن" پھر فرمایا کہ

خیال شاہ خوش خوبم تبسم کرد، برادیم　　　چنیں شد نسل بر نسلم چنیں فرزند فرزندم

افلاکیؔ اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ "الحمد للہ عالمیان بندہ مرید ایشانند"[1]

افلاکیؔ کے ان الفاظ کو چھ سو برس گزر گئے ہیں اور اب بھی یہی کیفیت ہے، حکومت اسباب واملاک دنیا دی کو ضبط کر سکتی ہے، دلوں پر قبضہ نہیں کر سکتی، اس کے ساتھ مولاناؔ کی اس پیشین گوئی کو ملا لیجئے کہ "اس زمانہ میں مثنوی شیخ کا کام دے گی" تو صاف عیاں ہو جاتا ہے کہ

از پس صد سال آنچہ آید برو　　　پیر می بیند معین مو بمو

---

[1] مناقب ص ۲۸۷

مولانا کی جانشینی

مولاناؒ کے بعد آپ کے اولین جانشین حضرت حسام الدینؒ چلپی ہوئے، ان کے بعد سلطان ولدؒ نے اس سجادہ کو زینت بخشیؔ[1]، اور پھر اس کے بعد سے اس وقت تک اسی خاندان کے افراد فرقہ مولویہ کے شیوخ ہوتے رہے، پس خاص جانشینی کے مسئلے میں صرف چلپی حسام الدینؒ کا نام لینا کافی ہے، آگے سلسلہ خاندانی رہا، حضرت حسام الدینؒ کے حالات اس سے قبل ضروری تفصیل کے ساتھ مذکور ہو چکے ہیں یہاں صرف جانشینی کے واقعہ کا ذکر کر دینا ہی کافی ہے اس واقعہ کو سلطان ولدؒ نے پوری تفصیل کے ساتھ نظم فرمایا ہے. جس کا ماحصل یہ ہے کہ

---

[1] دہیفلڈؒ نے لکھا ہے کہ مولاناؒ کے انتقال کے بعد سلطان بہاء الدینؒ ولد آپ کے خلیفہ ہوئے (دیباچہ ۴) ظاہر ہے کہ دہیفلڈؒ سے یہاں قدرے تسامح ہوا، سلطان بہاء الدین ولدؒ مولانا کے خلیفہ ہوئے مگر خلیفہ بلا فصل نہیں ہوئے

"مولاناؒ کے انتقال کے بعد[1] چلپی حسام الدینؒ نے مجھ سے فرمایا کہ اپنے والدؒ کی جگہ کے آپ ہی سزاوار ہیں اور اب آپ ہی ہم لوگوں کے پیشوا و امام ہیں، میں نے جواب دیا کہ نہیں، میں والدؒ کو زندہ سمجھتا ہوں، والدؒ کی زندگی میں آپ ہی فرائض خلافت انجام دیتے رہتے، اب بھی اسی طرح اس کام کو انجام دیجئے، چلپی حسام الدین نے ہرچند عذر کیا مگر میں بھی اصرار پہ قائم رہا، آخرازراہ لطف وکرم میری التجا کو قبول کیا اور ہم سب نے ان کے زیر سایہ بارہ[12] سال نہایت امن سے گزارے۔"

سپہ سالارؒ نے یہ لکھا ہے کہ "مولاناؒ کے انتقال کے بعد اصحاب میں اختلاف واقع ہوا بعضوں کی رائے تھی کہ چلپی حسام الدینؒ بدستور خلیفہ رہیں، اور بعض یہ کہتے تھے کہ مثل مشہور ہے کہ "الشبل فی المخبر مثل الاسد" (بچۂ شیر خصلت میں شیر ہی کے مانند ہوتا ہے) حضرت مولانا بہاء الدین ولد مولانا کے وارث علمی و صلبی اور کاشف امور حقائق و شارح معارف و دقائق ہیں، آپ خود مولاناؒ کے زمانہ میں یہ اہلیت رکھتے تھے کہ پیشوائے اولیاء کبار ہوتے مگر پاس ادب مانع تھا، اب کوئی وجہ نہیں رہی کہ آپ ہم سب کے امام نہ ہوں، آخر رائے یہ قرار پائی کہ اس کا فیصلہ خود انھیں دونوں بزرگوں پر چھوڑ دینا چاہئے[2]" بعد ازاں وہی صورت پیش آئی جو سلطان ولدؒ نے تحریر فرمائی ہے۔

چلپی حسام الدین کے خلیفہ ہو جانے کے بعد کراخاتون[3]ؒ نے سلطان ولدؒ سے اعتراضاً

---

[1] مناقب العارفین ذکر سلطان ولدؒ میں ہے کہ سات روز بعد۔

[2] سپہ سالار ص۵۔

[3] "کراخاتون" حضرت سلطان ولدؒ کی زوجہ محترمہ   کا لقب تھا، مناقب العارفین کے

کہاکہ "آپ خود اپنے والد کی جگہ بیٹھتے اور ان کی خلافت کا کام انجام دیتے مگر آپ اپنی جگہ چلپی حسام الدین کو دے کر خود فارغ ہو گئے ہیں" سلطان ولدؒ نے فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ چلپی کی آنکھ مثل زنبور خانہ کے ہے کہ ارواح غیبی وہاں آتی جاتی رہتی ہیں اور آپ سبز پوشان غیبی کی ہمراہی سے کسی وقت خالی نہیں رہتے، مجھے شرم آتی ہے کہ ان سے بالاتر بیٹھوں اور ان کی جگہ کی خواہش کروں، اندیشہ یہ ہے کہ اگر ایسا کروں تو یہ خلافت میرے لئے وبال ہو جائے، والدؒ کے آخر دم تک وہ خلیفہ رہے، بس میں بھی والدؒ ہی کے اشارت کی تعمیل کرتا ہوں۔"

چلپی حسام الدین نے یہ قاعدہ قرار دیا تھا کہ نماز جمعہ کے بعد مجلسِ سماع منعقد کرتے تھے اور تلاوت کلام مجید کے بعد مثنوی خوانی ہوتی تھی۔

چلپی حسام الدین کے دور خلافت کا واقعہ ہے کہ ایک بار قونیہ میں پانی کا سخت قحط پڑا، تمام علماء و شیوخ نے شہر سے باہر نکل کر نماز استسقا پڑھی مگر پانی نہ برسا،

(بقیہ حاشیہ ص۲۶۶)

"بزرگے از محرمات حرم معنی امی کرا کا رضی اللہ عنہا" رڈہاؤس نے اس روایت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "مولانا جلال الدینؒ کے انتقال کے بعد آپ کی بیوہ کرا خاتون نے اپنے سوتیلے بیٹے سلطان ولدؒ بہاء الدین سے کہا" ص۱۱ " "آپ کی بیوہ" اور "سوتیلے بیٹے" کے الفاظ رڈہاؤس نے اپنی طرف سے بڑھا کر اصل مفہوم کو بدل دیا ہے۔

آخر سب لوگ حضرت حسام الدینؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے فرمایا کہ تم لوگ اپنا کام کرو میں اپنا کام کرتا ہوں، آپ اپنے اصحاب کو لے کر مولاناؒ کی تربت پر آئے اور یہاں نماز ادا کی اور دعا مانگی، پانی اس قدر برسا کہ لوگوں نے پھر آپ سے استدعا کی کہ پانی رکنے کی دعا کیجئے۔

چلپی حسام الدینؒ کا انتقال۔

چلپی حسام الدینؒ کے انتقال کا واقعہ اس طرح منقول ہے کہ ایک روز اپنے اصحاب عظام کے ساتھ اپنے باغ میں تشریف فرما تھے ایک درویش نے آکر یہ خبر نامبارک سنائی کہ تربت مبارک کے قبہ کا پایچہ گر پڑا اور قبہ میں درز پڑ گئی، چلپی حسام الدینؒ نے ایک آہ کی اور بے خود ہو گئے، اپنے ہاتھ کو کئی مرتبہ زانو پر مارا اور رونے لگے دیگر اصحاب بھی رونے لگے۔ کچھ دیر بعد فرمایا کہ "شیخؒ کی تاریخ رحلت کو دیکھو" دیکھنے سے معلوم ہوا کہ پورے دس سال ہو چکے ہیں اور اب گیارہواں شروع ہوا ہے، چلپی کے چہرے پر تغیر ظاہر ہوا، فرمایا کہ "بس گھر لے چلو کہ میرا پیمانۂ عمر بھی اب لبریز ہوا چاہتا ہے اور سفر آخرت نزدیک ہے، جب اشارت بشارت حاصل ہوئی تو خوش خوش روانہ ہونا چاہیے" آپ کو مکان لائے، چند روز بیمار رہ کر چہارشنبہ ۲۲ شعبان ۶۸۳ھ کو انتقال فرمایا، کہتے ہیں کہ جس روز قبہ کا پلپچہ کا کام اتمام کو پہنچا اسی روز آپ نے انتقال کیا۔

یہ روایت مناقب العارفین کی ہے مگر خود مناقب العارفین ہی میں سلطان ولدؒ کی نسبت ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ "ہمچناں یازدہ سال تمام حضرت چلپی حسام الدین را قدس اللہ ارواحہم قائم مقام والدؒ خود دیدہ" مولاناؒ نے ۵ جمادی الآخر ۶۷۲ھ کو انتقال فرمایا ہے، پس جمادی الآخر ۶۸۳ھ میں چلپی حسام الدینؒ کی خلافت کو گیارہ برس پورے ہوگئے نہ کہ شعبان میں، اصل یہ ہے کہ سنین کے متعلق مناقب العارفین میں جا بجا غلطیاں ہوگئی ہیں، اس بحث میں ایک نسخہ میں اصل متن میں مدت خلافت "مقدار شش سال" درج ہے اور حاشیہ پر "دہ سال" لکھا ہے، سپہ سالارؒ نے صاف لکھا ہے کہ "دوازدہ سال تمام اورا قائم مقام پدر خویش دانست[1]" اور تاریخ وفات "در شہور سنۃ اربع وثمانین وستمایۃ (۶۸۴ھ) میں قرار دی ہے اور آخری قول فیصل سلطان ولدؒ کا ہے۔

بعد دہ سال و دو زنا گاہ او گشت رنجور و شد بحضرت ہو

جس سے قطعاً یہ ثابت ہے کہ حضرت حسام الدینؒ نے مولاناؒ کے بعد بارہ برس فرائض خلافت انجام دیئے اور ۶۸۴ھ میں (جیسا کہ سپہ سالارؒ نے لکھا ہے) انتقال فرمایا۔

---

[1] رڈہاوس نے لکھا ہے کہ حسام الدینؒ نے ۱۲۸۴ء میں اپنے پیر کے انتقال کے ٹھیک دس برس بعد انتقال فرمایا (دیباچہ صفحہ ۱۲) رڈہاوس نے افلاکیؒ کے قول "دہ سال" سے حساب کرکے ۱۲۸۴ء (یعنی ۶۸۳ھ) کو سال وفات قرار دیا ہے مگر اقوال مذکورہ بالا سے ثابت ہے کہ یہ دونوں مفروضات (یعنی دس سال کی مدت خلافت اور ۶۸۳ھ میں انتقال) غلط ہے۔

سلطان ولدؒ کی خلافت۔

چلپی حسام الدین کے انتقال کے بعد لوگوں نے سلطان ولدؒ سے عرض کیا کہ اس وقت آپ نے ایک عذر پیدا کر لیا تھا، اب وہ عذر بھی باقی نہیں رہا، پس سجادہ خلافت پر رونق افروز ہو جئے، آخر آپ نے قبول فرمایا اور ۷۱۲ھ تک اس خدمت کو انجام دیا۔ آپ کے جانشین آپ کے فرزند چلپی عارف ہوئے، اور آئندہ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔

آل اولاد

گوہر خاتونؒ سے مولاناؒ کے دو فرزند بہاء الدین ولدؒ اور علاء الدین محمدؒ تھے اور کرا خاتونؒ[1] سے ایک فرزند مظفر الدینؒ امیر عالم تھے اور ایک دختر ملکہ خاتونؒ تھیں۔ اس امر کے قطعی تعین میں کسی قدر قیل و قال کی گنجائش نکل آئی ہے کہ مولاناؒ کے خلف اکبر حضرت بہاء الدینؒ تھے یا علاء الدینؒ، سپہ سالارؒ نے ایک موقع پر حضرت بہاء الدین ولدؒ کے متعلق

---

[1] گوہر خاتونؒ کا سنہ انتقال معلوم نہیں ہوا مگر مولانا کے ورود قونیہ کے بعد ان کا ذکر مطلق نہیں ہوا ہے، حالانکہ ان کی والدہ کرا خاتون بزرگؒ کا ذکر متعدد بار آیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انتقال عقد کے تھوڑے زمانہ بعد ہو گیا تھا، مولانا کی دوسری زوجہ کرا خاتونؒ کے متعلق مناقب العارفین (ذکر چلبی حسام الدینؒ) میں ہے کہ چلپی حسام الدین کے بعد ہی کرا خاتون نے بھی انتقال فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کرا خاتونؒ کا انتقال ۶۸۳ھ کے بعد ہوا ہے۔

لکھا ہے کہ "فرزند مہین خداوندگار بود[عہ۱]" اور دوسری جگہ علاء الدین کے متعلق لکھا ہے کہ "فرزند متوسط مولاناؒ خداوندگار بود[عہ۲]" اس کے سوا اور بھی جابجا حضرت بہاء الدینؒ کو خلف اکبر لکھا ہے، صرف ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ "مولاناؒ فرمود کہ بہاء الدین ہفت سالہ بود و برادرش علاء الدینؒ ہشت سالہ .... [عہ۳]" لیکن فصل پنجم میں جہاں تخصیص کے ساتھ شجرہ نسب بیان کیا ہے وہاں بالصراحت یہ لکھا ہے کہ "ہمچنان حضرت مولانا جلال الدین قدس اللہ سرہٗ را سہ فرزند و یک دختر بود و فرزند مہین را نام بہاء الدینؒ بود، دوم را نام علاء الدین محمدؒ بود .... [عہ۴]" سخت حیرت ہے کہ رڈہاؤس نے اس قدر صاف و صریح بیان پر اعتماد نہ کیا اور ایک ضمنی روایت پر بھروسہ کرکے قطعاً یہ قرار دیدیا ہے کہ علاء الدین خلف اکبر تھے اور جب ایک مرتبہ رڈہاؤس نے لکھ دیا تو اس کے بعد سے تمام محققین یورپ بلا استثنا یہی لکھتے آرہے ہیں کہ علاء الدین خلف اکبر تھے۔ مگر سپہ سالار اور افلاکیؒ کے قطعی بیانات کے مقابلہ میں یہ رائے ہرگز قابل قبول نہیں ہوسکتی[عہ۵] شواہد و قرائن بھی اس کے خلاف معلوم ہوتے ہیں چنانچہ افلاکیؒ ہی کی ایک روایت ہے کہ

عہ۱ ص۱۳ عہ۲ ص۹۶

عہ۳ مناقب ص۱۰۹ عہ۴ ص۱۲۴ یہاں رڈہاؤس نے ایک غلطی اور کی ہے کہ بہاء الدین ولدؒ کا نام محمد لکھا ہے حالانکہ آپ کا نام احمد تھا، محمد علاء الدین کا نام تھا۔

عہ۵ افلاکیؒ کی جس روایت مذکورہ بالا میں حضرت بہاء الدینؒ کی عمر سات سال اور علاء الدین کی عمر آٹھ سال ظاہر کی گئی ہے وہ ان دونوں بھائیوں کے ختنہ سے تعلق رکھتی ہے، اسمیں بجائے خود یہ امر قابل لحاظ ہے کہ سات سال کی عمر تک ختنہ ہو جانے کا رواج عام و قدیم ہے، مولاناؒ کے ایسے پابند شرع و سنت شخص نے کیوں علاء الدین کے ختنہ میں غیر ضروری تعویق روا رکھی؟ قرینہ یہ چاہتا ہے کہ یہاں ہشت کے بجائے شش ہوگا

"ایک روز سلطان ولدؒ کے چند دینار کم ہو گئے تھے وہ دینار ان کے بھائی علاء الدین کی کتاب میں ملے، سلطان ولدؒ نے کچھ سخت و سست کہا، مولانا نے فرمایا کہ بہاء الدین علیٰ حرف جر ہے اگر جسر (کشش) نہ کرے تو کیا کرے، دونوں بھائیوں میں صفائی ہو گئی"[1]

اس روایت کے الفاظ کا اقتضا یہی ہے کہ علاء الدین چھوٹے تھے۔

بہر حال مولانا کے خلف اکبر و اصغر سے قطع نظر کر کے مولاناؒ کی زندگی میں اور زندگی کے بعد بھی آپ کے "خلف رشید" سلطان ولدؒ ہی تھے علاء الدین کا ذکر جو کچھ آ گیا ہے۔ وہ صرف شمس الدینؒ کی مخالفت کے سلسلہ میں آیا ہے [چونکہ سلطان ولدؒ کا سلسلہ آگے چلتا رہا ہے اس لئے تسلسل قائم رکھنے کے خیال سے ترتیب بدل دی گئی اور سلطان ولدؒ کا ذکر موخر کر دیا گیا ہے]

علاء الدین کے متعلق افلاکیؒ کے الفاظ یہ ہیں کہ "در قصد مولانا شمس الدینؒ تبریزی روح اللہ روحہ مبادرت نمودہ مبادرت کرد تا ہر تنگ مریدان مرتد گشت و گویند او را ایشاں اغوا کردہ بودند دبراں داشتہ بودند"

مولاناؒ اسی وجہ سے ان سے بیزار ہو گئے تھے ان کا خیال بھی اپنے دل سے نکال دیا تھا۔ اور اپنی نظر عنایت صرف سلطان ولدؒ پہ محدود کر دی تھی۔ جب علاء الدین نے انتقال کیا تو مولانا ان کے جنازے پر بھی نہیں گئے۔

علاء الدین کے سنہ انتقال کے نسبت کوئی قطعی روایت نہیں ملتی، یورپی تذکرہ نویسوں نے

---

[1] مناقب ص ۲۶۹

تو بلا استثنا یہ لکھ دیا ہے کہ علاء الدین اس ہنگامے میں مارے گئے، جس میں حضرت شمس الدین گرفتار یا قتل ہوئے[1]۔ سپہ سالار نے اس ہنگامہ کا مطلق ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ مگر افلاکی نے کچھ لکھا ہے اسی کے ضمن میں علاء الدین کے نسبت یہ لکھا ہے کہ "علاء الدین را کہ بداغ انہ لیس من اہلک، انہ عمل غیر صالح موسوم بود، تپ محرق علتے عجب پیدا گشتہ دراں ایام وفات یافتہ و حضرت از غایت انفعال بجانب باغ روانہ گشتہ بجنازۂ او حاضر نشدہ بود"

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت شمس الدین کی غیبت ثانیہ کے تھوڑے ہی زمانہ بعد علاء الدین نے انتقال کیا ہے، خزینۃ الاصفیاء میں لکھا ہے کہ علاء الدین نے ۶۶۰ھ میں بعلت جذام انتقال کیا" دوسرے تذکرے جن میں یہ ذکر آیا ہے ان میں بھی یہی تاریخ ہے۔ مگر افلاکی ہی کی ایک دوسری روایت حسب ذیل اور بھی ہے کہ

چلپی حسام الدین کی عادت تھی کہ مولاناؒ کی زندگی میں روزانہ التزام کے ساتھ سلطان العلماء بہاء الدین ولدؒ کے مزار کی زیارت کے لئے جاتے اور "شیخ صلاح الدین کی زیارت کے لئے بھی جاتے[2]" ایک روز حسب عادت زیارت کو گئے تھے، اوراد وغیرہ سے فارغ ہو کر جب نکلے تو پھر تربت مبارک کی طرف پلٹے اور نعرہ مار کر کہا کہ "نے نے نشاید و مصلحت نیست بردن او" ایک لحظہ بعد مسکرائے اور روانہ ہو گئے، استفسار پر فرمایا کہ "میں نے دیکھا کہ فرشتگانِ عذاب عالم غیب سے آئے اور علاء الدین کو زنجیروں میں باندھ کر لے چلے اور وہ فریاد کرتا تھا، میرا دل جلا اور میں نے شفاعت کی اور قبول ہوئی۔"

یہاں غور طلب یہ ہے کہ زیارت شیخ صلاح الدین سے کیا غرض ہے، سیاق و سباق کلام سے

؎۱ بڑے فرزند علاء الدین اس ہنگامے میں مارے گئے جس میں شمس الدینؒ تبریزی قتل ہوئے (روداد ص ۱۳۴)

؎۲ تقریباً یہی الفاظ تمام دوسرے تذکرہ نویسوں کے بھی ہیں ؎۳ زیارت شیخ صلاح الدین میرفت۔

یہ معلوم ہوتا ہے کہ صلاح الدینؒ کے انتقال کے بعد حضرت حسام الدینؒ آپ کی زیارت مزار کے لئے جایا کرتے تھے، اگر مفہوم یہی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین کا انتقال ۶۵۷ھ کے بعد کسی سال میں ہوا اور انتقال کے بعد یہ واقعہ پیش آیا۔

بہر نوع مولاناؒ کے سوانح کے سلسلہ میں علاء الدین کا ذکر جو کچھ آیا ہے وہ صرف اس اعتبار سے آیا ہے کہ انھوں نے حضرت شمس الدینؒ کی مخالفت میں شرکت کی اور مولاناؒ کے نزدیک مردود و مقہور قرار پائے۔

علاء الدین کے اخلاف۔

علاء الدین کی اولاد کا کوئی ذکر کہیں نہیں ہے، مگر چلپی عارف کے تذکرے میں ایک روایت یہ منقول ہے کہ ایک روز چلپی عارفؒ اور چلپی علاء الدین آقشہری میں مناظرہ ہوا، علاء الدین نے کہا کہ میں خداوندگار (مولاناؒ) کی نسل سے ہوں، مجھے کیوں آپ بیگانہ سمجھتے اور میری طرف سے بے التفاتی برتتے ہیں، باپ کے گناہ کی وجہ سے لڑکے کی رعایت نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، امیر عارفؒ نے جواب دیا کہ مولاناؒ سے آپ کو کوئی تعلق نہیں اور اس خاندان میں آپ کا حکم عضو مردہ کا ہے، آپ کی شاخ اس درخت سے کٹ گئی ہے اور آپ اس سے علیٰحدہ ہو گئے ہیں اور آپ ہی لوگوں کی شان میں آیت انہ لیس من اہلک انہ عمل غیر صالح نازل ہوئی ہے[1]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین کے سلسلہ النسب میں بھی کچھ لوگ تھے مگر مولاناؒ نے ان سے تعلقات قائم نہیں رکھے تھے۔

---

[1] مناقب (ذکر چلپی)

مناقب العارفین کی ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولاناؒ نے علاء الدین کے لئے دعائے مغفرت کی تھی۔ اور وہ دعا مقبول ہوئی۔ مولانا فخر الدین معلم کی روایت ہے کہ ایک روز مولاناؒ اپنے والدؒ کی قبر کی زیارت کو تشریف لائے تھے، نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر مجھ سے قلم دوات طلب کی اور اپنے فرزند علاء الدین کی قبر پر آ کر یہ شعر لکھا

گر تو نپذیری بجز نیک ای کریم ۔۔۔ پس کجا نالد کجا گرید لئیم

فی الحال فرمایا کہ میں نے عالم غیب میں دیکھا کہ مولانا شمس الدینؒ نے علاء الدین سے صلح کر لی اور انھیں بخش دیا اور ان کی شفاعت کی اور ان پر رحمت ہوئی۔[۱]

مولاناؒ کے تیسرے فرزند مظفر الدینؒ امیر عالم کا کوئی خاص ذکر کہیں نہیں آیا ہے۔ صرف شجرۂ نسب سے ان کے نام کا علم ہوتا ہے۔

مگر دو ایک روایتوں سے ضمناً یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی معیشت امیرانہ تھی اور غالباً فقر و تصوف میں آپ کو زیادہ انہماک نہیں تھا، ایک روایت مناقب العارفین میں یہ ہے کہ ایک روز سلطان ولدؒ اور ان کے بھائی چلپی امیر عالم اور چند دوسرے اصحاب مولاناؒ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ناگاہ سلطان اسلام نے ایک کیسۂ زر بھیجا۔ اور استدعائے دعا کی۔ امیر عالم اس زمانہ میں سلطان کے خزینہ دار کے بڑے دوست تھے، مولاناؒ نے فرمایا کہ "یارو اسم اعظم کیا ہے" سب نے کہا کہ حضرت ہی ارشاد فرمائیں" فرمایا کہ اسم اعظم یہی سیم و زر ہے، اسی سے حق تک رسائی ہوتی ہے اور اسی سے باطل کی آراستگی بھی ہوتی ہے۔ اس بغیر نہ دنیا معمور ہے، اور نہ

---

[۱] مناقب ص ۲۱۵

اہلِ آخرت مسرور ہیں[ع۱]۔" پھر فرمایا کہ "امیر عالم" کے اخراجات بہت ہیں ان کو زیادہ دو۔"

ایک دوسری روایت مولانا کے حمام میں جانے کے متعلق فصل چہارم میں آ دیگی، وہاں یہ منقول ہے کہ امیر عالم" نے کسی کو بھیج کر حمام سے سب لوگوں کو خارج کر دیا تھا۔

مناقب العارفین کی ایک اور روایت سے امیر عالم" کی امیرانہ معیشت کی پوری توثیق ہوتی ہے، وہ روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ سلطان عزالدین مولانا کی ملاقات کو آیا، مولانا نے امیر عالم سے فرمایا کہ قل ہو اللہ پڑھو، انھوں نے پڑھا، مولانا نے فرمایا کہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے ماں، باپ، فرزند و مانند شریک و شبہ نہیں ہے۔ یہ وقت طاعت و عمل کا ہے، جہاں تک ہو سکے طاعت میں کوشش کرو، مجھ پر بھروسہ نہ کرو، کیونکہ مردان خدا خدا صفت ہوتے ہیں، پھر یہ آیت پڑھی "فلا انساب بینہم یومئذٍ ولا یتساءلون"۔ چلپی امیر عالم جب مولانا کے پاس سے باہر آئے، تو اصحاب مولانا اس اشارت سے بہت رنجیدہ ہوئے اور بہت روئے، مولانا نے فرمایا کہ "نہیں نہیں اس حد تک نہیں" میرا مطلب یہ تھا کہ ہمارا امیر عالم

ع۱ سلطان ولد" نے اسے اس طرح ادا فرمایا ہے۔

نشاط مرداں از زر و سیم است — خوشی ہائے جہان از زر و سیم است

رسی بر باب مقصود اے ولد" زود — زاگر نردبان از زر و سیم است

(سلطان ولد")

بالکل کاہل نہ ہو جائے اور تا امکان کوشش کرے کیونکہ خدائے تعالیٰ مردم کاہل و عاطل
واہل کسل کو دوست نہیں رکھتا[1]

اس پر افلاکیؒ یہ اضافہ کرتے ہیں کہ "حضرت چلپی امیر عالم تا بود در عبادت و تقویٰ
و زہد و سخاوت مشغول بود"

مناقب العارفین میں دو چار جگہ اور بھی آپ کا نام آیا ہے مگر ان سے کچھ مزید حالات
منکشف نہیں ہوئے۔

بہر حال ان روایات سے مستنبط ہوتا ہے کہ امیر عالمؒ زمرۂ اہل فقر سے نہیں تھے[2]
امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔

مولاناؒ کی دختر ملکہ خاتون کو لوگ "خندولہ" (یعنی خداوندگار زادی) کہا کرتے
تھے[3]، ان کی نسبت رڈ ہاؤس نے لکھا ہے کہ "ان کا نکاح کسی شہر کے شہزادے
سے ہو گیا تھا اور وہ قونیہ سے چلی گئی تھیں"[4] افلاکیؒ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے
کہ ملکہ خاتون کا عقد خواجہ شہاب الدین سے ہوا تھا[5]، مگر خود خواجہ شہاب الدین کا کچھ زاید
حال کہیں سے نہیں معلوم ہوتا لیکن اس روایت سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ خواجہ شہاب الدین
کوئی متمول شخص تھے کیونکہ ملکہ خاتون نے ایک بار مولاناؒ سے ان کی شکایت ان الفاظ میں کی ہے کہ "در
خانہ خود تنعم ندارد و با وجود چنداں اسباب و اموال کنیزان و غلامان خود را عور و گرسنہ

---

[1] مناقب ص ۱۸۱ [2] مناقب (نسخۂ قلمی)

[3] رڈ ہاؤس ص ۱۳۴

[4] مناقب ص ۱۹۱-۱۹۲

میدارد " ممکن ہے کہ رڈ ہاؤس کا بیان صحیح ہو؛

مقتضائے عنوان کے اعتبار سے مولاناؒ کے خلف اکبر و فرزند رشید سلطان ولدؒ کے حالات کا بیان زیادہ تفصیل سے ہونا چاہئے مگر آپ کی ولادت، آپ کا عقد آپ کا سفر شام، آپ کے فرزند امیر عارف کی ولادت، آپ کے متعلق حضرت شمس الدینؒ شیخ صلاح الدینؒ کے خیالات، خود مولاناؒ کے نزدیک آپ کی وقعت و منزلت، مسئلہ جانشینی، آپ کی تصنیف رباب نامہ، یہ تمام امور اپنے اپنے موقع پر اس طرح بیان ہو چکے ہیں کہ ناظرین کو آپ کے سوانح حیات کا اجمالی اندازہ ہو گیا ہوگا، سلسلہ مولویہ کی اشاعت کے متعلق آپ کے مساعی کا ذکر فصل چہارم کے آخر میں آئے گا۔ اس کے بعد اب آپ کے متعلق خاص طور پر لکھنے کے لئے بہت کم کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ تاہم چند روایتیں جن سے آپ کے اوائل عمر کے حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

مولاناؒ کو آپ سے بچپن ہی سے اس قدر الفت و محبت تھی کہ آپ کو اپنے پاس سلاتے تھے۔ مولاناؒ نماز تہجد کو اٹھتے تو آپ رونے لگتے، مولاناؒ نماز چھوڑ کر آپ کو بہلاتے پھر نماز پڑھتے [1]

سلطان ولدؒ ابھی خورد سال تھے کہ ایک روز مولاناؒ نے اثنائے تقریر میں فرمایا کہ "حضرت موسیٰؑ کا عصا ساحروں کے تمام سانپوں کو کھا گیا اور اس کی جسامت میں ذرا بھی فرق نہ آیا اس کو کس طرح سمجھاؤں" پھر سلطان ولدؒ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ

---

[1]

"تم اس کی کوئی مثال دو"، آپ نے فرمایا کہ "اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی وسیع مکان میں تاریکی ہی تاریکی ہو، دفعۃً وہاں ایک شمع لے آئیں اس شمع کا نور تمام تاریکی کو کھا جائیگا اور شمع میں نہ زیادتی ہوگی نہ کمی" مولاناؒ نے آپ کو گود میں اٹھالیا اور بے حد مسرور ہوئے۔[عله]

سلطان ولدؒ جب جوان ہوئے تو مولاناؒ سے اس قدر مشابہ تھے کہ جب کسی مجلس میں مولاناؒ کے پہلو میں بیٹھتے تھے تو لوگ سمجھتے کہ مولانا کے بھائی ہیں، خود مولاناؒ فرمایا کرتے تھے کہ "انت اشبہ الناس لی خَلقاً و خلقاً" (یعنی تم باعتبار خلق و خلق مجھ سے سب سے زیادہ مشابہ ہو)[عله]

سلطان ولدؒ کی عمر جب بیس سال کی تھی تو آپ نے چلہ کشی کا ارادہ کیا، مولاناؒ نے فرمایا کہ ہمارے دوستوں کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے اور ہمارے دین میں یہ بدعت ہے۔ مگر سلطان ولدؒ نے اصرار کیا تو آپ نے اجازت دیدی اور خلوت گاہ کے دروازے کو بند کرادیا، دوسرے تیسرے روز مولانا اور شیخ صلاح الدینؒ اس خلوتگاہ کے قریب آکر مراقبہ کیا کرتے، جب چالیس روز پورے ہوئے تو دروازہ کھلوایا، دیکھا کہ سلطان ولدؒ بالکل نور میں غرق ہیں، تمام اصحاب نے جوش مسرت کے ساتھ سماع کا آغاز کیا۔[عله]

عله　　　عله مناقب　　　عله

سلطان ولدؒ کی عمر ۶۴۲ھ میں بیس برس کی ہوئی ہوگی، یہ وہ زمانہ ہے جب حضرت شمس الدین تبریزیؒ اول بار قونیہ آکر چلے گئے تھے اور ہنوز دوبارہ قونیہ میں واپس نہیں آئے تھے، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شیخ صلاح الدینؒ کے خلیفہ ہونے سے بہت قبل سے آپ کو مولاناؒ سے خصوصیت حاصل تھی۔

آپ کے اخلاق کے متعلق صرف ایک روایت یہاں نقل کی جاتی ہے جس سے یہ اندازہ ہوگا کہ آپ میں مروت و فردتی کس درجہ تھی، مولانا کے انتقال کے بعد ایک روز مولاناؒ کی حرم محترم کراخاتونؒ حضرت حسام الدینؒ کے وہاں تشریف فرما تھیں کہ سلطان ولدؒ بھی وہاں آگئے، کراخاتونؒ نے کہا کہ میں نے رات کو خواب میں دیکھا ہے کہ مولاناؒ مثل عنقائے مغرب کے سلطان ولدؒ کے سر پر سایہ گستر ہیں اور سلطان ولدؒ جدھر جاتے ہیں مولاناؒ ان پر سایہ افگن رہتے ہیں، حضرت حسام الدینؒ کو اس سے کسی قدر غبط ہوا کہ مجھے کیوں نہ دیکھا، سلطان ولدؒ نے اس اثر کو ان کے چہرے پر محسوس کیا اور فرمایا کہ اس خواب کی تفسیر یہ ہے کہ پرندہ اپنے کمزور انڈے کو سیتا اور ہمیشہ پروں کے نیچے دبائے رہتا ہے، جب بچہ نکلتا ہے تو پھر اس کی پرورش کی فکر میں لگا رہتا ہے، جب بچہ بڑا ہو کر اڑنے لگتا ہے تو پھر پرندے کو اس کی فکر نہیں رہتی، بس چلپی حسام الدینؒ اب اس حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ خود پر و بال کھولے ہوئے اڑتے پھرتے ہیں اور میں ہنوز وہ بچہ ضعیف ہوں کہ ابھی انڈے سے باہر نہیں نکلا ہوں، اسی وجہ سے خداوندگار میری تربیت میں ہنوز مشغول ہیں، اس تفسیر سے حضرت چلپیؒ خوش ہو گئے اور وہ انقباض جاتا رہا۔

آپ کے مناقب میں بہت کثرت سے روایتیں منقول ہیں مگر یہاں صرف مولاناؒ کا ایک قول درج کر دینا کافی ہے جس کے بعد کسی دوسری تعریف و توصیف کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے، فرمایا ہے کہ "بہاء الدینؒ آمدن من بایں عالم جہت ظہور تو بود، چہ ایں ہمہ سخنان من قولِ من است تو فعلِ منی"

سلطان ولدؒ کا انتقال۔

چلپی حسام الدینؒ کے انتقال کے بعد آپ مولاناؒ کے جانشین ہوئے اور تقریباً انیس سال کی خلافت کے بعد ۱۰ رجب ۷۱۲ھ کو اس دار فانی سے عالم جاودانی کو انتقال فرمایا اور مقبرۂ خاندانی میں مدفون ہوئے۔

سلطان ولدؒ کی عمر۔

آپ کی عمر کے متعلق سپہ سالارؒ نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ "مدت نود و شش سال عمر یافت[1]" اور یہ الفاظ ایک ہی صفحہ پر دو جگہ آئے ہیں۔ اسی بنا پر مولانا شبلی مرحوم نے بھی لکھ دیا ہے کہ "انھوں نے (سلطان ولدؒ نے) ۷۱۲ھ میں (۹۶) برس کی عمر میں انتقال کیا[3]" لیکن مصنف مرحوم خود اس سے قبل تحریر کر چکے ہیں[4] کہ "سلطان ولدؒ کی ولادت ۶۲۳ھ میں ہوئی" اور سلطان ولدؒ کی ولادت کا یہ سنہ بلا استثنا متفق علیہ ہے۔ پس اس حساب سے ۷۱۲ھ میں سلطان ولدؒ کی عمر ۸۹ برس کی ہوئی نہ کہ ۹۶ برس کی۔ رسالہ سپہ سالار میں نقل در نقل سے کوئی غلطی ہو گئی ہو گی ورنہ یہ مسئلہ اس قدر صاف ہے کہ اس میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے (اشتباہ کی صرف ایک صورت ہے، سلطان ولدؒ کے فرزند امیر عارفؒ نے ۷۱۹ھ میں انتقال فرمایا ہے، ممکن ہے سہواً ۶۲۳ھ

---

[1] سپہ سالار ص۸۲

[2] " ص۶۶

[3] سوانح مولانا روم ص۸۸

[4] " " ص۵

کی تخریج ۱۹؁ھ سے کر دی ہو اور اس طرح حاصل تفریق ۹۶ کو سلطان ولدؒ کی عمر قرار دیا ہو۔[1])

کتاب کے ابتدا ہی میں بذیل اسناد یہ بیان ہو چکا ہے کہ سلطان ولدؒ کی تصنیف "ربابنامہ" مولاناؒ کے کلام کی تفسیر ہے۔ افلاکیؒ نے آپ کی بابت یہ لکھا ہے کہ "ہفتاد سال تمام بے انقطاع وانفصام کلام پدر خود را بفصاحت لسان وصباحت بیان تقریر می فرمود" سلطان ولدؒ نے ۷۱۲؁ھ میں انتقال فرمایا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ آپ مولاناؒ کے کلام کے شارح اسی وقت سے ہیں جب سے مولاناؒ نے شعر کہنا شروع کیا یعنی ۶۴۲؁ھ سے جبکہ آپ کی عمر صرف انیس برس کی تھی۔

سلطان ولدؒ کا دیوان —

ربابنامہ کے سوا آپ کی یادگار ایک دیوان بھی ہے، آپ بیشتر مولاناؒ کی غزل ہی پر غزل کہا کرتے تھے مگر چونکہ آپ کے دیوان کو شہرت عام نہیں حاصل ہے اور نہ بالعموم شاعروں کے زمرے میں آپ کا شمار ہے[2]، اس وجہ سے مولاناؒ کے دیوان کی بحث میں، مولاناؒ کی غزلوں سے آپ کی غزلوں کا مقابلہ نہیں کیا اور در حقیقت ایسا کرنا کچھ خلاف شان ادب بھی تھا، اس لئے آپ کی چند غزلوں کے اقتباسات اس موقع پر درج کردیئے جاتے ہیں کہ ناظرین اس لطف سے بھی محروم نہ رہیں۔

---

[1] اس کی ایک مثال مولاناؒ کی وفات کے متعلق فہرست کتبخانہ بہار سے نقل ہو چکی ہے کہ سلطان ولدؒ کے سنہ وفات کو مولاناؒ کا سنہ وفات قرار دیدیا ہے۔

[2] صاحب مجمع الفصحا نے آپ کا نام لیا ہے۔

[یہ دیوان کتب خانۂ آصفیہ سرکار عالی میں بعنوان غزلیات "مولانا روم و فرزند مولانا" دواوین فارسی شمارہ ۴۴۳ پر درج ہے۔ اس کی ترتیب یہ ہے کہ اول ایک غزل مولانا کی دی ہے اور پھر ایک غزل سلطان ولد کی۔ اکثر غزلیں متحد الاوزان والقوافی ہیں، مگر التزاماً ایسا نہیں ہے۔ یہ دیوان حروف تہجی کے اعتبار سے نہیں ہے مگر رڈہاؤس نے لکھا ہے کہ دیوان باعتبار حروف تہجی جمع کیا گیا ہے[عله]۔ اس میں ابتدا کے دو اوراق غائب ہیں اور آخر سے بھی ناقص ہے، جس سے اول تو کلام ناتمام رہ گیا، دوسرے سنہ کتابت وغیرہ کا بھی کچھ پتہ نہ چلا گرجو ہے وہ بھی بسا غنیمت ہے۔]

خصوصیاتِ کلام انتخابِ غزلیات سے قبل اول سلطان ولدؒ کے کلام کے چند خصوصیات کا مختصراً بیان کر دینا مناسب ہے۔

(۱) سلطان ولدؒ نے غزلیں تمام تر مولاناؒ کے اتباع میں کہی ہیں اور اکثر مولاناؒ کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں، خود جا بجا اس کا اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ صاف لکھا ہے کہ ؎

در پردہ شہ، گفتیم ایں غزل را — کاے امتانِ باطل بزماں زنید براں

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ ؎

دائم ولدؒ و والدؒ گفتہ بہم اے ولدؔ — ہم بیشہ و ہم شیرے ہم آہو و باہویم

(مصرعۂ ثانی مولاناؒ کے مطلع کا مصرع ہے)

(۲) یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزلیں زیادہ تر مولاناؒ کی زندگی ہی میں کہی گئی ہیں، بیشتر ایسا ہوتا رہا ہوگا کہ مولانا اپنے حسب معمول بجوش دانہ طور پر کوئی غزل کہہ دیتے ہوں گے، اس کے

عله صـ ۱۲۲

بعد سلطان ولدؒ اور مولاناؒ کے دوسرے اصحاب بھی اسی طرح میں طبع آزمائی کرتے رہے ہوں گے، سلطان ولدؒ نے تو بعض جگہ مولاناؒ کی غزلوں کا اس طرح جواب دیا ہے گویا مولاناؒ کے مفہوم کو مولاناؒ ہی پر پلٹ دیا ہے، چنانچہ مولاناؒ کی ایک غزل ہے۔

چوں ز صورت بر تر آمد آفتاب داخترم　　　از معانی در معانی تا روم من خوشترم
در معانی گم شدستم ہمچنیں شیریں تراست　　　سوئے صورت باز نایم در دو عالم ننگرم

سلطان ولد نے بھی اس مفہوم کو اس طرح پلٹا ہے۔

نے تو گفتی من ز ہمت در دو عالم ننگرم　　　ہمچو عنقا پر زنم وز ہفت دریا بگزرم
نے نہادی سر بدعوی پیش آں جانان کہ من　　　ہر دو دست از جاں بشویم یک جہش بر شجرم[1]

(یہ دونوں غزلیں آگے چل کر نقل کی جاتی ہیں۔)

(۳) متعدد غزلوں میں ایسا ہوا ہے کہ مولاناؒ کے مطلع کو بجنسہ اٹھالیا ہے اور دو ایک لفظ کے تغیر کے ساتھ تو بہت سے مطلع لے لئے ہیں، مولاناؒ کا مطلع ہے۔

بہ ہیں دلے کہ نگردد ز جاں سپاری سیر　　　اسیر عشق نگردد ز رنج و خواری سیر

سلطان ولدؒ نے اس میں صرف ایک لفظ کا تغیر کر دیا ہے۔

زہے دلے کہ............... ◆ ....

یہ کوئی منفرد مثال نہیں ہے بلکہ ایسی مثالیں دیوان میں بکثرت ملیں گی۔

(۴) غزلیات میں جابجا مولاناؒ اور اصحاب مولاناؒ کی طرف اشارے بھی کئے ہیں۔

الف۔ اشارہ بجانب مولاناؒ

---

[1] اس غزل کے تحت میں حاشیہ بھی ملاحظہ ہو

بگذر د لد از یں تن ہمچو "پدر" تو جان شو — مگر خبر دہد کسے را اگر عاشقی و بینا

آں "ذاالدؒ" ایں دلد را فرمو دیں احدا — گرچہ زردے صنع او اندر صور در آمد

گر ز مولاناؒ نارسیدے ایں دلد را جام جاں — قطرہ اش در بحر معنی در تب بے ہمتا شدے

ب اشارہ بہ شمس الدینؒ تبریزی

نگار کعبۂ جانست اگر نمی دانند — بہر طرف کہ بگردید، رو بگر دانند

حیات جملہ جہانست شمسؒ تبریزی — ز دل محب وے آیند اگر مسلمانند

ہمیشہ ہمچو دلدؒ گرد او بدور آیند — چرا رستہ دریں بند و دام در مانند

(یہ غزل گیارہ شعروں کی ہے اور پوری غزل حضرت شمسؒ کی مدح میں ہے۔

جہانہائے آسمانی سر ست شمس تبریزؒ — یکشائے چشم و بنگر پران شدہ چو ژالہ

ج

د اشارہ بہ حسام الدینؒ

تختِ حسام دیںؒ را شاہنشہِ گزیں را | در سینہ بیں نہادہ ہم او نشستہ بر سر

(۵) بعض غزلوں میں کچھ ایسا التزام کیا ہے کہ نہ صرف قوانی متحد ہو گئے ہیں بلکہ مولاناؒ ہی کے مضامین کو ایک دوسری شان سے ادا کر دیا ہے، یوں تو یہ کیفیت ہر غزل کے دو چار شعر میں نظر آجاتی ہے مگر ایک غزل میں خصوصیت سے ایسے اشعار زیادہ ہیں، سلطان ولدؒ کی یہ غزل اکیس شعروں کی ہے اور مولاناؒ کی غزل تیئیس شعروں کی ہے، ان میں گیارہ قافیے متحد اور ایک قافیہ سلطان ولدؒ کے وہاں مکرر ہے، یہ بارہ اشعار ذیل میں دیئے جاتے ہیں، ان میں سلطان ولدؒ کی غزل کی ترتیب قائم رکھی ہے اور مولاناؒ کی غزل سے متحد القافیہ شعر جہاں سے ملا ہے اٹھا لیا ہے۔

سلطان ولدؒ	مولاناؒ
اے خدائے کہ مفرح بخشِ غمگیناں توئی	اے خدائے کہ مفرح بخشِ رنجوراں توئی
در میانِ قہر و لطف و نیک و بد پنہاں توئی	در میانِ لطف و رحمت ہمچو جاں پنہاں توئی
صد ہزار اشخاص را تو بندۂ شخصے کنی	
ہمچو جاں جویند او را خود درو پنہاں توئی	
رنج دادی جان و تن را تا ترا زاری کند	خستہ کردی بندگاں را تا ترا زاری کند

سلطان ولد

چون ز رحمت مشتری زاری و افغان توئی
بر مثال درد درمان از تو می جوئیم ما
قبلهٔ هر درد و درمان بیشک ای رحمان توئی
ز احتیاج و آز جمله گرد دریا می رویم
در میان ماست بوده اول و پایان توئی
گمرهی از تست و راه راستی بخشست
ظلمت کفران ز تست و نور در ایمان توئی
هم توئی آنکس که میگوید توئی و جز تو نیست
هم تو گوئی و هم تو چوگان شاه و هم میدان توئی
آنکه گفت او خبر تو نی و باز ترسان میشود
گر دلیر است اندر ریش ورنه هم ترسان توئی
آن یکی مقبول این با زاد مردود آن
چشم بندی از تو است و فتنهٔ ایشان توئی
جسم ما چون خوانها و روح ما مهمان در آن
آن همه نقش اندر پرده خوان و هم مهمان توئی
گرچه بیداریم و غافل غیر تو در کار نیست
جمله اندر خواب رفته در جهان یقظان توئی
توبه کردن یا شکستن نیست اندر دست کس
هم دو را مبدع توئی و هم کر این و آن توئی

مولانا روم

چون خریدار نفیر و لابه و افغان توئی
روز و شب ما چنین بر بهر گر رحمت کنیم
شب همه رحمت رود سوی تو چون رحمان توئی
دردهای کآدمی را بر در خلقان برد
آن حجاب اول است و آخر و پایان توئی
دست در طاعت زنیم و چشم در ایمان نهیم
بر امید آنکه بنمائی که خود ایمان توئی
هم توئی آنکس که میگوید توئی و الله توئی
گوی و چوگان و نظاره گرد این میدان توئی
وانکه میگوید توئی زین گفت و ترسان میشود
در میان جان او در پردهٔ ترسان توئی
در یکی کار این یکی راغب و آن دیگر نفور
تو مخالف کرده شان فتنهٔ ایشان توئی
صورت ما خانها و روح ما مهمان در آن
نقش و جانها سایهٔ تو جان آن مهمان توئی
غفلت و بیداری ما در توئی هر کار و بس
غفلت ما بی فضولی تر جز خود یقظان توئی
جمله درمان خواه و آن درمانشان خواهان تست
آنکه درد و دارو خواست بیشک آن توئی

اتو سلاطین جہاں بنگر بغیرت اے ولدؒ | (کو سلاطین جہاں گر شاہ ایواں بودہ اند
گوئے با حق لے خدا سلطان ہر دو راں توئی | پس ندانستیم بیشک کاندریں ایواں توئی)

(۶) جا بجا یہ بیان ہو چکا ہے کہ سلطان ولدؒ درحقیقت مولاناؒ کے کلام کے شارح ہیں اسکی مثال میں مولاناؒ کی ایک غزل جو گیارہ شعروں کی ہے اور اس کے بعد سلطان ولدؒ کی غزل جو اسی وزن وقافیہ میں ہے نقل کی جاتی ہے، دونوں غزلوں کو غائر نظر سے دیکھا جائے تو صاف واضح ہوتا ہے کہ فی الاصل مولاناؒ کے گیارہ شعروں کے مطالب کو سلطان ولدؒ نے ستائیس شعروں میں پھیلا کر بیان کیا ہے۔

مولاناؒ

چوں ز صورت بر ترآید آفتاب داخترم | از معانی در معانی تا ردم من خوشترم[1]
در معانی گم شدستم ہمچنیں تر بیں تر است | کو صورت باز نایم در دو عالم بنگرم
در معانی میگزارم تا شوم ہمرنگ او | زانکہ معنی ہمچو آب ومن درو چوں شکرم
دل نگیرد ہیچکس را از حیات جان خویش | من ازیں معنی ز صورت یاد نارم لاجرم
ورمن از تنگی دل در کار خود سستی کنم | دود از دریا برآرد شعلہائے آذرم

---

[1] جامع دیوان سلطان ولدؒ نے مولاناؒ کی بھی غزل بالمقابل رکھی ہے اور اسی لئے اس غزل کو نقل کیا گیا گو مولاناؒ کے دیوان میں ایک دوسری غزل آٹھ شعروں کی اور ہے اور درحقیقت سلطان ولدؒ کی غزل اسی دوسری غزل کے جواب میں ہے نہ کہ غزل منقولہ بالا کے جواب میں ؎

نے تو گفتی کز جفائے آں جفا گر نشکنم | نے تو گفتی عالمے در عشق او برہم زنم

می خرامم من بباغ از باغ یار دجانیان　　چو گل سرخم لطیف و تازه چو نیلوفرم
ہمچو زر خنداں خوشم اندر میان آتشش　　آنکہ گر ز آتش بر دنم ہمچو زر من بیفسرم
من ز افسونے چو مار سرنہادم بر خطش　　تا چہ افتد از خطا و اے برادر بر کرم
کشتی تن را چو موج تختہ تختہ بشکند　　خویشتن را بگسلم چوں خویشتن را ننگرم
من ز صورت سیر گشتم آمدم سوئے صفات　　ہر صفت گوید در آ اینجا کہ بحر اخضرم
بخش از جام لطیفت جرعهٔ از جام فضل　　تا کہ من از نور ہمت در دو عالم ننگرم
چو سکندر ملک دادم شمس تبریزی را لطیف　　سوئے لشکر ہائے معنی لاجرم سرلشکرم

(۱۱ ـ صـ ۵۲۱)

سلطان ولد

نے تو گفتی من ز ہمت در دو عالم ننگرم　　ہمچو عنقا پر زنم و از ہفت دریا بگزرم
نے منادی سر بدعوی پیش آں جاناں کہ من　　ہر دو دست از جاں بشویم یکجوش بر بشمرم
از خود و عالم برآیم گم شوم اندر عدم　　عشق او را قبلہ سازم جز بر ویش ننگرم
ہمچو غواصانِ بحرِ ہستی غوطہ خورم　　دائماً جولاں نمایم در ہوائے گوہرم
خون خود را جرعہ جرعہ در کشم در جستجو　　گرچہ ہر دم جاں سپارم غیر آں رہ نسپرم
پشت گردانم بعالم پا نہم در راہِ او　　رو نگردانم ز کویش گرچہ راند از درم

(بقیہ حاشیہ صـ ۲۸۹)
نے تو دست او گرفتی عہد کردی رد برد　　کز پئے آں جان و دل ایں جانِ دل بر کنم

(۸ ـ صـ ۵۲۳)

گر دو صد تیر حوادث چرخ بر من افگند — چون هدف دایم بدارم پیش هر تیرش برم

در جنون از حد خود من پای را افزون نهم — کز فلک بیزار گردد تا بریزد اخترم

کعبتین پنج و شش در طاس هفت اخترم — گرچه من زین چار خاک و باد را و آب و آذرم

این چهار اضداد را این چون ز قدرت یک کند — سازوار و یار گشته در رضای دلبرم

چون بجنس خود رساند عاقبت جان را بجان — باشد آن آمیختن خوشتر ز شیر و شکرم

پس چه می ترسی ز مردن عقل خود راجع کن — در نگر تحقیق این را تا بداری یاورم

تا که از کتم عدم آورد جان را در وجود — هر زمان از وی لطیف و تازه تر شد پیکرم

همچنین چون باز جان را در عدم پیدا کند — صد هزاران بار گویی زانچه بودم خوشترم

در تنی کو نیست پر از خون و آتش ببین — چون زند نقشش همی گویی ای چو جان اندر خورم

پس ترا چون زین پلیدی سوی پاکی ها برد — محض ظلمت بوده ام گویی و اکنون انورم

پس بران صد یک که کردی گر کنون هستی مقیم — از تن و از جان بباید گشت تنها لاجرم

نیستی ماهیست تابان هستی تن ابر دان — چون شوم عریان ز هستی رو نماید زیورم

گفتن شعرت ندارد سود هین بر خود مجیب — ره رو از گفتار بگذر تا نماید لشکرم

همچنین غلمان بپویم سوی آن جنت چرا — خود منم جنت بجویم تا رسم در کوثرم

دارم از جان ذره‌ی می نگنجم در جهان — تا نیفتی در غلط هان گر بتن من لاغرم

خیز ساقی در ده اندر بزم جانان باده را — تا بکف گیرم بشادی آب شراب احمرم

خود شراب من منم ساقی که باشد در میان — چون بجان و دل شرابم چون بقا ساغرم

طرفه میدیدم از دگر خار و خس گه سرو و گل — در فراقش پا تا بالم در وصالش سر دم

شمس تبریزی مرا بنما طریق ارتقا — چشم دل را بر گشا کز جان برویت بنگرم

اسم اعظم نام تست اندر مکان لامکاں | سیر ہو زاتش جہانے چونکہ نامت میبرم
ہر دمے از جان ولدؒ گوید کہ بہار دے تو خود | زانکہ عشقت ہست دایم ہمچو مغز اندر سرم

(۷) جان سخن پر ستم ہوگا اگر محض پاس ادب کے خیال سے اس امر کو پوشیدہ رکھا جائے کہ اس دیوان میں ایسی بھی غزلیں ہیں، جنہیں بحیثیت مجموعی ولدؒ کی شان والدؒ سے بڑھ گئی ہے اس میں نہ مولاناؒ کی کسرِ شان ہے اور نہ سلطان ولدؒ کو اس سے ترجیح مطلق حاصل ہو جاتی ہے بلکہ یہ خود مولاناؒ کے لئے باعث فخر ہے کہ اس صنف خاص میں بھی بیٹے نے باپ کی اقتدا کو حد کمال پر پہونچا دیا۔ دیوان میں اس قسم کی متعدد غزلیں ہیں مگر یہاں صرف ایک غزل پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مولاناؒ کی ایک غزل سات شعروں کی ہے اور اپنی شان میں فرد ہے، اس کا مطلع بیت الغزل بلکہ مولاناؒ کے خاص منتخب اشعار میں سے ہے، سلطان ولدؒ کی غزل میں اس پایہ کا کوئی شعر نہیں ہے مگر مجموعۂ سلطان ولدؒ کی غزل اس سے بڑھی ہوئی ہے۔

مولاناؒ

امروز بحمد اللہ از دی بتر است این دل | امروز دریں سودا رنگِ دگر است این دل
در زیر درختِ گل دی بادہ ہمی خورد او | از خوردن آں بادہ زیر و زبر است این دل
از بسکہ نے عشقت نالیدہ دریں پردہ | از ذوق نے عشقت ہمچوں شکر است این دل
بند کمرت گشتم لے سبز قبائے من | پا بستہ بگرد تو ہمچو کمر است این دل
از پرورش آبت اے بحر حلاوتہا | ہمچوں صدف این تن ہمچوں گہر است این دل
چوں خانۂ ہر مومن از عشق تو ویراں شد | ہر لحظہ ازیں شورش بر بام و در است این دل
شمس الحق تبریزی تابندہ چو خورشید است | وز تابش خورشیدش ہمچوں سحر است این دل
(۷، ص)

سلطان ولدؒ

امروز بفضل حق چیزے دگر است ایں دل — امروز بروں زخود اندر سفر است ایں دل
گر بود شکستہ دل از لشکر آب و گل — امروز بفضل حق اندر ظفر است ایں دل
گر بود ستارہ دل بر چرخ سوارہ دل — امروز دریں کیواں صد ماہ و خور است ایں دل
تلخیش شدہ شیریں مانند ز شہد و تیں — امروز ہمہ جاں قند و شکر است ایں دل
گر از خبر دل نابود ست پری دل را — امروز دریں منزل جملہ خبر است ایں دل
لعلے شدہ سنگ او چوں کرد خود آں نور — زیں در نگ ایں دریا تاباں گہر است ایں دل
نابود دریں پیکر بودش تن و پا و سر — اکنوں چوں ہمہ جاں شد بے پا و سر است ایں دل
عالم ہمہ قلابند از قلب ہمی لافند — در آتش عشق حق خنداں چو زر است ایں دل
جملہ صدف خالی در نقش و اشکالے — اے عاشق رز چہرہ خوش ہم بر است ایں دل
دادش پر نورانی حق تا شود او جانے — جلوہ بکنواں با بال و پر است ایں دل
بالش حق و پرش حق تا نے حق شود اکنوں — یک راد و چرا گفتم نور نظر است ایں دل
دل نور درون آمد وز پوست بروں آمد — دل را چہ درون بیروں جملہ شرر است ایں دل
گفتی تو ولدؒ از دل رمزے و نشاید ایں — ہم نیز نگفتی او چوں بے اثر است ایں دل

علی ہذا مولانا کی ایک غزل ہے جس کا ردیف "من خانہ نمیدانم" ہے، یہ غزل صرف سات شعروں کی ہے، سلطان ولدؒ نے اسی ردیف کی پابندی کے ساتھ چھبیس شعروں کی غزل کہی ہے جس میں مطلع مولاناؒ ہی کا ہے اور پچیس شعر سلطان ولدؒ کے ہیں۔

مولاناؒ

اے کردہ تو مہمانم در پیش در آجانم　　زانرو دے کہ حیرانم، من خانہ نمیدانم

....

شمس الحق تبریزم جز باتو نیامیزم　　من رفتم و بے خبرم، من خانہ نمیدانم

سلطان ولدؒ

اے چشم ز تو بینا و اے عقل ز تو دانا!　　رہ رد سوے مولاناؒ من خانہ نمیدانم

زیں خلق ولدؒ باز آ چوں چند نہ باز آ　　در عشق تو سر باز آ، من خانہ نمیدانم

اس مختصر تبصرے کے بعد اب اس دیوان سے چند غزلوں کے اقتباسات دیے جاتے ہیں مگر ان اقتباسات کو دیوان کا "انتخاب" نہ سمجھنا چاہیے اگر بامعان نظر انتخاب کیا جائے تو اس دیوان سے ایک نادر مجموعہ نہایت بلند و بلیغ اشعار کا مرتب ہو سکتا ہے یہ اقتباسات صرف سرسری اندازے کا کام دے سکتے ہیں اور بس۔

بیا بیا کہ توئی بحر عشق و شوق و صفا　　بیا بیا کہ ترا برگزیدہ شاہ بقا

بیا بیا کہ شدی بر فلک مثال ملک　　بیا بیا کہ گزشتی ز چرخ و عرش و خلا

بیا بیا کہ چو تو نیست در جہاں دیگر　　بیا بیا کہ توئی فرد در خلا و ملا

بیا بیا و مرادہ شراب از کفِ خود　　کہ باز گردد پیر کہن ز نو برنا

بیا بیا کہ شراب خدا ز ما بکشد　　بدہ بدہ مے جانے کہ دل شود بینا

بیا بیا کہ مشکک را بہ پیش جو　　ولدؒ تو تیز منہ در دہان سگ حلوا

بخوردم ساغرے چوں نار امشب شدم مستِ رخِ گلنار امشب
ہمی جویم چو جو در باغ وصلت یکے دستہ گل بے خار امشب
نگار ماہرو از چہ نشانے بیابی ہر دمم در تار امشب
تو دل بردی و رخت جاں بیغما بسانِ لشکر تاتار امشب
بخواہم کرد امشب انچہ خواہم بگرداز شور من انکار امشب

. . . .

چو ما بیرون ز جسم و عقل و جانم ربابِ ما بزن بے تار امشب
شرابِ ما ز نور آمد نہ ز انگور ازیں مستی بود دیدار امشب
محمدؐ را بہ بیں بر عرش پیدا اگرچہ شد نہاں در غار امشب
ولدؔ گوید منم دریاے اسرار زمن بشنو ہما اسرار امشب

دیوانگانِ عشقیم از ما ادب نیاید جز فتنہ و خرابی ما را دگر نیاید
رندانِ تند و تیزیم با خون دیو ریزیم در رزم شیر مرداں ہر سست کے در آید

. . . .

خبر جاں خوبے زود آ بنگر کیست افزوں لیلے حسن ما را مجنون عشق باید
لیلیٰ از آن مجنوں، مولیٰ ازان ذوالنون مولےٰ است کو ز میداں گوئے دمم ربابد
گشتی ولدؔ تو حیراں در کار دربار سلطاں سلطاں شوی اگر آں سلطاں رخت نماید

امروز بحمدالله عیش و طرب افزون شد — بر جا کباب و نان در کف می گلگون شد
بی آتش بیجوشم، می بی لب نوشم — حیرانم کاین دولت ناگاه مرا چون شد
در مجلس جان دلبر در داد می چون زر — عریان و گدا زین می با اطلس و اکسون شد

. . . .

بنگر بولد از جان آشفته و سرگردان — چون در طلب وصلش جان و جگرش خون شد
زد دانه درختی شد، زد محنتی بختی شد — زد سنگ چو گوهر شد، زد قطرهٔ جیحون شد

ماه هفتم آسمانم، ای پسر بیدار باش — نور عرش و فرشیانم، ای پسر بیدار باش
جان و دل در تن نهان شد عجب کر لطف تن — در دل و در جان نهانم، ای پسر بیدار باش

. . . .

جوی جانم زره بس نقشها آرد پدید — در نشان من بی نشانم، ای پسر بیدار باش

. . . .

شهر دل عقست جان در تلو وصلش مقیم — پیش آن شه ترجمانم، ای پسر بیدار باش

. . . .

گفته با تو بی زبانی این لذّت عاشقی — همچو مردم ای پسر بیدار باش

مست عشقم ای پسر با خودنیم — عقلم از سر شد ندانم من کیم
من چه دانم هر کسی در چیست و کیست — چون نمی دانم ز مستی من کیم
هستی من نیست شد در عشق او — می نمایم چو سراب آمانیم

چوں مرادِ من مرادِ یار شد — ہر چہ آید بر من از وے راضیم
گوید از مستی ولدؒ اندر فنا — ایں مئے باقی کہ خوردم باقیم

گر طالبِ آں یاری رو خانہ تو ویراں کن — واندر عوضش خانِ خوش بر سرِ کیواں کن
گر ہمچو زمستانی از عشق بہارے شو — وانگاہ ز ہر خارے صد گونہ گلستاں کن

. . . .

گرچہ کہ نہانی تو، خورشیدِ جہانی تو — چرخے کہ بود جانے پیدا کن گرداں کن
خواہی کہ شوی زندہ در دولتِ پائندہ — از جا بسرِ خود در اگل رو ے برجاں کن
بر تختِ ولدؒ جنبش با دولت دبا تکیں — ہر کہ شود بت بندہ ملکش دہ و سلطاں کن

گر بقدرِ دردِ دل افغانِ جاں بالا شدے — سقفِ گردوں در شکستے محو و ناپیدا شدے
ور بقدرِ سوزِ سینہ اشکِ چشم آمدے — ویں زمیں را آب بردے سربسر دریا شدے
ور شدے واقف جہاں از شور و از غوغائے من — در ہمہ در شور رفتے، خلق در غوغا شدے
گر دمے غم گشتے آشکارا در جہاں — تر و خشک و زیر و بالا والہ و شیدا شدے

. . . .

با چنیں عشقے بغایت گر شدے معشوق یار — زہرِ دل چوں شہد گشتے خار او خرما شدے
بحرِ رحمت جوش کردے جرمہا مغفور شد — نالہ ام مقبول گشتے کارِ من زیبا شدے
ذرہ ام خورشید گشتے بر چہارم آسماں — پشہ ام بر کوہِ قافِ وصل چوں عنقا شدے

. . . .

گرز مولانا رسید این دلدار جام جاں — قطرہ داش در بحر معنی دریے ہمتا شدے

سلطان ولدؒ کے ایک فرزند چلپی جلال الدینؒ امیر عارف اور دو دختر مطہرہ خاتونؒ (عابدہ) دشرفہ خاتون (عارفہ) شیخ صلاح الدین کی دختر فاطمہ خاتونؒ کے بطن سے تھیں، ایک فرزند چلپی شمس الدینؒ امیر عابد ایک سریہ نصرت خاتونؒ سے تھے اور دو فرزند چلپی صلاح الدینؒ امیر زاہد اور حسام الدینؒ امیر واجد ایک دوسری سریہ سنبلہ خاتونؒ سے تھے۔ ان میں سے امیر عابدؒ اور امیر واجدؒ (امیر عارفؒ) کے بعد منصب خلافت پر فائز ہوئے، امیر عارفؒ مولاناؒ کی زندگی ہی میں یوم سہ شنبہ[1] ۸ ذیقعدہ ۶۷۰ھ (۶ مئی ۱۲۷۲ء) کو متولد ہوئے تھے، ان کے قبل سلطان ولدؒ (کے بارہ یا تیرہ لڑکے) ہوئے اور سب ایام شیرخوارگی ہی میں انتقال کر گئے، سلطان ولدؒ اس سے متألم تھے، امیر عارفؒ کی ولادت کے قبل ہی مولاناؒ نے آپ کی بشارت دی تھی، مولانا نے شیخ صلاح الدینؒ کے نام پر آپ کا نام فریدون رکھا اور امیر عارفؒ ان کا خطاب اور اپنے لقب پر جلال الدینؒ لقب قرار دیا، اسی زمانہ میں یہ غزل کہی۔

مبارک باد بر ما ایں فریدون — کہ گردد بادشاہ دیں فریدون

زمادر زاد او روز سہ شنبہ — بتاریخ سنہ سبعین فریدون

بماہ ذوالقعدہ در ہشتم اد — بدو ستا پس از پیشیں فریدون

---

[1] افلاکیؒ نے "یکشنبہ" لکھا ہے مگر مولاناؒ کی غزل جو آگے منقول ہے، اس میں "سہ شنبہ" ہے، وزن کے اعتبار سے "سہ شنبہ" کے بجائے "یکشنبہ" آ بھی نہیں سکتا، اس لئے "سہ شنبہ" کو صحیح سمجھنا ناگزیر ہے۔

چو گردد ہوشیاؤ سر فراز و | بدیں شعرم کند تحسین فریدوں
ہزاراں سال عمرش باد افزوں | تو ہم از جاں بگو آمیں فریدوں

(مناقب العارفین میں گیارہ شعروں کی یہ غزل ہے مگر کلیات میں نہیں ملی) بچپن میں امیر عارف کے گلے میں ورم ہو گیا تھا، کئی روز تک دودھ بھی نہ پی سکے۔ بالکل ناامیدی کی حالت میں سلطان ولدؒ آپ کو مولاناؒ کے پاس لائے، مولاناؒ نے قلم لے کر آپ کے گلے پر سات خط طول میں اور سات خط عرض میں کھینچے اور لکھا کہ "العاقل تکفیہ الاشارہ" اس کے بعد ہی آپ کو صحت ہو گئی، لوگوں نے اس کے معنی اپنے اپنے طور پر قرار دیئے، مگر جب اکیاون برس کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا، اس وقت یہ راز منکشف ہوا کہ مولاناؒ کا اشارہ کس طرف تھا۔

آپ نے سلطان ولدؒ کی زندگی میں اور آپ کے بعد بھی عراق، آذربیجان، روم وغیرہا کے سفر بکثرت کئے اور سلسلہ مولویہ کی اشاعت و تنظیم آپ کے ذریعہ سے بہت کچھ ہوئی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس سلسلہ کا باقاعدہ انضباط اور انتظام آپؒ ہی کی ذات سے ہوا۔

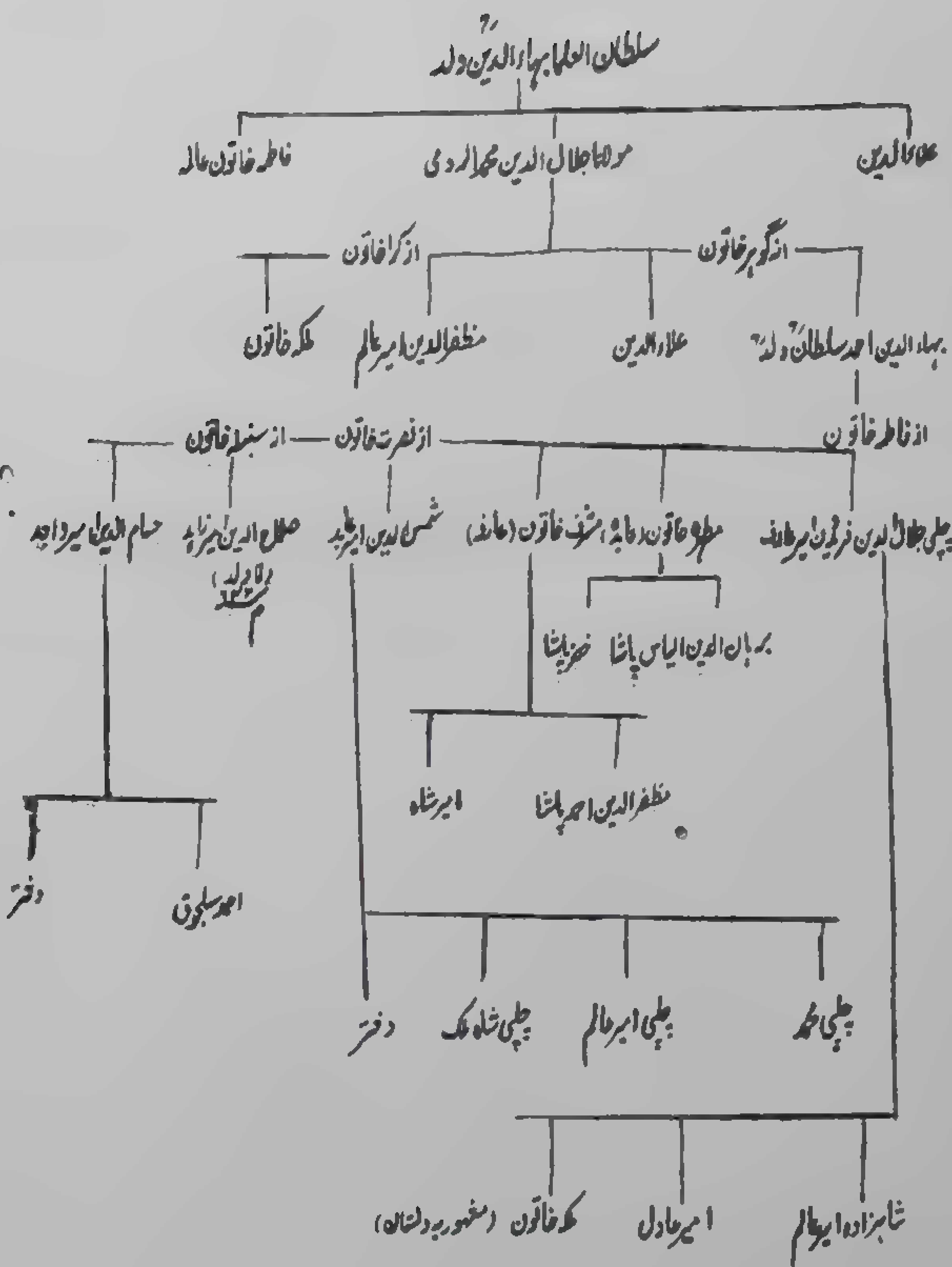
آپ نے روز سہ شنبہ ۲۴ ذی الحجہ ۷۱۹ھ (۵ فروری ۱۳۲۰ء) کو رحلت فرمائی۔

آپ کے بعد آپ کے بھائی چلپی شمس الدینؒ امیر عابد آپ کے جانشین ہوئے اور شعبان ۷۳۹ھ (اپریل ۱۳۳۸ء) میں انتقال فرمایا۔[عله] (سپہ سالارؒ نے اپنا رسالہ آپ

عله ۵ محرم ۷۳۱ھ (۲۴ نومبر ۱۳۳۰ء) فہرست کتبخانہ بانکی پور۔

ہی کے زمانہ میں مرتب کیا تھا) ان کے بعد حسام الدینؒ واجد خلیفہ ہوئے، اور آخر شعبان ۷۴۲ھ (۱۳۴۲ء) میں انتقال فرمایا۔

ان کے بعد امیر عارفؒ کے بڑے صاحبزادے امیر عالم جانشین ہوئے افلاکی کا سلسلۂ بیان یہاں پہونچکر ختم ہو جاتا ہے اور مولاناؒ کے سوانح کے ذیل میں امیر عارفؒ کے جانشینوں میں سے کوئی مولاناؒ کی زندگی میں متولد نہیں ہوا، لیکن یہ سلسلہ تا ایندم اسی خاندان میں قائم و برقرار ہے اور اس سلسلہ کے شیوخ "چلپی" کے لقب سے ملقب ہوتے ہیں۔


سلطان العلما بهاء الدین ولد
علاء الدین
مولانا جلال الدین محمد الرومی
فاطمه خاتون عالمه
از گوهر خاتون
از کرا خاتون
بهاء الدین احمد سلطان ولد
علاء الدین
مظفر الدین امیر عالم
ملکه خاتون
از فاطمه خاتون
از نصرت خاتون
از سنبله خاتون
چلبی جلال الدین فریدون امیر عارف
مطهره خاتون
شرف خاتون (عابده)
شمس الدین امیر عابد
صلاح الدین امیر زاهد
حسام الدین امیر واجد
برهان الدین الیاس پاشا
خضر پاشا
مظفر الدین احمد پاشا
امیر شاه
احمد سلجوق
دختر
چلبی محمد
چلبی امیر عالم
چلبی شاه ملک
دختر
شاهزاده امیر عالم
امیر عادل
ملکه خاتون (مشهور به دلشاد)

فصل چهارم

شمائل و فضائل

درجہاں گر عاشقے ہست اے مسلماناں منم　　کافرے یا مومنے یا راہبے ہست آں منم

مولاناؒ کے شمائل و فضائل کو تفصیلی اصناف میں تقسیم کر کے بیان کرنا تکلف سے خالی نہیں ہے اور اس کے لئے مواد بھی کافی موجود نہیں ہے۔ پس جو واقعات فراہم ہو سکے ہیں، انھیں اس ترتیب سے پیش کرنے کی سعی کی جاتی ہے کہ ان سے صاحب المثنوی کے چیدہ چیدہ (الف) عادات و خصائل (ب) محاسن اخلاق (ج) کمالاتِ صوری و معنوی پر کسی قدر روشنی پڑ سکے اور اس غلبۂ مادیت و افادیت کے زمانہ میں ایک صاحب باطن و پیرو سیرت محمدی کے حالات سے روحانیت و فنائیت کا کچھ پرتو دلوں پر ضیافگن ہو سکے

(الف) بعض عادات و خصائل

قدوقامت :۔ مولاناؒ خلقۃً قوی الجثہ اور زور آور شخص تھے۔ اکمل ا[illegible]

کی روایت ہے کہ سفر شام میں آپ نے ساربان کو ایک منزل میں اترنے سے منع کیا اس نے نہ مانا، آپ نے اسے ایک گھونسہ مارا، وہ گر پڑا اور آپ اس کے دونوں کے ہاتھ باندھ کر اسے ایک فرسنگ تک اٹھائے گئے اور وہاں قیام کیا، فرمایا کہ تجھے ہم پر رحم نہیں آیا تو اپنے اونٹوں پر بھی رحم نہیں آیا، جس جگہ تو ٹھہرنا چاہتا تھا، وہاں آج مغلوں کا لشکر قیام کرے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا [1]۔

فخر الدین دیودست کو آپ نے اپنا ایک پیرہن دیا تھا، وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس کا دامن تراش کر اپنے جسم کے مطابق بنایا، اگر فخر الدین کوتاہ قامت نہیں تھے تو ضرور ہے کہ مولانا دراز قامت تھے، مگر کثرت ریاضت سے آپ کے جسم میں نہایت ضعف آگیا تھا، ایک روز حمام میں آئے اور اپنے جسم کو ترحم کی نظر سے دیکھتے رہے۔ فرمایا کہ تمام عمر کسی سے شرمندہ نہیں ہوا ہوں مگر اپنے جسم لاغر سے نہایت شرمندہ ہوں "اما چہ کنم کہ آسائش من در رنج اوست" [2]

مثنوی شریف میں اس باب میں اشعار نہایت کثرت سے ہیں (ملاحظہ ہو حصہ دوم تحکم بحث تن در روح) از انجملہ ذیل کے دو شعر شروع ہی میں واقع ہیں۔

صحت ایں حس ز معموری تن — صحت آں حس زتخریب بدن

شاہ جاں مر جسم را ویراں کند — بعد ویرانیش آباداں کند

رنگ۔

ایک روز مولانا قلعہ کی خندق کے قریب کھڑے ہوئے تھے چند فقہا مدرسہ قراطائی

---

[1] مناقب ص ۲۵ [2] مناقب ص ۱۲۶

سے آرہے تھے، انھوں نے ازراہ امتحان سوال کیا کہ سگِ اصحابِ کہف کا رنگ کیسا تھا؟ فرمایا کہ زرد تھا کیونکہ عاشق تھا اور عاشق کا رنگ زرد ہی ہوتا ہے جیسا کہ میرا رنگ ہے۔ سب نے سر جھکا دیئے۔[1]

مرا گر تو ندانی بپرس از شبہا ‖ بپرس از رخ زرد و خشکیٔ لبہا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرتِ ریاضت کی وجہ سے مولانا کا رنگ زرد پڑ گیا تھا

خورش:-

گرسنگی کو مولاناؒ نے اپنا خاص الخاص مسلک بنالیا تھا، مثنوی میں گرسنگی کے فضائل نہایت کثرت سے بیان فرمائے ہیں اور یہ جو کچھ لکھا ہے درحقیقت اپنا ہی حال ہے، گرسنگی کی حکمت و مصلحت کو جس تکرار کے ساتھ اور جس قدر مختلف پیرایوں میں ظاہر کیا ہے، اس کے لئے درر الحکم میں گرسنگی کے بحث کو دیکھنا چاہیئے، مناقب العارفین میں (صفحہ ۲۲۱ و ۲۲۳) گرسنگی کے فضائل کے متعلق مولانا کے بہت طول طویل اقوال منقول ہیں جن میں گرسنگی کے فوائد و منافع پر ایک تفصیلی تقریر عربی میں بھی ہے۔ اور اس کے مطالب کو فارسی کیا ہے مگر ان مباحث کے دقیق ہونے اور نیز خوف طول کی وجہ سے انھیں نقل نہیں کیا گیا۔ یہاں صرف ایک غزل کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن سے یہ واضح ہوگا کہ دیوان بھی اس ترغیب و تحریص سے خالی نہیں ہے،

زہے حلاوتِ پنہاں دریں خلائے شکم ‖ مثال چنگ بود آدمی نہ بیش نہ کم

---

[1] مناقب ص۱۶۳

چنانکہ گر شکم چنگ پُر شود مثلاً — نہ نالہ آید ازان چنگ نہ زیر نہ بم
اگر ز روزہ بسوزد دماغ اشکم تو — بسوز نالہ برآید ز سینہ ات ہر دم
ہزار پردہ بسوزی بہر دے زاں سوز — ہزار پایہ برآئی بہ ہمت و بقدم
شکم تہی شود ی نال چوں نے بہ نیاز — شکم تہی شود اسرار گو بسانِ قلم
چو پر شود شکست درزمان حشر آرد — بجائے عقل تو شیطان بجائے کعبہ صنم

(صلے ۵۷۲)

اپنے اصحاب کو بھی نہایت ہی شدومد سے اس جانب توجہ دلایا کرتے تھے سلطانؒ ولدؒ سے تو یہاں تک فرما دیا کہ میرا مسلک بس یہی ہے کہ "کم خوردن بلکہ ناخوردن" اکثر کئی کئی دن بغیر کچھ کھائے ہوئے سماع میں گزار دیتے تھے، جب کھاتے تھے، اس میں بھی نہایت اختصار مدنظر رکھتے تھے، بسا اوقات صرف دہی پر اکتفا فرماتے تھے اور اس میں چند دانے لہسن کے ملایا کرتے تھے۔

فاطمہ خاتونؒ (اہلیہ سلطان ولدؒ) کی روایت ہے کہ ابھی میری نئی شادی ہوئی تھی کہ ایک روز مولاناؒ نے آکر پوچھا کہ گھر میں دہی ہے، میں نے کہا کہ ہے مگر نہایت کھٹا ہے، فرمایا لاؤ، میں نے ایک بڑے پیالہ میں لاکر پیش کیا، فرمایا کہ بیس دانے لہسن کے کوٹ کر اس میں ملا دو تا لذیذ ہو جائے، پھر نصف شب کو آئے اور وہ دہی طلب کیا، اس میں کچھ باسی روٹیاں ملائیں اور کھانے لگے، میں نے جو اس دہی میں سے ذرا سا زبان پر رکھا تو زبان پر آبلے پڑ گئے، مگر مولاناؒ سب کا سب کھا گئے، اور اس کے بعد نماز تہجد میں مشغول ہوئے اور فجر تک نماز پڑھتے رہے۔[ملہ]

ملہ مناقب صلے ۲۴۳ صلے ۲۲۹

اسی ہی ایک روایت بہاء الدین بحری سے منقول ہے کہ مولاناؒ ایک مرتبہ آب گرم کو گئے تھے، میں بھی ساتھ تھا، مولاناؒ دس روز تک اسی آبگرم کے اندر رہے، نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ اتفاقاً ایک ترکی ایک بڑا پیالہ دہی کا لایا، مولاناؒ نے اس میں لہسن ملائے اور اسی کو کھالیا پھر سماع میں مشغول ہو گئے۔ [1]

مولاناؒ اگرچہ خود بھی کم خور تھے اور اپنے مریدوں کو بھی کم خوری کی ہدایت فرماتے تھے۔ مگر کم خوری سے مقصود یہ تھا کہ ترقیِ باطن حاصل ہو، ایک مرتبہ فرمایا کہ غذا جس قدر چاہو کھاؤ مگر اپنے کو نگاہ رکھو کہ تمہاری قوت امور دنیا میں خرچ نہ ہو جائے بلکہ حصول حکمت و استماعِ کلامِ اولیاء میں صرف ہوے

چونکہ لقمہ می شود در تو گہر   تن مزن چندانکہ بتوانی بخور

چونکہ در سدہ شود پاکت پلید   قفل نہ بر حلق و پنہاں کن پلید [2]

مثنوی شریف میں ایک حکایت کے ضمن میں راہِ اوسط کی تعریف کردی ہے۔
(ملاحظہ ہو حکایت تشنیع صوفیاں بر صوفئ بسیار خوار، دفتر دوم)

گفت راہِ اوسط ار چہ حکمت است   لیک اوسط نیز ہم بانسبت است

ہر کرا باشد وظیفہ چار ناں   دو خورد یا سہ خورد ہست اوسط آں

در خورد ہر چار دور از اوسط است   او اسیر حرص مانند بط است

ایک روز یہ ذکر ہوا کہ تعجب ہے کہ درویش سے گناہ سرزد ہو، فرمایا کہ درویش کا گناہ

---

[1] مناقب ص ۲۴۳

[2] ، ص ۲۹۸

یہ ہے کہ بغیر اشتہا کے کھانا کھائے، بے اشتہا کھانا درویش کے لئے گناہ عظیم ہے آدمی اگر انتہائی بھوک کی حالت میں زہر بھی کھالے گا تو وہ بھی گوارا ہو جائے گا اور سیری شکم کی حالت میں شکر بھی زہر کا کام دے گی، حالتِ اشتہا میں صاحبدل کے لئے ہر چیز مباح ہے ؎

توصاحب نفسی ای عاقل میان لقمہ خون میخور   کہ صاحبدل اگر زہری خورد آن انگبین باشد[۱]

ایک روز فرمایا کہ انسان کے جسم میں تین ہزار سانپ ہیں، ایک لقمہ سے ہزار سانپ زندہ ہو جاتے اور تین لقموں میں سے اگر ایک لقمہ کم کر دو تو ہزار سانپ مر جاتے ہیں۔[۲]

مولاناؒ کی یہ تمام کم خوری و ناگوار خوری ریاضت کی بنا پر تھی عجز کی بنا پر نہیں تھی، قدرت ولایت کا ایک کرشمہ ملاحظہ ہو۔

نورالدین کی روایت ہے کہ میرے وہاں سماع میں مولاناؒ نے سولہ روز تک نہ کچھ کھایا نہ پیا، عالم وجد میں رہے، پھر کھانا طلب کیا، لوگ لاتے تھے اور مولاناؒ کھاتے جاتے تھے، پچاس پیالے کھا گئے اور حالت میں کچھ فرق نہ ہوا[۳]

۱؎ مناقب ص۲۹۸

۲؎ مناقب ص۲۰۵

۳؎ " " ص۱۰۹

وہی کے علاوہ لہسن بھی آپ کو بہت پسند تھا اکثر کچے بھی کھایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ آنحضرتؐ حضرت علیؓ سے فرمایا کرتے تھے کہ "کل الثوم" شاید اس میں کوئی حکمت ہوگی ؎۱

"فقاع" بھی آپ کی مرغوب اشیاء میں تھا، اسے آش جو سمجھنا چاہیئے جس میں شربت فواکہ شامل کر لیا گیا ہو۔

ایک روز فرمایا کہ اس عالم سے میں نے تین چیزیں اختیار کر لی ہیں، سماع، فقاع اور حمام ؎۲

مولاناؒ کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ ہمیشہ ہلیلہ زرد منہ میں رکھتے تھے، لوگوں نے اس کی مختلف تاویلیں کی ہیں، چلپی حسام الدین کا خیال تھا کہ آپ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ منہ کا مزا شیریں رہے ؎۳

لباس :-

اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ شمس الدینؒ کی غیبت ثانی کے بعد مولاناؒ نے لباس کی وہ خاص وضع اختیار فرمائی تھی جو آپ کے فرقہ کا شعار ہو گیا، اس وضع خاص میں قمیص کے آگے سے کھلے ہونے کی ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے کہ راستہ چلتے سائل مل جاتے اور کچھ نہ

؎۱ مناقب ص۱۱۶ ؎۲ مناقب ص۲۴۳ منقول ہے کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے دنیا سے تین چیزیں اختیار کر لی ہیں، عورت، خوشبو، اور نماز (وقرۃ عینی فی الصلوٰۃ) پس مولاناؒ نے اس سے زاید دنیا سے جو کچھ اختیار کیا وہ بھی تین چیزیں تھیں جنہیں حظ نفس کو بہت کم دخل تھا۔

؎۳ سپہ سالار ص۴۴، مناقب ص۲۱۰

ہوتا تو مولانا کپڑے اتار کر دیدیا کرتے تھے اور اسی غرض سے قمیص آگے سے کھلی ہوتی تھی کہ اتارنے میں دقت نہ ہو، اس کے سوا آپ کی عادت میں یہ بات بھی داخل تھی کہ سماع میں جب وجد میں آتے تو کپڑے قوالوں کو دیدیا کرتے تھے، آپ کے مخلصان خاص میں ایک صاحب خواجہ مجدالدین تھے، ان کے پاس جو کچھ تھا سب مولانا پر فدا کر دیا تھا اگر کپڑوں کے کئی صندوق رکھے ہوئے تھے، جب مولانا حالتِ وجد میں کپڑے قوالوں کو دیدیتے تو فوراً دوسرے کپڑے حاضر کر دیتے تھے۔ [1]

{ برکت اخلاص:۔

مجدالدین کے پاس بکریاں بہت تھیں، مغلوں کی شورش کے زمانہ میں بہت متشوش ہوئے کہ کیا کروں، مولانا سے عرض کیا، فرمایا کچھ فکر نہ کرو، ایسا ہی ہوا کہ مغول حوالی قونیہ سے تمام مویشی ہانک لے گئے مگر مجدالدین کی ایک بکری بھی ضائع نہیں ہوئی }

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حالت سماع میں مولانا اکثر آستین چڑھائے رہا کرتے تھے جس کا خاص مقصود آپ ہی نے بیان فرمایا ہے، چنانچہ ایک روز عین حالت سماع میں آپ نے خواجہ نفیس الدین کا گریبان پکڑ لیا اور پوچھا کہ اگر کوئی تم سے سوال کرے کہ مولانا آستین کیوں چڑھائے رہتے ہیں تو کیا جواب دو گے؟ انھوں نے کہا کہ جو آپ فرمائیں، کہا کہ تمام دنیا مثل خانقاہ کے ہے اور شیخ حقیقی خدائے تعالیٰ ہے تمام انبیا اولیا اور خواص امت مثل مسافر صوفیوں کے ہیں، اگر کوئی مسافر صوفی خانقاہ میں آئے تو دیکھے گا

---

[1] مناقب ص۱۵۲

کہ آستین کون چڑھائے ہوئے، سمجھے گا کہ یہ خادم ہے، پس اس وقت میں خانقاہ عالم کا خادم ہوں [۱]

اثاث البیت:۔

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ فضول خرچی اثاث البیت وغیرہ میں ہے، کھانے میں فضول خرچی نہیں ہے، پس مولانا جب کھانے تک میں تنوع روا نہ رکھتے تھے تو ساز و سامان میں کب اسے جائز رکھتے، حالت یہ تھی کہ آپ کی محفل میں چراغ کے سوا شمع نہیں جلتی تھی۔[۲]

تکلف سے بیزاری:۔

مولاناؒ کے خورد و نوش، ساز و سامان کی جو حالت تھی وہ بیانات مذکورۂ بالا سے واضح ہو چکی ہے ایسی حالت میں تکلف کی گنجائش ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے اور اگر کچھ گنجائش ہو بھی تو مولاناؒ خود اس سے بیزار تھے، مولاناؒ اگرچہ اہل دنیا کی آرائش و زیبائش اور اظہار تمول کی مخالفت نہیں کرتے تھے بلکہ مصالح مسلمین کے اعتبار سے اسے مفید سمجھتے تھے مگر خود ان باتوں سے کوسوں دور تھے اور اپنے اصحاب خاص کے لئے بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ سلطان ولدؒ دستار باندھ رہے تھے، کنارہ ٹھیک نہیں بیٹھا کھول کر پھر سے باندھنے لگے، مولاناؒ نے فرمایا کہ بہاء الدین دوبارہ نہ باندھو اور تکلف و رعونت میں نہ پڑو، میں نے بھی جوانی میں ایک مرتبہ دستار کو دوبارہ باندھا تھا، حضرت خضر نے مجھ سے ملنا چھوڑ دیا اور مدت تک ان کی صحبت سے

---

[۱] مناقب ص ۱۳۲

[۲] ” ص ۲۰۷-۲۰۸

ضمیمۂ دوم

اقتباس حالاتِ مولانا

از

مثنوی سلطان ولد

محروم رہا، سلطان ولدؒ پر اس کہنے کا اس قدر اثر ہوا کہ اس کے بعد سے آپ نے اپنے ہاتھ سے دستار کا باندھنا ہی ترک کر دیا، دوسرے لوگ جس طرح باندھ دیتے تھے آپ اسی طرح سر پر رکھ لیتے تھے۔ [1]

"حمام" چشمۂ آب گرم۔

سماع کے بعد اگر مولاناؒ کو کسی شئے سے اگر دلی رغبت تھی تو وہ "حمام" تھا، اکثر ایسا ہوتا تھا کہ سماع سے جب فارغ ہوتے حمام میں چلے جاتے تھے اور کئی کئی دن وہیں گزار دیتے تھے، حقائق و معارف کے بیان کا سلسلہ وہاں بھی جاری رہتا تھا، بس اوقات سب سے الگ ہو کر مشاہدات میں غرق ہو جاتے، اس حالتِ استغراق میں کبھی کبھی پانی کے حوض میں جا بیٹھتے تھے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سماع اور شب بیداری کی تھکن رفع کرنے کے لئے مولاناؒ حمام میں جایا کرتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی ریاضت سے خالی نہیں تھا۔ [اولیاء اللہ کے حالات و عادات بھی کچھ عجیب حیرت افزا ہیں، ایک طرف مولاناؒ کی یہ حالت تھی کہ حمام سے گویا آپ کو عشق تھا اور دوسری طرف خراسان میں ایک دوسرے بزرگ عبداللہ بن المبارک (۱۱۸ھ-۱۸۱ھ) کا حال یہ تھا کہ ساری عمر کبھی حمام میں نہ گئے]

مولاناؒ جب حمام میں جانے لگتے تو اکثر آپ کی حرم محترم کرا خاتون آپ کے اصحاب سے یہ فرمائش کر دیا کرتی تھیں کہ مولاناؒ کا خیال رکھیں کیونکہ خود آپ کو اپنی ذات کی مطلق فکر نہ تھی، احباب قالین اور عرق چین ہمراہ لے جاتے، قالین سردابہ میں بچھا دیا کرتے

---

[1] مناقب ص ۲۶۳

تھے۔ مولاناؒ کبھی کبھی وہاں آرام کرتے اور کبھی کبھی سر بھی دبوا لیا کرتے تھے لیکن اتنی آسائش بھی گوارا نہیں تھی، ایک روز عین جاڑوں کے موسم میں حمام کے اندر گئے اور فوراً ہی نکل کر باہر چلے گئے، آپ کے احباب پیچھے پیچھے پہنچے، دیکھا کہ برف پر کھڑے ہیں اور سر پر برف رکھے ہوئے ہیں، لوگوں نے فریاد شروع کی، فرمایا کہ "نفسم بدی آموز و گستاخ می شود لله الحمد و لمنّہ ما از آں فرعون نیستم، از آں پادشاہیم کہ سلطان فقر ابود" فوراً ہی دستار و فرجی پہن کر روانہ گئے[۱]۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حمام بھی آپ نے حظ نفس کیلئے نہیں اختیار کیا تھا اور نفس کی تادیب کے نسبت تو جسقدر اشعار مثنوی میں ہیں ان سے ایک پورا دستور العمل بن سکتا ہے اور مولاناؒ نے قولاً جو کچھ کہا ہے عملاً اس سے زیادہ کرتے تھے۔

قونیہ سے قریب آب گرم کا ایک چشمہ تھا، مولاناؒ عادتاً سال میں ایک بار وہاں بھی جایا کرتے تھے، چالیس پچاس دن قیام کرتے[۲] اس موقعہ پر آپ کے اصحاب بھی ساتھ ہوتے تھے۔ یہ مختصر سفر و قیام بھی وعظ و تذکیر سے خالی نہیں رہتا تھا۔

چلپی حسام الدینؒ اور بعض دیگر اصحاب کے باغ میں بھی کبھی کبھی تشریف لے جاتے اور ایک آدھ دن قیام فرماتے تھے، اسے اگر تفریح کہا جائے تو آپ کی تفریح جو کچھ تھی بس یہی تھی۔

شہرت سے اجتناب:۔

مولاناؒ کو شہرت اور جاہ طلبی سے نہایت استکراہ تھا، حالاتِ سفر میں ذکر

---

[۱] مناقب صـ ۷۹ - ۸۰

[۲] ، صـ ۱۰۵

ہوچکا ہے کہ حلب سے اسی وجہ سے چلے گئے تھے کہ لوگوں میں شہرت ہو گئی تھی [۱] مگر معلوم ہوتا ہے کہ قوانین ولایت میں یہ بھی ایک قانون ہے کہ جو اولیا اللہ شہرت سے جتنا ہی بھاگتے ہیں اتنی ہی ان کی شہرت زیادہ ہوتی ہے، یہی حال مولانا کا تھا، ایک روز مولانا اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے کہ جب سے میری شہرت ہوئی اور لوگ میرے زیارت کو آنے لگے میں ایک آفت میں مبتلا ہو گیا ہوں، سچ فرمایا ہے آنحضرت صلعم نے کہ "الشہرۃ آفۃ والراحۃ فی الخمول" مگر کروں کیا حکم خدا یوں ہی ہے اپنے اصحاب کو بھی آفت شہرت سے محترز رہنے کی ہدایت فرمایا کرتے تھے۔[۲]

خویش را رنجور سازی زار زار | تا ترا بیروں کنند از اشتہار
کاشتہار خلق بند محکم است | در رہ ایں از بند آہن کے کم است

مثنوی شریف کے علاوہ دیوان میں بھی نہایت کثرت سے اس جانب اشارہ فرمایا ہے، پچھتر فیصدی غزلوں کے آخر میں خود اپنے نفس سے خاموش رہنے کا خطاب کیا ہے تا آنکہ بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ "خاموش" مولانا کا تخلص تھا فرماتے ہیں کہ

خاموش نشیں و مستمع باش | نے واعظ خلق شو، نہ قاری

(ص ۸۶۶)

یہاں ایک خدشہ یہ لاحق ہوتا ہے کہ جب مولانا شہرت کو اس درجہ ناپسند کرتے

---

[۱] مناقب ص ۵۴

[۲] " ص ۲۳۳

تھے تو گوشۂ خمول کیوں نہیں اختیار کر لیتے تھے، یہ بجائے خود ایک نازک مسئلہ ہے۔ جس کا ایک مقبولِ عام جواب تو یہ ہے کہ اصحابِ باطن جب درجۂ کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ تو انھیں اس شہرت و اختلاط سے کچھ ضرر نہیں پہنچتا، اولیا اللہ کے ذکر میں مولاناؒ نے مثنوی شریف میں خود فرمایا ہے کہ ؎

پیشِ خلق ایشاں فراز صد کہ اند　　گام خود بر چرخ ہفتم می نہند

پس چرا پنہاں شود کہ جو بود　　کہ زصد دریا دکہ آنسو بود

دوسرا جواب مسئلۂ خاص یہ ہے کہ اولیا اللہ کا اظہار و استتار دونوں حکم خداوندی کے تابع ہے، جن افراد سے عام نفع رسانی متصور ہوتی ہے، انھیں اخفا کی اجازت نہیں ہوتی، اگر مخفی ہونا چاہیں تو بھی نہیں ہو سکتے، جن سے خاص نفع رسانی مقصود ہوتی ہے انھیں پردۂ خفا میں رکھا جاتا ہے اور وہ زمرۂ اولیا مستور میں ہوتے ہیں ؎

قوم دیگر سخت پنہاں میروند　　شہرۂ خلقان ظاہر کے شوند

مولاناؒ صنفِ اول میں تھے، حضرت شمسؒ تبریز صنفِ دوم میں۔

مولاناؒ اگرچہ شہرت سے اس درجہ کارہ تھے مگر خود نفسِ انقطاع کے متعلق آپ کا جو خیال تھا وہ واقعۂ ذیل سے بخوبی ظاہر ہو جائے گا۔

مولاناؒ کے والد سلطان العلماء کے شاگردوں میں ایک صاحب خواجہ فقیہ احمد تھے، ہدایہ پڑھتے تھے۔ ایک روز اسی ضمن میں سلطانؒ العلماء نے ایسے حقائق و معارف ارشاد فرمائے کہ فقیہ گھبرا اٹھے، کتابیں آگ میں ڈال دیں اور گورستان کی راہ لی، جبتک سلطانؒ العلماء زندہ رہے قونیہ میں نہیں آئے، آپ کی رحلت کے بعد شہر کے ایک دروازہ میں بیٹھے رہا کرتے تھے، بہت مشہور ہو گئے تھے، مولاناؒ کو جب

آتے دیکھتے بیساختہ شور مچاتے، مگر مولاناؒ نظر بچا جاتے اور فرماتے کہ "وہ اہل اقتدار میں سے نہیں ہیں، مقتدی مخلص وہ ہے جو بجمیع الوجوہ اپنے مقتدا کی متابعت کرے، یہ صاحب یکہ و تنہا اپنی کملی بچالے گئے اور نجات پاگئے ہیں، ایسے لوگوں کو عالم غیب اہل فتوت کہتے ہیں۔" (فقیہ کا جب انتقال ہوا، مولانا کو از روئے کشف اس کی اطلاع ہوگئی۔ زبان مبارک سے نکلا کہ "روح پاک فقیہ را ملائکہ کرام بآسمان میبرند" پھر جا کر ان کی نماز جنازہ پڑھی[1] اس سے واضح ہوتا ہے کہ مولاناؒ اگرچہ ایسے لوگوں کے منکر نہیں تھے مگر اپنی تنہا جانبری کے بہ نسبت خدمت خلق کو مقدم سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ اس تمام استکراہ و اجتناب کے باوجود آپ خلق سے کنارہ کش نہیں ہوتے تھے اور ہمہ وقت فیض رسانی عام میں مشغول رہتے تھے۔

ازدحام سے گریز:-

باایں ہمہ ہر کام کی ایک حد ہوتی ہے، مولاناؒ بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے تا امکان لوگوں سے ملتے مگر جب کثرت ازدحام سے پریشان ہو جاتے تو کہیں روپوش ہو جایا کرتے، اکثر حمام میں جا بیٹھتے تھے، وہاں بھی لوگ جمع ہو جاتے تو خزانہ آب میں گھس جاتے ایک مرتبہ تین دن تک خزانہ آب میں بیٹھے رہے، تیسرے دن چلپی حسام الدینؒ نے بہت عجز و الحاح کی جب باہر نکلے، نہایت ہی کمزور معلوم ہوتے تھے چلپیؒ نے عرض کیا کہ ضعف نہایت ہو گیا ہے .... اگر ہم بے چاروں کی خاطر سے تقویت کی کچھ فکر فرمائیں تو کیا مضائقہ ہے، فرمایا کہ پہاڑ ایک مرتبہ کی تجلی کو برداشت نہ کرسکا، میرا یہ ضعیف جسم

---

[1] مناقب ص۲۵۱-۲۵۲

تین دن کے اندر سترہ مرتبہ کی تجلی کو کس طرح برداشت کرتے ۔

بعض اوقات ایسا ہوتا کہ حالت استغراق میں شراب خانوں میں جا کر بیٹھ رہا کرتے تھے تا لوگوں کو خبر نہ ہو اور وقت خراب نہ کریں مگر جس شراب خانہ میں اس طرح وارد ہونے کا اتفاق ہوتا امرا و اکابر اسے مسجد بنا دیتے تھے۔[۲] مولانا نے متعدد غزلوں میں خود اس طرف اشارہ فرمایا ہے ۔

در خانۂ خمار و خرابات کہ دیداست ۔۔۔ معراج و تجلی نہ مقامات بلندی

در کوئے خرابات مرا عشق کشاں کرد ۔۔۔ واں دلبر عیار مرا دید نشاں کرد

دیوان میں ایک کثیر تعداد ایسی غزلوں کی ہے جن کا مطلع "باز آمدم باز آمدم" سے شروع ہوتا ہے، یہ غزلیں تمام تر ایسے ہی مواقع پر لکھی گئی ہیں ۔

---

[۱] سپہ سالار ص۵۲ مناقب ص۲۰۵

[۲] جہاں ہم خشت خم رکھدیں بنائے کعبہ پڑتی ہے ۔۔۔ جہاں ساغر پٹک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے (اریانی)

[۳] سپہ سالار ص۲۴ ۔ یہ آخری شعر ایک خاص واقعہ سے متعلق ہے ۔

ایک مرتبہ مولانا نے وعظ کا وعدہ فرمایا تھا، لوگ وقت مقررہ پر جمع ہو گئے اور مولانا کا کہیں پتہ نہ تھا، بہت جستجو کے بعد سراغ لگا کہ ایک شراب خانہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، چلپی حسام الدینؒ گئے اور وہاں سے لائے، آپ بعد نماز منبر پہ تشریف لائے اور یہ دو شعر پڑھے ؂

اے خوشا شب کہ وصال یار ایاد دش بود ۔۔۔ مشتری در طالع و خورشید در آغوشش بود

ہر قدح کز نے مغن دادے بیگنہ ہوش دار ۔۔۔ اے مسلماناں درا حالت چہ جائے ہوش بود

مولاناؒ کا یہ تمام گریز زیادہ تر اس وجہ سے تھا کہ آپ اپنے حق میں لوگوں کی تعظیم و تکریم کو ناپسند کرتے تھے، ایک روز تنہا کسی طرف کو چلے جا رہے تھے، شیخ بدرالدین نقاش اور مولانا سراج الدینؒ تبریزی بھی اسی طرف جا رہے تھے مگر مولاناؒ کو تنہا دیکھ کر دور ہی دور رہے، مولاناؒ نے پلٹ کر دیکھا، ان لوگوں پر نظر پڑی تو فرمایا کہ تم لوگ تنہا آؤ، میں کثرت کو پسند نہیں کرتا اور خلق سے میرا یہ تمام گریز شوئی دستبوس اور سر جھکانے کی وجہ سے ہے۔ مولاناؒ اس تعظیم سے بہت رنجیدہ ہوتے تھے لیکن خود لوگوں کی تعظیم و توقیر میں کمی نہیں کرتے تھے ؎۱

غیرت :-

غیرت کا مادہ مولاناؒ میں بہت زیادہ تھا، مثنوی شریف میں مولاناؒ نے خود اس کی توجیہ فرمائی ہے کہ ع ہر کہ زیبا تر بود رشکش فزوں

جس قدر کمال زیادہ ہوتا ہے، اسی قدر غیرت بھی زیادہ ہوتی ہے، سلطان رکن الدین کا واقعہ دوسری جگہ تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے کہ اس نے پہلے مولاناؒ کو اپنا باپ کہا تھا، پھر ایک دوسرے درویش شعبدہ باز کے نسبت ایسا ہی کہا تو مولاناؒ نے اسی وقت فرمایا کہ انھوں نے دوسرے کو اپنا باپ بنایا ہے تو ہم کسی دوسرے

(بقیہ حاشیہ ص۳۱۸)
جذب روحانی کا اثر تھا کہ لوگ انھیں دو شعروں میں مست ہو گئے اور مجلس میں شور و فغاں برپا ہو گیا (آگے چل کر دیوان کی بحث میں معلوم ہوگا کہ مولاناؒ کے اشعار محض خیال آرائی پر ہی نہیں ہوتے تھے، اکثر و بیشتر غزلیں کسی نہ کسی واقعہ سے تعلق رکھتی ہیں۔)

؎۱ مناقب ص۱۱۸

کو بیٹا بنالوں گا۔ اس طرح جب مولانا کی اہلیہ کرا خاتونؒ بعض دوسرے مستورات کے کہنے سے ایک درویش کے کرامات کا مشاہدہ کرنے گئیں تو مولاناؒ ان سے نہایت ناخوش ہوگئے، اس غیرت ہی کا اثر تھا کہ مولاناؒ کی طبیعت میں یہ مرکوز ہو گیا تھا کہ آپ ایک وقت میں دو شخصوں کی طرف التفات خاص نہیں رکھتے تھے، ایسمیں اس حد تک غلو تھا ایک روز سلطان دلدؒ سے فرمایا کہ شیخ صلاح الدینؒ کے سامنے شمس الدینؒ کا تذکرہ نہ کیا کرو اور چلپی حسام الدینؒ کے روبرو شیخؒ کا مذکور درمیان نہ لایا کرو اگرچہ ان کے انوار میں اتحاد کلی ہے اور کوئی فرق فیما بین نہیں ہے مگر غیرت الٰہی کارفرما ہے، بس ایسا نہ کرنا چاہیے، ادب شیخؒ اس کا مانع ہے،

غیرت عقل است بر خوبی روح پُر ز تمثیلات و تشبیہ ای نصوح

سلطان ولدؒ کی یہ بھی روایت ہے کہ دمشق میں مولاناؒ کے ایک خاص دوست حمید الدینؒ تھے، آپ بھی اولیا کاملین میں سے تھے، جب مولاناؒ دمشق سے روم کی جانب روانہ ہونے لگے تو میں نے (سلطان ولدؒ) کہا کہ شیخ حمید الدینؒ کو بھی ساتھ لیتا چلوں۔ فرمایا کہ وہاں ہمارے شیخ صلاح الدینؒ موجود ہیں، ان کا وہاں لے چلنا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ دو ولی مثل دو شیروں کے ہیں، ایک جگہ نہیں رہ سکتے، میں نے پوچھا کہ تو پھر خود جناب دونوں سے کس طرح نباہ کر سکتے ہیں، فرمایا کہ "پدر شفق با ہمہ فرزندان خود می تواند ساختن، اما فرزندان با ہم گر نسازند"[۱]

سخت کلامی :- مناقب العارفین کی بعض روایتوں کے پڑھنے سے بادی النظر

---

[۱] ذکر شیخ صلاح الدینؒ (نسخہ قلمی ص ۴۳۹)

میں یہ گمان ہوتا ہے کہ مولانا بسا اوقات سخت و درشت الفاظ استعمال کیا کرتے تھے مثلاً غرخواہر[1] بے ادب، گستاخ، خر بے تمیز، نامرد لیکن اس قسم کی تمام روایتوں کے استقصا سے صاف یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کہیں ایک جگہ بھی اپنے ذاتی معاملہ سے متعلق کوئی سخت لفظ نہیں استعمال کیا ہے، اس قسم کے الفاظ ہمیشہ ایسے ہی مواقع پر آپ کی زبان سے نکلے ہیں جب کسی نے اہل طریقت اور بالخصوص آپ کے اصحاب کے نسبت کوئی ناواجب بات کہی ہے، چونکہ آپ کی طبیعت نہایت زود رنج واقع ہوئی تھی اس لئے جب ایسی باتیں سنتے تھے جوش میں آجاتے تھے اور بیساختہ اس قسم کے الفاظ آپ کی زبان سے صادر ہو جاتے تھے لیکن جب گہری نظر سے دیکھا جائے تو اول تو اس قسم کے الفاظ کے آپکا مقصود ان کے حقیقی معنی نہیں ہوتے تھے (مثنوی شریف کی تحت تخاطب کو دیکھیں تو بہت سے الفاظ ایسے ملیں گے جو کریہہ و سخت ہیں مگر مقصود ان سے محض خطاب ہے) دوسرے یہ کہ اہل اللہ کی زبان سے اس قسم کے جو الفاظ نکل جاتے ہیں ان کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے ؎

کفر و ایماں نیست آں جائے کہ اوست ° زانکہ او مغز است ایں دو رنگ و پوست

اولیا اللہ اس سے بالاتر ہیں کہ کسی پر عیب لگائیں لیکن اگر فی الحقیقت مقصود عیب ہی ہوتا ہے تو یا تو وہ عیب اس شخص میں واقعاً موجود ہوتا ہے اور نہیں ہوتا ہے تو اولیا اللہ کے زبان سے ارادۃً اس قسم کے الفاظ نکل جانے سے لاحق ہو جاتا ہے

---

[1] افلاکی نے لکھا ہے کہ مولانا جب کسی سے رنجیدہ ہوتے اور رنجیدگی حد سے بڑھ جاتی تو اسے "غرخواہر" کہکر مخاطب کرتے جسکی وجہ یہ ہے کہ خراسان میں عام طور پر ایسا ہی کہتے ہیں۔ مناقب ص ۹۵

ہرچہ گوید مرد عاشق بوئے عشق | از دہانش می جہد در کوئے عشق
گر بگوید فقہ فقر آید ہمہ | بوئے فقر آید ازاں خوش دمدمہ
ور بگوید کفر دارد بوئے دیں | آید از گفت شکش بوئے یقیں

خود مولانا کی نسبت متعدد روایتیں اس قسم کی منقول ہیں کہ آپ نے بعض اشخاص کی نسبت بعض الفاظ استعمال کئے، واقعی ان کا وہی حال ہوا ایک بہت تفصیلی روایت شیخ ناصر الدین رحم کی نسبت مناقب العارفین کے صفحہ (۱۱۷) پر منقول ہے کہ انھوں نے مولاناؒ کو دور سے دیکھ کر اپنے مریدوں سے کہا کہ یہ شخص کس قدر تاریک صورت اور باریک طریقت رکھتا ہے، دستار خانی اور فرجی کبو پہن لی ہے، معلوم نہیں سیرت کیسی ہے اور طریقت کیا ہے اور ان کا خرقہ کس شخص تک پہنچتا ہے؛ مولانا کو بھی از روئے کشف معلوم ہوگیا، فرمایا کہ "اے خربے تمیز" ناصر الدین کا حال اسی وقت سے نہایت زبوں ہوگیا۔

شگون :-

مولانا شگون وغیرہ کے قائل نہیں معلوم ہوتے، جب آپ اظہار اعتقاد علی اللہ کے لئے ایسے امور اپنے اوپر گوارا کر لیتے تھے جو قواعد طبعی کے مطابق صریحی مہلک ہوں تو شگون کی آپ کے نزدیک کیا حقیقت ہو سکتی تھی، روایت ہے کہ مولانا ایک روز پیراہن پہنے ہوئے تھے اور آپ کی حرم محترم اس میں ایک بند ٹانک رہی تھیں، لوگوں کا خیال ہے کہ کپڑے پہنے ہوئے ٹانکنا نہ چاہئے اگر ایسا اتفاق ہو

تو کوئی چیز منہ میں رکھ لینا چاہیے' یہ خیال خاتون محترم کے دل میں گزرا' مولانا نے فرمایا کہ بے فکر نہ کرو' میں نے قل ہو اللہ احد کو منہ میں رکھ لیا ہے [۱]

اہل وعیال کی محبت۔

محبت مولانا کے خمیر میں داخل تھی۔ اپنے اصحاب ومریدین کے ساتھ مولانا کو جو انس تھا اس کا بیان دوسرے مواقع پر ہوا ہے' اپنے اہل وعیال کے ساتھ بھی آپ کی محبت درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔

سلطان ولدؒ سے آپ کو خصوصیت کے ساتھ جو الفت تھی وہ آپ کے تمام سوانح سے ظاہر ہے' ان کی ادنیٰ آزردگی بھی آپ کو گوارا نہ تھی اور ان کے دل خوش کرنے کے لئے آپ اکثر ایسے دلچسپ پیرایہ اختیار کرتے تھے کہ روتا ہوا آدمی بھی ہنس دے' ادھر منقول ہو چکا ہے کہ ایک مرتبہ سلطان ولدؒ کے بھائی علاء الدینؒ نے ان کے کچھ دینار نکال لئے تھے' سلطان ولدؒ ان پر ناخوش ہو رہے تھے مولاناؒ نے فرمایا کہ "علی جبر نہ کرے تو کیا کرے"[۲] (علی حرف جر ہے اور جر کے معنی کشش کے بھی ہیں)

بعض اوقات خود اپنے وقار کا بھی خیال نہیں فرماتے تھے' چنانچہ حضرت سلطان ولدؒ ہی کی روایت ہے کہ ایک روز میں سخت افسردہ تھا' مولاناؒ مدرسہ سے آئے تو فرمایا کہ تم کس سے رنجیدہ ہوئے کہ پیشانی پر بل پڑے ہوئے ہیں؟ میں نے کہا کہ

---

[۱] مناقب ص ۱۴۹

[۲] ص ۲۶۹

ہ کچھ معلوم نہیں کہ کیوں میری یہ حالت ہے؟ اٹھ کر اندر تشریف لے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد ایک بھیڑیے کا چمڑا اسر اور منہ پر ڈالے ہوئے نکلے اور میرے نزدیک پہنچکر "بع بع" کرنے لگے، گویا مجھے ڈراتے تھے، مجھے سخت ہنسی آئی، فرمایا کہ "بہاء الدین اگر کوئی شخص ہر وقت تمہارے ساتھ رہتا ہو اور دفعۃً اپنی صورت بدل کر آئے اور تمہیں ڈرائے تو ڈر نہ معلوم ہوگا" میں نے کہا نہیں، فرمایا کہ "جو تمہیں ہمیشہ خوش رکھتا تھا کیونکر ہو سکتا ہے وہ تمہیں غمگین کرے" میری طبیعت کشادہ ہو گئی اور پھر مجھے کبھی انقباض نہ ہوا

چوں لباس قہر پوشد چوشیر بشناسمش   چوں بدیں شیوہ بر ما بارہا ست آمدست[1]

علیٰ ہذا مولانا کی صاحبزادی ملکہ خاتون نے ایک مرتبہ اپنے شوہر خواجہ شرف الدین کے بخل کی شکایت کی فرمایا کہ اچھا کرتا ہے، اگر ممسک مال جمع نہ کریں تو دنیا کا مال کیسے جمع ہو، پھر ایک دولتمند بخیل کی حکایت بیان کی کہ نماز جماعت کے لئے مسجد میں گیا تھا، اتفاق سے خیال آیا کہ شاید چراغ بے سرپوش رہ گیا ہے، فوراً مکان کو آیا اور لونڈی کو آواز دی کہ دروازہ نہ کھول کر چراغ پر سرپوش رکھدے، لونڈی نے پوچھا کہ دروازہ کیوں نہ کھولوں کہا دروازہ کی چول نہ گھسے، لونڈی نے کہا آپ اتنا راستہ طے کرکے آئے آپکے جوتے نہ گھسے، کہا جوتے بغل میں لیکر آیا ہوں، صاحبزادی یہ سن کر ہنس دیں اور ان کے دل کو اطمینان ہو گیا[2]

فاطمہ خاتون (زوجہ سلطان ولد) کی جس درجہ دلداری کرتے تھے وہ اس خط سے واضح

---

[1] مناقب ص ۱۳۵

[2] ،، ص ۱۹۱-۱۹۲

ہے جو سلطان ولدؒ کی رنجیدگی کے اشتباہ کی حالت میں فاطمہ خاتونؒ کو لکھا تھا،

حبّ وطن۔

مولاناؒ نے (بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ حضرت سلطان العلماء نے) بلخ کو ترک کرنے کے بعد قونیہ کو اپنا وطن بنایا تھا اور آج تک آپ کا سلسلہ ظاہری و باطنی وہاں جاری ہے، اس وطن پذیری کے بعد آپ کو اہل روم کے ساتھ بالعموم اور اہل قونیہ کے ساتھ بالخصوص محبت والفت کا ہو جانا طبعی امر تھا۔ قونیہ کو آپ خاص اپنا شہر سمجھتے اور اسے اپنی "ولایت" میں تصور فرماتے تھے، آگے چل کر کرامات کے ذیل میں ذکر ہوگا کہ باجو خاں کے حملہ کے وقت آپ نے بذات خاص قونیہ کی حفاظت میں مدد فرمائی اور کیتغاتو خاتون کے محاصرہ کے وقت آپ کے روحانی تصرف نے شہر کو بچایا۔

یہ بار بار ذکر ہو چکا ہے کہ "محبت" مولاناؒ کے سرشت میں داخل تھی، پھر کیونکر ممکن تھا کہ اپنے وطن جدید سے آپ کو محبت نہ ہوتی، روم اور قونیہ کا جب ذکر آتا نہایت محبت آمیز الفاظ استعمال فرماتے تھے، مناقب العارفین میں اس قسم کی متعدد روایتیں منقول ہیں اور ضمنی طور پر تو بہت کثرت سے ایسے جملے اور فقرے مل سکتے ہیں جن سے اس ملک و شہر کے متعلق مولاناؒ کے لطف آمیز خیالات کا اندازہ ہو سکے، مگر ان سب کا احصاد شوار ہے، یہاں صرف چند روایتیں نقل کی جاتی ہیں جن سے اس باب میں مولاناؒ کے خیالات کا کچھ سرسری اندازہ ہو سکے گا۔

ایک روز مولاناؒ حقائق و معارف کے بیان میں سرگرم تھے، اس ضمن میں فرمایا کہ اہل روم

علہ مناقب صـ ۱۵۲-۱۵۴ باجو خاں کے متعلق فصل پنجم دیکھنا چاہیے۔

پر خدائے تعالیٰ کی عنایت عظیم ہے اور خطۂ روم دنیا میں بہترین خطہ ہے لیکن اس ملک کے لوگ مالک الملک کے عشق اور ذوق درون سے بے خبر تھے، مسبب الاسباب نے عالم بے سببی سے ایک سبب پیدا کر دیا کہ ملکِ خراسان سے ولایت روم میں پہنچایا اور اس خاک پاک کو میرے اعقاب کا ماویٰ بنایا تاکہ ہم اپنے علم لدنی کو یہاں کے لوگوں پر نثار کریں اور یہ لوگ کیمیا بن جائیں اسی سلسلہ میں فرمایا کہ جب میں نے دیکھا کہ یہ لوگ حق کی طرف مائل نہیں ہوتے اور اسرار الٰہی سے محروم ہیں تو میں نے لطائف سماع اور شعر موزوں کے ذریعہ سے معارف وحقائق کو ان کے حسب حال بنا دیا ؎۱

ایک مرتبہ شیخ صلاح الدین نے اپنے باغ کی تعمیر کیلئے کچھ ترک مزدور مقرر فرمائے مولانا نے سنا تو فرمایا کہ رومی مزدور مقرر کرنا چاہیے تھا، کیونکہ ترکوں کا کام خراب کرنا اور رومیوں کا کام عمارت کرنا ہے ؎۲۔

ایک دوسرے موقع پر بھی فرمایا کہ "عاقبت الامر خرابی شہر قونیہ ہم از دست ظلمہ

؎۱ مناقب ص۱۲۱

؎۲ یہاں ترکوں سے مراد تاتاری ہیں، آل عثمان کا غلبہ اس وقت تک نہیں ہوا تھا اور آل سلجوق زیادہ تر سلجوقی کہلاتے تھے، خود مولانا کی زبان سے تاتاریوں کی نسبت جا بجا ترکوں کا لفظ منقول ہے ابن خلدون تک نے "ظہور تاتر" کے عنوان کو ان الفاظ سے شروع کیا ہے "ظہرت ہذہ الامۃ من اجناس الترک" بعض مورخین نے بھی تاتاریوں کو ترکوں ہی کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔

(تاریخ ابن خلدون جلد ثالث ص۵۲۴ مطبوعہ مصر)

ترکان خواہد بودن'' اس پر افلاکی نے یہ اضافہ کیا کہ "اطالۃ ہٰذہ آنچناں بود کہ فرمودہ بود" اور یہاں اعتبار سے صحیح معلوم ہوتا ہے کہ افلاکی نے جب مناقب العارفین لکھنا شروع کی ہے اس وقت تک سلجوقیوں کا انقراض کلی ہوچکا تھا، عثمان اول سنہ ۶۹۹ (۱۲۹۹)، سنہ ۷۲۶ (۱۳۲۶) دور گزر کر آرخان (سنہ ۷۲۶ (۱۳۲۶) ۔ سنہ ۷۶۱ (۱۳۶۰)) کا زمانہ تھا اور پایہ تخت قونیہ سے بردصہ کو منتقل ہوچکا تھا۔ اس زمانہ میں قونیہ کی وہ رونق وشوکت نہ رہی ہوگی جو مولانا کے زمانہ میں تھی۔

قونیہ کے محفوظ و مامون رہنے کے متعلق مولانا کی مفصل تقریر شیخ صلاح الدینؒ کے حالات کے ذیل میں آئی ہے اور وہ باجوخاں کے واقعہ سے متعلق ہے، اس زمانہ میں جب مغلوں نے شہر قونیہ کا محاصرہ کیا اور اہل شہر محاصرہ سے عاجز آگئے تو مولانا کی خدمت میں طلب ہمت کیلئے حاضر ہوئے، آپ نے فرمایا کہ کچھ خوف نہ کرو، خدائے تعالیٰ نے تمہیں حضرت صلاح الدینؒ کے طفیل میں بخش دیا ہے، یہ شہر قیامت تک مغلوں کی تلوار کے نیچے نہ آئے گا اور جو شخص قونیہ کا قصد کرے گا وہ ہمارے زخم سے بچ نہ سکے گا، جب تک مولانائے بزرگ عظم اللہ ذکرہٗ کا جسم مبارک اس خاک میں آسودہ ہے یہ ملک تمام آفات سے مصئون و محصون ہے۔ اس شہر کو دنیا میں بڑی شہرت حاصل ہوگی اور انشاء اللہ ہمارے اعقاب یہاں ہمیشہ سلامت رہیں گے۔[۱]

اسی مضمون کی ایک تقریر دوسری جگہ منقول ہے، جس میں اس قدر اضافہ ہے کہ "خطہ قونیہ کو مدینۃ الاولیا کہیں گے۔ جب تک حضرت بہاء الدینؒ ولد کا جسم مبارک یہاں مدفون اور آپ کی اولاد یہاں موجود ہے، اس شہر میں تلوار نہ چلے گی اور یہ شہر آخر زمانہ کے فتنہ

---

[۱] ذکر شیخ صلاح الدین

سے محفوظ رہے گا۔ اگرچہ کچھ حصہ خراب و تباہ و متضرر ہو جائے گا مگر بالکلیہ منہدم نہ ہوگا۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔ مردم معنوی تمام دنیا سے اس جانب متوجہ ہو نگے۔" یہ بھی فرمایا کہ "جب
تک قونیہ میں میرے خاندان کے منکر رہیں گے اہل شہر کو آسودگی نہ حاصل ہوگی۔[1]

اس میں ایک طرح پر چار پیشین گوئیاں کی ہیں، اول یہ کہ شہر قونیہ میں جنگ نہ ہوگی، چنانچہ شہر قونیہ عثمانیوں کے تحت تصرف میں آجانے کے بعد سے کسی شدید جنگ میں مبتلا نہیں ہوا۔ دوسرے یہ کہ فتنہ تتار میں یہ شہر بالکلیہ غارت نہ ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اس شہر میں تاتاریوں نے وہ تباہی برپا نہ کی جو دوسرے بلاد و امصار میں کی۔ تیسرے یہ کہ مردم معنوی تمام دنیا سے اس جانب متوجہ ہونگے، الحق کہ یہ ثابت ہے، مثنوی معنوی سے بڑھ کر اہل معنی کو کس دوسری شے کی تلاش ہے، جو مثنوی شریف کا شیدا ہے۔ وہ مولاناؒ کا معتقد بھی ہے اور قونیہ کی عظمت اس کے دل میں ہے۔

چوتھے یہ کہ جب تک مولاناؒ کے خاندان سے کچھ لوگ منکر رہیں گے شہر کو آسودگی نہ حاصل ہوگی، یہ بھی بالکل درست ثابت ہوا، ساتویں صدی کے نصف اور بالخصوص ربع آخر میں اس شہر میں کم و بیش اضطراب و پریشانی رہی مگر آٹھویں صدی سے سکون ہوگیا اور یہ ثابت ہے کہ اس وقت تک مولاناؒ کا سلسلۂ باطنی و ظاہری اس شہر میں اس طرح مستحکم ہوگیا تھا کہ کوئی اس کا مخالف نہ رہا تھا، یہ ہیں اہل دل کی باتیں۔

قونیہ کی اس طرح مدح و تعریف اور الفت کے باوجود مولاناؒ نے جب طریق سماع اختیار کیا اور لوگوں نے اس کی مخالفت کی تو یہ امر آپ پر شاق گزرا، اور آپ نے اہل قونیہ کے متعلق

---

[1] مناقب ص۱۵۵

کسی قدر ناراضگی کا اظہار فرمایا لیکن اس ناراضگی میں بھی اہل قونیہ کی نکوخواہی مضمر تھی اور اس میں بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے جو مجملاً اوپر منقول ہو چکا ہے۔

ایک مرتبہ اپنے دوستوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا" افسوس ہے کہ اہل قونیہ ہمارے سماع و ذوق سے ملول ہوتے ہیں اور ادھر اُدھر طعن و تشنیع کرتے ہیں اور ان خوشیوں اور مسرتوں سے راضی نہیں ہوتے۔ اور اہل سبا کی طرح سے کفران نعمت کرتے ہیں، یقین جانو کہ اس کفران نعمت اور شومیٔ طغیان کی وجہ سے وہ برباد ہوں گے اور ان میں سے اکثر اغنیا افلاس سے ہلاک ہو جائیں گے، آخرالامر جب استغفار کریں گے اور ہماری اولاد و اعقاب کو معزز و گرامی رکھیں گے تو بفضل خدا قونیہ از سر نو معمور ہو جائے گا اور اس زمانہ کے لوگ سماع کو درست رکھیں گے اور صاحب ذوق ہوں گے۔[1]

محاسنِ اخلاق

صلح جوئی و صلح پسندی:-

یوں تو حسن خلق کا کوئی شعبہ ایسا نہ ہوگا جس کی بہترین مثال مولاناؒ کی ذات ستودہ صفات میں نظر نہ آتی ہو مگر آشتی و صلح پسندی کا وصف آپ کے تمام اوصاف میں سب سے زیادہ نمایاں وصف تھا۔ اس ایک وصف کی وجہ سے آپ اکثر بڑے بڑے فتنوں کو

---

[1] مناقب صفحہ ۱۶۴

ٹال دیتے تھے۔

چلپی حسام الدینؒ کی روایت ہے کہ سفر شام میں ہم سب کو مولاناؒ کی موافقت میں تین دن بخار رہا، مولاناؒ کے ساتھ جب میں دمشق کے ایک مدرسہ میں پہنچا تو دیکھا کہ بعض فقہا حضرت بہاء الدین ولدؒ کی شان میں کچھ خلاف بیان کر رہے ہیں کہ کیوں انھیں سلطان العلماء کہتے ہیں، مولاناؒ ان کے پاس بیٹھے رہے مگر کچھ بولے نہیں، ان فقہا میں سے ایک شخص نے مولاناؒ کو پہچان لیا اور خاموش ہو گیا، جب ہم لوگ مدرسہ سے باہر آئے، اس نے اس حال سے دوسرے فقہا کو مطلع کیا، ان لوگوں نے مولاناؒ سے معذرت کی اور بہت مہمان نوازی کی، مولانا نے فرمایا کہ میرا مقصود آپ کی خوشی ہے اور میں ہمیشہ اس خوشی کا طالب رہتا ہوں۔[۱]

اس وصف کا اثر نہ صرف آپ کی ذات تک محدود رہتا تھا بلکہ اکثر دوسروں کے معاملات میں بھی اس کا اظہار اس خوبی سے ہوتا تھا کہ لوگ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے. بار بار اس قسم کے واقعات پیش آئے ہیں کہ محض مولاناؒ کی دلچسپ مداخلت سے مخالفوں میں موافقت ہو گئی ہے. اس قسم کی متعدد روایتیں منقول ہیں، از آنجملہ ایک روایت ہے کہ ایک روز مولانا کسی محلے سے گزر رہے تھے، دو شخصوں کو دیکھا کہ آپس میں لڑ رہے ہیں، مولاناؒ کچھ فاصلے پر ٹھہر گئے، اور ان کی باتیں سنتے رہے، ایک نے کہا کہ اے ملعون تو کیا کہتا ہے ایک کہے گا تو ہزار سنے گا۔" مولانا نے آگے بڑھ کر فرمایا کہ "جو کچھ کہنا ہو مجھے کہو کہ ہزار کہو گے تو ایک بھی نہ سنو گے۔" دونوں نے مولاناؒ

---

[۱] مناقب ص۲۶۳

کے قدم پر سر رکھ دیے اور صلح کرلی[1]

اسی طرح ایک روز دو شخص آپس میں لڑ رہے تھے، ایک نے کہا کہ "اگر تو جھوٹ کہتا ہے تو خدا تجھے پکڑے" دوسرے نے کہا کہ "جھوٹا تو ہے خدا تجھے پکڑے" اتفاق سے عین وقت پر مولاناؒ کا گذر ہوا، فرمایا کہ "خدا تجھے پکڑے اور نہ اسے بلکہ مجھے پکڑے کہ لائق گرفت میں ہوں" دونوں نے سر جھکا دیے اور صلح کرلی[2]

کبھی کبھی نہایت لطیف پیرایہ میں فہمائش بھی کر دیتے تھے جس کا اثر قطعی ہوتا تھا، درحقیقت یہ ظاہری الفاظ باطنی تصرف کے مظہر ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ دو دوستوں میں خصومت ہو گئی تھی اور کسی طرح مصالحت نہیں ہوتی تھی مولاناؒ نے اثنائے بیان معرفت میں فرمایا کہ خدائے تعالیٰ نے دو طرح کے آدمی پیدا کیے ہیں، ایک خاک کے مانند جامد، بے حرکت و غایت درجہ ثقالت کی حالت میں ہیں اور دوسرے پانی کی طرح ہمیشہ رواں و سیال ہیں، پانی جب خاک سے ملتا ہے تو اس سے طرح طرح کے پھول اور پھل پیدا ہوتے ہیں، یہ دوست واحباب جو آپس میں لڑتے ہیں، انھیں چاہیے کہ ایک خاک کی صفت اختیار کرے اور دوسرا آب کی، تا ان کی آمیزش و اختلاط سے ہزاروں مسرتیں پیدا ہوں، پھر فرمایا کہ اے نورالدین تیرے بھائی نے جب خاک کی صفت اختیار کی ہے تو تجھے چاہیے کہ آب کی صفت

---

[1] مناقب ص۲۸

[2] ،، ص۲۷۲

اختیار کر اور جاکر اس سے مل جا' دونوں نے سر جھکا دیئے اور باہم صلح ہوگئی۔[1]

دلجوئی و دلداری :۔

اسی وصف صلح پسندی کا اثر تھا کہ مولاناؒ کسی کی دل آزاری پسند نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ لوگوں کی دلجوئی و دلداری میں سرگرم رہا کرتے تھے، آپ کا قول تھا کہ "مرا خوے ہست کہ نخواہم کہ ہیچ کس' یا دل از من آزردہ شود" اور یہ صرف قول ہی نہ تھا بلکہ اسی پر مدت العمر آپ کا عمل رہا۔

ایک روز آپ حمام میں داخل ہوئے اور پھر اسی وقت باہر آکر کپڑے پہن لئے، لوگوں نے پوچھا کہ اس قدر جلد کیوں نکل آئے فرمایا کہ "ولاک نے میرے لئے جگہ خالی کرنے کے واسطے ایک شخص کو حوض کے کنارے سے ہٹا دیا' مجھے شرم سے پسینہ آگیا اور میں جلد باہر نکل آیا۔[2]"

اسی قسم کا دوسرا واقعہ ہے کہ ایک روز آپ حمام کو جا رہے تھے 'چلپیؒ' نے امیر عالم کو پہلے ہی دوڑا دیا کہ لوگوں کو حمام سے خارج کر دیں' انھوں نے لوگوں کو حمام سے نکال کر حوض کو سرخ و سپید سیبوں سے بھر دیا۔ مولاناؒ جب پہونچے تو دیکھا کہ لوگ جلدی میں کپڑے پہن رہے ہیں' فرمایا کہ "امیر عالم! کیا یہ آدمی کیا ان سیبوں سے کم رتبہ ہیں کہ انھیں نکال دیا اور سیب بھر دیئے' کہو کہ سب لوگ حمام میں پھر داخل ہو جائیں تاکہ ان کے طفیل میں میں بھی داخل ہو جاؤں" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔[3]

---

[1] مناقب ص۲۸۰

[2] " ص۲۳۶ [3] مناقب ص۲۵۵

اسی طرح ایک مرتبہ حسب عادت آپ آبگرم کو جا رہے تھے، اصحاب نے پہلے ہی آگے بڑھ کر لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا اور پھر مولانا کے استقبال کو آئے، اس اثنا میں بہت سے اشخاص جن میں مریض بھی تھے دوبارہ وہاں جمع ہو گئے۔ جب مولانا وہاں پہنچے تو اصحاب نے ان لوگوں کو ہٹانا شروع کیا۔ مولانا نے بہت سختی کے ساتھ منع کیا اور کپڑے اتار کر انھیں لوگوں میں جا ملے اور اسی پانی سے غسل کرنے لگے[۱]

انتہا یہ ہے کہ جانوروں تک کو بے آرام کرنا آپ کو گوارا نہ تھا، ایک مرتبہ ایک پتلے راستہ سے گزر رہے تھے ایک کتا سویا ہوا تھا، آپ ٹھہر گئے، کسی شخص نے اس کتے کو ہٹا دیا، آپ ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ کیوں اسے ناوقت جگایا[۲]

حلم و تواضع:-

حلم و تواضع میں مولانا کو خاص اہتمام تھا۔ آپ کے حلم کی یہ حالت تھی کہ ایک مرتبہ مجلس سماع گرم تھی، ایک مست کسی گوشہ سے آیا اور سماع میں وجد کرنے لگا اور بار بار مولانا ہی سے آکر ٹکراتا تھا، لوگوں نے پکڑ کر الگ کر دیا، اس نے لڑنا شروع کیا، لوگوں نے اسے مارا، مولانا ان لوگوں سے آزردہ ہوئے اور فرمایا کہ "شراب او خوردہ است بد مستی شما می کنید[۳]" لوگوں نے کہا کہ یہ شخص ترسا ہے، فرمایا کہ او ترسا است شما چرا ترسا نیستید"[۴]

---

[۱] مناقب ص۲۰۱

[۲] رسالہ سپہ سالار ص۴۲

[۳] " " ص۵۳، ۹۵ [۴] مناقب ص۲۱۲

تواضع کی کیفیت یہ تھی کہ ایک راہب مولاناؒ کے علم و حلم کا شہرہ سن کر قسطنطنیہ سے بغرض ملاقات آیا تھا، اتفاقاً راستہ میں ملاقات ہو گئی، اس نے پے در پے تیس بار مولاناؒ کے آگے سر جھکایا اور جب سر اٹھایا تو دیکھا کہ مولاناؒ سر جھکائے ہوئے ہیں، اس نے پریشان ہو کر کہا کہ آخر تواضع کی کوئی حد بھی ہے، مولاناؒ نے فرمایا کہ جب ہمارے سلطانؐ دو عالم کا فرمان ہے کہ "طوبیٰ لمن تواضع" تو میں کیوں کر تواضع نہ کروں، وہ راہب مع اپنے رفقا کے مسلمان و مرید ہو گیا، مدرسہ میں جب تشریف لائے تو فرمایا کہ آج ایک راہب چاہتا تھا کہ تواضع و مسکنت میں بازی لے جائے الحمدللہ کہ میں ہی غالب رہا[1]

تواضع میں لڑکوں تک کی رعایت کرتے تھے، چنانچہ منقول ہے کہ ایک روز ایک محلے سے گزر رہے تھے، کچھ لڑکے کھیل رہے تھے، مولاناؒ کو دیکھ کر سب دوڑ پڑے، اور آداب بجالائے، مولاناؒ نے بھی ویسا ہی کیا، ایک لڑکا دور تھا اس نے وہیں سے آواز دی کہ ٹھہر جائیے کہ میں بھی آجاؤں، مولاناؒ اس وقت تک ٹھہرے رہے کہ لڑکا اپنے کام سے فارغ ہو کر آگیا۔[2]

عفو و درگزر :-

ایک روز مولانا اپنے حجرہ میں نماز پڑھ رہے تھے، ایک شخص نے آکر کہا کہ میں محتاج ہوں، جب مولاناؒ کو نہایت مستغرق دیکھا تو غالیچہ پاؤں کے نیچے سے نکال کر لے گیا۔ خواجہ فخر الدین مراغی نے دیکھ لیا اور اس کے پیچھے چلے، وہ شخص بازار میں غالیچہ کو فروخت

---

[1] مناقب ص۲۱۴

[2] رسالہ لار ص۱۵، مناقب ص۵۶

کر رہا تھا، انھوں نے لعنت ملامت شروع کی اور زانے مولانا کی خدمت میں لائے، فرمایا کہ "غایت احتیاج کی وجہ سے ایسا کیا ہے اسے معذور رکھو بلکہ اس سے خرید لو" [۱]

حاجت روائی :-

لوگوں کی حاجت روائی میں مولانا کو کسی حال میں بھی دریغ نہیں ہوتا تھا، اپنی ذات سے جو کچھ ہوتا وہ تو کرتے ہی تھے۔ ارباب جاہ کے پاس سعی و سفارش میں بھی تامل نہیں فرماتے تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ امرا و حکام سے اہل اللہ کے ملنے کا مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ اہل حاجت کی کاربرآری کریں۔

صلاح الدین ملطی کی روایت ہے کہ جب میں مولانا کا مرید ہوا ہوں تو میں نے دیکھا کہ دن میں دس بار رقعے پروانہ وغیرہ کو لوگوں کی سفارش میں بھیجتے اور سب کی ضرورتیں پوری ہو جاتی تھیں۔ کوئی رقعہ بیکار نہیں جاتا تھا [۲]

ایک مرتبہ مولانا کے دوستوں میں سے ایک عالم کئی ہزار دینار کا مقروض ہو گیا تھا اور ادا کرنے کی طاقت نہ تھی، مع اپنے لڑکوں کے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا التجا کی کہ معین الدین پروانہ کے نام سفارش فرما دیں، ممکن ہے کہ کمی ہو جائے یا مہلت ملجائے، مولانا نے رقعہ لکھ دیا، پروانہ نے کہا کہ یہ معاملہ "دیوان" سے متعلق ہے، مولانا نے جواب میں تحریر فرمایا کہ "حاشا حاشا "دیوان بحکم سلیمان اند نہ آنکہ سلیمان بحکم دیوان" اس میں دو لطیفے رہے ایک تو دیوان (دفتر) کے لفظ میں اور دوسرے سلیمان کے لفظ میں کیونکہ

---

[۱] مناقب ص۲۲۵

[۲] " ص۲۱۱

پروانہ کا نام سلیمان تھا، پروانہ نے خوش ہو کر کل رقم چھوڑ دی۔ ؎۱

ذاتی جود و سخا کا یہ حال تھا کہ فقیر سامنے آجاتے اور کچھ موجود نہ ہوتا تو کپڑے ہی اتار کر دیدیتے تھے اور اسی وجہ سے پیراہن سامنے سے کھلا رکھتے تھے کہ اتارنے میں دقت نہ ہو، امرا و روساء ان کپڑوں کو تبرکاً بڑی قیمتوں پر خرید لیتے تھے۔ ؎۲

اپنے دوستوں کی حاجتیں جس خوبصورتی سے پوری کرتے تھے اس کا اندازہ واقعہ ذیل سے ہو سکتا ہے۔

عثمان گرینده کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں سخت افلاس میں مبتلا ہو گیا تھا اور اسی زمانہ میں نئی نئی شادی کی تھی، خرچ کی بہت ضرورت تھی، مولاناؒ کو معلوم ہوا تو اندر جا کر اپنی خالہ سے چھ دینار لائے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ عثمان کی عادت تھی مجھ سے گاہ گاہ مصافحہ کیا کرتے تھے معلوم نہیں اب یہ عادت کیوں ترک کر دی ہے، میں نے اٹھ کر مصافحہ کیا، دینار پوشیدہ میرے ہاتھ میں رکھ دیئے۔ اور فرمایا کہ "اس عادت کو جاری رکھو" کچھ دنوں وہ دینار خرچ کئے، پھر تنگدستی پیش آئی۔ مولاناؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ وقت ہے کہ "سنت دستبوس کو بجا لاؤں" فرمایا "خوش رہو، آج لقمۂ چرب ملے گا" شام تک وہیں رہا، کچھ اثر ظاہر نہ ہوا، تعجب ہوا کہ خلاف اشارت کیوں ہوا، جب رات ہو چلی اور کچھ پانی بھی برسنے لگا، سوچا کہ نکل چلوں ورنہ راستہ خراب ہو جائے گا، ایک جگہ پانی ایک باغیچہ میں گزر رہا تھا اور خس و خاشاک سے راستہ

؎۱ مناقب ص۱۲۷

؎۲ سپہ سالار ص۵۰

بند ہو گیا تھا، اس کو پیر سے ہٹایا تو ایک رسی پیر میں اُلجھ گئی، پیر باہر کھینچا تو دیکھا کہ ایک تھیلی ہے اور اس میں درم ہیں اٹھا کر گھر لے گیا، گنا تو سات سو درم تھے، اس میں سے کچھ گھر کے لوگوں کو دیا، کچھ ضروریات میں خرچ کیا، دوسرے روز پھر اسی طرح منہ بنائے ہوئے مولانا کے حضور میں آکر بیٹھا، فرمایا کہ عثمان شرم نہیں آتی کہ تھیلی گھر لے گئے اور افلاس کا اظہار کرتے ہو، میں قدموں پر گر پڑا اور توبہ کی۔[1]

شفقت ورافت :۔

مولانا کی شفقت ورافت کی صرف ایک مثال یہاں دی جاتی ہے جس سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ آپ کی رحمت کے لئے خاص وعام کی تخصیص نہ تھی، بلا استثنا سب ہی اس سے منتفع ہوتے تھے، آپ کی صاحبزادی ملکہ خاتون اپنی کسی کنیز کو مار رہی تھیں، ناگاہ آپ آگئے، اور ڈانٹ کر کہا کہ کیوں اسے مارتی ہو، اگر وہ خاتون ہوتی اور تم اس کی کنیز ہوتیں تو تمہارا کیا حال ہوتا کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں فتویٰ دیدوں کہ دنیا میں کوئی کنیز نہیں ہے جو ہے وہ خدا کی کنیز ہے اور حقیقت ہے بھی یہی کہ غلام وکنیز ہمارے بھائی بہن ہیں، ملکہ خاتون نے اسی وقت توبہ کی اور جو کچھ پہنے ہوئے تھیں وہ اتار کر اس کنیز کو پہنا دیا اور پھر عمر بھر کسی غلام یا کنیز کو تکلیف نہیں دی۔ مثنوی شریف میں اس جانب اشارہ فرمایا ہے

شرم دارم از نبی، ذو فنون ۔۔۔ البسوہم گفت مستا یلبسون

مصطفےٰ کرد ایں وصیت با بنون ۔۔۔ اطعموا الاذناب مستا تاکلون

من چو پوشم از خز واطلس لباس ۔۔۔ زاں نپوشانیم حشم را ہم پلاس[2]

---

[1] سپہ سالار ص ۲۴۵ - ۲۴۴

[2] مناقب ص ۲۴۳

شفقت عام:۔

مولانا کی شفقت و رحمت بنی نوع انسان سے گذر کر حیوانوں تک کیسلئے عام تھی، شیخ نفیس الدین سیوا ای کی روایت ہے کہ ایک روز مجھ سے فرمایا دو درم کا عمدہ خطاب خرید لاؤ، اُس زمانہ میں ایک درم میں بکتا تھا میں خرید کر لایا، میرے ہاتھ سے لے لیا اور کپڑے میں رکھ کر روانہ ہوئے، میں پیچھے پیچھے چلا، ایک خرابہ میں پہونچکر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مادہ سگ اور اس کے سات بچے سوئے ہوئے ہیں، فرمایا کہ سات روز سے اس نے کچھ کھایا نہیں ہے اور بچوں کو چھوڑ کر جاتی نہیں، وہ سب اس کتیا کو کھلا دیا، میں یہ شفقت و رحمت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ؏۱

ایسا ہی ایک اور واقعہ پیش آیا کہ ایک مرتبہ سماع کے موقع پر کرجی خاتون نے دو طبق خطاب (شیرینی) کے بھیجے، مولانا نماز میں مشغول تھے، ایک کتے نے آکر کچھ کھا لیا اور کچھ خراب کر ڈالا، لوگوں نے اسے مارنا چاہا، مولانا نے فرمایا کہ "مصلحت نہیں ہے وہ تم سے زیادہ محتاج تھا اور اس کی اشتہائے نفس تم سے زیادہ صادق تھی" ؏۲

مال دنیا:۔

مولانا کا بذات خاص مال دنیا سے متنفر ہونا کوئی بڑی بات نہیں تھی، بڑی

؏۱ مناقب ص۲۲۵

؏۲ " ص۲۲۶

بات یہ تھی کہ آپ اپنے مریدوں اور مخلصوں کے لئے بھی مال دنیا کی کثرت پسند نہیں کرتے تھے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ آپ کے مریدین بااخلاص مولانا کے اس منشا پر صدق دل سے عامل تھے۔ شیخ صلاح الدینؒ اور چلپی حسام الدینؒ مال وقف سے مطلق نفع نہ اٹھاتے تھے۔ چلپی حسام الدینؒ کو اس معاملہ میں اس درجہ اہتمام تھا کہ مدرسہ کے پانی سے وضو تک نہ کرتے تھے۔

لوگ روپیہ اشرفی لاکر پوشیدہ مولاناؒ کے نمد کے نیچے رکھ دیتے تھے مولانا ان کی خاطر سے قبول کر لیتے اور خاموش رہتے، جب رات کو نماز کے لئے اٹھتے تو سب جمع کر کے کنوئیں میں ڈالدیتے، لوگوں نے عرض کیا کہ دوستوں کو کیوں نہیں بخش دیتے فرمایا کہ دوستی یہ ہے کہ محبوب ترین چیز دوست کو دے، مال دنیا زہر قاتل ہے جس چیز سے مجھے زحمت ہوتی ہے، نہیں چاہتا کہ وہ تمہیں دیدوں"۔ [۱]

مولاناؒ کے مریدوں میں ایک صاحب شیخ بدرالدین علم کیمیا وغیرہ میں بے نظیر تھے اصحاب مولاناؒ کے فقر و فاقہ کو دیکھ کر ایک روز کہنے لگے کہ اگر خداوندگار اجازت دیں تو کچھ تدبیر کروں کہ کسی قدر اطمینان حاصل ہو جائے، جب یہ خبر مولاناؒ کے سمع مبارک تک پہنچی تو غصہ میں آگئے، اور بدرالدین کو طلب کر کے فرمایا کہ میں اپنے اصحاب کو فقر کی تعلیم دیتا ہوں اور تم میرے برخلاف ان کو دنیاداری کی طرف راغب کرتے ہو، اس مرتبہ معاف ہے لیکن دوسری مرتبہ ایسا کیا تو برباد ہو جاؤ گے [۲]

---

[۱] مناقب ص۲۶۵

[۲] سپہ سالار ص۲۰

[یہی بدرالدین جب اول اول مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے تو انھیں اپنے فن کیمیاگری پر ناز تھا اور اپنا کمال دکھانا چاہتے تھے، اس وقت بھی مولاناؒ نے فرمایا تھا کہ میں اس کوشش میں لگا رہتا ہوں کہ سونے کو خاک کر دوں کہ اس کا فتنہ فرو ہو ایک صاحب آئے ہیں کہ میں خاک کو سونا کرتا ہوں کہ اور فتنہ برپا ہو، انھیں یہ خبر نہیں کہ "الفتنۃ نائمۃ لعن اللہ تعالیٰ من ایقظہا" عله]

مریدین اور معتقدین سے کبھی کچھ طلب نہیں کرتے تھے، لوگ اس آرزو میں رہتے تھے کہ مولاناؒ کچھ اشارہ فرمائیں لیکن اس قسم کے اشارے کی بھی صرف دو روایتیں ملی ہیں، ایک شیخ صلاح الدین کی چھوٹی صاحبزادی کے جہیز کے لئے شہزادیوں سے اشارہ فرمایا تھا اور دوسرے ایک واعظ کی دیت کے لئے علم الدین قیصر کو لکھا تھا۔ اول الذکر واقعہ اوپر گذر چکا ہے، واعظ کا معاملہ یہ ہوا کہ (بروایت مولاناؒ شمس الدین ملطی) آقسرا میں ایک واعظ منبر پر وعظ کہہ رہا تھا اور مولاناؒ کے اشعار پڑھتا تھا، کسی عالم نے اعتراض کیا اور اس کی تکفیر کی، واعظ نے منبر سے اتر کر عالم کو گھونسہ مارا اور گرا دیا، اتفاق سے وہ مرگیا، واعظ بھاگ کر قونیہ پہنچا اور مولاناؒ کے پاس پناہ لی، ادھر عالم کے اعزہ بھی اس کے پیچھے پہونچ گئے اور اس کی حوالگی کا تقاضا کیا، ورنہ دیت میں چالیس ہزار درم مانگے، مولانا نے علم الدین قیصر کو خط لکھا کہ واعظ کو خلاصی دلاؤ، جو شخص رقعہ لے کر گیا اس نے علم الدین کو سناروں کے بازار میں پایا۔ وہیں رقعہ دیا، علم الدین نے اپنا گھوڑا اور کل آلات وغیرہ اسی جگہ بیچ ڈالے، پچاس ہزار قیمت

عله مناقب صـ ۲۲۲

آئی چالیس ہزار دیت میں دیئے، دس ہزار مولانا کے اصحاب کو شکرانہ میں دیئے اور واعظ کو خلعت اور ایک عمدہ اونٹ دیا، کرجی خاتون کو جب اس کا علم ہوا تو علم الدین سے ناخوش ہوئی کہ کیوں نہ مکان پر آیا اور کیوں بازار میں اس طرح ساز و سامان علیحدہ کیا، علم الدین نے کہا کہ مولانا کبھی کسی سے کچھ سوال نہیں کرتے، یہ خاص عنایت تھی کہ آج مجھے اس کا اشارہ کیا۔ میں ڈرا کہ اگر تاخیر ہوئی تو ممکن ہے کہ وہ رحمت ہاتھ سے جاتی رہے۔ کرجی خاتون نے اس جواب کو بے حد پسند کیا اور ایک لاکھ علم الدین کو دیئے [2]

یہ تو اشارۂ صریح کی مثال ہے، مولانا کے عقیدتمندوں کو اگر اتنا معلوم ہو جاتا کہ کسی امر میں مولانا کا ایسا منشا ہے تو سب کچھ فدا کر دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے، اس کی بھی ایک مثال سننا چاہیئے۔

مولانا کے زمانہ میں ایک امیر بیگ اوج بڑے بہادروں میں تھا اور پروانہ کی جانب سے کسی خدمت پر مامور تھا، اس کے آدمیوں نے مجد الدین کے کارواں کو لوٹ لیا تھا، پروانہ نے اسے حساب فہمی کے لئے قونیہ میں طلب کیا تو بہت پریشان ہوا، مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر بہت تضرع کیا اور استمداد چاہی، مجد الدین یہ دیکھ کر ایک کونے میں کھڑے ہوئے کہہ رہے تھے کہ "مردک یہاں کیوں آیا، اب مولانا سے استعانت چاہتا ہے، میرا مال لوٹا اور اس قدر خونریزی کی قیامت میں میں تیرا مقابلہ کروں گا، ہرگز نہ چھوڑوں گا، بچ کر کہاں جائے گا" امیر بیگ کے چلے جانے کے بعد مولانا نے فرمایا "ضرور چھوٹے گا، کیوں نہ چھوٹے گا، کون کہتا ہے کہ نہ چھوٹے گا، واللہ ثم واللہ کہ جو شخص میرے مدرسہ

---

[1] مناقب صـ ۲۷۶
[2] مناقب صـ ۲۹۱

سے ہو کر گذرے گا وہ بھی چھوٹ جائے گا' .... " مجدالدین نے سر جھکا دیا اور کل مال معاف کر دیا۔

محمد بیگ جب حساب فہمی سے فارغ ہو کر واپس گیا تو اس کے ساتھیوں میں سے ایک شخص نے اس سے یہ ماجرا بیان کیا' اس نے مجدالدین کا تمام مال اور اس کے ساتھ مزید تحائف ارسال کئے اور عذرخواہی کی' مجدالدین نے بھی وہ تمام مال صدقہ کر دیا۔[1]

کسب و محنت :-

صدقہ و ہدیہ پر گزران کرنا مولاناؒ کو بغایت ناپسند تھا اپنے مریدوں کو ہمیشہ اس کے خلاف نصیحت کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنی مجلس میں یہ فرمایا کہ اکثر اولیاء اللہ نے سوال کو ذلتِ نفس کے لئے جائز رکھا تھا مگر میں نے اس در کو بھی بند کر دیا ہے تا میرے مرید اپنی محنت سے کمائیں یا تجارت میں مشغول ہوں۔ "ہرکہ از یاران ما ایں طریقہ را نورزد' پوسے را نیرزد' زہیچاں روز قیامت روئے ما را نخواہد دیدن و اگر چنانکہ کسے دست دراز کند من روئے بر ایشاں فراز نخواہم کرد[2]"

کاہل کو بغایت ناپسند فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ حق تعالےٰ مردم کاہل و عاطل و بے کسل کو دوست نہیں رکھتا ؎

دوست دارد دوست ایں آشفتگی کوشش بیہودہ بہ از خفتگی!

کسب و جہد اور توکل کے مسائل و دقائق پر مثنوی شریف میں نہایت وسعت اور

---

[1] مناقب ص۲۹۱

[2] " " ص۱۴۵:۲۳۲

کرامات و مرات سے بحث کی ہے اور جہد و کسب کے فضائل کو پوری طرح واضح کر کے دکھایا ہے اور صحیح توکل کے معنی بتائے ہیں، لوگوں نے جو کام نہ کرنے کا نام توکل رکھ لیا ہے اس کی پردہ دری اچھی طرح کی ہے، ان تمام مباحث کو (جہد و کسب اور توکل کے تحت میں) درر الحکم میں تفصیل کے ساتھ دیکھنا چاہیئے، یہاں ایک روایت نقل کی جاتی ہے جس سے یہ واضح ہوگا کہ عملی حیثیت سے اپنے مریدوں کو اس جانب توجہ دلانے میں، مولانا کو کس درجہ انہماک تھا اور اس مسئلہ کو کس انتہائی احتیاط تک پہنچانا چاہتے تھے۔

چونکہ آپ کی یہ عادت تھی کہ اکثر مسائل کو تمثیل سے سمجھایا کرتے تھے، ایک موقع پر جہد و کسب کے متعلق متواتر تین حکایتیں بیان کیں چونکہ ان تینوں حکایتوں سے اس معاملہ میں مولانا کا اصلی خیال واضح ہوتا ہے، اس لئے نہایت اختصار کے ساتھ ان ہم حکایتوں کا ماحصل درج کیا جاتا ہے۔

(۱)

ایک درویش چالیس سال تک واله و حیراں جنگلوں میں پھرتا رہا، اتفاق سے ایک قطب کا وہاں گذر ہوا، انھوں نے درویش کو ایک چپت لگا کر کہا کہ "مردک حرام خور" درویش نے کہا کہ میں نے چالیس سال سے دنیا کا حلال کھانا بھی نہیں کھایا ہے، حرام کا کیا ذکر، قطب نے فرمایا کہ "ہوا سے سانس لیتے رہے اور خوشبو سونگھتے رہے یہ کیا ہے" یہی تمہاری غذا تھی اور یہ چیزیں بے رنج و کد حاصل ہوئی ہیں اور یہ مردانِ کامل کے مذہب میں حرام ہے۔

(۲)

حضرت سلیمانؑ کے پاس ایک مرتبہ طعام بہشت آیا۔ آپ نہایت شوق و رغبت سے کھانے لگے، ایک فرشتہ نے دوسرے سے کہا کہ سلیمانؑ اس طرح کھا رہے ہیں گویا اس کے حصول میں محنت برداشت کی ہے۔ حضرت سلیمانؑ کو تنبہہ ہوگیا اس کے بعد سے آپ نے زنبیل بافی شروع کی۔

(۳)

حضرت موسیٰؑ کی آنکھ میں درد ہوا، آپ نے رب العزت میں دعا کی بعض نباتات کے استعمال کا حکم ہوا، آپ نے وہ نباتات جنگل سے لے کر استعمال کئے درد اور بڑھ گیا۔ فریاد کی، ارشاد ہوا کہ ہم نے یہ نہیں کہا تھا کہ بلا زحمت جنگل سے گھاس لے لو، کسی طبیب کے یہاں سے جاکر لو کہ تمہیں بھی نفع پہونچے اور اسے بھی۔

اس تمام تقیید و تدقیق کے ساتھ ہی ساتھ مولاناؒ نے جا بجا فرمایا ہے کہ اولیاء اللہ کے لئے بہت کچھ جائز ہے، اس کی تہہ میں یہ امر مخفی ہے کہ اولیاء معصون من جانب اللہ ہوتے ہیں، اس کا ثبوت خود مولاناؒ کے ایک واقعہ میں ملاحظہ ہو۔

ایک مرتبہ مولاناؒ کے احباب میں سے ایک شخص تازہ انجیر لایا، فرمایا کہ "انجیر اچھے ہیں مگر ان میں ہڈی ہے" اس شخص کو حیرت ہوئی کہ انجیر میں ہڈی کہاں سے آئی، پھر جاکر دوسرے انجیر لایا، مولاناؒ نے ایک دانہ اس میں سے نوش فرمایا اور کہا کہ اس میں ہڈی نہیں ہے، اور شیخ محمد خادم کو اشارہ کیا کہ حاضرین مجلس کو تقسیم کر دیں۔ لوگوں کو اس معاملہ میں حیرت تھی، جب وہ انجیر لانے والا شخص باہر نکلا تو اس سے دریافت کیا کہ کیفیت واقعہ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں اپنے ایک دوست کے باغ

ہیں گیا، وہ موجود نہ تھا، میں نے انجیر توڑ لیے، میرا ارادہ تھا کہ قیمت بعد کو دیدوں گا جب مولاناؒ نے انجیروں کو نہ کھایا، دوبارہ گیا، وہ دوست مل گیا اس سے معافی چاہی اور دوسری مرتبہ قیمت دے کر انجیر لایا تو تناول فرمایا۔[1]

خدماتِ شاہی۔

شاہی خدمات کو اکثر اولیاء اللہ نے ناپسندیدہ نظر سے دیکھا ہے، مگر مولاناؒ ان لوگوں میں نہ تھے، جو اس صحیح اصول کے خلاف ہوں کہ دنیا کی آبادانی کے لئے یہ تمام خدمات ضروری ہیں، حضرت بہاء الدین کی علالت کے دوران میں جب سلطان علاء الدین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر آپ کو صحت ہوگئی تو آپ کو بادشاہ بناؤں گا اور میں خود سپہداری کروں گا، اس وقت حضرت نے جو کچھ فرمایا تھا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ "اگر میں ظاہر میں بھی بادشاہ ہوجاؤں گا، تو لوگ میری اتباع میں دنیا کا کام چھوڑ بیٹھیں گے، پھر دنیا کا کام کس طرح چلے گا۔" مولاناؒ کے مریدوں اور معتقدوں میں بہت سے ایسے لوگ داخل تھے جو شاہی خدمتوں پر سرفراز تھے مگر اس کے خلاف صلاح دینا کیا آپ نے کبھی اس کام کی مذمت تک نہیں کی۔ حالانکہ مال و دولت دنیا دی کے خلاف آپ نے بہت کچھ کہا اور لکھا ہے، ایک روایت بھی آپ سے ایسی منقول نہیں ہے کہ آپ نے کبھی کسی مرید یا معتقد کو ترک خدمت کی صلاح دی ہو، بلکہ اس کے برخلاف بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسے پسند فرماتے تھے، چنانچہ اصحاب دیوان میں سے ایک شخص آپ کی خدمت میں آیا کہ اپنے اس کام کو ترک کر کے کوئی اور کام کرے۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ ہارون رشید کے زمانہ میں ایک شحنہ تھا کہ خضرؑ روزانہ اسے دیکھنے آتے تھے، اس شخص نے ملازمت ترک کر دی۔ خضر بھی نہ آئے، بہت پریشان

[1] [illegible] ص ۹۰

ہوا اور رات بھر روتا رہا۔ خواب میں دیکھا کہ یہ درجہ اسی کام کی وجہ سے تھا۔ صبح کو جاکر خلیفہ کی خدمت میں عرض کیا اور پھر اسی خدمت کو اختیار کیا۔ خضرؑ پھر اس کی ملاقات کو آنے لگے۔ وہ بدستور اپنے منصب پر قائم رہا۔^{عل}

ایک مرتبہ پروانہ نے کہا۔ میں شبانہ روز دل وجان سے خدمت کرنا چاہتا ہوں مگر مشغولیتوں کی وجہ سے حاضر نہیں ہو سکتا۔ فرمایا کہ "ایں کار باہم کار خیر است۔ زیرا کہ سبب امن و امان مسلمانانست" علہ

خود مولاناؒ بھی ایک اعتبار سے اس اصول کے قائل ہی نہیں بلکہ عامل بھی تھے اور اپنی ذات سے ایک مثال قائم کر دی تھی

"کسب حلال" اور خرچ حلال میں بھی مولاناؒ نے ایک نازک فرق قائم کیا تھا۔ آپ نے فرمایا ہے کہ محض لقمہ حلال، اور کسب حلال پر نظر نہ کرنا چاہئے کیونکہ آمد کی اصل خرچ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح خرچ ہوتا ہے۔ بہت لقمہ حلال ایسا ہے کہ اس سے کاہلی و سستی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ جو لقمہ جان میں ذوق و شوق بڑھائے۔ اُس عالم کی رغبت پیدا کرے اور طریقہ انبیاء و اولیا کی طرف مائل کرے اسے حلال سمجھو، یہ مرد نستی ہے گفتنی نہیں ہے۔ جس لقمہ سے اس کے برعکس حالت پیدا ہو وہ حرام محض ہے^{عٰلہ} مقصود اس ... یہ ہے کہ حلال میں بھی وہی حلال ہے جس سے قوت روحانی حاصل ہو۔

علہ مناقب ص۳۶۱

علہ فیہ مافیہ ص۳۲

علہ مناقب ص۱۱۷

فتویٰ نویسی:۔

مولاناؒ جس طرح اپنے مریدوں کو کسب حلال کی تاکید فرماتے تھے، خود بھی اس پر اسی سختی کے ساتھ عامل تھے، اپنے والد سلطانؒ العلماء کی طرح آپ بھی خدمت افتا انجام دیا کرتے تھے اور اس کے لئے بیت المال سے آپ کے لئے کچھ مرسوم بھی مقرر تھا، مولاناؒ کو اس باب میں نہایت اہتمام تھا کہ یہ مرسوم آپ کے لئے جائز رہے۔ اپنے اصحاب سے ہمیشہ یہ تاکید کرتے رہتے تھے کہ "میں کسی حال میں ہوں اگر کوئی شخص کوئی فتویٰ لائے یا کچھ سوال کرنا چاہے تو اس کو رد کو نہیں تاکہ مرسوم مدارس مجھ پر حلال ہو جائے اور میں نہیں چاہتا کہ اس خاندان سے فتویٰ منقطع ہو جائے" مریدین قلم دوات ہر وقت لیا رکھتے تھے اور مولاناؒ حالت استغراق سماع تک میں فتوی لکھدیا کرتے تھے[۱] اسی حالت میں ایک فتوی لکھا تھا جس پر شمس الدین ماردینی نے اعتراض کیا اور مولاناؒ نے انھیں کے پاس کی ایک کتاب کے حوالہ سے اسے صحیح ثابت کیا: اس کا ذکر اعتراف منکرین کی بحث میں آیا ہے، اسی طرح لوگ ایک مرتبہ مولاناؒ کا کوئی فتویٰ قاضی عزالدین سیواسی کے پاس لے گئے۔ انھوں نے اس فتویٰ کو قبول نہ کیا انھیں مولاناؒ متصور ہو کر دکھائی دیئے اور یہ کہا کہ جس کتاب میں تم نے اس فتویٰ کو رکھ دیا ہے اسی کتاب میں دیکھو۔ وہ نعرہ مار کر بے ہوش ہو گئے، اور جب ہوش میں آئے اس مسئلہ کو اسی جگہ پایا اور مرید بااخلاص ہو گئے[۲]

اس تمام احتیاط و اہتمام کے باوجود خود اس روزینہ کے متعلق مولاناؒ کا جو کچھ خیال تھا وہ واقعۂ ذیل سے بخوبی ظاہر ہو سکتا ہے۔

---

[۱] مناقب ص۱۹۳ [۲] ص۵ ، ص۲۶۴۔

ایک روز معین الدین پروانہ شیخ صدرالدینؒ کی زیارت کو آیا، تو وہاں لوگوں کے وظیفہ کا ذکر چلا، اس زمانہ میں مولاناؒ کے اصحاب کے لئے نصف دینار روزانہ مقرر تھا۔ شیخؒ نے فرمایا کہ ممکن ہے مولاناؒ کو دونوں عالم کے وظیفہ سے فراغت ہو، محتاجوں کو دینا بہتر ہے، اسی روز پروانہ مولاناؒ کی زیارت کو بھی آیا، مولاناؒ نے فرمایا کہ معین الدینؒ شیخؒ کے اخراجات بہت ہیں اور ان کی معیشت شاہانہ ہے، میرے دوستوں کیلئے کچھ بھی درکار نہیں ہے، یہ دینار بھی انھیں کو دینا اولیٰ ہے ؎۱

اہل دولت سے استکراہ:۔

مولاناؒ اگرچہ اہل منصب کو من حیث المنصب برا نہیں سمجھتے تھے مگر مال دنیا سے آپ کو جو نفرت تھی اس کی وجہ سے آپ اہل دولت سے بھی کنارہ رہتے تھے۔ آپ کے معتقدین میں خود سلاطین روم اور امراء اکابر سب ہی داخل تھے مگر آپ حتی الامکان ان کی صحبت سے بچتے رہتے تھے۔ پروانہ آپ کے بہت ہی مخصوص معتقدین میں سے تھا اور مولاناؒ بھی اس کی خاطر داری بدرجۂ اتم کرتے تھے، ایک مرتبہ اس نے بدیر آنے کا عذر کیا۔ فرمایا کہ "میں آنے کے بہ نسبت نہ آنے سے زیادہ شکر گزار ہوتا ہوں"

خواجہ مجدالدین ایک مرتبہ ایک امیر کو مولاناؒ کی خدمت میں لائے، مولاناؒ صحبت خانہ میں جا بیٹھے، بہت دیر ہوگئی تو مجدالدین نے کہا کہ "خداوندگار کیا کر رہے ہیں" فرمایا کہ یہاں کی گندگی ان امیروں کی صحبت سے بہتر ہے، امیر بدل و جان مرید ہوگیا۔ ؎۲

؎۱ مناقب ص۲۶۴

؎۲ 〃 ص۲

ایسے ہی ایک مرتبہ مدرسہ میں ٹہل رہے تھے۔ اصحاب کھڑے ہوئے تھے، فرمایا کہ دروازے کو بند کر دو۔ اس کے بعد ہی سلطان عزالدین مع امرا کے آگیا، مولاناؒ حجرے میں چلے گئے، اور کہنے لگے کہ جواب دینا کہ زحمت نہ کریں [۱]

بظاہر ان روایات سے دل پر یہی اثر پڑتا ہے کہ مولاناؒ اہل دولت کی تذلیل کرتے تھے لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا، یہ سب کچھ پند فعلی میں داخل تھا، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ دنیا اور مال و جاہ دنیا کی حقیقت کیا ہے، مولاناؒ کو ان لوگوں کی صحبت سے جس وجہ سے گریز تھا اس کی بنا، اصل فیہ ما فیہ کی روایت سے واضح ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ پروانہ مولاناؒ کی ملاقات کو آیا، مولاناؒ بہت دیر تک برآمد نہیں ہوئے، جب آئے تو تاخیر کی وجہ اس لطیف پیرائے میں بیان کی کہ "میری مختلف حالتیں ہیں، کبھی بات کرتا ہوں، کبھی نہیں کرتا، کبھی لوگوں کی پرواہ ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی، کبھی عزلت و خلوت میں رہتا ہوں، کبھی استغراق و حیرت میں، ممکن ہے کہ امیر ایسے وقت میں آجائے کہ اس کی دلجوئی نہ کر سکوں اور مجھے فراغت نہ ہو، پس بہتر یہی ہے کہ جب مجھے فرصت ہو، میں خود آجایا کروں ......[۲]" دوسری جگہ اس کی توجیہ اس طرح منقول ہے کہ

"اس آمد سے مقصد اعزاز تھا، خواہ میرا اعزاز ہو یا امیر کا اعزاز، اگر میرا اعزاز مقصود تھا تو زیادہ بیٹھنے سے میرا اعزاز زیادہ ہوا، اور اگر امیر کا اعزاز مقصود تھا تو اس کو ثواب زیادہ ملا"[۳]

---

[۱] مناقب ص ۱۵۱

[۲] فیہ ما فیہ ص ۸۲

[۳] ؍ ؍ ص ۹۵

اس تمام گریز کے باوجود مولاناؒ کے تعلقات اہل دول سے برابر قائم رہے، اس کی توجیہ خود مولاناؒ ہی کے الفاظ میں سننا چاہئے، معین الدین پروانہ کی ایک مجلس میں مولاناؒ پہلے سے تشریف فرما تھے۔ جب چلپیؒ آئے تو آپ ان کے استقبال کو اٹھے اور پھر صحن میں بیٹھ گئے، دوسرے اکابر بھی مولاناؒ کی تقلید میں وہیں آبیٹھے، ایک شخص کے دل میں یہ خیال گزرا کہ ایسا مرد بزرگ نیچے کیوں بیٹھے، ہر شخص کی ایک جگہ مقرر ہے، مولاناؒ نے فرمایا کہ ایسے شخصوں کے لئے اوپر بیٹھنے اور نیچے بیٹھنے میں کیا فرق ہے۔ ان کی مثال چراغ کی ہے، چراغ کو روبرو اس وجہ سے رکھتے ہیں کہ اس سے نفع حاصل کریں مگر خود چراغ کو کیا اوپر ہو یا نیچے، وہ تو ہر حال میں روشن ہے، یہ لوگ اگر دنیا کی جاہ و بلندی چاہتے ہیں تو غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کی نظر ایسی نہیں ہے کہ ان کی اصل بلندی کو دیکھ سکیں، وہ دنیا ہی کے جال سے اہل دنیا کو شکار کرتے ہیں کہ اس طرح یہ لوگ آخر الامر آخرت کے جال میں پھنسیں، لوگوں کو عطا بخشی کے لئے آمادہ کرتے ہیں تو مقصود یہ نہیں ہوتا کہ خود اس سے کچھ نفع حاصل کریں" (بلکہ غرض یہ ہوتی ہے کہ انھیں کو نفع پہونچے)

"فیہ ما فیہ" سے یہ بھی بین طور پر واضح ہوتا ہے کہ سلاطین و امرا اور مولاناؒ کے دیگر مریدین و مخلصین آپ کا جو اعزاز و اکرام کرتے تھے آپ اسے مہمل نہیں چھوڑتے تھے بلکہ اسے تشکر کی نظر سے دیکھتے تھے، چنانچہ ایک موقع پر یہ فرمایا ہے کہ "تم لوگ جس قدر لطف دستی کرتے ہو اگر اس کے شکر و تعظیم میں مجھ سے تقصیر ہو تو یہ بربنائے کبر نہیں ہے، نہ اس وجہ سے ہے کہ میں یہ نہ جانتا ہوں کہ منعم مجازی کا بھی حق ہے بلکہ یہ اس وجہ سے ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ تم یہ سب کچھ خدا کیلئے کرتے ہو تو میں بھی اُنکا

اجر خدا پر چھوڑتا ہوں" ؏۱

چونکہ اس قسم کی شان بے نیازی اکثر اولیا اللہ سے ظہور میں آتی رہتی ہے۔ اور ناواقف اسے تکبر پر محمول کرتے ہیں، پس اس محل پر اس نکتہ کو مولاناؒ ہی کے الفاظ میں واضح کردینا مناسب ہے۔

ایک روز مولاناؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ بعض اولیا اللہ متکبر ہوتے ہیں، یہ تکبر کس وجہ سے ہے؟ فرمایا کہ "درمردان خدا کبر کبریائی باشد، نہ کبر ریای وتجبر نفسانی وعجب جاہ مردم جانی" اس پر یہ حکایت بیان فرمائی کہ امام جعفر صادقؒ کبھی کبھی تزکیہ نفس میں مشغول ہوتے تو اس وقت تمام خلق بلکہ بادشاہوں تک کی جانب التفات نہیں فرماتے تھے، لوگوں نے اس تکبر کی نسبت سوال کیا، فرمایا "حاشا میں متکبر نہیں ہوں لیکن جب میں اپنی ہستی سے گزر جاتا ہوں اور خدا کی کبریائی مجھے مستہلک کردیتی ہے تو یہ اسی کی کبریائی کا جلوہ ہوتا ہے، میں درمیان میں نہیں ہوتا" ؏۲

پند ونصیحت اہل جاہ

سلاطین وامرا کے سامنے مولاناؒ کو حق بات کے کہنے میں کبھی تامل نہیں ہوتا تھا۔ اور حق تو یہ ہے کہ آپ جس حد تک سلاطین وامرا سے ملنا جائز رکھتے تھے وہ اسی مصلحت سے تھا کہ ان کو نیک نصیحت کریں، "فیہ مافیہ" تمام تر انھیں مواعظ کا مجموعہ ہے جو آپ نے وقتاً فوقتاً پروانہ کی مجلس میں ارشاد فرمائے ہیں، یہاں دو تین روایتیں پروانہ سے متعلق نقل کی جاتی ہیں جن سے یہ اندازہ ہوگا کہ پروانہ کے ایسے "آمر مطلق" کو جب آپ اس معانی

؏۱ "فیہ مافیہ" ص۲۱۴ ؏۲ مناقب ص۲۱۲

کے ساتھ متنبہ کر دیا کرتے تھے تو دوسروں کا کیا ذکر ہے۔

ایک مرتبہ پروانہ نے مولاناؒ سے پند و نصیحت کی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ "میں نے سنا ہے کہ تم نے قرآن شریف یاد کیا ہے" کہا "ہاں"، پھر فرمایا شیخ صدرالدینؒ سے کل احادیث سُنی ہیں، اس نے کہا، ہاں، مولاناؒ نے فرمایا کہ "جب ان کلمات سے تمہیں پند و نصیحت نہ حاصل ہوئی تو میرے کلمات سے کیا حاصل ہوگی" [1]

اسی طرح ایک روز سلطان عزالدین کیکاؤس مولاناؒ کی خدمت میں آیا، مگر مولاناؒ نے کچھ زیادہ التفات نہیں فرمایا، اس نے کہا کہ مجھے کچھ نصیحت کیجئے، آپ نے فرمایا کہ کیا نصیحت کروں، تمہیں شبانی کا حکم دیا گیا ہے اور تم گرگی کرتے ہو، پاسبانی کے لئے کہا گیا ہے اور دزدی کرتے ہو اور سلطانی کے خلاف شیطان کی بات پر عمل کرتے ہو، سلطان روتا ہوا باہر آیا اور در مدرسہ پر آکر توبہ کی، پھر مولاناؒ نے بھی بہت نوازش کی [2]

ایک مرتبہ معین الدین پروانہ اور دوسرے اکابر مولاناؒ کی خدمت میں آئے، مولاناؒ برآمد نہیں ہوتے تھے، یہ لوگ انتظار کرتے کرتے تھک گئے، پروانہ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ "امیران عادل اولوالامر ہیں" "بزرگان دین نے ان کا احترام کیا ہے، مولانا کا اس درجہ گریز کس وجہ سے ہے؟ ناگاہ مولاناؒ مدرسہ کے جماعت خانہ سے برآمد ہوئے، اور اثنائے بیان میں فرمایا کہ سلطان محمود، شیخ ابوالحسن خرقانی کی زیارت کو روانہ ہوا، امراء و وزراء نے آگے بڑھ کر خبر دی، شیخؒ نے جنبش نہ کی، جب سلطان دروازے تک پہنچ گیا تو وزیر

---

[1] مناقب ص۱۰۳

[2] ، ص۲۶۸

نے عرض کیا کہ بادشاہ کی عزت کے خیال سے قدم بقدم بازخر مقدم کریں۔ آخر بادشاہ اندر قریب آگیا۔ اس وقت وزیر نے کہا کہ قرآن میں اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم وارد ہے۔ تعظیم اولی الامر واجب ہے خاص کر ایسے بادشاہ دل بیدار کی، فرمایا کہ "میں اطیعوا اللہ میں اس درجہ مستغرق ہوں کہ اطیعوا الرسول سے فارغ نہیں ہوا ہوں۔ اولی الامر کا کیا ذکر، سب رونے لگے [1]

اس طرح کی تلخ نصیحتوں کے ساتھ ہی ساتھ جن سلاطین وامرا کی نسبت مولاناؒ کا خیال اچھا تھا۔ ان کی مدح میں بھی آپ دریغ نہیں کرتے تھے، دل کھول کر تعریف کرتے تھے، چنانچہ ایک روز معین الدین پروانہ مولاناؒ کی زیارت کو آیا، سلطان ولدؒ نے اسے بٹھلایا اور مولاناؒ کو خبر دی، مولاناؒ نے برآمد ہونے میں بڑی تاخیر کی۔ سلطان ولدؒ بطور خود کچھ باتیں کرتے رہے۔ ناگاہ مولاناؒ باہر آئے۔ پروانہ نے کہا کہ سلطان ولدؒ نے مجھ سے بہت کچھ عذرخواہی کی۔ اور بہت لطف فرمایا، میں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ اشارہ اس امر کا ہے کہ کسی کو انتظار میں رکھنا کس قدر گراں اور باعث زحمت ہوتا ہے، مولاناؒ نے فرمایا کہ تمہارا یہ خیال بہت اچھا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ جب کوئی بدقوارہ و بدآواز سائل آجاتا ہے تو اسے جلد کچھ دے کر رخصت کرتے ہیں مگر جب کوئی خوش شکل و خوش آواز سائل ہوتا ہے تو اسے حیلہ و حوالہ سے دیر تک روکتے ہیں کہ اس کی آواز سے لطف حاصل ہو، پس میرا دیر سے آنا اسی وجہ سے تھا کہ مردانِ خدا کے ساتھ تمہیں جو خلوص واعتقاد ہے وہ مجھے پسند ہے چاہتا ہوں کہ

---

[1] مناقب ص ۱۴۹

اور زیادہ ہو اور خدا کے ہاں مقبول ہو عا

ایک مرتبہ پروانہ نے کہا کہ مولاناؒ کا لطف و کرم ہے کہ تشریف لائے، مجھے اس کی توقع نہ تھی، میں کس لائق ہوں، مجھے چاہئے کہ رات دن دست بستہ حاضر رہوں بلکہ میں اس قابل بھی نہیں ہوں، فرمایا کہ یہ تمام خیالات اس وجہ سے ہیں کہ تمہاری ہمت بلند ہے، اگرچہ تم بہت بڑے کاموں میں مشغول ہو مگر اپنی علوے ہمتی کی وجہ سے انھیں کم سمجھتے ہو اور ان پر راضی نہیں ہو میں اگرچہ دل میں ہمیشہ تمہارا خیال رکھتا ہوں، مگر یہ چاہا کہ ظاہر میں بھی مشرف ہوں کیونکہ ظاہر بھی بڑی چیز ہے" عا

ایک مرتبہ اتابک (مجد الدین) کا لڑکا مولاناؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمایا کہ "پدر تو دایم بحق مشغول است و اعتقادش غالبست واز تخنش پیدا" یہ اس وجہ سے فرمایا تھا کہ رومیوں نے کئی مرتبہ مشورہ کیا کہ ہم اپنی لڑکی تاتاریوں کو دیں تاکہ ہمارا ان کا دین ایک ہو جائے اور مسلمانوں کا دین اٹھ جائے، اتابک نے کہا کہ دین ایک کب رہا ہے جو اب ایک ہو جائے گا" مختلف دینوں میں ہمیشہ جنگ و جدل قائم رہی ہے، اس طرح ان کو اپنے ارادہ سے باز رکھا عہ

ایک مرتبہ فخر الدین سیواسی اپنے وطن سیواس سے آئے تھے۔ اس روز معین الدین پروانہ بھی مولاناؒ کے یہاں آیا، مولاناؒ نے فخر الدین سے پوچھا کہ کل کہاں ٹھہرے تھے، کہا پروانہ کے مکان میں، دریافت کیا کہ اس راستہ میں پروانہ کا

عا مناقب ص۱۷۷ مثنوی شریف میں اس تمام بیان کو نظم کیا ہے "تاخیر اجابت دعائے مومن" در الحکم میں دیکھنا چاہئے۔ عا "فیہ ما فیہ" ص۴۴-۴۵ عہ تاریخی حیثیت سے یہ مسلم ہے

کوئی مکان ہے، کہا ہاں، امن و امان اس قدر ہے کہ مسافر جہاں چاہتے ہیں بے خوف و خطر ٹھہر جاتے ہیں، پروانہ بہت خوش ہوا، مولانا نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے زمانہ میں ایک اونٹ تھا، اس کی گردن میں ایک ہیکل باندھ دیا تھا، وہ باغوں میں میوے کھاتا پھرتا تھا، کوئی تعرض نہ کرتا، کسی نے اس ہیکل کو اتار لیا، اس کے بعد اس اونٹ کو لوگوں نے بیگار میں پکڑ لیا " پس اے امیر کبیر فقیر نہاد، جان لے کہ وہ ہیکل میں ہوں جو اشتر عالم کی گردن پر بندھا ہوا ہے جب میں نہ رہوں گا احوال معلوم ہو جائے گا، پروانہ رونے لگا کہ خدا نہ کرے کہ حضرت کے بعد ہم لوگ زندہ رہیں، فرمایا نہیں نہیں، میرے بعد تھوڑی مدت تک تم رہو گے، مگر یہ آسائش و آرائش نہیں رہے گی عہ (انتقال کے وقت بھی یہی فرمایا تھا کہ میرے بعد تم لوگوں کو آسائش نہیں ملے گی مگر تمہارے فرزندوں کو آسائش ملے گی)

باجوخاں کی نسبت فرمایا کہ وہ ولی ہے مگر نہیں جانتا [کیفا خاتون کو قتل کر کے باجوخان ۶۹۵ھ / ۱۲۹۵ء میں حکمراں ہوا تھا۔ چھ ماہ کی حکمرانی کے بعد خود غازان کے ہاتھ سے ہلاک ہوا۔ غازان نے عہد کیا تھا کہ اگر باجو پر اسے فتح ہوئی تو وہ مسلمان ہو جائے گا، چنانچہ فتح کے بعد غازان مغلوں کی ایک کثیر تعداد کے ساتھ مسلمان ہو گیا، گویا اس طرح باجو کا قتل بالواسطہ مغلوں کے اسلام لانے کا باعث ہوا۔]

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۴

کہ تاتاریوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنے میں مسیحیوں نے صنف نازک کا قوی حربہ بھی پوری آزادی سے استعمال کیا تھا، ہلاکو اور اباقا کے محلوں میں عیسائی عورتیں داخل تھیں اور الجایتو کو اس کی عیسائی ماں نے باقاعدہ اصطباغ دلایا تھا، ان تمام زن فروشیوں کا مقصود یہی تھا کہ ایک

پاس خاطر مریدین :۔

حضرت بہاء الدین ولد کے حالات میں یہ مذکور ہو چکا ہے کہ آپ کو اپنے مریدوں کا خیال کس درجہ رہا کرتا تھا، مولانا میں یہ وصف کچھ اور بھی بڑھا ہوا تھا۔ اگر یہ کہا جائے تو اس میں کچھ بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ آپ نے اپنی زندگی اپنے اصحاب و مریدین کے لئے وقف کر دی تھی، اپنے خاص خاص اصحاب کی قدر و منزلت جس درجہ آپ کرتے تھے وہ آپ کے ہمعصروں کے لئے باعث حیرت تھی اور آپ کے بعد تو بہتوں کو یہ مغالطہ ہوا کہ شیخ صلاح الدین اور چلپی حسام الدین مولانا کے مرید نہیں بلکہ پیر تھے، یہاں چند واقعات ایسے نقل کئے جاتے ہیں جن سے یہ واضح ہوگا کہ مولانا کس کس طرح اپنے مریدوں کی پاسداری بلکہ بزرگداشت کرتے تھے

حمایت وضمان :۔

ایک مرتبہ معین الدین پروانہ نے کہا کہ مولانا نہایت نیک شخص ہیں اور میرا خیال ہے کہ مدتوں ایسا کوئی شخص پیدا نہو گا مگر آپ کے مرید نہایت بد و فضول لوگ ہیں، ایک مرید نے یہ خبر مولانا کو پہنچائی مولینا نے پروانہ کو رقعہ لکھا کہ "اگر یہ لوگ نیک ہوتے تو میں خود ان کا مرید

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۵)

طرف سے اہل یورپ اور دوسرے طرف سے تاتاری حملہ آور ہو کر مصر و شام کی مابقی اسلامی سلطنتوں کو نیست و نابود کر دیں۔ اس حالت میں مجد الدین کی یہ سعی قابل شکر گزاری تھی (ان تمام پیچ در پیچ تعلقات کو قدرے وضوح کے ساتھ سمجھنے کے لئے نفسل نجم دیکھنا چاہئے) ۵۱ مناقب ص ۱۸۴

کہیں نہ ہو جاتا۔ میں ان لوگوں کو مرید اسی وجہ سے تو کرتا ہوں کہ یہ بد ہیں اور حق یہ ہے کہ جب تک خدا ان کا ضامن نہیں ہوتا، میں انھیں مرید نہیں کرتا"۔[1]

مولاناؒ نے اپنے مریدوں کے بارے میں پروانہ کو جو کچھ لکھا اسی کو ایک دوسرے موقع پر زیادہ صاف الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ فخرالدین ابوالخیر نے یہ کہا کہ "مولانا بادشاہ بزرگوار ہیں لیکن ضرورت ہے کہ انھیں ان کے مریدوں سے الگ کر دیا جائے اور ان مریدوں کو دفع کیا جائے"۔ جب یہ خبر مولاناؒ کو پہنچی تو آپ نے مسکرا کر فرمایا کہ میرے مرید اہل دنیا کی نظر میں اس قدر مبغوض کیوں ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی نظر عنایت میں مقبول و محبوب ہیں۔ میں نے ساری دنیا کو چھلنی میں چھانا، سب جھڑ گئے، یہی لوگ باقی رہ گئے۔ میں اپنے مریدوں کی جان ہوں اور میرے مرید تمام دنیا کی جان ہیں بشرطیکہ لوگوں کو سمجھ ہو"۔[2]

ایک اور واقعہ اسی قسم کا پیش آیا کہ ایک مرتبہ معین الدین پروانہ نے شیخ صدر الدین کے زاویہ میں مجلس منعقد کی تھی مولاناؒ بھی تشریف فرما تھے، امیر کمال الدین پروانہ کے پہلو میں بیٹھا ہوا مولاناؒ کے مریدوں کی مذمت کر رہا تھا کہ "مولانا کے مرید بھی عجیب لوگ ہیں، اکثر عامی اور اہل حرفہ ہیں، اعیان شہر اور فضلا بہت کم ہیں، جہاں کوئی خیاط، بزاز، بقال ہوتا ہے مولانا اسے مرید بنا لیتے ہیں"۔ ناگاہ مولاناؒ نے سماع کے درمیان ایک نعرہ مارا اور فرمایا کہ "کیا منصورؒ حلاج نہیں

---

[1] مناقب ص۱۶۵

[2] " ص۱۲۵

تھے، ابوبکر نساج نہیں تھے اور ایک دوسرے بزرگ حاج نہیں تھے، ان کی حرفت نے انھیں کیا نقصان پہنچایا؟ تم ان کے نام کے ساتھ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہو۔" ؎۱

اس بارے میں مولانا نے ایک موقع پر اپنا اصول یا یقین بیان فرمادیا ہے۔ اسے بھی سن لینا چاہئے۔ ایک مجلس میں ایک لڑکا مولانا کا مرید ہوا۔ ایک حاسد نے کہا کہ "معلوم نہیں یہ مرید خدا تک پہنچے گا یا نہیں اور خدا اسے بخشے گا یا نہیں؟" مولانا نے فرمایا کہ "پہلے بخشدیا اس کے بعد میرے پاس بھیجا ہے، کیونکہ مشیت الٰہی یہ ہے کہ اول بندے کو خدا قبول کرتا ہے۔ اس کے بعد اسے (نیک) بندوں کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ ان کی برکت صحبت و فیض تربیت سے بہرہ اندوز ہوں اور تقرب خدا حاصل کریں۔" ؎۲

[اصل یہ ہے کہ مولانا کے مریدوں کے متعلق اس قسم کے جتنے اعتراضات لوگ کرتے تھے ان کی بنا یہ ہوتی تھی کہ مولانا کے مریدوں میں عام اشخاص کثرت سے داخل تھے اور عام اشخاص جیسے ہوتے ہیں وہ ظاہر ہے اور پھر اپنی جگہ پر اس نفس واقعہ کی دو وجہیں ہیں، اول یہ کہ اس تمام پیری مریدی سے مولانا کا مقصود ہی یہ تھا کہ عام اشخاص کی اخلاقی حالت کو درست کریں۔ دوسری یہ کہ مولانا بیکاری و کاہلی سے سخت متنفر تھے اور بالخصوص اپنے مریدوں کے لئے اسے کسی صورت میں

؎۱ مناقب ص ۹۴

؎۲ " ص ۲۷۶

روا نہیں رکھتے تھے، اس لئے زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کو مرید کرتے تھے جو کسی نہ کسی قسم کی حرفت، تجارت وغیرہ میں مشغول ہوں، اگر نہ ہوتے تھے تو ضرور ہے کہ مرید ہونے کے بعد مولاناؒ کے فیض تعلیم کے اثر سے کوئی نہ کوئی شغل اختیار کر لیتے رہے ہوں گے اور یہ عامۃ الناس کا گروہ ہر زمانہ اور ہر جگہ میں اخلاق کی زیریں سطح پر ہوا کرتا ہے، لیکن انھیں کی دستگیری اصل دستگیری ہے]

قدر افزائی:۔

مریدین اگر مولاناؒ کی کچھ خدمت کرتے تو اس کی قلت و کثرت پر نظر نہ کرتے تھے بلکہ قلیل کو اس طرح سراہتے کہ وہ سبک نہ معلوم ہو۔

ایک مرتبہ دو ترک حاضر ہوئے اور تھوڑی سی مسور ہدیہ لائے اور اس سے شرمندہ تھے، مولاناؒ نے اس پر ایک حکایت بیان کی کہ آنحضرتؐ نے ایک بار اصحاب سے مال طلب کیا، جس سے جو ہو سکا لایا، ایک صحابی کے پاس ایک روئیؓ اور تین چھواروں سے زیادہ کچھ نہ تھا، وہ اسی کو لے آئے، آنحضرتؐ نے اسے سب مال سے زیادہ باوزن قرار دیا اور فرمایا کہ "القلیل عند الجلیل کثیر" اس طرح ان لوگوں کو خوش کر دیا۔ [1]

اغماض:۔

مریدوں اور مخلصوں کی ظاہری حالت و ہیئت پر چنداں لحاظ نہیں فرماتے تھے بلکہ احیاناً اگر کوئی لغزش ہو جاتی تو اس سے چشم پوشی فرماتے اور اس کی تاویل

---

[1] مناقب ص۱۰۱

ایسے دلپذیر طریق پر کرتے کہ ہزار امتناع سے زیادہ مؤثر ہوتی، ایک خواجہ اکمل الدین طبیب نہایت ہی نفیس کپڑے پہن کر مولاناؒ کی خدمت میں آئے، مولانا نے ان کے کان میں کچھ کہا، سب کپڑے اتار کر قوالوں کو دیدیئے، اور روانہ ہو گئے، حسام الدین نے پوچھا کہ مولاناؒ نے کیا کہا تھا، جواب دیا کہ میرے دل میں یہ خیال آرہا تھا کہ ایسے نفیس کپڑے پہن کر کیوں آیا، یہ حرکت مناسب نہ تھی، مولاناؒ نے میرے کان میں فرمایا کہ بے فکر رہو اور کچھ اندیشہ نہ کرو "تنت زدما اعتبار ندارد تا جامہ بالائے را کہ بیرون است چہ اعتبار خواہد بودن، جہدے کن کہ تو معروف جامہ شوی نہ جامہ معروف تو۔" اس شکرانہ میں میں نے کپڑے قوالوں کو دیدیئے۔ اس کے بعد اکمل الدین جب تک زندہ رہے کبھی نفیس کپڑے نہ پہنے [۱]

عظمت و قوت:

مولانا اپنے مریدوں کی جس درجہ عظمت و قوت کرتے تھے اور جسے اکثر لوگ نظر استعجاب سے دیکھتے تھے، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ چلپی حسام الدینؒ کی عیادت کو جارہے تھے، راستہ میں ایک کتا پڑا تھا۔ کسی نے اسے مار کر بھگا دیا۔ آپنے ناخوش ہو کر فرمایا کہ "اے بے ادب چلپیؒ کی گلی کے کتے کو مارتا ہے" [۲]

ایک انتہائی مثال ملاحظہ ہو، چلپیؒ کے وہاں آپ اکثر تشریف لے جایا کرتے تھے، ایک مرتبہ جاڑے میں رات کو بے وقت جا پڑے، دروازہ بند تھا، سب لوگ سو رہے تھے۔ اور باہر سخت برف پڑ رہی تھی مگر نہ آپ واپس ہوئے اور نہ دروازے کو کھٹکھٹایا۔

---

[۱] مناقب ص ۲۴۲

[۲] سپہ سالار ص ۹۴

صبح تک یوں ہی کھڑے رہے اور برف اوپر گرتی رہی، صبح کو جب دربان نے دروازہ کھولا اور یہ حال دیکھا دوڑ کر چلپی کو خبر دی وہ دوڑتے ہوئے باہر آئے قدم پر سر رکھدیا اور رونے لگے،

سپہ سالارؒ لکھتے ہیں کہ یہ درحقیقت اس امر کی تعلیم ہے کہ شیخؒ اگرچہ مرید سے مستغنی ہے۔ مگر وہ مرید کی عزت وحرمت اس درجہ ملحوظ رکھتا ہے تو مرید کو شیخ کی عزت کس درجہ ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ عله

جب آپ کا خود یہ حال تھا تو ظاہر ہے کہ اپنے مریدوں کی شان میں دوسروں کی ادنیٰ سوء ادبی کے بھی آپ روادار نہیں ہو سکتے تھے۔

ایک مرتبہ سماع میں کمال سرف صوفیوں کا کچھ لحاظ نہ کرکے اصحاب مولاناؒ کی طرف پشت کرکے بیٹھ گئے تھے اور ادھر ملتفت نہ تھے، مولاناؒ نے ڈانٹ کر فرمایا کہ "اے کمال ناقص، تو نے کمال کر دیا، ہشیار ہو جا" کمال اسی وقت گر پڑے اور سر پھٹ گیا، مولاناؒ کے روبرو بہت گریہ وزاری کی، آخر مولاناؒ راضی ہو گئے اور اپنی دستار اور اپنا پیراہن انھیں دیا، وہ اسی وقت صدق دل سے مرید ہو گئے عله

محبت :-

مولاناؒ کو اپنے مریدوں سے جس درجہ محبت تھی اور آپ ان کے لئے شفاعت اور دعائے خیر میں جسطرح سرگرم رہتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک روز مولاناؒ نے

عله سپہ سالار ص ۴۴

عله مناقب ص ۹۵

سراج الدین تبریزیؒ سے کہا کہ حاضر رہنا کہ میں آج تم سے بغل گیر ہوں گا، سراج الدینؒ نے اس خوشی میں بہت کچھ شکرانہ درویشوں کو دیا اور اپنے مکان پر بہت نفیس بستر بچھایا، ناگاہ مولاناؒ تشریف لائے اور فرمایا کہ سراج الدینؒ تم بستر پر سو رہو، سراج الدین کہتے ہیں کہ میں صبح تک کروٹیں بدلتا رہا کہ شاید مولاناؒ آکر بستر پر استراحت فرمائیں گر مولاناؒ نماز میں مشغول ہو گئے تو برابر نماز ہی پڑھتے رہے، آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہا کہ صبح قریب ہے کچھ تو آرام کیجیے، فرمایا کہ سراج الدینؒ اگر میں سو رہوں تو اتنے سونے والوں کی فکر کون کرے، میں نے تو ان سب کو اپنے ذمہ لیا ہے تاکہ انھیں خدا تک پہنچاؤں انشاءاللہ العزیز علہ

گاہ بگاہ حسب عادت عملی مثال سے بھی اپنے اس خیال کا اظہار فرمایا کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ پروانہ کے یہاں مجلس سماع تھی۔ مولاناؒ وہاں پہونچکر دروازہ پر ٹھہر گئے، جب آپ کے سب اصحاب جمع ہو لئے تب اندر گئے، مجلس کے بعد چلپی حسام الدینؒ نے اس توقف کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ "اندر چلا جاتا تو ممکن تھا دربان میرے بعض اصحاب کو روک دیتا اور وہ میری صحبت سے محروم رہ جاتے، اور جب دنیا میں اپنے دوستوں کو ایک امیر یا وزیر کے مکان میں نہ لے جا سکوں تو قیامت میں انھیں جنت میں کیا لے جا سکوں گا علہ"

علی ہذا ایک روز مدرسہ میں کھڑے ہوئے تھے اور تمام احباب حاضر تھے۔ دوستوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ "تمام دنیا میں ایک شخص ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے، تمہارے واسطے ہے اور تمہارے لئے کوشاں ہے اور تمہیں چاہتا ہے (باشما ست واز برائے شمات

علہ مناقب صہ ۱۷۱

علہ " صہ ۹۶

واز بہرِ شما کوشِ دو شما را میخواہد) ؎

من از برائے مصلحت در حبسِ دنیا ماندہ ام | من از کجا حبس از کجا مالِ دو رزدیدہ ام[1]

ایک غزل میں اس کا اشارہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

نیم زکار تو فارغ ہمیشہ در کارم | کہ لحظہ لحظہ ترا من عزیز تر دارم
بذاتِ پاکِ من آفتاب سلطنتم | کہ من ترا نگذارم بلطف بر دارم
رخِ ترا ز شعاعاتِ خویش نور دہم | سر ترا بدہ انگشتِ مغفرت خارم[2]

ایک غزل میں اپنے مریدوں کی مدح اس طرح فرمائی ہے۔

آنچہ می آرد ز وصفِ ایں زمانم درد ہن | بر مریدِ مردہ خوانم اندر اندازد کفن
خود مریدِ من نمیرد کابِ حیواں خوردہ است | وانگہاں از دستِ کہ از ساقیانِ ذوالمنن

مولاناؒ کو جس درجہ اپنے مریدوں سے الفت و محبت تھی آپ کے مرید بھی اسی قدر آپ پر دل و جان سے فدا تھے، دو چار روز مولاناؒ کے دیدار سے مشرف نہ ہوتے یا چند روز پند و نصائح سے محروم رہتے تو بیقرار ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ شہر کے کچھ اعیان و اکابر جمع ہو گئے تھے مولاناؒ نے اپنا وقت انھیں کے درمیان حقایق و معارف بیان کرنے میں صرف کر دیا، ان لوگوں کے جانے کے بعد مریدوں نے شکایت کی کہ آج ہم فیضِ علم لدنی سے محروم رہ گئے۔ فرمایا کہ "ان لوگوں نے جو کچھ سنا وہ تمہارے ہی طفیل میں سنا۔ مقصود تم ہی تھے" اسی طرح ایک مرتبہ مولاناؒ رمضان شریف میں دس روز تک مکان

---

[1] مناقب ص ۲۴۸

[2] سپہ سالار ص ۳۸

میں بیٹھے رہے باہر نہ آئے، مریدوں نے شور برپا کر دیا کہ ہمیں اس فراق کا تحمل نہیں ہے، سب لوگ مدرسہ میں جمع ہوئے، سلطان ولدؒ نے حجرے کے دروازے کے دراز سے جھانک کر دیکھا کہ مولاناؒ کیا کر رہے ہیں، مولاناؒ نے فرمایا کہ "باہر کیا شور مچا ہوا ہے"، عرض کیا کہ "محبان و عاشقان، خداوندگار کے فراق میں بیتاب ہو رہے ہیں"، فرمایا کہ "حق بجانب ہیں، مگر تین دن مجھے اور مہلت دیں" اس کے بعد برآمد ہوئے اور سات روز تک سماع رہا۔[1]

تاویل شکایات:۔

مولاناؒ کے سامنے آپ کے مریدوں کی جب کبھی کوئی شکایت ہوتی، ہمیشہ اس کی تاویل نہایت لطیف پیرایہ میں کرتے تھے، چنانچہ ایک روز سلطان ولدؒ نے مولاناؒ کے سامنے بیان کیا "دوسرے صوفی باہم موافقت کے ساتھ رہتے ہیں مگر ہمارے اصحاب برابر ایک دوسرے سے بےوجہ لڑتے رہتے ہیں" فرمایا کہ "بہاء الدین اگر ہزار مرغیاں گھر میں ہوں تو سب گھل کر رہتی ہیں مگر دو مرغ ایک جگہ نہیں رہتے"[2]

اسی طرح ایک روز شیخ محمودؒ نے شکایت کی کہ ہمارے اصحاب ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں، فرمایا کہ "بھائی بھائی آپس میں لڑتے ہیں مگر باپ دونوں سے خوش رہتا ہے۔"

ایک روز سلطان ولدؒ نے عرض کیا کہ "بعض اشخاص کبھی کبھی عقیدت کا

---

[1] سپہ سالار صہ ۲۱

[2] مناقب صہ ۱۲۳-۱۲۴

اظہار کرتے ہیں اور پھر برگشتہ ہو جاتے ہیں" فرمایا کہ " ان لوگوں کی مثال دیوانوں کی ہے کبھی کبھی عاقلوں کی سی باتیں کرنے لگتے ہیں اور پھر وہی ہذیان بکنا شروع کر دیتے ہیں۔"

اتباعِ شیخ :- مولانا کا یہ خیال تھا کہ بغیر مدد شیخ کے کوئی شخص کسی درجہ پر نہیں پہونچ سکتا۔ ایک روز اسی سوال کے جواب میں فرمایا کہ ایک درویش بغیر تلقین شیخ کے ذکر میں مشغول رہتا اور نہایت کوشش وسعی کرتا تھا، ایک شب دیکھا کہ اس کے منہ سے نور نکلتا ہے اور زمین پر گر کر رہ جاتا ہے، سخت حیران ہوا اور ایک شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا، شیخ نے کہا کہ جو ذکر بلا تلقین شیخ کے ہوتا ہے اس کا یہی حال ہے۔ شیخ نے اسے تلقین کی، اس کے بعد اس شخص نے مشاہدہ کیا کہ نور اس کے منہ سے نکل کر آسمان کی طرف بلند ہوتا ہے، پس معلوم رہنا چاہئے کہ بغیر شیخ کے کوئی تربیت ٹھیک نہیں ہوتی [1]

پس اسی لئے اس تمام پاس خاطر کے ساتھ مولاناؒ مریدوں سے بھی یہ توقع رکھتے تھے کہ اپنے شیخ کے سوا اور کسی طرف نظر نہ کریں۔ فرمایا کرتے تھے کہ " شیخ مثل آفتاب کے ہے مرید کو چاہئے کہ اس کا دامن پکڑ لے، جب برآمد ہوا اس کے ساتھ برآمد ہو، جب غروب ہوا اس کے ساتھ غروب ہو تا کہ تسلیم کلی و متابعتِ تام ثابت ہو جائے"۔ متعدد غزلوں میں اس خیال کی طرف اشارہ فرمایا ہے ؎

بمن نگر کہ بجز من بہر کہ در نگری   یقین بود کہ ز نور خدائے بیخبری

---

[1] مناقب ص۳۱۲

بمن نگہ بد ور خسار زعفرانی من — بگو نہ گونہ علامات آں جہانی من[1]

ایک روز مولاناؒ اپنے مدرسہ میں حقائق و معارف بیان فرما رہے تھے اسی سلسلہ میں فرمایا کہ "میں شمس الدینؒ مطی کو بہت دوست رکھتا ہوں، مگر ان میں ایک عیب ہے" شمس الدین نے سر جھکا کر پوچھا کہ "وہ عیب کیا ہے" فرمایا کہ "در ہر وجود تصور میکنی کہ خدا آں بجاست و در پئے آں خیال بے حقیقت میروی" شمس الدین کہتے ہیں کہ واقعی میری عادت یہ تھی کہ کوئی شیخ، کوئی گوشہ نشیں، کوئی درویش ہو میں اس کے پاس پہنچتا تھا اور اس سے مدد و اعانت چاہتا تھا، میں نے اس سے توبہ کی[2]

مولاناؒ خود جس درجہ شیخ کا اتباع کرنا چاہتے تھے اس کی مثال کے لئے وہ واقعہ کافی ہے جو حضرت شمس الدینؒ کے طلب شاہد و شراب کے متعلق پیش آیا۔ اسی طرح اپنے مریدوں کے لئے بھی اتباع و حضوری شیخ کو لازم و ضروری سمجھتے تھے، آپ کے مریدوں میں ایک صاحب ملک المدرسین شرف الدین قیصری تھے، تاج الدین نے ان کے لئے آقسرا میں ایک مدرسہ بنایا اور انھیں مدرسی کے لئے طلب کیا، انھوں نے جواب دیا کہ ایک روز میں مولاناؒ کی خدمت میں حاضر تھا، فرمایا کہ شیخ کی حضوری میں مرید کو (بلا اجازت شیخ) نماز پڑھنا بھی جائز نہیں خواہ کعبہ میں کیوں نہ ہو، اس پر یہ حکایت بیان کی کہ ایک روز حضرت بہاء الدینؒ ولد بیان معرفت میں مشغول تھے، نماز کا وقت آگیا، بعض مرید اٹھ کر نماز میں مشغول ہو گئے اور بعض اسی طرح بیٹھے رہے، خدا نے ان

---

[1] مناقب صـ۲۵ و سپہ سالار صـ۳۶

[2] ″ صـ۹۷

لوگوں کو نظرِ بصیرت عطا کی اور انھوں نے دیکھ لیا کہ ان نماز پڑھنے والوں کا منہ قبلہ کی طرف سے پھرا ہوا ہے [1]

معین الدین پروانہ کے داماد مجدالدین اتابک نے مولانا سے یہ درخواست کی کہ مولانا کے مدرسہ میں چلہ کشی کریں، مولانا نے اجازت دیدی، چند روز بعد بھوک کی بیتابی سے اپنے رفیق کے ساتھ رات کو حجرے سے نکل کر ایک دوست کے یہاں گئے مرغ و مزعفر کھایا اور پھر آکر حجرے میں بیٹھ رہے، صبح کو مولانا جب مدرسہ میں تشریف لائے تو اس حجرے کے دروازہ پر انگلی رکھ کر سونگھا اور فرمایا کہ اس حجرے سے تو مرغ و مزعفر کی بو آتی ہے، ریاضت کی بو نہیں آتی، اپنے کو شیخ کے سپرد کر دینا چاہیے تاکہ شیخ بر مصلحت کو دیکھ کر مقصود تک پہونچا دے، مجدالدین حجرے سے باہر نکل پڑے اور استغفار کر کے کہا کہ ایسے خیطار رحمت کے ہوتے ہوئے کنجِ خلوت میں بیٹھنا بے سعادتی ہے [2]

حضوری باطنی:۔

لیکن یہ ملحوظ رہے کہ اس حضوری سے مولانا کا مقصود ظاہری حضوری سے بڑھ کر باطنی حضوری کا تھا، مولانا بارہا یہ فرمایا کرتے تھے کہ "میں یہ جسم نہیں ہوں جسے تم لوگ دیکھتے ہو" متعدد روایتیں ایسی منقول ہیں کہ مولانا بعض لوگوں کے دعوی حضوری وصحبت کو رد کر دیا کرتے تھے۔ وہ اس اعتبار سے تھا کہ اصل حضوری دل کی حضوری ہے چنانچہ

---

[1] مناقب ص۱۱۴

[2] ، ص۱۰۵

ایک روز سلطان ولدؒ نے عرض کیا کہ مریدین یہ کہتے ہیں کہ "جب ہم مولاناؒ کو نہیں دیکھتے تو خوش نہیں رہتے" فرمایا کہ جو شخص میرے بغیر خوش نہیں رہتا اس نے درحقیقت مجھے پہچانا نہیں ہے، مجھے اس وقت پہچانیں گے جب میرے بغیر خوش رہیں، فرمایا کہ بہاءالدینؒ جب تم اپنے کو خوش پاؤ تو سمجھ لو کہ وہ خوشی میری ذات سے ہے" [۱]

لیک مارا چوں بجوئی بر سر شادی بیا جو | کہ مقیمانِ خوش آباد جہان شادیم

علیٰ ہٰذا ایک روز مولاناؒ کے سامنے کسی نے یہ بیان کیا کہ فلاں شخص کہتا ہے کہ "میرا دل و جان مولاناؒ کی خدمت میں حاضر ہے" فرمایا "چپ رہو، لوگوں میں جھوٹ بولنا باقی رہ گیا ہے، ان لوگوں نے ایسا دل و جان کہاں سے پایا کہ مردوں کی خدمت میں حاضر کریں۔" [۲]

اسی طرح ایک روز علاءالدینؒ ثریالوس نے عرض کیا آج اخی احمد لوگوں میں یہ کہہ رہے تھے کہ میں بھی مولاناؒ کے مریدوں اور عاشقوں میں ہوں' فرمایا "چپ رہئے، وہ کیسے مرید و عاشق ہیں کہ معشوق کو پہچانتے بھی نہیں" [۳]

حق شناسی:۔

دوسروں کے خیالات کی قدر کرنے میں مولاناؒ بہت فراخدل تھے، شیخ صلاح الدینؒ کے حالات میں مذکور ہو چکا ہے کہ آپ فارسی نہ جاننے کی وجہ سے بعض الفاظ کا تلفظ غلط

---

[۱] مناقب ص۱۳۲

[۲] " "

[۳] " ص۱۳۳

کیا کرتے تھے، مولاناؒ خود بھی اس لفظ کا تلفظ اسی طرح کرتے، اسے فرط محبت یا
دفور ادب پر محمول کر سکتے ہیں، گو مذہب شعرا میں جو جرم سب سے زیادہ ناقابل
درگذر ہے وہ دوسرے شعرا کا اعتراف ہے، لیکن مثنوی شریف میں حکیم سنائی، عطارؒ وغیرہ
کے خیالات جن الفاظ میں نقل کئے ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ آپ دوسروں کے خیالات
کی کس درجہ وقعت کرتے تھے، دیوان میں بھی جہاں کہیں کوئی ذکر کسی کا آگیا ہے نہایت
اچھے الفاظ میں اسے یاد کیا ہے، آپ کا یہ طریقہ تھا کہ اگر کوئی شخص معمولی سی معمولی بات بھی پسندیدہ
کہتا تو آپ اس کی بے حد تعریف فرماتے تھے. ایک واقعہ ہے کہ ایک بڑے شخص کا انتقال
ہو گیا. لوگوں نے آکر مولاناؒ سے سوال کیا کہ مع تابوت کے قبر میں رکھیں یا نہیں، مولاناؒ نے
اپنے اصحاب کی طرف خطاب کرکے پوچھا کہ کیا رائے ہے. کریم الدین ولد بیکتیمور نے کہا کہ
بے تابوت کے رکھنا بہتر ہے، لوگوں نے کہا کہ اس کی دلیل کیا ہے؟ کہا کہ ماں اپنے بیٹے
کی رعایت بھائی سے زیادہ کرتی ہے، انسان کا جسم خاک سے بنا ہے اور لکڑی کا تختہ
بھی خاک سے پیدا ہوا ہے. پس دونوں بھائی ہیں اور خاک ماں ہے، پس مادر مشفق کے
سپرد کرنا زیادہ بہتر ہے، مولاناؒ نے بہت تعریف کی اور فرمایا کہ یہ بات کسی کتاب میں
نہیں ہے [1]

قدردانی اہل کمال :۔

اہل کمال کی قدردانی میں بھی کوتاہی نہیں فرماتے تھے. ایک روز ملک الحفاظ اکمل
مولاناؒ کی خدمت میں آئے، مولاناؒ نے بہت تعظیم کی، بلند جگہ پر بٹھلایا اور فرمایا کہ مصحف

---

[1] مناقب ص۱۱۱

کی عزت کرتے اور رحل پر رکھتے ہیں، حفاظ کہ حامل کلام اللہ ہیں انھیں کیوں نہ بلند جگہ پر بٹھلایا جائے، کسی کاغذ میں قرآن شریف لکھا ہوتا ہے اسے آگ میں نہیں ڈالتے تو جس دل میں قرآن شریف ہو تو اسے دوزخ میں کیوں ڈالیں گے، شہر کے تمام حفاظ نہایت شکرگزار ہوے اور مولاناؒ کے مرید ہو گئے [۱]

حسن ظن:-

حق شناسی اور قدردانی کے ساتھ حسن ظن کا وصف بھی آپ میں بہت بڑھا ہوا تھا اور ظن المومنین خیرا پر آپ خود پوری طرح عامل تھے اور اپنے اصحاب کو ہمیشہ یہ نصیحت کرتے رہتے تھے کہ اگر اپنے دوستوں میں سے کسی کی نسبت کسی بری بات کا علم ہو تو ستر مرتبہ خیر و نیک اندیشی سے اس کی تاویل کرو جب بالکل ہی عاجز ہو جاؤ تو یہ کہہ کر چھوڑ دو کہ اس کا راز اسی کو معلوم ہوگا، اگر ایسا نہ کرو گے تو کوئی دوست نہ رہے گا، من طلب اخا بلا عیب فقد بقی بلا اخ ؎

یار آئینہ است جاں را در حزن ۔ در رخِ آئینہ اے جاں دم مزن [۲]

قدماء معاصرین کا ادب و لحاظ

اگر ذرا دقیق نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ جس شے کو قدردانی کہتے ہیں اس کے باطن در باطن میں خود اپنے حسن اخلاق کا اظہار بھی مضمر ہوتا ہے اور اس لئے اہل دنیا اور اہل جاہ سے بھی اس کا ظہور چنداں دشوار نہیں ہوتا بلکہ بکثرت وقوع میں آتا رہتا ہے، البتہ اس اظہار میں اہل تن اور اہل دل کے مبداء خیال میں فرق ہوتا ہے لیکن اپنے ہم

---

[۱] مناقب ص۱۸۱ [۲] ایضاً ص۱۹۱

فن دہم چشم اشخاص کے اوصاف کا اعتراف قدرے دشوار ہوتا ہے اور اس موقع پر بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں کیونکہ اظہار یا اعتراف کے لئے بے نفسی کی ضرورت ہوا کرتی ہے مولاناؒ کا ایک وصف خاص سمجھنا چاہئے کہ آپ اس بارے میں نہایت فراخدل واقع ہوئے تھے۔ اس خصوص میں جسقدر حالات و روایات ملتے ہیں ان سے بلا استثنا یہ ثابت ہوتا ہے کہ مولانا قدما کا ادب و معاصرین کا پاس و لحاظ بدرجۂ غایت مد نظر رکھتے تھے، اپنے خاص اصحاب (حضرت شمسؒ تبریز، شیخ صلاح الدینؒ، چلپی حسام الدینؒ) اور اپنے فرزند رشید سلطان ولدؒ کے متعلق جو کچھ آپ کے خیالات تھے وہ اپنے اپنے موقع پر واضح ہو چکے ہیں، اپنے عام مریدوں سے آپ کو جس قدر الفت تھی وہ بھی بیان ہو چکی ہے لیکن اگر اپنے گروہ خاص کے علاوہ اپنے زمانہ کے دیگر علما و صلحا کے نسبت بھی مولاناؒ ہمیشہ نہایت عمدہ خیالات کا اظہار فرمایا کرتے تھے اور سلف صالحین کا نام جب لیتے تو بغیر تعریفی الفاظ کے آگے نہ بڑھتے تھے۔ مثنوی شریف میں کسی محل و موقع پر کسی نہج سے اگر کسی بزرگ کا ذکر آگیا ہے تو ان کی تعریف و توصیف میں چند اشعار نظم سے ٹپک پڑنا لازمات سے ہے اور اشعار بھی ایسے جن سے صاف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دل سے نکلے ہیں (مثنوی کی بحث میں اسے دیکھنا چاہئے)

دیوان میں بھی جا بجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے مولاناؒ کے پاس ادب اور حسن ظن کا اظہار ہوتا ہے ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ

اسرار فقر و شرع حقیقت ز ما شنو — کاندر جہاں ز عالم اسرار آمدیم
عطارؒ روح بود و سنائیؒ دو چشم او[1] — ما در پے سنائیؒ و عطارؒ آمدیم

---

[1] دیوان اور تمام تذکروں میں "روح" کا لفظ ہے اور یہی مشہور ہے گر دوست شاہ نے "روحی" لکھا ہے۔

مردانِ راہ جملہ یکے روح و یک دل اند　　گویند در یقین کہ بیکبار آمدیم

دوسرا شعر بغایت مشہور ہے مگر تیسرے شعر کو اس کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مولاناؒ نے تخصیصاً عطارؒ و سنائیؒ کی تعریف کی ہے مگر تقریباً تمام "مردان راہ" اور خود اپنی ذات کو بھی اس میں شامل کر لیا ہے۔

ایک دوسری جگہ انھیں دونوں بزرگوں کی تعریف کرتے ہوئے خود اپنی نسبت ممیز حیثیت سے فرمایا ہے کہ

اگر عطارؒ عاشق بد سنائی شاہ فائق بد　　نہ آنم من نہ اینم من کہ گم کردم سر و پا را

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ نہ صرف خود ان بزرگوں کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے بلکہ اگر کسی دوسرے کے قول و فعل سے ادنیٰ سوء ادبی کا بھی اظہار ہوتا تھا تو سختی کے ساتھ اس کی تردید و ملامت کرتے تھے چنانچہ

ایک مرتبہ ملک الشعرا امیر بہاء الدینؒ قانعی نے یہ تعریض کی کہ میں حکیم سنائی کو پسند نہیں کرتا کیونکہ انھوں نے آیات قرآن مجید کو اشعار میں تضمین کیا ہے اور اس میں قوافی پیدا کئے ہیں، مولاناؒ نے جوش میں آکر فرمایا کہ "بس خاموش رہیے" سنائیؒ کے مرتبہ کو آپ کیا جانیں، وہ شارح اسرار قرآن ہیں، یہ اولیاء اللہ کے غوامض سے ہے، آپ لوگ اسے نہیں سمجھ سکتے بس اس سے انکار کر کے اپنے کو معرض ہلاکت میں نہ ڈالئے۔

اصطلاحاتیست مر ابدال را　　کہ نباشد زاں خبر عقال را

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷۱)

اور زیادہ موزوں و مناسب بھی معلوم ہوتا ہے۔

زاں نماید ایں حقائق ناتمام　　کہ بریں خاماں بود فہمش حرام[1]

علی ہٰذا آپ ایک مرتبہ شیخ فریدالدین عطارؒ کا کلام ملاحظہ فرما رہے تھے، کسی بوالفضول نے کہا کہ عطارؒ کا کلام ہے، آپ نے ناخوش ہو کر فرمایا "بس، میں کون ہوں" [2]

اسی طرح ایک روز مولاناؒ بدرالدین کے حجرے میں گئے، دیکھا کہ سو رہے ہیں اور "الٰہی نامہ" پس پشت رکھا ہے، فرمایا کہ "خواجہ حکیم حاضر اور تم مست خواب، ادب ظاہری کی رعایت تمام طاعتوں سے بہتر ہے، ادب کو نگاہ رکھو تاکہ محل عقب وہدف تعب نہ ہو" [3]

قدما کی اس بزرگداشت سے صعب تر کام اپنے معاصرین کا اعتراف و اقرار ہے مگر مولاناؒ نے اس مرحلہ کو جس خوبی سے طے کیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا، اسی کسر نفسی اور وسعت اخلاق کا اثر تھا کہ ابتدائے حال میں جتنے اصحاب آپ کے منکر تھے۔ سب ایک ایک کرکے آپ کے معترف ہو گئے، مولاناؒ جس درجہ ان لوگوں کی عزت و وقعت ملحوظ رکھتے تھے، وہ اس سے زیادہ مولاناؒ کی حرمت کو مدنظر رکھتے تھے، ذیل میں چند واقعات ایسے دیئے جاتے ہیں جن سے ان دونوں امور کا ثبوت ملتا ہے۔

---

[1] مناقب ص

[2] " ص۲۷

[3] " ص۲۶۱

مختلف واقعات وبیانات سے واضح ہوچکا ہے کہ شیخ صدرالدینؒ کے نسبت مولاناؒ کے خیالات کیا تھے اور مولاناؒ کس درجہ آپ کا پاس ادب ملحوظ رکھتے تھے، آخری حد یہ ہے کہ اپنے نماز جنازہ کے لئے آپ ہی کی نسبت وصیت کی۔

ایک روز لوگوں نے مولاناؒ سے امامت کیلئے کہا تو فرمایا کہ ہم لوگ ابدالی ہیں۔ جہاں ہوتا ہے وہیں بیٹھ جاتے ہیں اور کھڑے ہو جاتے ہیں، امامت کیلئے ارباب تصوف وتمکین کی ضرورت ہے۔ یہ کہہ کر شیخ صدرالدینؒ کی طرف اشارہ کیا، انھوں نے امامت کی، بعد نماز کے فرمایا کہ "من صلیٰ خلف امامٍ تقیٍ کا نّما صلیّٰ خلف نبی" شیخ آداب بجالائے[1]

شیخ بھی اسی نسبت سے مولاناؒ کی عزت وحرمت کا خیال رکھتے تھے، شیخ کی عادت تھی کہ نماز جمعہ کے بعد حجرہ میں چلے جاتے، وہاں لوگ جمع ہوتے، اور خود آخر میں تقریر کرتے، ایک روز اسی حالت میں دیکھا کہ مولاناؒ آرہے ہیں۔ سبنے استقبال کیا، مولاناؒ آکر صف کے کنارے بیٹھ گئے۔ شیخ نے بہت اصرار کیا کہ سجادہ پر تشریف رکھیں، تو فرمایا کہ خدا کو کیا جواب دوں گا" آخر شیخ نے فرمایا کہ "ایک طرف سجادہ پر حضرت تشریف رکھیں، دوسری طرف بندہ بیٹھ جائے گا" پھر وہی کہا، شیخ نے کہا کہ "جب سجادہ حضرت کے کام نہیں آسکتا تو ایسے سجادہ کی ضرورت ہی کیا ہے" اور اسے اٹھادیا[2]

---

[1] مناقب صـ۳۳۱

[2] ،، صـ۱۸۹

علیٰ ہٰذا ایک مرتبہ مدرسہ اتابکیہ میں تمام علماء و مشائخ اور اکابر شہر جمع تھے۔ شمس الدین ماردینی مسند تدریس پر تھے، داہنی جانب قاضی سراج الدین اور بائیں طرف شیخ صدرالدینؒ بیٹھے ہوئے تھے۔ مولاناؒ آخر میں آئے اور صف کے کنارے بیٹھ گئے کر دامن نیچے لٹکا ہوا تھا، پروانہ اور مجدالدین وغیرہ اٹھ کر مولانا کے قریب آ بیٹھے، مولاناؒ نے کسی طرف التفات نہ کیا۔ آخر قاضی سراج الدین آئے اور مولاناؒ کا ہاتھ پکڑ کر اوپر لے جاکر بٹھلایا، شمس الدینؒ نے بہت معذرت کی کہ ہم سب آپ ہی کی غلام ہیں۔ [۱]

وسعت مشرب :—

مولاناؒ اگرچہ اپنے طریق و مسلک میں نہایت سخت تھے مگر تنگ نظری کا اثر آپ میں مطلق نہ تھا، اوپر منقول ہو چکا ہے کہ چلپیؒ حسام الدین شافعی طریق کو ترک کر کے حنفی طریق کو اختیار کرنا چاہتے تھے مگر آپ نے انھیں روک دیا، ہفتاد و دو ملت سے متحد ہونے کی بحث میں ایک واقعہ پیش آیا وہ آگے آتا ہے۔ آپ کی وسیع المشربی ہی کا اثر تھا کہ مسلمانوں کے علاوہ آپ کے ملنے والوں میں ایک بہت بڑا گروہ یہود و نصاریٰ کا بھی تھا، ایک بڈھا راہب تھا، اسے چلپیؒ عارف سے نہایت محبت تھی، لوگوں نے اس اعتقاد کا سبب پوچھا، تو اس نے کہا کہ "آپ لوگ مولاناؒ جلال الدینؒ کو کیا جانیں، میں نے ان سے بے شمار کرامات دیکھے ہیں، انجیل میں انبیائے سلف کے جو اسرار پڑھے تھے وہ سب ان کی ذات میں مشاہدہ کئے ہیں اور حق یہ ہے کہ ان کی حقیقت پر ایمان لایا ہوں" [۲]

---

[۱] مناقب صفحہ ۱۸۱ [۲] مناقب صفحہ ۲۲۳

مولاناؒ کے جنازے میں یہود و نصاریٰ نے جس جوش کے ساتھ شرکت کی وہ آپ کی وسیع المشربی کے لئے شاہد عادل ہے، آپ کو کسی مذہب کسی فرقہ سے خصومت نہیں تھی، اسی مرنج و مرنجاں روشن کا اثر ہے کہ آج تک ہر مسلک و طریق کے لوگ آپ کی یکساں عزت وعظمت کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

ایک روایت ہے کہ ایک روز شیطان نے متمثل ہو کر حضرت حسام الدینؒ سے مولانا کے تہجد و تعبد کی شکایت کی کہ جس وقت مولاناؒ با نیاز تمام نماز میں قیام کرتے ہیں، دنیا میرے لئے تاریک ہو جاتی ہے، اگر میں جانتا کہ آدم کے فرزندوں میں ایسے ایسے لوگ ہونگے تو میں آدم کی مخالفت نہ کرتا اور مجھے آدم کے رحم دل فرزندوں سے امید ہے کہ میرے لئے خدا کی درگاہ میں عذر کرینگے۔ حضرت حسام الدینؒ نے جب یہ حکایت مولاناؒ سے بیان کی تو آپ نے مسکرا کر فرمایا کہ "امید است کہ نا امید نشود"[۱]

اعتراف منکرین:-

مولاناؒ کی انھیں خوش خویوں کا نتیجہ تھا کہ آپ کے زمانہ کے تمامی علماء و فضلاء آپ کے معترف ومداح بن گئے تھے، مولاناؒ کے زمانہ میں قونیہ میں کثرت سے علماء و فضلاء موجود تھے۔ اور ان میں سے بعض اکابر ایسے بھی تھے، جو ابتدائے حال میں مولانا کے معترف نہ تھے، مگر تجربہ و مشاہدہ کے بعد نہ صرف معترف بلکہ معتقد ہو گئے۔ قاضی سراج الدین شیخ صدر الدینؒ شمس الدینؒ ماردینی بڑے پایہ کے لوگ تھے، ان میں سے ہر ایک کو ابتداءً مولاناؒ کی جانب سے اگر انکار نہیں تو بے التفاتی ضرور رہی مگر آخر الامر سب مولاناؒ کے فضل و کمال کے گرویدہ ہو گئے۔

شمس الدین ماردینی ابتداءً مولاناؒ کے قائل نہ تھے، مولاناؒ نے ایک مرتبہ جب سیادت

[۱] مناقب نذکرہ چلپی؟

حالت استغراق میں ایک فتویٰ لکھ دیا، شمس الدینؒ ماردینی نے اسے قبول نہ کیا، لوگ اس فتوے کو قاضی سراج الدین کے پاس لے گئے، اور بہت کچھ کہا، مولانا اختیار الدین اس مجمع میں موجود تھے، انھوں نے بحث کی اور صورت حال مولانا سے آکر عرض کی، فرمایا کہ جاکر ان اصحاب سے میرا اسلام کہو اور کہو کہ بغیر تحقیق مسئلہ درویشوں کو طعنہ دینا ٹھیک نہیں، مولانا شمس الدینؒ کے پاس ایک کتاب دو جلدوں میں ہے، شہر حلب میں چالیس درم کو خریدی تھی اور مدت سے اس کا مطالعہ نہیں کیا ہے، اس کتاب کے وسط میں آٹھویں سطر میں دیکھیں۔ جب شمس الدینؒ سے جاکر کہا تو انھوں نے کتاب کا خریدنا اور بہت دنوں سے اس کا نہ دیکھنا تسلیم کیا مگر یہ کہا کہ نفس معاملہ میں احتیاط چاہیے، کتاب منگا کر دیکھی تو واقعی وہ مسئلہ اسی مقام پر درج تھا، سب حیران رہ گئے۔ [1]

شمس الدین ماردینیؒ نے ایک تو اس فتوے کے بارے میں مولانا کی کرامت مشاہدہ کی پھر ایک مرتبہ آنحضرت صلعم کو خواب میں دیکھا کہ ان سے رو گرداں ہیں اور وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ "اخوان مرا بنظر انکار می نگری" آخر الامر یہ ہوا کہ ایک مرتبہ مولاناؒ کے مدرسہ میں سماع تھا، شمس الدین ماردینی کا مدرسہ بھی قریب تھا، شمس الدینؒ لباس تبدیل کر کے عوام میں جا بیٹھے اور دل ہی دل میں ایک سورۃ پڑھی جس سجدہ کی آیت تھی۔ مولاناؒ نے اس محل پر سجدہ کیا۔ قیاس کیا کہ شاید سجدۂ سماع ہوگا، جب تیسری مرتبہ ایسا ہی ہوا تب تو یقین ہو گیا کہ مولاناؒ کی نظر لوح محفوظ پر ہے اپنے تمام فرزندوں اور شاگردوں کے ساتھ آکر مرید ہوئے۔ [2]

---

[1] سپہ سالار صفحہ ۴۹ مناقب صفحہ ۱۹۳ [2] نفحات الانس صفحہ ۳۰

قاضی سراج الدین بھی مولاناؒ کی طرف سے خوش اعتقاد نہ تھے۔ انھیں یہ خبر ملی کہ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ میں بہتّر فرقوں کے ساتھ متفق ہوں، انھوں نے چاہا کہ اس معاملہ میں مولاناؒ کو ذلیل کریں، اپنے وہاں سے ایک عالم صاحب کو بھیجا کہ وہ مجمع عام میں مولاناؒ سے سوال کریں کہ آیا آپ نے ایسا کہا ہے، اگر اقرار کریں تو برملا برا بھلا کہیں، انھوں نے جاکر پوچھا۔ مولاناؒ نے جواب دیا کہ ہاں میں نے کہا ہے، انھوں نے گالیاں دینا شروع کیں، مولاناؒ نے ہنس کر فرمایا کہ "یہ جو کچھ ارشاد ہو رہا ہے. میں اس سے بھی متفق ہوں" وہ صاحب نہایت شرمندہ ہو کر واپس ہو گئے[عل]. دیوان میں ایک مشہور غزل میں اس جانب اشارہ کیا ہے ؎

ملت وادیان و ہفتاد و دو ملت در جہاں   در حقیقت نیست باللہ ملت وادیان منم

غالباً قاضی سراج الدینؒ ابھی مولانا کے حلقہ بگوشوں میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ ایک روز چلپی حسام الدینؒ نے مولاناؒ سے پوچھا کہ قاضی سراج الدینؒ کس قسم کے شخص ہیں، فرمایا کہ حوض کے گرد پھر رہے ہیں اور ایک دھکے کی دیر ہے، امید ہے کہ ناامید نہ ہونگے"[عہ]۔

ایک روز قاضی سراج الدینؒ نے چند مشکل و دقیق مسائل مختلف علوم سے جمع کیے اور ان مسائل کو اپنے شاگردوں کو سمجھا دیا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ کبھی امراء و فضلاء کے مجمع میں مولاناؒ سے دوچار ہوں تو اپنی فضیلت ثابت کر دوں کہ مولاناؒ کو معلوم ہو جائے

عل نفحات الانس صنہ ۳۰۰

عہ مناقب صنہ ۲۴۷

کہ عالم کیسے ہوتے ہیں، میں جب بحث میں گرم ہوں اور ان مسائل میں سے کوئی دقیقہ مجھ سے فوت ہو جائے، تو تم لوگ ہر طرف سے میری مدد کرنا۔ دوسرے روز کیا دیکھتے ہیں کہ مولانا علی الصباح تشریف لائے اور سلام کر کے نہایت ہیبت کے ساتھ قاضی صاحب کی طرف دیکھا اور پھر فوراً ہی واپس ہوئے۔ قاضی صاحب ان کے پیچھے روانہ ہوئے مگر کہیں کوئی نظر نہ آیا، ادھر لوگوں نے دیکھا کہ مولاناؒ بالاخانہ سے اتر رہے ہیں، قاضی صاحب نماز پڑھنے کیلئے جب اپنے بالاخانہ میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ تمام نکات و مسائل دیوار پر لکھے ہوئے ہیں اور ہر ایک کا نہایت شافی جواب درج ہے، قاضی صاحب پر ہیبت طاری ہو گئی، کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اس امتحان سے توبہ کی اور دوڑتے ہوئے مولاناؒ کے مدرسہ میں آئے اور بعد اظہار عذر مولاناؒ کے محب مخلص بن گئے[1]

شیخ صدرالدینؒ: نہ صرف علوم ظاہر میں اپنے زمانہ کے وحید العصر تھے بلکہ علوم باطن میں بھی صاحبِ مقاماتِ عالیہ تھے شیخ محی الدین ابن العربیؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور قونیہ میں خصوصیت کے ساتھ "فصوص الحکم" کا درس دیا کرتے تھے، اولاً آپ کو بھی مولاناؒ کے حق میں بہت انکار تھا، ایک روز رات کو خواب میں دیکھا کہ مولاناؒ کے پیر دبا رہے ہیں (تمسخر می کند) جاگے تو استغفار کیا اور سو رہے، تین مرتبہ یہی خواب دیکھا، تیسری مرتبہ اٹھ کر غلام سے کہا کہ چراغ جلاؤ اور فلاں کتاب لے آؤ، غلام جب اوپر سے آنے لگا تو دیکھا کہ زینہ پر مولاناؒ بیٹھے ہوئے ہیں، آکر شیخ کو خبر دی، جاکر دیکھا تو واقعی تشریف فرما تھے، فرمایا کہ رنجیدہ نہ ہو اور استغفار نہ کرو، کبھی تم میرے پاؤں دباتے ہو اور کبھی میں تمہارے، کبھی تم

---

[1] مناقب ص۲۶۶

میری خدمت کرتے ہو اور کبھی میں تمہاری، ہم میں بے گانگی نہیں ہے یہ کہہ کر غائب ہو گئے، صبح کو شیخؒ نے قاضی سراج الدینؒ کے پاس جا کر کل حال بیان کیا، پھر قاضی سراج الدینؒ کے ہمراہ آ کر مولاناؒ سے بہت عذر کیا، مولاناؒ نے حد سے زیادہ خاطر داری کی، جب باہر نکلے تو شیخؒ نے کہا کہ یہ شخص مؤید من اللہ ہے اب آج سے اسے دوسری ہی نظر سے دیکھنا چاہئے، قاضی سراج الدین نے بھی تصدیق کی، اور پھر ان دونوں صاحبوں کی ارادت بڑھتی گئی عله

غرض، اوائل حال میں جن لوگوں نے مولاناؒ کی طرف سے بے التفاتی برتی یا آپ کے منکر ہوئے، آخر میں وہ سب آپ کے حسن خلق کے شکار ہو گئے، مولاناؒ کا مسلک "محبت" تھا اور محبت کے اثر سے بچ نکلنا محال، اور یہ "محبت" بھی نتیجہ تھی اس امر کا کہ مولاناؒ کی نظر نہایت کار پرہوتی تھی، آپ خوب سمجھتے تھے کہ انجام میں کیا ہونا ہے ایسے ہی لوگوں کی نسبت فرمایا ہے کہ ؎

دلبر بیگانہ صورت مہر دارد در نہاں	گر زبانش تلخ گوید قند دارد در لباں
از درون شو آشنا و از بروں بیگانہ وش	ایں چنیں پُر مہر تر دشمن ندیدیم در جہاں

بحث و جدل۔

مناظرات مولاناؒ سے بہت کم منقول ہیں۔ جب کبھی ایسا موقع آتا تو آپ اکثر طرح دے جاتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ دانستہ ملزم بن جاتے تھے، خواجہ شرف الدین سمرقندی کی روایت ہے کہ نو سال کی عمر میں مولاناؒ اکثر علماء کو لاجواب کر دیتے تھے اور پھر از راہ تلطف خود ہی ملزم بن جاتے تھے۔ لانسلّم کبھی نہیں کہتے تھے، میں نے (شرف الدین نے) کہا کہ دوسرے

عله مناقب صـ۱۸۱

نماز کرتے اور لا تسلم کہتے ہیں، آپ کیوں نہیں کہتے؟ جواب دیا کہ جو لوگ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں، ان کے سامنے میں لاتسلم کس طرح کہوں۔ مولاناؒ میں یہ عادت آخر تک رہی کہ آپ زیادہ قیل و قال میں نہیں پڑتے تھے، بحث و بحث کا پہلو بدل کر اصل مسئلہ کو کسی مثال سے اس طرح واضح کر دیتے تھے کہ نفس مفہوم دل میں جاگزیں ہو جائے"

مثنوی شریف کے تبصرہ میں واضح ہوگا کہ ہر ایک قول و واقعہ کا مثال سے دلنشیں کرنا مولاناؒ کے خصوصیات میں تھا، یہاں صرف ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے کہ آپ نے کس طرح ایک پوری بحث کو ایک ہی دلچسپ مثال سے طے کر دیا۔

ایک مرتبہ ایک مجلس میں ایک قاری شیخ ضیاء الدین نے "والضحیٰ" کی تلاوت کی ان کی قرأت کا انداز کچھ ایسا تھا کہ مولانا بہت منفعل ہوئے، حضرت حسام الدینؒ نے بطریق عذر کہا کہ یہ قاری صاحب کسائی کی قرأت کے بموجب پڑھتے ہیں، مولاناؒ نے فرمایا کہ بجا ہے، پھر یہ قصہ بیان کیا کہ ایک فقیہ سفر سے آئے تھے، ایک نحوی نے ان سے پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو کہا "من طیس" نحوی نے کہا کہ میں نے تو اس شہر کا نام عمر بھر کبھی نہیں سنا، فقیہ نے کہا، کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ "من" حرف جر ہے، جب طوس پر یہ حرف جر آیا تو اسے طیس کر دیا، نحوی نے کہا کہ میں نے نحو میں یہ پڑھا ہے کہ جر اسم کو جر دیتا ہے، یہ کبھی نہیں سنا کہ شہر کو ویران کر دیتا ہے [۲]

یہ طریق تفہیم بالامثلہ کچھ علماء و فضلا تک محدود نہیں تھا، ہر شخص کے حسب لیاقت مولاناؒ

---

[۱] مناقب ص ۱۹۱

[۲] " ص ۸۴

اسے اسی قسم کا جواب دیا کرتے تھے، حسام الدین دباغؒ کی روایت ہے کہ جوانی میں میری آنکھ میں درد ہو گیا تھا اور کسی طرح سے اچھا نہیں ہوتا تھا، لوگوں کی صلاح سے میرے والد مجھے مولاناؒ کے پاس لے گئے، میں نے دیکھا کہ خود مولاناؒ کی آنکھ میں بھی درد ہے، میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ جب خود اپنا علاج نہیں کر سکتے تو میرا علاج کیا کریں گے، مجھے قریب بلایا اور اپنا آب دہن میری آنکھ میں لگایا اور فرمایا کہ خود چھری اپنے دستہ کو نہیں کاٹ سکتی مگر دوسری جگہ تلوار کا کام کر سکتی ہے، دوسرے روز بفضل خدا میری آنکھوں کا درد جاتا رہا، والد نے مجلس سماع ترتیب دی اور میرا کل خاندان مرید ہو گیا (اب عمر اسی برس کی ہو گئی ہے مگر پھر کبھی درد نہیں ہوا

رد و کد سے مولاناؒ جسطرح پہلو بچائے جایا کرتے تھے، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک مرتبہ مولاناؒ کے بعض اصحاب "فتوحات مکیہ" کے متعلق کچھ قیل وقال کر رہے تھے کہ عجب کتاب ہے، اس کا مقصود بالکل معلوم نہیں ہوتا اور اس کے اسرار ناقابل فہم ہیں، اسی اثناء میں زکی قوال آ گیا، مولاناؒ نے فرمایا کہ "فتوحات زکی بہ از فتوحات مکی است" اور فوراً ہی سماع شروع کر دیا اس طرح لوگوں کو اس فضول بحث سے روک دیا۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک درویش کو مولاناؒ نے صرف سکوت سے جواب دیا جس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک روز مولاناؒ شیخ صدر الدینؒ کے وہاں تشریف فرما

لہ مناقب ص۳۸۳

تھے اور دونوں بزرگ مراقب تھے، ایک درویش حاجی کاشی نے سوال کیا کہ فقر کیا ہے؟ مولاناؒ خاموش رہے، اس نے تین مرتبہ سوال کیا، تینوں مرتبہ خاموش رہے، پھر اٹھ کر چلے گئے، مولانا کے تشریف لے جانے کے بعد شیخ نے کہا کہ یہ کونسا موقع سوال کا تھا، مگر جواب مل گیا، فقیر نے پوچھا کہ وہ کیا فرمایا کہ "الفقیر اذا عرف اللہ کل لسانہ۔"

مولاناؒ خود معارضہ کا پہلو اختیار نہیں کرتے تھے، دوسرے ایسی صورت پیدا کرتے تو آپ مختصر و مسکت جواب پر کفایت کرتے تھے، ایک شیخ مجدالدین جندی نے پروانہ کی مجلس میں یہ دعویٰ کیا آج اس مجلس میں مولاناؒ جو کچھ کہیں گے، میں اس کی مخالفت کروں گا، شیخ صدرالدینؒ نے فرمایا کہ ایسا نہ چاہیے، اسی اثنار میں مولانا آگئے اور آتے ہی فرمایا کہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" مجدالدین نے استغفار کیا اور بہت ہی عذرخواہی کی۔ علہ

اسی طرح ایک روز معین الدین پروانہ نے اپنے مکان پر بہت بڑا اجتماع علمار و اکابر کا کیا اور آرزو یہ ہوئی کہ کاش مولاناؒ بھی تشریف لاتے، پروانہ کا داماد مجدالدین اتابک مولاناؒ کو لینے کے لئے روانہ ہوا، ادھر علمار میں یہ گفتگو ہوئی کہ مولاناؒ آویں تو کہاں بیٹھیں، لوگوں نے کہا کہ ہم لوگ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے رہیں، مولاناؒ بھی جہاں چاہیں گے بیٹھ جائیں گے، حسام الدین مولاناؒ کے قبل آگئے، سب نے ان کی تعظیم کی اور صدر میں جگہ دی، اس کے بعد مولاناؒ تشریف لائے اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہہ کر

علہ مناقب ص۲۵۳

صحن میں بیٹھ گئے۔ حسام الدینؒ اٹھ کر مولاناؒ کے پہلو میں آ بیٹھے، پھر تو اکثر اکابر اٹھ اٹھ کر وہیں آ گئے، اور جو اتفاق نفاق باہم ہوا تھا شکست ہو گیا، جب صدر صفہ اس طرح خالی ہو گیا تو ایک صاحب شرف الدینؒ ازراہ گستاخی سوال کیا کہ اب مقام صدر کہاں ہے؟ صدر تو خالی ہو گیا اور صف نعال کو صدر بنا دیا، قاضی سراج الدین نے کہا کہ مدرسوں میں صدر صف کے درمیان ہوتا ہے جہاں مدرس بیٹھتا ہے، شیخ شرف الدین ہروی نے کہا کہ طریق اہل اعتکاف اور پیران خراسان کے یہاں صدر کنج زاویہ ہوتا ہے، شیخ صدر الدینؒ نے کہا کہ صوفیوں کے مذہب میں صدر کنار صفہ کو کہتے ہیں، اس کے بعد ازراہ امتحان مولاناؒ نے سوال کیا کہ آپ کے نزدیک مقام صدر کہاں ہے، فرمایا کہ ؎

آستان و صدر در معنیٰ کجاست | ما و من کو آں طرف کہ یار ماست

صدر وہاں ہے جہاں یار ہے۔

سید شرف الدین نے کہا کہ یار کون؟ فرمایا ؎

تو دیدہ نداری کہ بدو در نگری | ورنہ ز سرت تا قدمت اوست ہمہ[1]

نصائح۔

نصائح کے متعلق مولاناؒ کا انداز خاص جس کا اظہار مثنوی شریف میں نہایت کثرت سے ہوا ہے، یہ تھا کہ تمثیل سے بیشتر کام لیتے تھے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ کسی وقوعہ کے پیش آنے سے نتیجۃً نصیحت کیا کرتے تھے جس کا اثر خصوصیت کے ساتھ زیادہ ہوتا تھا" فیہ ما فیہ " میں مولاناؒ کے نصائح بہت کثرت سے منقول ہیں بلکہ وہ انھیں نصائح کا مجموعہ ہے

---

[1] مناقب ص۶۵-۶۰

لیکن اگر اس کے اقتباسات یہاں دیئے جائیں تو بہت طول ہو جائے گا۔ صرف مناقب العارفین سے چند نصائح نقل کئے جاتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ مولاناؒ کا طرز خاص کیا تھا (اہل دول کو مولاناؒ جس طرح نصیحت کرتے تھے اور اس کا جو اثر ہوتا تھا وہ اوپر مذکور ہو چکا ہے)

ایک مرتبہ بہاء الدین ولدؒ سے فرمایا کہ چاہتے ہو کہ تم اپنے دشمن کو دوست سمجھو، اور وہ تمہیں دوست سمجھے؛ پس چالیس روز تک اس کی نیکی کے سوا اور کچھ نہ کہو، جس طرح دل سے زبان تک راہ ہے اسی طرح زبان سے دل تک راہ ہے ؎۱

ایک روز مولاناؒ اپنے مدرسہ میں وعظ فرما رہے تھے، اس میں فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں "انکر الاصوات لصوت الحمیر" فرمایا ہے، معلوم ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت ہی بہتر جانتے ہیں، ارشاد ہوا کہ تمام حیوانات کے لئے ایک تسبیح ہے، علیٰ ہٰذا انسان و ملائکہ کے لیے بھی۔ مگر گدھا صرف دو وقت بولتا ہے ایک جب اسے آرزوے جماع ہوتی ہے اور دوسرا جب بھوکا ہوتا ہے، پس یہی حال اس شخص کا ہے جسے سوائے کھانے اور مباشرت کے کوئی فکر نہ ہو ؎۲

بزرگان شہر قونیہ میں سے ایک شخص کا انتقال ہو گیا تھا، شہر کے تمام اعیان وا کابر جمع ہوئے، بڑے لوگوں میں سے جو شخص آتا، کمال الدین معرف اس کی تعریفیں کر کے اسے بٹھلاتا۔ مولاناؒ جنازے کے نکلنے تک مکان کے باہر ہی کھڑے

؎۱ مناقب ص۱۰۵

؎۲ ،، ص۲۳

رہے، جب جنازہ کو لے کر قبر تک پہونچے اور تابوت کو قبر کے کنارے رکھا تو مولانا لب قبر اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے کوئی تلقین پڑھتا ہو اور فرمایا کہ کمال معرف کو بلاؤ۔ کمال حاضر ہوا تو فرمایا کہ اب صدرالدین اور بدرالدین ہیں تو ظاہر ہوں اور مدد کریں، لوگوں میں ایک شور برپا ہو گیا عله

ایک روز مولاناؒ ایک ویرانے کی طرف سے گزر رہے تھے، سراج الدینؒ تبریزی بھی ہمراہ تھے، بہت سے کتے پڑے سو رہے تھے، سراج الدین نے کہا کہ ان بیچاروں میں کیسا اتحاد ہے اور کیسا ایک دوسرے سے ملے ہوئے سو رہے ہیں، مولاناؒ نے فرمایا کہ اگر ان کا اتحاد دیکھنا ہے تو ایک مردار یا ایک کلیجی ان کے درمیان پھینک دو، پھر دیکھو کیسا اتحاد ہے یہی حال دنیا اور اہل دنیا کا ہے کہ جب تک کوئی غرض نہیں ہوتی ایک دوسرے کے دوست و محب ہیں مگر جہاں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ غرض بھی درمیان آئی برسوں کی دوستی و محبت سب ہوا ہو گئی، پس اہل نفاق کے اتفاق کو بقا نہیں عله

ایک مرتبہ مولاناؒ حمام میں بیٹھے ہوئے حقائق و معارف بیان کر رہے تھے، دفعتہً اٹھ کھڑے ہوئے اور بلند آواز سے پوچھا کہ "مولاناؒ کون ہے" تین بار ایسا ہی کہا۔ سب لوگ خاموش رہے فرمایا کہ اگر کوئی غیر شخص آوے اور کپڑے اتارنے کے کمرے میں تم لوگوں کے کپڑے دیکھے تو سمجھ لے گا کہ مولاناؒ کے اصحاب یہاں جمع ہیں۔

عله مناقب ص۱۰۰

عله " ص۱۱۱

پس اکنوں جامہ و دستار معروف شما باشد چرا نیاید کہ شما معروف جانہا و جامہا باشید جس طرح تم نے ظاہر کو آراستہ کیا ہے ویسا ہی باطن کو آراستہ کرو اور پوری طرح مولوی معنوی ہو جاؤ۔

اثرِ کلام: یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ پند و نصائح کا اثر الفاظ کی وجہ سے اس قدر نہیں ہوتا جس قدر صدق و سوز کی وجہ سے ہوتا ہے، مولاناؒ کی زبان میں جو اثر تھا وہ نتیجہ تھا آپ کے صدق و سوز کا، مولاناؒ ہی کے ہمعصروں میں نصیر الدین طوسی بھی ہو گذرے ہیں، جو اپنے کمالِ علمی کی وجہ سے "محقق" کے خطاب سے یاد کئے جاتے ہیں، آپ نے ایک کتاب "اخلاق ناصری" لکھی ہے جو اس وقت تک درس میں داخل ہے، اس میں اخلاق کی ایک ایک صنف کو ترتیب وار گنایا ہے مگر خود مصنف کے اخلاق کی کیفیت سے تاریخ اسلام کے صفحات پر جا بجا دھبے پڑے ہوئے ہیں[1]؛ پس کتاب کا اثر بھی اسی حد تک ہے کہ حلق سے نیچے نہیں اتر سکتی، اس کے برخلاف مولاناؒ کا کلام ہے کہ نہ کوئی ترتیب ہے نہ مسائل اخلاق کو ایک ایک کر کے بیان کیا ہے، مگر اثر کا یہ عالم ہے کہ کہیں سے بھی کوئی ٹکڑا اٹھا لیجئے، دل کا کیا ذکر روح تک وجد میں آجاتی ہے، اور یہ تو ایک مشہور مقولہ (اور واقعہ) ہے کہ مثنوی نے سینکڑوں کو ولی بنا دیا، یہ حالت جب اس وقت

---

[1] تباہی بغداد کی تمام کارروائی میں آپ ہلاکو خاں کے مشیر و مؤتمن تھے اور معتصم باللہ کے ہلاک کرنے کی ترکیب کو تو آپ کے اختراعات میں درجۂ خاص حاصل ہے، معتصم کے علاوہ اور بھی متعدد مسلمان حکمرانوں کو مربی بدعہدی سے مغلوں کے ہاتھ برباد کرنے کے فخر سے آپ کا کارنامۂ حیات مزین ہے۔

تک ہے تو جو لوگ مولانا کے کلام کو خود آپ کی زبان سے سنتے رہے ہوں گے ان پر کیا کچھ اثر نہ ہوتا رہا ہوگا۔ "فیہ ما فیہ" میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک مجلس میں کچھ رومی بھی موجود تھے اور مولانا کا کلام سن کر روتے اور وجد کرتے تھے، لوگوں نے کہا کہ اس قسم کے کلام کو ہزار ہا مسلمانوں میں دو چار سمجھتے ہیں، یہ لوگ کیا سمجھ کر روتے ہیں، فرمایا کہ یہ ضرور نہیں کہ وہ نفس معاملہ کو بھی سمجھیں، جو اصل ہے اسے سمجھتے ہیں، یہ خدا کی ثنا و صفت ہے، اس سے سب کو ذوق حاصل ہوتا ہے۔ "چہ اگر راہہا مختلف است اما مقصد یکیست" عله

مقولات:-

نصائح کے ذیل میں مولانا کے چند مقولات کا نقل کر دینا بے محل نہ ہوگا۔ ان مقولات سے خصوصیت کے ساتھ یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ شگفتگی و زندہ دلی کو ہر حال میں قائم رکھتے تھے، لوگ آپ سے ہر قسم کے سوالات کیا کرتے تھے۔ آپ اس سے کبھی مکدر نہیں ہوتے تھے اور جواب ایسے معنیٰ خیز، دلچسپ دیتے تھے کہ دل میں گھر کر جائیں۔

(افلاکی نے مناقب العارفین صفحہ (۲۲۸-۳۱۰) میں مولانا کے چند طولانی مقولات بلکہ مواعظ نقل کیے جاتے ہیں لیکن یہاں جو مقولات درج ہوئے ہیں وہ مختلف واقعات سے ماخوذ ہیں، جنیں خصوصیت سے اختصار مد نظر رکھا گیا ہے)

ایک مرتبہ ایک گستاخ نے یہ سوال کیا کہ خدا نے جب آدمی کو مٹی اور پانی سے

عله "فیہ ما فیہ" صفحہ ۲۰۵-۲۰۴

بنایا تو اس میں بھوسا بھی لایا تھا یا نہیں، فرمایا کہ اگر بھوسا لایا ہوتا تو میری ایڑیاں اس طرح پھٹ نہ جاتیں [۱]

اسی طرح ایک درویش نے سوال کیا کہ آدمؑ کو خدا نے صبح کے وقت بنایا، رات میں یا دن میں کیوں نہ بنایا، فرمایا کہ اگر رات میں بناتا تو تمام بنی آدم ظلماتی ہو جاتے اور اگر دن میں بناتا تو سب نورانی ہو جاتے، اس لئے صبح میں بنایا کہ کچھ ظلماتی (کافر) ہوں، کچھ نورانی (مسلمان) [۲]

ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ عارف کون ہے، فرمایا کہ "عارف کسے است کہ ہیچ کدورتے صاف او را کدر نگرداند، العارف لا یتغیر" [۳]

ایک دن شیخ اوحد الدین کرمانی نے کہا کہ کافر کون ہے، فرمایا کہ آپ مومن کو دکھائیے تو میں بتا دوں گا کہ کافر کون ہے؟ شیخؒ نے کہا کہ "مومن آپ لوگ ہیں" فرمایا "جو ہماری ضد ہے وہ کافر ہے" [۴]

ایک روز ایک امیر زیارت کو آیا تھا، اس نے کہا کہ کتے کے بچے بہت ہوتے ہیں اور بکری کے ایک یا دو بچے ہوتے ہیں اور سال بھر بکریوں کو ذبح کرتے رہتے ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ بکریاں زیادہ ہیں اور کتے کم، فرمایا کہ بکری سحر خیز ہے اور کتا صبح کو سو جاتا ہے یہ برکت سحر خیزی کی ہے [۵]

---

۱ مناقب ص۲۲۲
۲ ؍؍ ص۲۳۰
۳ ؍؍ ص
۴ ؍؍ ص
۵ ایضاً ص

ایک عزیز نے سوال کیا کہ ابلیس آنحضرتؐ کے دل میں وسوسہ ڈالتا تھا اور حضرت عمرؓ کے سایہ سے بھاگتا تھا، اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا کہ آنحضرتؐ دریا تھے، اور حضرت عمرؓ ایک پیالہ، دریا میں اگر کتا منہ ڈالدے تو کوئی اسے روکتا نہیں مگر پیالہ کو محفوظ رکھتے ہیں۔[۱]

ایک روز فرمایا کہ انسان کو اوپر لے جانا مشکل ہے، نیچے گرا دینا کچھ دشوار نہیں[۲]

(یعنی ترقی مدارج مشکل ہے، تنزل کچھ دشوار نہیں۔)

ایک دن کوئی درویش کسی کی بدگوئی کی شکایت کر رہا تھا، فرمایا "جہانگیر تواں شد دہاں گیر نے"

کسی شخص نے کہا کہ میں ایک چیز بھول گیا ہوں، فرمایا دنیا میں ایک چیز ہے، اسے نہ بھولنا چاہئے اور وہ فرمان خدا ہے، باقی اور تمام چیزیں فراموش ہو جائیں تو کوئی پروا نہیں، اور اگر ان تمام چیزوں کو یاد رکھا اور اس فرمان کو بھول گئے تو پھر کچھ نہ کیا۔[۳]

ایک مرتبہ امیر پروانہ نے سوال کیا کہ مغول ہمارا مال لے جاتے ہیں اور کبھی کبھی دے بھی جاتے ہیں، اس باب میں کیا ارشاد ہے۔ فرمایا کہ مغول جو کچھ تم سے لے جاتے ہیں وہ ایسا ہے کہ خدا کے قبضہ و خزانہ میں چلا جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ تم دریا سے ایک کوزہ بھر لو، جب تک پانی اس کوزے میں ہے تمہاری ملک ہے، جب پھر دریا میں ڈالدو وہ ملک عام ہے، اسی طرح ہمارا مال ان پر حرام ہے اور ان کا مال ہمارے لئے حلال

---

[۱] مناقب ص۲۶۰

[۲] " ص۲۶۲

[۳] "فیہ مافیہ" ص۳۳

سبے ۵۱ؔ

ایک مرتبہ فرمایا کہ جو چیز محبوب ہے وہ اچھی ہے مگر یہ لازم نہیں کہ جو چیز اچھی ہو وہ محبوب بھی ہو، خوبی جزو محبوب ہے، محبوبی اصل ہے ۵۲ؔ

ایک مرتبہ پروانہ نے کہا کہ اصل علم ہے، مولاناؒ نے فرمایا کہ اہل عمل کون ہے۔ اور طالب کہاں ہے کہ میں اسے عمل دکھاؤں، عمل کا خریدار کوئی ملتا نہیں ہے، مجبوراً گفت میں مشغول ہوں ۵۳ؔ

ایک مرتبہ ایک شخص نے سوال کیا کہ آیا جوں مارنا گناہ ہے، فرمایا کہ جب ہاتھ دھو ڈالو تو وہ گناہ زائل ہو گیا ۵۴ؔ

ایک روز فرمایا کہ جو پرندہ زمین سے اوپر اڑے گا آسمان پر نہیں پہونچے گا مگر اسقدر تو ہوگا کہ دام دنیا سے دور تر رہے گا اور جال میں پھنسنے سے بچ جائے گا، اسی طرح اگر کوئی درویش ہو جائے تو اگرچہ کمال کو نہ پہونچے مگر اسقدر تو ہوگا کہ زمرۂ عام اور اہل بازار سے ممتاز ہو جائے گا، دنیا کی زحمتوں سے بچ جائے گا اور سبک بار رہے گا۔ ۵۵ؔ

(مولاناؒ نے انسان کامل کی ایک نہایت ہی نادر تعریف بیان کی ہے چنانچہ)

۵۱ؔ "فیہ مافیہ" ص۱۴۴

۵۲ؔ " ص۱۶۲

۵۳ؔ " ص۱۷۰

۵۴ؔ مناقب ص۲۲۳

۵۵ؔ " ص۱۰۵

ایک روز فرمایا کہ تمام دنیا شخص واحد کے اجزا ہیں اور "اللّٰھم اہد قومی فانہم لایعلمون" کا اشارہ اسی جانب ہے کیونکہ اگر قوم انسان کامل کا جزو نہو تو وہ کل نہ ہوگا ؎

جزو درویشند جملہ نیک و بد　　　　　ور نہ باشد ایں چنیں درویش نیست[۱]

ایک مرتبہ فرمایا کہ عاقلوں نے اس قدر زحمتیں برداشت کر کے چاندی سونے کو خاک و سنگ سے نکالا کہ لوگ ان سے نفع حاصل کریں۔ بخیل ان چیزوں کو پھر مٹی اور پتھر میں دفن کرتے ہیں کہ لوگوں کو ان چیزوں سے نفع نہ پہونچے[۲]

ایک مرتبہ فرمایا کہ مردی یہ ہے کہ خاک کو سونا بنادیں مردی یہ نہیں ہے کہ سونے کو خاک بنادیں، الحمد للہ کہ ہم دونوں حال میں پہلوان ہیں[۳]

بعض فتاوے۔

اس ضمن میں مولانا کے بعض دلچسپ فتاویٰ کا ذکر کر دینا بھی ناموزوں نہ ہوگا، اہل فتوے کے پاس لوگ اکثر ایسے سوالات بھی پیش کیا کرتے ہیں جنھیں فی الواقع نفس فقہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ لاینحل مشکلات کو جودت طبع سے حل کرنا پڑتا ہے، تمام ائمہ اور بالخصوص امام اعظمؒ کی نسبت اس قسم کی حکایتیں بہت کثرت سے منقول ہیں[۴]، مولانا کے پاس بھی ایسے سوالات گاہ بگاہ آجاتے تھے اور مولانا ان میں ایسی راہیں

---

[۱] مناقب ص۱۰۲

[۲] ″ ص۳۴۶

[۳] ″ ص۶۰

[۴] ″ ″

پیدا کر دیتے تھے کہ ان کے سوا کوئی دوسری صورت ہو نہیں سکتی تھی، یہاں اس نوع کی صرف دو حکایتیں نقل کی جاتی ہیں۔

ایک مرتبہ ایک شخص کسی کے درخت پر پھل توڑنے کیلئے چڑھ گیا تھا، ناگاہ صاحب باغ آگیا، اس نے کہا نیچے اتر، وہ نیچے نہ آیا، جب صاحب باغ نے سخت اصرار کیا تو کہا کہ اگر میں اس درخت سے نیچے اتروں تو میرے بیوی کو تین طلاق ہے، تین روز اسی حالت میں گرفتار رہا، ہر طرح کے فتوے طلب کئے مگر کوئی صورت نہ نکلی، آخر ایک شخص نے جا کر مولاناؒ سے عرض کیا، فرمایا اس درخت سے دوسرے درخت پر چلا جائے اور وہاں سے اتر آئے اور اگر درخت تنہا ہو تو گھوڑے کی پیٹھ پر اتر آئے، پھر زمین پر آجائے، طلاق واقع نہ ہوگی عہ

اسی طرح ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ گرجی خاتون، پروانہ سے رنجیدہ ہو گئی، لوگوں نے ہر چند سفارش کی کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر الامر اس شرط پر مصالحت کی کہ میں جو کچھ طلب کروں وہ مجھے دے ورنہ مجھ پر تین طلاق ہو جائے گی، پروانہ نے منظور کر لیا، خاتون نے کہا کہ خدا نے دنیا میں جتنی نعمتیں اور عجائب پیدا کئے ہیں سب میرے سامنے لا کر حاضر کر دو، پروانہ عاجز ہو گیا اور کوئی تدبیر بن نہ آئی، آخر مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر کل کیفیت عرض کی، فرمایا کہ کلام مجید کو رومال میں باندھ کر اسے دیدو، طلاق واقع نہ ہوگی کیونکہ لا رطب ولا یابس الا فی کتٰب مبین عہ

عہ مناقب ص ۲۲۴

عہ " ص ۲۶۰

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ یا معنی خیز فتوے بھی ملاحظہ ہو: ایک شخص کو اس کی بیوی نے یہ قسم دی کہ جو کچھ میں کہوں وہ کرو ورنہ مجھ پر تین طلاق ہو جائے گی، شوہر نے اسے منظور کر لیا، بیوی نے کہا کہ "سور کا آدھ سیر گوشت کھا جاؤ" وہ شخص سخت حیران ہوا کہ کیا کرے، کسی سے کوئی جواب بن نہیں آتا تھا، مولانا کے پاس آکر عرض کیا، فرمایا "قاضی کے محکمہ سے آدھ سیر ردی لے کر کھالے طلاق نہیں ہو گی" عله

زندہ دلی۔

مولانا کے کلام کے مطالعہ کرنے والے قدم قدم پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کا کلام تمام تر وصال سے تعلق رکھتا ہے، افسردگی و پژمردگی آپ کے قریب ہو کر نہیں گزری ہے، کلیات کا مجموعہ بچاس ہزار اشعار کے قریب ہے مگر اس تمام مجموعہ میں ایک غزل بھی شکوہ و شکایت کی نہیں ہے، شمس الدینؒ کے فراق میں جو دلدوز غزلیں لکھی ہیں وہ بھی اپنے انداز میں خاص ہیں؛ یہاں اس اصل کی ایک دوسری شاخ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، وہ یہ کہ مولاناؒ نے نہ صرف اپنے کلام سے "فراق" کو خارج کر دیا تھا بلکہ اپنی طبیعت کو بھی حزن و ملال سے فارغ کر لیا اور فرحت و انبساط کو اپنا خاصۂ طبیعت بنا لیا تھا، ظاہری اعتبار سے یہاں ایک تخالف پیش آتا ہے، وہ یہ کہ جب لوازم تصوف میں "حزن" بھی ایک شرط لازمی ہے اور خود مولاناؒ نے مثنوی شریف میں جا بجا اس جانب توجہ دلائی ہے تو پھر عملی حیثیت میں مولانا کا اس سے مستغنی ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کا جواب

عله مناقب صد ۲۶

یہ ہے کہ "یہ حزن ممدوح" امور عاقبت سے تعلق رکھتا ہے' اور پھر اس میں باریک تر نکتہ یہ ہے کہ جن لوگوں کی نظر نہایتِ کار پر ہے ان پر خوف کا اور خوف کی وجہ سے حزن کا غلبہ رہتا ہے اور جن کی نظر بدایت کار پر ہے وہ غم و شادی دونوں سے فارغ ہوتے ہیں۔ مثنوی شریف میں یہ نکتہ بھی پوری طرح منشرح کر دیا گیا ہے لیکن خود مولاناؒ کے اس فرحت و انبساط کو نہ نہایتِ کار سے واسطہ تھا نہ بدایت کار سے اور نہ اس سے امور عاقبت کے اندیشہ سے محزون ہونے کی نفی لازم آتی ہے۔ یہ جو کچھ تھا اس اعتبار سے تھا کہ مولاناؒ معاملات و تفکرات دنیاوی سے اس درجہ بے فکر رہتے تھے کہ اس کی وجہ سے آپ کے دل پر رنج و غم طاری نہیں ہوتا تھا' مثنوی شریف میں اسے اس تمثیل میں بیان فرمایا ہے کہ حالتِ خواب میں کسی کو کسی شے کی فکر نہیں رہتی' عارف کی یہی حالت بیداری میں بھی ہوتی ہے ؎

شب ز زنداں بے خبر زندانیاں	شب ز دولت بے خبر سلطانیاں
نے غم و اندیشۂ سود و زیاں	نے خیالِ ایں فلان و آں فلاں
حال عارف ایں بود بے خواب ہم	گفت یزداں ہم رقود زیں مرم
خفتہ از احوال دنیا روز و شب	چوں قلم در پنجۂ تقلیب رب

پس جب معاملات دنیا سے اس طرح کی بے فکری پیدا ہو گئی تو پھر رنج و غم کا اثر از خود ناپید ہو گیا' اور فرح و انبساط کے سوا دل میں کسی شے کا دخل باقی نہ رہا۔ مگر یہ فرح و انبساط کسی نہج سے وہ فرح و انبساط نہیں ہے۔ جو فرقہ خرمیہ کا مسلک ہے کہ تمام علائق و قیود سے آزاد ہو کر نتائج و عواقبِ دینا و عقبیٰ سے بے فکر بن کر اور ہر طرح کی ہمدردی انسانی کو بالائے طاق رکھ کر لذاتِ دنیاوی سے تا حد امکان تمتع حاصل کیا جائے' اور جو میسر ہو اس کی پرواہ نہ کیجائے' بلکہ یہ فرح و انبساط نتیجہ ہے اس اعتماد و توکل علی اللہ کا جو خاصہ ہے نفس مطمئنہ کا۔

سلطان ولدؒ کی رنجیدگی پر مولانا نے انھیں جو نصیحت کی ہے اس میں اس رمز کو منکشف کر دیا ہے کہ باطن در باطن میں رنجیدگی کے معنیٰ یہ ہیں کہ ربوبیت الٰہی اور حکمت خداوندی پر اعتقاد کامل نہیں ہے ورنہ وہاں رحم محض کے سوا اور کیا ہے ؎

اے زغم مردہ کہ دست از ناں تہی است   چو غفور است و رحیم این ترس چیست

زیادہ صاف الفاظ میں یوں کہا ہے کہ غلبۂ حسنِ ظن نے دوسری جانب کے خیال کو باقی نہیں رکھا ہے ؎

حسن ظنے بر دل ایشاں کشود   کہ نپوشند از غمے جامہ کبود

مولاناؒ کو اس باب میں اس درجہ غلو تھا کہ ایک مرتبہ مجمع احباب میں آپ حضرت شمس الدینؒ تبریزی کی مدح فرما رہے تھے، بدرالدین ولدؒ مدرس کی زبان سے نکلا کہ زہے حیف، زہے دریغ" مولاناؒ نے پوچھا کہ 'چرا حیف وچہ حیف وایں بر کجا ست، و موجب حیف چیست وحیف درمیان ماچہ در دارد" بدرالدین نے کہا کہ میں مولانا شمس الدین کے حضورِ پر نور سے مستفید نہ ہو سکا، اس کا افسوس کرتا تھا، کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد فرمایا کہ "اگر چہ تم مولانا شمس الدین کی خدمت میں نہ پہونچ سکے مگر ایسے شخص کی خدمت میں پہونچ گئے ہو جس کے ہر تار مو میں ہزاروں شمس الدین آویزاں ہیں" [۱] (یعنی حیف بے کار ہے)

مولاناؒ کے سوانح سے جہانتک استنباط ہو سکتا ہے اُس سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے

---

[۱] مناقب ص۶۹ [اگر چہ خود حضرت شمس الدینؒ مولانا کی شان کو اس سے بھی ارفع و اعلیٰ سمجھا کرتے تھے مگر مولانا نے جس طرح حضرت شمس الدینؒ کی مدح سرائی کی ہے اس پر نظر کرتے ہوئے ان الفاظ

کہ روزمرہ کی زندگی میں بھی مولاناؒ پر شگفتگی و زندہ دلی کا رنگ غالب رہا کرتا تھا۔ جمع کی جائیں تو اس قسم کی بہت سی روایتیں مل جائیں گی جن سے مولاناؒ کی بشاشت طبیع کا اظہار ہوتا ہو۔ ازانجملہ ایک روایت ہے کہ ایک روز حجام داڑھی درست کر رہا تھا، پوچھا داڑھی کتنی رکھوں فرمایا بس اتنی کہ مرد و عورت کا فرق معلوم ہو جائے۔ بڑھی داڑھی صوفیوں کیلئے اچھی مگر جتنی دیر میں صوفی داڑھی میں کنگھا کرے گا۔ عارف خدا تک پہنچ جائے گا۔"

اسی طرح ایک روز حجام سر مونڈ رہا تھا اور بہت زیادہ صاف کرتا تھا۔ فرمایا جب بالوں کو نکلنا ہے تو اتنا ہی کافی ہے۔

ایک مرتبہ کسی شادی کی محفل میں کسی نے کہا کہ شکر بادام نہیں ہے، مولاناؒ نے فرمایا کہ "شکر تو ہے مگر بادام نہیں ہے۔"

ایک مرتبہ مولاناؒ، شیخ صدرالدین اور نجم الدین رازی یکجا تھے، نماز کا وقت آیا تو نجم الدینؒ رازی نے امامت کی اور دونوں رکعتوں میں قل یاایہا الکفرون پڑھی، چونکہ دونوں میں ایک ہی سورت پڑھنا غیر معمولی بات تھی، مولاناؒ نے شیخ صدرالدینؒ کی طرف خطاب کر کے کہا کہ ایک دفعہ میرے لئے پڑھی اور ایک دفعہ آپ کے لئے عـ۱۵

(بقیہ حاشیہ ص ۳۹۶)

میں گو نہ استبعاد معلوم ہوتا ہے لیکن بادنیٰ تامل واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو کچھ فرمایا مخاطب کے استفادہ کی نظر سے فرمایا کہ حضرت شمسؒ سے اسے جو کچھ حاصل ہو سکتا تھا اس سے ہزار گونہ وہ مولاناؒ سے حاصل کر سکتا ہے]

عـ۱۵ سوانح مولانا روم ص۳۱ بحوالہ نفحات الانس

کمالاتِ باطنی

مولاناؒ نے ابتدائے سن شعور سے آخر دم تک جس طرح مجاہدات وریاضات میں زندگی بسر کی ہے اگر ان کی کیفیات کا التقاط کر کے یکجا جمع کیا جائے تو علاوہ طول بحث کے اس زمانہ میں ان پر یقین آنا بھی دشوار ہو جائے گا، جس زمانہ میں رمضان المبارک میں بھی "شبینہ" کا ذکر کہیں سننے میں نہ آئے، بلکہ تراویح کی بیس ہلکی رکعتوں سے بھی ہمتیں قاصر ہوں، اس زمانہ میں کس طرح یقین آئے کہ صدہا بزرگان سلف دو رکعت میں قرآن شریف ختم کر دیا کرتے تھے اور ایک ایک شب میں پانچ پانچ سو بلکہ ہزار ہزار رکعتوں تک پڑھا کرتے تھے۔ پس مولاناؒ کے عبادات وریاضات میں سے ایسے ہی چیدہ چیدہ حالات دیئے جاتے ہیں جن پر یقین آنے کے لئے طبیعتوں پر زیادہ زور دینا نہ پڑے۔

پابندیٔ شریعت ظاہری۔

مولاناؒ اگرچہ بچپن ہی سے مراتب سلوک طے کرتے رہے تھے اور اپنے والدؒ بزرگوار کے انتقال کے بعد سید برہان الدینؒ سے تمام کمالات باطنی حاصل کر لئے تھے، پھر بھی تقریباً چالیس برس کی عمر تک آپ علمائے ظاہری کے لباس میں رہے اور فتوے نویسی کا شغل تو آخر تک جاری رہا۔ شمس تبریز کی ملاقات کے بعد جب تصوف کا رنگ زیادہ غالب ہوا تو آپ نے اپنی وضع ظاہری میں بہت کچھ تبدیلی کر دی، لیکن شرع کی پابندی میں مطلقاً کوئی فرق نہیں آیا، تمام اکابر صوفیہ اول دن سے کہتے اور لکھتے آئے ہیں کہ کمال پابندی شریعت ہی تصوف ہے مگر اس گروہ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہو گزرے ہیں جنھوں نے اپنی اباحت پسندی سے اہل تصوف کی نسبت ایک ظن باطل پیدا کر دیا ہے کہ "تصوف پابندی شریعت سے آزاد ہونے کا نام ہے اور بناءً علیہ ممکن ہے کہ مولاناؒ کی نسبت بھی یہی گمان ہو کہ آپ تصوف میں داخل ہو کر قیود شرع سے آزاد ہو گئے تھے مگر حاشا کہ ایسا نہیں تھا، ساری مثنوی پیروی سنت و پابندی شریعت کے بیانات و نکات سے پُر ہے "تصوف" کی جان "عشق" کو مولانا "اباحت" و "آزادی" نہیں سمجھتے تھے بلکہ مراحل و مراتب عشق کے نسبت آپ کا جو کچھ خیال تھا، اسے ایک غزل میں بیان فرما دیا ہے، اس غزل کو دیکھنا اور سوچنا چاہیئے کہ جو شخص "عشق" کے یہ شرائط قرار دیتا ہو وہ "بے قیدی" کی جانب کب قدم اٹھا سکتا تھا۔

"عشق" شاہیست سخت غیرتناک	کہ کند خانہ را از غیرت پاک
"عشق" مرغ بلند پرواز است	دائر اندر ہوائے افلاک
عشق را دہ مقام میگویم	با تو اے یار گر کنی ادراک
ادب است اولین مقام و دوم	ترس و بیم است و دیدۂ نمناک

سومش تقویت و چارم صبر — ہست تقدیم پنجم اے دراک
ششمش داں سخاوت و ہفتم — علم داں اے عزیز طالب پاک
ہشتمش مسکنت نہم عرفاں — وہمیں ہم بگویمت بیباک

شریعت ظاہری کی پابندی کے متعلق مولانا اور آپ کے اصحاب کا جو مسلک ہو سکتا تھا اور ہونا چاہیے تھا اُس کا اظہار حضرت شمس الدین تبریزی کی ایک تقریر سے بہت خوبی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ آپ نے ایک روز شیخ صلاح الدین اور دوسرے اصحاب کرام کے سامنے فرمایا کہ "آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ "لا صلوٰۃ الا بالقرأۃ" اور یہ بھی فرمایا ہے کہ "لا صلوٰۃ الا بحضور القلب" بعض لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ جب حضور قلب حاصل ہے تو پھر ظاہری صورت نماز سے فراغت ہو گی اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ "طلب الوسیلۃ بعد حصول المقصود قبیح" میں اسے تسلیم کیے لیتا ہوں کہ انھیں اس درجہ کا حضور قلب حاصل ہے۔ مگر ان سے یہ پوچھنا چاہیے کہ یہ حضور قلب آپ کو ملا کہاں سے؟ آنحضرتؐ سے ملا یا نہیں؟ اور اگر کہیں ہاں تو پھر بتائیں کہ متابعت رسول اللہ صلعم کی کیوں نہیں کرتے"۔[1]

با ایں ہمہ متعدد روایتیں ایسی منقول ہیں کہ بعض علماء ظاہر نے آپ کی مخالفت بھی کی۔ اس میں دو امور غور طلب ہیں اول یہ کہ کسی عالم نے مولانا کی مخالفت اس شد و مد سے نہیں کی جس شد و مد سے بعض دوسرے صوفیوں کی مخالفت ہوئی، ابن العربی تک پر زندیقیت کے فتوے ہوے۔ مگر مولانا کی نسبت کسی نے ایسا گمان تک نہ کیا۔ مخالفت جو کچھ ہوئی وہ زیادہ تر سماع اور رباب کی ہوئی اور بس۔ دوسرے یہ کہ جن لوگوں نے مخالفتیں کی تھیں۔ ان میں سے اکثر بعد تجربہ و مشاہدہ نہ صرف مولانا

[1] مناقب العارفین مطبع علاء الدین

کے موافق بلکہ معتقد ہو گئے۔ خود مولاناؒ کی جانب سے بھی بعض اقوال ایسے منقول ہیں جن سے علماء ظاہر کی مخالفت پائی جاتی ہے مگر اس قسم کی تمام روایتوں پر غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مولاناؒ نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف علماء ظاہر کی بےخبری حقیقت کے متعلق کہا ہے، جس سے علماء ظاہر کی تنقیص نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف علوم ظاہر اور علوم باطن کے فرق کا اظہار ہوتا ہے۔

ایک روز علاء الدین ثریانوس سے فرمایا کہ اگر تم سے پوچھیں کہ مولاناؒ کون تھے۔ تو جواب دینا کہ "نہ بینی و نشنوی" یعنی نہ ان کی عظمت کو تم دیکھ سکتے ہو اور نہ ان کے اسرار کو سن سکتے ہو (پھر فرمایا کہ دس من (پانچ سیر) روٹی کا توڑنا اور اس کا جیب میں ڈال لینا آسان مگر ایک من (آدھ سیر) روٹی کا کھا جانا مشکل ہے۔ یہ علمائے ظاہر علوم اہل علوم کو پڑھتے ہیں اور گراتے جاتے ہیں، ایک مرتبہ کھا لیئے تو بے پڑھے ہوئے اس تمام زحمت سے چھوٹ جاتے، اور خاموشی اختیار کرتے ؏

اس مفہوم کو ایک مجلس پر زیادہ واضح طور پر بیان کرنے کا موقع اس طرح ملا کہ قاضی عزالدین قونوی نے ایک مرتبہ مولاناؒ سے کہا کہ آپ نے جو علوم حاصل کیے ہیں ظاہراً ہم نے بھی بقدر استعداد و اجتہاد ان علوم کو حاصل کیا ہے۔ اور انہی کتابوں سے حاصل کیا ہے۔ جن کتابوں سے آپ نے حاصل کیا ہے؛ لیکن جو باتیں آپکو معلوم ہو جاتی ہیں وہ ہمیں نہیں معلوم ہوتیں اور ہماری عقل وہاں تک نہیں پہونچتی، مولاناؒ نے مسکرا کر فرمایا کہ ہم نے دو ایک ورق علم اقبال کا بھی پڑھ لیا ہے اور وہ علم اللہ ہے، یہ علم آپ تک نہیں پہنچا کبھی کسی کو پڑھا دیتے ہیں۔ ؏

۱؎ مناقب ص۲۴۳ ۲؎ ص۱۲۹

عقل کاں باشد ز دورانِ زحل | پیش عقل ماند اردآن محل
وز عطارد و ز زحل داناشد او | داد مارا اگر دگار از لطف خو
علّم الانسان خم طغرائے ما | علم عند اللہ مقصد ہائے ما[۱]

ایک دوسرے موقع پر اس سے بھی زیادہ صریح اور معنی خیز الفاظ میں اس مفہوم کو واضح کردیا ہے، فرمایا ہے کہ ابوحنیفہؒ اور امام مطلبیؒ اور دوسرے ائمۂ عالم خشکی کے معمار تھے جو شخص بصدق تمام ان کے طریق کو اختیار کرے گا اور ان عزیزوں کی متابعت کرے گا شرور اور اشرار اور قطاعانِ راہ سے ایمن ہو جائے گا لیکن جنیدؒ، ذوالنونؒ، بایزیدؒ، شقیقؒ، ادہمؒ، منصورؒ اور دوسرے ان کے مثل 'مرغان آبی' اور سیاحانِ عمانِ معانی ہیں جو شخص ان کی متابعت کرے گا نفس مکارہ کے حیلوں سے خلاص پائے گا اور دریائے قدرت کے گوہر تک پہنچ جائے گا[۲]

آخری قول فیصل یہ ہے کہ :۔

جملہ علوم علماء کہ در عالم کسب می کنند تالبِ گوراست، دیگر پیش نمی گذرد، امّا اعتقاد باید داشت کہ ازاں عالم آمدہ است، باز بداں عالم میرود۔[۳]

علماء ظاہر کی مخالفت کو مولاناؒ جس حد تک ان کی ناشناسی حقیقت پر محمول کرتے تھے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک روز چلپی شمس الدینؒ

---

[۱]

[۲] مناقب ص۱۲۹

[۳]

دل مدرس نے شکایت کی کہ فلاں عالم نے مجھ سے یہ کہا کہ تمہارا چرٹا کھنچوا دوں گا، مولاناؒ نے فرمایا کہ کیا ہی اچھا شخص ہے، ہم تو رات دن اسی فکر میں رہتے ہیں کہ چرٹے کو کھینچ کر پھینکیں تاکہ دوست کی رحمت سے سرفراز ہوں۔ ضرور بضرور آویں اور ہمیں چرٹے سے خلاص دیں۔ یہ خبر اُن عالم صاحب کے کان تک پہنچی تو افتاں خیزاں حاضرِ خدمت ہوئے اور صدق دل سے مرید ہو گئے۔[1]

پس اگرچہ مولاناؒ کی پابندی شریعت اپنی جگہ پر اظہر من الشمس وابین من الامس ہے، مگر بعض واقعات سے دل میں ایک طرح کا تردد سا پیدا ہو جاتا ہے کہ مولاناؒ کا فلاں قول یا فعل شرع ظاہر سے موافقت نہیں رکھتا۔ چنانچہ حضرت شمس الدینؒ کی خواہش پر آپ کا یہود کے محلہ سے شراب لانا، اتباع پیر کے نسبت یہ فرمانا کہ مرید کو پیر کے سامنے (یعنی پیر سے سبقت کر کے) نماز تک نہ پڑھنا چاہیے خواہ کعبہ ہی میں کیوں نہ ہو، ایسی باتیں ہیں کہ ظاہر بیں نظریں انھیں خلاف شرع قرار دیں گی مگر ادنیٰ تامل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مولاناؒ کا حضرت شمسؒ کے لئے شراب لانا کیا معنیٰ رکھتا ہے، حضرت شمس الدینؒ نے امتحاناً ایسا کہا تھا اور ضرور ہے کہ مولاناؒ نے بھی سمجھ لیا ہو اور نہ سمجھا ہو تو بھی آپ نے اس فعل سے شرع کی مخالفت نہیں کی بلکہ کمال تسلیم بہ شیخ کا اظہار کیا اور یہ تسلیم عین متابعت شرع ہے، کیونکہ مرید کے لئے یہ یقین کر لینا ضروری ہے کہ پیر خلاف شرع نہیں کرے گا اور جو امر بظاہر خلاف شرع معلوم ہوتا ہو اس میں کوئی حکمت باطنی ہوگی۔ چنانچہ خود مولاناؒ نے مثنوی شریف (دفتر دوم) میں "طعنہ زدن بیگانہ بہ شیخ" کے عنوان سے ایک حکایت درج کی ہے کہ ایک شخص نے ایک شیخ کی نسبت یہ طعن کیا کہ وہ شارب خمر ہے۔ شیخ کے کسی مرید نے اس کو سمجھایا مگر وہ نہ مانا اور خود اس مرید کو ایک روز لے جا کر دکھایا کہ شیخ

---

[1] مناقب ص ۲۱۶

کے ہاتھ میں بھرا ہوا جام موجود ہے، شیخ نے اسے معلوم کر لیا اور اس شخص کو قریب بلا کر دکھا دیا کہ جام شراب نہیں بلکہ شہد خالص ہے، اس کے بعد شیخ نے مرید سے کہا کہ مجھے شراب کی آرزو ہے، کہیں سے لے آؤ۔ مرید جس شراب خانہ میں جاتا تمام خم شہد سے بھرے ہوئے ملتے، شراب کا کہیں پتہ بھی نہ چلا۔

یہ تو عام حکایت ہوئی خاص حضرت شمس الدینؒ کے بارے میں مولاناؒ نے بعض فقہا کے اس سوال کے جواب میں کہ شراب حلال ہے یا حرام، یہ فرمایا تھا کہ "پینے والا کون ہے؟ دریا میں اگر مشک بھر کے شراب ڈال دیں تب بھی وہ پاک ہے لیکن چھوٹے حوض کو نجس کر دینے کے لئے ایک قطرہ شراب کافی ہے اور جواب صریح یہ ہے کہ اگر مولانا شمس الدینؒ پئیں تو ان کے لئے سب کچھ مباح ہے کیونکہ حکم دریا کا رکھتے ہیں، اور تمہارے ایسے لوگوں کے لئے جو بھی حرام ہے [۱]

ایں بنا شد در بودای مرغ خاک	بحر قلزم راز مردارے چہ باک
نیست دون القلتین حوض خورد	کہ تواند قطرہ‌ش از راہ برد
گر ولی زہرے خورد نوشے شود	در خورد طالب سیہ موشے شود

اس کہنے کا مقصود اصلی یہی تھا کہ ان کی ذات سے برخلاف شرع فعل سرزد ہی نہ ہوگا۔

علیٰ ہذا نماز کے بارے میں جو کچھ آپ نے فرمایا وہ خود نماز کا ترک نہیں ہے۔ بلکہ ظاہر صرف یہ کرنا ہے کہ نیک و شرعی کام میں بھی پیر کا ادب ملحوظ رکھنا چاہیے

---

[۱] مناقب ص۲۵۸

اور صاف یہ ہے کہ اس کے خلاف کرنے والوں کے باطن در باطن میں اپنے تشریع کا اظہار مخفی ہوتا ہے اور یہ سرزنش اسی کی ہے۔ اہل باطن کی نظر دل پر ہوتی ہے، وہ اصل کو دیکھتے ہیں، فرع کو نہیں دیکھتے۔ اکثر دیکھتے اور پوشیدہ رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی بر بنائے ضرورت اظہار بھی کر دیتے ہیں۔

[واقعۂ ذیل اگرچہ بیان مذکورۂ بالا پر ہو بہو صادق نہیں آتا مگر اس سے اتباع تام کا مفہوم واضح ہوتا ہے اور یہ کہنا اصلیت سے کچھ زیادہ بعید نہیں ہے کہ اہل طریقت کے وہاں اتباع پیر "تسلیم کلی" کے مرادف ہے، آنحضرتؐ نے غزوہ بنی قریظہ کے لئے روانگی کا حکم ظہر کے وقت دیا تھا اور نظر بہ استعجال یہ فرمایا تھا کہ عصر کی نماز وہیں پہنچ کر پڑھیں، فراہمی سامان وغیرہ کی وجہ سے بعض اصحابؓ کو روانگی میں دیر ہو گئی اور وہ عشاء کے بعد وہاں پہنچے گر عصر کی نماز وہیں پہنچکر پڑھی۔ [1]

مولاناؒ کی پابندی شریعت کے خلاف روڈہاوس نے ایک جگہ تعریض کی ہے۔ کہ مولاناؒ نے اپنے خادم سے کوئی کام کہا اس نے کہا "انشاء اللہ" اس پر مولاناؒ برہم ہو گئے۔ یہی سمجھ کی غلطی ہے، درحقیقت مولاناؒ کا برہم ہونا ہی عین شریعت تھا لوگوں نے "انشاء اللہ" کو عمل نہ کرنے کی سپر بنالیا ہے، حالانکہ مقصد شرع عزیمت امر و اعتصام باللہ ہے، سید احمد خاں مرحوم نے تہذیب الاخلاق میں ایک مضمون اس بارے میں لکھا ہے اور اس میں اس کی حقیقت خوب کھول کر بیان کی ہے، اسے بھی دیکھ لینا چاہیے۔

---

[1] "خاتم المرسلین" بحوالہ ابن اثیر جلد (۲) ص ۰۰

یہ تو تردیدی جواب ہے۔ خود اصل عبارت کو دیکھیے کہ مولاناؒ نے کیا کہا اور تعریض کرنے والے نے کیا سمجھا۔ افلاکی کے الفاظ یہ ہیں "روزے حضرت مولانا... شیخ محمدؒ درجواب ان شاء اللہ گفتہ باشد حضرت مولاناؒ بانگ بروے زد کہ اے ابلہ بس گوینده کیست" علہ

صاف ظاہر ہے کہ مولاناؒ نے ان شاء اللہ کہنے پر اعتراض نہیں کیا بلکہ اعتراض شیخ محمدؒ کے اس سمجھنے پر ہے کہ گویا کہنے والا ان شاء اللہ سے غافل ہے، اس کیلئے کسی دوسرے کی طرف سے عذر پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مولاناؒ نے مثنوی شریف میں خود ہی اس کا جواب شافی ووافی دیا ہے۔

ترک استثنا مرادم قسوتے است — نے ہمی گفتن کہ عارض حالتے است
اے بسا ناوردہ استثنا بگفت — جان او با جان استثناست جفت

غرض شرع ظاہری کی صریح مخالفت تو مولاناؒ سے کہیں بھول کر بھی نہیں ہوئی ہے، بعض روایتوں سے جو اشتباہ پیدا ہوتا ہے اسے بھی جب نظر تعمق سے دیکھا جاتا ہے تو باطل ہو جاتا ہے، اور ثابت ہو جاتا ہے کہ مولاناؒ کا تصوف صحیح معنی میں کمال پابندی شریعت تھا اور بس۔

نماز۔

اس اجمال کے بعد مولاناؒ کے عبادات و ریاضات کے متعلق بعض حالات قدرے تفصیل کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں، اور آپکے ادائے نماز کی کیفیت یہ تھی کہ جب نماز کا

علہ مناقب ص۱۹۱

وقت آتا قبلہ رو ہو بیٹھتے، چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا تھا، نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو خضوع وخشوع کی حد نہ رہتی اور ایک عجیب عالم استغراق کا طاری ہو جاتا، خود ایک غزل میں اس کیفیت کو بیان فرمایا ہے، عجب بیخود کن غزل ہے۔

چوں نماز شام ہر کس بنہد چراغ و خوانے | منم و خیال یارے، غم و نوحہ و فغانے
چو وضو ز اشک سازم بود آتشیں نمازم | در مسجدم بسوزد چو بدو رسد اذانے
رخ قبلہ ام کجا شد کہ نماز من قضا شد | ز قضا رسد ہمارہ بمن و تو امتحانے
عجبا نماز مستاں، تو بگو درست ہست آں | کہ نداند او زمانے، نشناسد او مکانے
عجبا دو رکعت است ایں، عجبا چہارم است ایں | عجبا چہ سورہ خواندم، چو نداشتم زبانے
در حق چگونہ کوبم کہ نہ دست ماند نے دل | دل و دست چوں تو بردی بدہ اے خدا امانے
بخدا خبر ندارم چو نماز میگذارم | کہ تمام شد رکوعے کہ امام شد فلانے[1]

بسا اوقات ایسا ہوتا کہ دو رکعت میں صبح کر دیتے تھے ایک مرتبہ موسم سرما میں مدرسہ میں اول شب میں نماز کے لئے کھڑے ہوئے، سجدے میں گئے، تو اس قدر روئے کہ آنسوؤں سے داڑھی تر ہو گئی۔ آنسو بر ودت ہوا کی وجہ سے جم کر برف ہو گیا۔ ریش مبارک زمین صحن سے چپک گئی۔ صبح کو جب لوگ آئے تو گرم پانی ڈال کر برف کو پگھلایا، تب اٹھے اللہ اکبر۔[2]

روزہ:۔ ابتدائے سلوک میں تین تین دن، ایک ایک ہفتہ بلکہ چالیس چالیس دن

---

[1] سپہ سالار ص ۲۱

[2] مناقب ص ۲۰۸

کے روزے رکھے ہیں، سید برہان الدینؒ نے جب آپ سے چلہ کشی کے لئے کہا تو تین چلّے تک مسلسل روزہ رکھا[1]، آخر میں یہ معمول ہو گیا تھا کہ پورے رمضان میں صرف دو بار افطار کرتے تھے، اور چند بار تو ایسا ہوا کہ رمضان کا پورا مہینہ گزار کر عید کے دن افطار کیا،

جب افطار کرتے، ایک قسم کی غذا پر اختصار کرتے اور بہت زیادہ کھاتے تو دس لقمہ سے زیادہ نہ کھاتے[2]

شب بیداری:

سپہ سالار کا بیان ہے کہ چالیس برس مولانا کی خدمت میں رہا مگر اس اثنا میں کبھی بسترِ خواب پر آسایش کرتے نہ دیکھا، خود ایک غزل میں اس جانب اشارہ کیا ہے ؎

---

[1] ابنائے زماں کو اس کا یقین دلانا دشوار تھا مگر غیب سے خود ایسے سامان پیدا ہوتے جاتے ہیں کہ اہلِ دنیا جو رنگ اختیار کرتے ہیں اُسی رنگ میں انھیں مصالح دینیہ پر یقین کرنا پڑتا ہے، ایک زمانہ تھا کہ روزہ مضر صحت سمجھا جاتا تھا، زیادہ مدت نہیں گذری کہ روزے کو مفید صحت سمجھا جانے لگا، تحقیقات کچھ اور آگے بڑھی تو طولانی فاقہ کشی حصول صحت کا ذریعہ قرار پائی اہلِ یورپ اور خاص کر اہلِ امریکہ نے ایک مہینہ سے زائد تک کی فاقہ کشی کر دکھائی اب آخری حد یہ ہے کہ یورپ میں ایک عورت نے دو ماہ کی فاقہ کشی تک نوبت پہنچا دی، پس جب اہلِ تن سے دو ماہ کی فاقہ کشی ممکن ہے، تو اہلِ دل سے چار ماہ کا روزہ کیوں مستبعد سمجھا جائے

[2] سپہ سالار ص۱۹،

اگر خواب آیدم امشب سزائے ریش خود بیند　　بجائے مفرش و بالیں ہمہ شست و لگد بیند

کثرت سماع اور شب بیداری سے اصحاب پر خواب کا غلبہ ہوتا اور وہ لوگ ترک ادب کے خیال سے سو نہ سکتے تو مولانا دیوار سے پیٹھ لگا کر مراقب ہو بیٹھتے اور شیخ محمد خادم ایک لبادہ اڑھا دیتے، جس سے کل جسم ڈھک جاتا، جب اصحاب سو جاتے، مولانا اٹھ کر نماز میں مشغول ہو جاتے، فرماتے ہیں[1]:-

اگر یکدم بیاسایم روان من نیاساید　　من آں لحظہ بیاسایم کہ یک لحظہ نیاسایم

شب بیداری کے متعلق مولانا کی ایک نہایت ہی مشہور و لولہ انگیز غزل ہے جس کا مطلع ہے،

دیدہ خوں گشت و خوں نمی خسپد　　دل من از جنوں نمی خسپد[2]

یہ محض خیال آرائی نہیں ہے، بلکہ امر واقعہ ہے،

استغراق

مولانا کے استغراق کا یہ حال تھا کہ جوتہ پہن کر چلتے، جوتا تنگ معلوم ہوتا راستہ ہی میں اتار دیتے، اگر اتفاق سے کبھی جوتا کیچڑ میں پھنس جاتا تو اسی طرح چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے[3]،

روشن ضمیری

---

[1] اس غزل کے اشعار انتخاب غزلیات میں ملاحظہ ہوں،

[2] سپہ سالار ص۱۰۰،

[3] ایضاً،

مقاماتِ تصوف میں ایک مقام شعور و وقوف یعنی اشراف القلوب ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ بغیر کہے ہوئے دلوں کے خیالات معلوم ہو جائیں، عام طور پر اسے کشف القلوب یا روشن ضمیری کہتے ہیں، تمام ہی اولیاء اللہ کے متعلق اس قسم کے واقعات منقول و مشہور ہیں، اور اب بھی اللہ کے بہیترے نیک بندے ایسے ہیں کہ جن لوگوں کو ان کی خدمتوں میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوتا ہے، انھیں وقتاً فوقتاً اس کا تجربہ اور مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس عاجز کو حضرت شاہ نیاز احمد دام برکاتہ فیض آبادی (خلیفہ حضرت مولانا شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی) کی خدمتِ بابرکت میں اکثر حاضر ہونے کا موقع ملا ہے، اور بارہا ایسا ہوا ہے کہ بغیر کہے ہوئے بعض واقعات و خطراتِ دلی پر واقف ہو کر آپ نے کبھی اشارۃً اور کبھی صراحۃً متنبہ کر دیا ہے، پس مولانا رومؒ کے ایسے بزرگ کی نسبت اس قسم کے واقعات کے ذکر کی ضرورت ہی کیا ہے، خود فرماتے ہیں ؎

ایں طبیبانِ جہاں دانشورند	بر مقام تو ز تو واقف تراند
ہم زنبضت ہم ز چشمت ہم زرنگ	صد سقم بینند در تو بے درنگ
ایں طبیبان نو آموز زخود	کہ بدیں آیات شاں حاجت بود
کاملاں از دور نامت بشنوند	تا بقعرِ تار و پودت دررسند
بلکہ پیش از زادنِ تو سالہا	دیدہ باشند ترا با حالہا

(یہ ابیات اس حکایت کے ہیں جس میں یہ مذکور ہوا ہے کہ حضرت بایزید بسطامی نے شیخ ابو الحسن خرقانیؒ کی ولادت اور آپ کے اوصاف کی

خبر پہلے ہی دے دی تھی)

یہاں صرف دو مثالیں درج کی جاتی ہیں، جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ کو نہ صرف خطرات دلی پر بلکہ حالاتِ خواب تک پر وقوف ہو جاتا ہے،

شیخ صدرالدین نے ایک شب خواب میں دیکھا کہ مولانا کے پاؤں دبا رہے ہیں، مولاناؒ علی الصباح شیخ کی خدمت میں تشریف لائے، بعد سلام کے شیخؒ نے بیٹھنے کے لئے التماس کیا، مگر مولاناؒ بیٹھے نہیں، فرمایا کہ آنے کا سبب یہ تھا کہ دریافت کروں کہ رات کی زحمت سے آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی، شیخ کو مولاناؒ کی روشن ضمیری پر سخت تعجب ہوا،[1]

قونیہ میں ایک صاحب تاج الدین تھے، لوگ انھیں متصدر کہتے تھے، انھیں عالمِ اولیاء سے سخت انکار تھا، ایک شب خواب دیکھا کہ دوزخ کے دروازے پر کھڑے ہیں، فرشتے ایک شخص کو زنجیروں سے جکڑے ہوئے ایک دوزخ سے نکال کر دوسری دوزخ میں لے جا رہے ہیں، چار شخصوں نے وہاں موجود ہو کر اس سے کہا کہ تو اولیاء اللہ کا کلام پڑھ، کہ اس بارگراں سے رہائی نصیب ہو، تاج الدین اپنی جگہ پر خشک ہوئے جا رہے تھے، اُس شخص نے ان ہی سے التماس کی کہ مجھے کچھ سکھا دیجئے کہ پڑھ دوں

---

[1] سپہ سالار ص۴۴ یہ واقعہ قدرے فرق کے ساتھ مناقب العارفین سے تفصیلاً اوپر منقول ہو چکا ہے،

انھوں نے مولانا کے کلام سے کچھ بتایا، ان ابیات کے پڑھتے ہی اس کی زنجیریں کھل گئیں اور وہ بہشت کی طرف روانہ کر دیا گیا، تاج الدین خواب سے بیدار ہو کر مولاناؒ کے مدرسہ میں آئے، مولاناؒ نے آگے بڑھ کر فرمایا کہ یہ سب کچھ آپ ہی کی برکت سے ہوا کہ اس بے چارہ نے دوزخ سے خلاص پائی، جب اولیاء اللہ کے کلام کا یہ اثر ہے تو ان کی صحبت کا کیا کچھ اثر نہ ہوگا، تاج الدین مع اپنے اہل و عیال کے مرید ہو گئے۔[1]

آزمائش

بارہا ایسا ہوتا کہ لوگ آزمائش کے خیال سے مولانا کی خدمت میں آتے اور سوالات کرتے تھے، مولاناؒ ان کی راز دل سے واقف ہو کر باتوں ہی باتوں میں جواب دیتے تھے، سوال تک نوبت ہی نہیں آنے پاتی تھی، چنانچہ مولانا قطب الدینؒ شیرازی کی روایت ہے کہ جب میں اوائلِ شباب میں قونیہ آیا، تو ہم لوگ بارہ اصحاب تھے، ایک روز نہایت دقیق مسائل مختلف کتابوں سے جمع کر کے مولیناؒ کی خدمت میں گئے کہ ان پر بحث کریں، وہاں پہنچ کر وہ سب مسائل ذہن سے محو ہو گئے، میں نے ہر چند کوشش کی مگر ایک مسئلہ بھی خیال میں نہ آیا، پھر مولاناؒ نے خود ہی تقریر شروع کی اور اس تقریر کے دوران میں میرے ایک ایک نکتہ کا جواب دیا کہ عقل دنگ رہ گئی، ہم سب مرید ہو گئے۔[2]

اسی طرح شمس الدین ملطی کی روایت ہے کہ ایک دن ایک عالم

---

[1] مناقب ص ۳۶۵ [2] ایضاً ص ۲۵۳، ۲۵۴

متبحر مولانا کی زیارت کو آئے، اور دل میں یہ ٹھان کر آئے کہ مولانا سے بطریق استفسار مگر درحقیقت بطور امتحان کچھ سوالات کریں گے، جب حاضر خدمت ہوئے تو مولانا نے مختلف معارف و لطائف بیان فرمانے شروع کئے اور اسی ذیل میں یہ حکایت بیان کی کہ ایک نحوی اور ایک فقیہ ساتھ ساتھ جا رہے تھے، اتفاق سے ایک اندھے کنویں پر پہونچے تو فقیہ کی زبان سے نکلا کہ "بیر معطلة" نحوی نے اعتراض کیا کہ "بئر" ہے، بحث کو اس قدر طول ہوا کہ وہیں شام ہو گئی، اتفاق سے نحوی کا پیر پھسلا وہ کنوئیں میں جا رہا اب فریاد شروع کی، فقیہ نے کہا کہ جب تک "بئر" کے ہمزہ کو نہ حذف کرے گا کنوئیں سے نہ نکالوں گا، یہی حال اُن لوگوں کا ہے، جو اپنے ہنر پر مغرور ہیں، جب تک وہ اپنے پندار کو خارج نہ کریں گے چاہ ظلمتِ نفس سے نہ نکلیں گے، ان عالم صاحب نے یہ سُن کر سر جھکا دیا[1]،

ایک جمعہ کو قلعہ کی مسجد میں وعظ فرما رہے تھے، مجلس گرم تھی، اور مولانا ید بیضا کی تفسیر میں سرگرم تھے، ایک فقیہ نے (دل ہی میں) کہا کہ واعظین پہلے سے آیتیں مقرر کرکے طیار ہو جاتے ہیں، قاری ان ہی آیتوں کو پڑھتے ہیں، اور واعظین ان کی تفسیر کرتے ہیں، واعظ کا کمال یہ ہے کہ برمحل آیت پڑھی جائے، اور وہ اس کے لطائف و غرائب بیان کرے، مولانا نے اسی عالم استغراق میں ان فقیہ کی طرف اشارہ کیا کہ آپ کوئی آیت پڑھئے، تمام لوگوں کو اس سے تعجب ہوا، فقیہ نے والضحیٰ

---

[1] مناقب ص۸،

کی تلاوت کی، مولاناؒ نے تفسیر شروع کی، عصر کا وقت ہو گیا، اور ابھی "والضحیٰ" کے واو کے نکات بھی ختم نہ ہوئے تھے، نقیبہ صدق دل سے مرید ہو گیا۔[عله]

قیل وقال سے گذر کر ایسا بھی ہوتا کہ کسی کے دل میں کسی شے کی خواہش ہوتی، اور مولاناؒ کے بغیر اُس سے واقف ہو کر اس کا سامان کر دیتے۔ چنانچہ ایک روز چلپی حسام الدینؒ کے باغ میں سماع تھا، مولانا بھی سماع میں سرگرم تھے، اس دوران میں آپ نے کئی مرتبہ فرمایا کہ "آؤ آؤ، کمر کھولو"، پھر فرمایا کہ مسافروں کی ایک جماعت بہت دور سے آ رہی ہے، اور مجھ سے حلوائے گرم چاہتی ہے، ناگاہ ترکستان و بخارا کے فضلاء کی ایک جماعت قونیہ میں وارد ہوئی اور مولانا کا پتہ لگا کر باغ میں آئی، اُسی وقت مسافروں کے سامنے حلوا پیش ہوا، اور مولاناؒ نے فرمایا کہ اگر مائدہ عیسیٰؑ کی درخواست کرتے تو وہ بھی نازل ہو جاتا، مگر مردانِ خدا سے حلوا نہ طلب کیا کرو بلکہ یہ چاہا کرو کہ تمہاری مشکل حل ہو اور قوتِ جان تمہاری غذا ہو جائے۔[عه۲]

عله سپہ سالار ص۱ (واضح ہو کہ اس زمانہ میں وعظ کا طریقہ یہ تھا کہ قاری قرآن کی چند آیتیں پڑھتا تھا اور واعظ انہی آیتوں کی تفسیر بیان کرتا تھا" سوانح مولانا روم ص۳۹)

عه۲ مناقب ص۲۵۹ (یہاں زمانۂ جدید کا ایک نہایت ہی مماثل واقعہ درج کرنا بے محل نہ ہوگا، میرے والد نے ایک مرتبہ بر سبیل تذکرہ فرمایا کہ جب میں مولانا فضل رحمٰنؒ سے مرید ہونے کے لئے جا رہا تھا تو راستہ میں یہ خیال آیا کہ اب دو روز گوشت نہ ملے گا، کیونکہ مولانا کے وہاں دال و ترکاری کا عام معمول تھا، جب وہاں پہنچے تو رات ہو چکی تھی، مولانا سے ابھی شرفِ ملازمت کی نوبت بھی نہیں آئی (بقیہ حاشیہ ص۴۱۵ پر)

فقر و فاقہ

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ مولانا مال دنیا سے بیزار رہتے، اور اپنے مریدین کے لئے بھی مال کی کثرت کو پسند نہیں فرماتے تھے، مگر مولانا کے تعلقات سلاطین اور امرائے سے برابر قائم رہے، اور یہ لوگ اپنی عقیدت مندی کا اظہار اسی میں سمجھتے تھے کہ کچھ نذر و ہدایا پیش کریں، مولانا بھی ان کے پاس خاطر سے قبول فرمالیتے تھے، مگر جو کچھ آتا تھا سب کا سب شیخ صلاح الدین اور ان کے بعد چلپی حسام الدینؒ کے یہاں بھیج دیتے تھے وہ اپنے حسب صوابدید مریدوں میں تقسیم کر دیتے تھے، گھر والوں کے لئے کچھ نہ رکھتے تھے، اور سلطان ولدؒ کچھ عرض کرتے تو قدر قلیل کچھ رکھ لیتے، [1]

جس روز گھر میں کھانے پینے کا سامان وافر ہوتا، گھر کے لوگوں سے متغیر رہتے، اور جس روز کم ہوتا بہت بشاش رہتے، اور فرماتے کہ "امروز

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۴) کہ مولانا کے خادم نے گوشت اور روٹی سامنے لاکر رکھ دیا، یہ کرامت تو اسی وقت مشاہدہ ہوئی، دوسرے روز حضرت احمد میاںؒ اور دیگر اصحاب مولانا کے زمرہ میں ایک مسئلہ پر گفتگو ہوئی، دل میں ایک خطرہ وارد ہوا، دوسری صبح کو مولاناؒ نے درس میں ایک ایسی حدیث پر گفتگو شروع کی جو اسی مسئلہ سے متعلق تھی، اور اس کے ضمن میں میرے خطرۂ دلی کو رفع کر دیا،

[1] سپہ سالار ص ۲۱ (بعینہ یہی حال حضرت مولانا فضل رحمٰنؒ گنج مراد آبادی کا تھا کہ مریدین و معتقدین جو کچھ پیش کرتے سب کا سب آیندہ روند کی ضیافت میں صرف فرما دیتے تھے، حضرت احمد میاںؒ جب کبھی ضرورت شدید کا اظہار فرماتے تو کچھ برائے نام گھر کے لوگوں کے لئے عطا فرماتے)

نورِ فقر در جبینِ اصحاب ایں خانہ لائح است[1]"

ایک روز مولاناؒ کی حرم نے قلتِ اخراجات کی شکایت کی، فرمایا کہ "دنیا را از شما دریغ نمی دارم، شما را از دنیا دریغ می دارم[2]"

علیٰ ہذا شیخ محمد نجار کی روایت ہے کہ مولانا اپنے خادم شیخ محمد سے سوال کیا کرتے تھے کہ آج گھر میں کچھ ہے؟ اگر وہ جواب دیتے کہ برکت ہے، کچھ نہیں ہے، تو خوش ہو جاتے اور شکر کرتے کہ الحمد للہ آج ہمارا گھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مانند ہے، اگر شیخ محمد کہتے کہ اسباب مطبخ مہیا ہیں تو پژمردہ ہو کر کہتے کہ اس مکان سے فرعون کے مکان کی بو آتی ہے[3]۔

ایک روز مولاناؒ کے گھر کے خادم نے قلتِ مال و متاع کی شکایت کی، فرمایا کہ اگر تمھیں ہزار دینار دیں اور ناک کان کاٹ لیں تو تم اس پر راضی ہو، اس نے کہا نہیں، فرمایا پھر بے نوائی کی شکایت کیوں کرتے ہو، اتنا کچھ سامان تو تمھارے پاس ہے (جسے ہزار دینار پر علیحدہ نہیں کرتے)[4]

ایک شخص نے تنگدستی کی شکایت کی، مولاناؒ نے فرمایا آج سے میری دوستی ترک کر دو، دنیا ہاتھ آجائے گی[5]۔

---

[1] سپہ سالار ص ۲۰،

[2] مناقب ص ۲۶۵،

[3] ایضاً ص ۲۶۲،

[4] ایضاً ص ۲۷۲، [5] مناقب ص ۲۷۳،

اس معاملہ میں مولانا کی احتیاط اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ آپ مالِ دنیا کو ہاتھ لگانا بلکہ اپنی رائے سے اس کا صرف کرنا بھی پسند نہ فرماتے تھے' آپ کے مریدوں میں ایک صاحب جلال الدین قصّاب تھے، ان سے بعض تاجروں سے دوستی تھی، یہ لوگ جب جلال الدین کے پاس آتے تو مولانا کا ذکر سنتے، ان کے دلوں میں بھی اشتیاق حضوری پیدا ہوا ایک روز جلال الدین سے کہا ہمارے بارے میں مولانا سے عرض کرو اور اپنے اموال کی ایک فہرست لکھ کر دے دی کہ جس طرح مولانا فرمائیں صرف کیا جائے، جلال الدین جب ان لوگوں کو لے کر حاضر خدمت ہوئے، اور حالات عرض کئے، مولانا لوٹا لے کر صحت خانہ میں چلے گئے، اور بہت دیر تک برآمد نہ ہوئے، آخر لوگوں نے مولانا سراج الدین سے کہا کہ خبر لینا چاہئے کہ وجہ کیا ہے، انھوں نے جاکر دیکھا کہ مولانا ایک کونے میں کھڑے ہوئے ہیں، انھیں دیکھ کر فرمانے لگے کہ یہاں کی نجاست کی بو تمام دنیا کے مال کی بو سے اچھی معلوم ہوتی ہے، ان لوگوں سے میری طرف سے عذر کرو اور کہدو کہ اگر تمھیں راہ حق میں ارادت ہے تو اپنے مال کو اپنے ہاتھ سے صرف کرو،[عہ]

تقویٰ:-

تقویٰ ظاہری معاصی سے بچنا ہے، مگر اہل اللہ کا تقویٰ یہ ہے کہ ماسوی اللہ

عہ مناقب ص ۲۰۶،

سے قطع کلی ہو جائے۔ اس خصوص میں مولانا کا حال یہ تھا کہ سپہ سالار لکھتے ہیں کہ میں نے تمام عمر حضرت کو دنیا کے غم و شادی و مصالحِ دنیاوی کے متعلق کچھ کہتے نہیں سنا[1]

اشاعتِ اسلام :-

صوفیائے کرام کے ذریعہ سے اسلام کی جس قدر اشاعت ہوئی قرون اولیٰ کے بعد کسی اور فرقہ کے ذریعہ سے اسلام اس قدر شائع نہیں ہوا ہے، کوئی زمانہ، کوئی خطہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، خاص کر ہمارے ملک میں تو اشاعت اسلام کو تمام تر صوفیہ کا کارنامہ قرار دیا جائے تو بالکل بجا ہے، مولانا نے ۶۲۲ھ میں قونیہ میں مستقل قیام اختیار کیا ہے، قونیہ کو ۵۸۰ھ میں داؤد نے فتح کیا تھا۔ ایشیائے کوچک کا بہت بڑا حصہ ہنوز قیاصرۂ روم کے قبضہ میں تھا۔ آل عثمان کے فتوح کے ساتھ فرقہ مولویہ بھی ہر جگہ مستحکم ہوتا گیا اور ان اطراف میں اشاعت اسلام کا بہت بڑا ذریعہ بھی فرقہ ہوا، خود مولانا کے نسبت یہ منقول ہے کہ اٹھارہ ہزار کفار (یہود ونصاریٰ وگبر) آپ کے ہاتھ پر ایمان لائے اور مرید ہوئے[2]

دعوت اسلام کے متعلق صوفیائے کرام کا جو طریقہ ہمیشہ سے رہا ہے وہی طریقہ مولانا کا بھی تھا۔ بحث وجدل، مناظرہ و مجادلہ کو اس میں کوئی دخل نہیں تھا بلکہ جو کچھ ہوا پیروی سیرت محمدی اور تصرفاتِ باطنی سے ہوا۔ یہاں صرف چند مثالیں اس کی درج کی جاتی ہیں:-

ایک مرتبہ مولانا گھوڑوں کے بازار کے دروازے سے نکل کر حضرت بہاء الدین ولدؒ کے مزار کی طرف جا رہے تھے، دیکھا کہ راستہ میں ایک ہنگامہ برپا ہے، ان میں سے چند

---

[1] سپہ سالار، ص ۲۲

[2] مناقب ص ۳۰۸

اشخاص دوڑ کر مولانا کی خدمت میں آئے اور فریاد کرنے لگے کہ ایک جوان شخص کو سزا دے رہے ہیں، آپ شفاعت فرمائیں، مولانا نے پوچھا کہ جرم کیا ہے؟ کہا کہ ایک شخص کو مار ڈالا ہے۔ اُس کا قصاص ہے۔ مولانا آگے بڑھے۔ جلاد و کوتوال سب ہٹ گئے، مولانا نے اپنے پیراہن کا دامن اس پر ڈال دیا اور اسے اپنے ہمراہ لے گئے، جب سلطان سے یہ کیفیت بیان کی گئی، کہا کہ مولانا حاکم ہیں اگر سارے شہر کی شفاعت کریں، تو بھی بجا ہے، ایک شخص کی کیا حقیقت ہے، اس شخص کا نام تریابوس تھا۔ مولانا نے اسے ایمان کر کے علاءالدین نام رکھا۔ آخر میں یہی شخص مشائخ کبار میں سے ہو گیا۔ اور شیخ علاءالدین کے لقب سے مشہور ہوا۔

ایک رومی معمار مولانا کے مکان میں کام کر رہا تھا، مولانا کے بعض اصحاب نے بطریق کہا کہ تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے کہ بہترین دین اسلام ہے، اس نے جواب دیا کہ پچاس سال سے عیسیٰ کے دین پر ہوں۔ اب ڈرتا ہوں اور شرم معلوم ہوتی ہے کہ اس دین کو ترک کر دوں، اس اثنا میں مولانا آگئے، فرمایا کہ اصل ایمان "ترس" ہے جو شخص خدا سے ترساں ہو خواہ ترسا کیوں نہ ہو بادین ہے بیدین نہیں ہے، وہ معمار فوراً مسلمان ہو گیا۔

ایک روز احبار یہود یہ میں ایک شخص کا مولانا سے سامنا ہو گیا اس نے پوچھا کہ آپ کا دین بہتر ہے یا ہمارا دین۔ فرمایا تمہارا دین۔ وہ شخص اُسی وقت مسلمان ہو گیا [۱]

ایک روز علم الدین قیصر کے وہاں سماع تھا، مولانا نے حالت وجد میں کل کپڑے قوالوں کو دیدیے۔ علم الدین نے نہایت قیمتی و نفیس کپڑے لا کر پہنائے، جب وہاں سے نکلے تو راہ میں ایک میخانہ سے رباب کی آواز آئی، وہیں وجد میں آگئے اور دیر تک یہی عالم رہا،

---

[۱] مناقب ص ۲۹

وہ سب کپڑے مجاوروں کو دیدیئے، یہ لوگ آرمینیہ کے رہنے والے تھے، دوسرے روز آکر سب مسلمان ہو گئے، عہ

اسی طرح ایک راہب نے مولانا سے سوال کیا کہ قرآن شریف میں ہے کہ "ان منکم الا واردہا" پس جب سب کو آگ پر سے گزرنا ہے تو اسلام میں اور ہمارے دین میں فرق کیا رہا۔ مولانا خاموش رہے، تھوڑی دیر بعد اٹھے اور شہر کی طرف روانہ ہوئے، راہب کہتا ہے کہ میں بھی عقب میں چلا، اتفاق سے شہر کے کنارے ایک قرن (تنور) پر پہنچے، اسے ایک نان پزنے جلایا تھا، میرا پیلون سیاہ (   ) لے کر اپنے پیراہن میں لپیٹ کر اس قرن میں ڈالدیا اور تھوڑی دیر ساکت رہے۔ خباز پیراہن مبارک کو نکال کر لایا وہ بالکل صاف ہو گیا تھا اور میرا پیلون جل کر خاک ہو گیا، فرمایا کہ ہم اس طرح گزریں گے اور تم اس طرح، اس نے اسی وقت سر جھکا دیا۔ اور مرید ہو گیا۔ عہ

مولانا کے زمانہ میں کالیون اور عین الدولہ دو شخص صنعت نقاشی میں یگانۂ روزگار تھے یہ دونوں مولانا کے ارادتمندوں میں تھے۔ کالیون نے ایک روز بیان کیا کہ استنبول میں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ کی ایک ایسی تصویر ہے کہ دنیا میں اسکی نظیر نہیں، عین الدولہ کو اس تصویر کے حاصل کرنے کا شوق ہوا، استنبول میں جاکر اس کلب میں بہت دنوں رہا اور ایک روز موقع پاکر وہ تصویر لے کر بھاگ گیا۔ جب قونیہ میں آیا تو مولانا نے فرمایا کہ لاؤ وہ تصویر ذرا میں بھی دیکھوں۔ دیکھ کر فرمایا کہ یہ دونوں تصویریں تمہاری

عہ مناقب ص۲۹۳

عہ " ص۳۳۳

شکایت کرتی ہیں کہا کیوں کر؟ فرمایا کہ کہتی ہیں کہ نہ ہم دن کو کھاتے اور نہ رات کو سوتے اور عین الدولہ ہمیں چھوڑ کر دن میں کھاتا اور رات کو سوتا ہے، عین الدولہ نے کہا کہ نقش بے جان ہیں، بات کیوں کر کر سکتی ہیں؟ فرمایا کہ تم تو نقش با جان ہو اور تم میں ہزاروں صنعتیں ہیں اور تمہیں نقاشِ عالم نے بنایا ہے، پھر اسے چھوڑ کر اس نقشِ بے جان پر کیوں عاشق ہوئے ہو، عین الدولہ نے توبہ کی اور مسلمان ہو گیا۔

مولاناؒ بعض اشخاص کو مصلحتاً اپنے اسلام کو مخفی رکھنے کی بھی ہدایت فرمایا کرتے تھے اور یہ کچھ مولاناؒ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، دوسرے اولیاء اللہ نے بھی ایسا کیا ہے۔

شیخ صلاح الدین کے مریدوں میں سے ایک شخص کی روایت ہے کہ تجارت کی غرض سے میرا ارادہ استنبول کو جانے کا ہوا، مولانا نے مجھے تنہائی میں بلا کر فرمایا کہ وہاں فلاں کلیسا میں سردار راہبین سے تنہائی میں میرا سلام کہنا، میں نے ایسا ہی کیا، معلوم ہوا کہ وہ شخص مسلمان اور مولاناؒ کا معتقد ہے، مگر مولاناؒ اسے اظہار اسلام کی اجازت نہیں دیتے تھے [1]

سنان الدین آقشہری کی روایت ہے کہ جب مولاناؒ تحصیل علم کی غرض سے دمشق کو جا رہے تھے تو آپ کا قافلہ ولایت سیس میں ایک کھود میں ٹھہرا، وہاں چالیس راہب رہتے تھے جو لوگوں کے دلوں تک کے حال بیان کر دیا کرتے تھے، دور دور سے لوگ ان سے ملنے کو آتے تھے، ان لوگوں نے جب مولاناؒ کو دیکھا تو ایک لڑکے کو اشارہ کیا، وہ اڑا اور

---

[1] سپہ سالار ص۵۳ مناقب ص۸۵-۸۶ (افلاکیؒ نے اس میں کچھ اور اضافہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ مولاناؒ وہاں متمثل ہو کر نظر آئے)

ہوا میں معلق ہوگیا، مولاناؒ مراقبے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ناگاہ اس لڑکے نے فریاد شروع کی۔ کہ کچھ فکر کرو ورنہ میں اس جگہ بیجا پھنگا ادراس مراقب شخص کی ہیبت سے ہلاک ہوجاؤں گا، راہبوں نے کہا کہ نیچے اتر آ، اس نے جواب دیا یہ ہو نہیں سکتا ہے، راہبوں نے ہر چند کوشش کی مگر وہ لڑکا نیچے نہ اتر سکا، آخر سب نے آکر مولاناؒ کے قدم پر سر رکھے اور عرض کی آپ عنایت فرمائیں اور ہمیں رسوا نہ کریں، مولاناؒ نے فرمایا کہ بغیر کلمہ توحید پڑھے چارہ نہیں، لڑکے نے کلمہ پڑھا اور بآسانی نیچے اتر آیا، تمام راہب ایمان لائے اور چاہتے تھے کہ مولاناؒ کے ساتھ رہیں۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ اسی جگہ عبادت میں مشغول رہو اور مجھے دعائے خیر میں فراموش نہ کرو۔ وہ تمام راہب اس جگہ اسی طرح رہے اور آنے جانے والوں کی خدمت کیا کرتے تھے[۱]

تبریز کے ایک متمول سوداگر قونیہ میں آئے۔ اول شیخ صدرالدین کی زیارت کی اور سو دینار نذر کے لئے لے گئے، پھر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پچاس دینار نذر کے لئے لائے، مولاناؒ نے فرمایا کہ تمہارے یہ پچاس دینار قبول ہوئے آئندہ نقصان سے محفوظ ہوگے، اُن تاجر کو ایک مدت سے ہمیشہ خسارہ ہی ہوتا رہتا تھا اور اسی وجہ سے پریشان تھے، مولاناؒ نے فرمایا کہ اس خسارے کی وجہ یہ ہے کہ آپ ایک روز فرنگستان مغرب میں ایک محلہ میں جا رہے تھے، ایک فرنگی درویش چوراہے پر سویا ہوا تھا، آپ نے اسے حقارت کی نظر سے دیکھا اور اس کے سر پر تھوکا، یہ سب کچھ اس عزیز کی دل آزردگی کی وجہ سے ہوا۔ جاکر اس سے معافی چاہو اور میرا سلام بھی کہدو، سوداگر جب وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ وہ فرنگی مولاناؒ کے مریدانِ خاص میں سے ہے اور خود صاحبِ ولایت و کرامات ہے[۲]

---

[۱] مناقب ص۵۴-۵۵ [۲] مناقب ص۶۶-۶۷

علی ہذا سلطان ولدؒ جب مولانا شمس الدینؒ کی خدمت میں دمشق میں پہونچے تو وہاں حضرت شمس الدینؒ کو ایک فرنگی کے ساتھ جو آپ کے مرتبہ سے واقف نہ تھا، شطرنج کھیلتے ہوئے دیکھا۔ حالات سے واقف ہو کر وہ شخص مسلمان ہو گیا تو حضرت شمس الدینؒ نے بھی اسے اخفائے اسلام کی ہدایت فرمائی۔

[ہمارے اس زمانۂ جدید میں حضرت حاجی وارث علی شاہ کے نسبت بھی نہایت صحیح طور پر متعدد واقعات ایسے منقول ہیں کہ آپ کے ہندو عقیدتمندوں میں سے بہت سے دل سے مسلمان تھے مگر آپ نے انھیں اسی حال پر قائم رہنے کی ہدایت فرمائی، درحقیقت یہ بھی اولیاء اللہ کے رموز میں سے ایک رمز ہے اور مصالح دینی پر مبنی ہے: خود قرآن مجید میں مذکور ہے کہ فرعون کے اعیان میں سے ایک شخص بدل مسلمان ہو گیا تھا، مگر اس نے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا تھا اور فحوائے کلام سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ اس پر اظہار ناپسندیدگی کیا گیا ہو، غزوۂ احزاب میں نعیم بن مسعود نے بھی اختتام جنگ تک اپنا مسلمان ہو جانا پوشیدہ رکھا تھا۔[عا]

کرامات (خوارق)۔

افلاکیؒ نے تقریباً ساڑھے تین سو صفحوں میں مولاناؒ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ درحقیقت سوانح نہیں ہے بلکہ آپ کے کرامات کو ایک سلسلہ میں جمع کیا ہے جس میں ایک

عا سیرۃ النبی، ابن ہشام جلد (۳)، صفحہ ۸۴-۸۲ (المطبعۃ الخیریۃ، مصر ۱۳۲۹ھ)۔ "خاتم المرسلین" مصنفہ مولانا عبدالحلیم شرر۔ صفحہ ۳۸۲-۳۸۳

حد تک ترتیب زماں کے قائم رکھنے کی کوشش کی ہے، "سپہ سالار" نے بھی چند عنوانات قرار دے کر ایسا ہی کیا ہے، بس اس باب میں واقعات کی کچھ کمی نہیں ہوسکتی۔ سینکڑوں صفحے لکھے جاسکتے ہیں، لیکن کتاب کی گنجائش اس کی مانع ہے، اگر کسی وقت مناقب العارفین کا ترجمہ ہو گیا تو اردو خواں اصحاب مولاناؒ کے خوارق و کرامات سے دل کھول کر سیراب ہوسکیں گے، مگر یہ واضح رہے کہ کشف و کرامات کے اظہار سے گریز اور شریعت کی پابندی مولاناؒ کے خاص اوصاف میں سے ہیں، آپ سے جس قدر کرامات منقول ہیں وہ ضرورتاً صادر ہوئے ہیں اور بسا اوقات اس میں بھی اخفا کی ہدایت فرماتے تھے، درحقیقت یہاں بھی وہی نکتہ رہا کہ انبیاء سے معجزات ضرورتاً صادر ہوتے ہیں، شان و نمود کے طور پر کشف و کرامات کے اظہار کے متعلق مولاناؒ کے خیال کا پتہ اس واقعہ سے چل سکتا ہے کہ سید تاج الدین ابن سید احمد الرفاعی (م ۵۷۸ھ / ۱۱۸۲) جب اپنے مریدوں کو ہمراہ لئے ہوئے قونیہ میں وارد ہوئے تو علماء اکابر نے آپ کا استقبال کر کے آپ کو مدرسہ جلال الدین قراطائی میں ٹھہرایا۔ آپ خود اور آپ کے مریدین طرح طرح کے خوارق کا اظہار کرتے، آگ میں چلے جاتے، گرم لوہا منہ میں لے لیتے۔ سانپ نگل جاتے کھولتے ہوئے تیل سے وضو کرتے۔ خاک کو شکر بنا دیتے، اہل قونیہ نے اس قسم کی کرامات کم دیکھی تھیں، رجوع عام حد سے زیادہ ہو گیا، مستورات بھی جانے لگیں، ایک روز چند معزز خواتین مولاناؒ کی حرم محترم کرا خاتونؒ کو بالاصرار تمام وہاں لے گئیں، مولانا اس روز باہر گئے ہوئے تھے، جب واپس آئے اور آپ کو یہ حال معلوم ہوا تو آپ نے اظہار ناپسندیدگی کیا، کرا خاتونؒ کی طرف تیز نگاہ سے دیکھا اور فرمایا کہ "زہے سرد" اس کے بعد سے کرا خاتون کا جسم اس قدر سرد ہو گیا کہ گرمیوں میں بھی پوستین پہنتی تھیں۔

دوسری طرف احقاق عقائد کے ثابت کرنے میں یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ اطبانے یہ بحث اٹھائی کہ انسان کی زندگی خون سے ہے، خون نہ ہو تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا، مولاناؒ نے اسی وقت فصد لے لی اور جسم کا تمام خون خارج کر دیا اور بفضلہ تعالےٰ زندہ رہے، فرمایا کہ زندگی خدا کے ید قدرت میں ہے، خون پر منحصر نہیں ہے[1]

مولاناؒ کے کرامات سے متعلق یہاں چند واقعات تبرکاً و تیمناً درج کیے جاتے ہیں، تاکہ کتاب اس سے خالی نہ رہے ورنہ صاحب المثنوی کے لئے کسی دوسری کرامت کی ضرورت نہیں ہے، آپ کے اصحاب و معتقدین کے نزدیک آپ کے ایک ایک اشارہ میں کرامات موجود ہیں اس کا اندازہ اس ایک روایت سے ہوتا ہے کہ ایک روز پروانہ نے ایک بڑا اجتماع کیا تھا، مولاناؒ تشریف فرما تھے مگر خاموش تھے، پروانہ نے سمجھ لیا کہ چلپی حسام الدینؒ کے نہ ہونے کی وجہ سے خاموش ہیں، آپ کو باغ سے بلوایا، جب آئے مولاناؒ نے بڑی تعریفوں کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا، پروانہ کے دل میں یہ خیال گزرا کہ مولاناؒ جس قدر تعریفیں چلپیؒ کی کرتے ہیں آیا یہ اوصاف ان میں ہیں بھی یا نہیں، چلپیؒ نے پروانہ کا ہاتھ زور سے دبا کر کہا کہ معین الدین اگرچہ نہیں ہے مگر جب مولاناؒ نے فرما دیا تو ہے اور اس کا سو گونہ ہے، مولاناؒ کو یہ قدرت ہے کہ جس کی نسبت جو کچھ زبان سے کہدیں ویسا ہی وہ ہو بھی جائے۔

بار ہا ایسا ہوا ہے کہ مولانا نے حالت مرض میں اپنے مریدوں کے لئے ایسی چیزیں تجویز کی

---

[1] مناقب ص ۸۰

ہیں، جو اصول و فروع طبی کے بالکل خلاف تھیں اور خدا کے فضل سے انھیں چیزوں سے شفا حاصل ہوئی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جلال الدین فریدونؒ نے مولاناؒ سے کثرتِ خواب کی شکایت کی فرمایا کہ شیرہ خشخاش استعمال کرو، انجام یہ ہوا کہ کثرت بیخوابی سے دماغ پریشان ہوگیا، پھر مولاناؒ سے عرض کیا، حالت درست ہوگئی،

اسی طرح ایک دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ فخر الدین سیواسی کو تپ محرقہ ہو گئی تھی، اطبا علاج سے عاجز آگئے تھے، مولاناؒ عیادت کو تشریف لائے، فرمایا کہ سیر دانہ (لہسن) کچل کر لاؤ، اسی کو کھلا دیا، جب اطبا نے ان کی صحت سے کلیتہً مایوس ہو گئے، رات کو پسینہ آیا اور صحت ہوگئی، اطبا نے کہا یہ معالجہ مولانا کے دستِ قدرت کا ہے طب و حکمت سے اسے کوئی تعلق نہیں [1]

بہاء الدین بحری مقام آبگرم میں اس قدر بیمار ہوگئے تھے کہ لوگوں کو ان کی زیست کی امید نہیں رہی تھی، مولاناؒ نے حکم دیا کہ اسی طرح مع جامہ خواب کے اٹھالائیں، انھیں حمام آب گرم میں غوطہ دلانا شروع کیا۔ تمام لوگ بالکل مایوس ہو گئے، مگر کسی کو دم مارنے کی ہمت نہیں تھی، بہاء الدینؒ کا بیٹا صلاح الدین فریاد کرنے لگا۔ مولاناؒ نے بہاء الدین کو خود اپنے ہاتھ سے پانی سے نکالا اور فرمایا کہ تھوڑی سی آسائش کریں، بہاء الدین جب اٹھے تو کھانا مانگا اور بالکل اچھے ہوگئے تھے۔ [2]

---

[1] سپہ سالار ص۱۵ مناقب ص۱۹۶ (مناقب میں چلپی حسام الدینؒ کے متعلق بھی یہی روایت ہے)

[2] مناقب ص۱۳۵

بعض وقت خود اپنی ذات پر ایسے امور گوارا کر لیتے تھے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے چنانچہ ایک مرتبہ مولاناؒ کے اصحاب میں سے اٹھارہ شخصوں کو مسہل کی ضرورت تھی مولانا اکمل الدین نے اٹھارہ خوراکیں مسہل کی تیار کیں، صبح کو مولاناؒ تشریف لائے اور دیکھا کہ ان لوگوں کو مسہل کے پینے سے نفرت ہے، آپ نے سب خوراکوں کو جمع کر کے ایک بڑے پیالہ میں ڈال لیا اور سب پی گئے، پھر سماع میں مشغول رہے، اور سماع سے نکل کر حمام میں گئے اور بہت دیر تک وہاں ٹھہرے رہے، اس کے بعد برف منگائی اور توڑ توڑ کر کھانے لگے۔ اکمل الدین یہ سن کر دوڑے آئے اور شور مچانے لگے کہ آخر کیا ارادہ ہے مگر مولاناؒ کو کچھ بھی نقصان نہ ہوا، تمام اطباء انگشت بدنداں رہ گئے۔ ؎۱

ایک روز مولاناؒ غائب ہو گئے تقریباً چالیس روز تک خبر نہ ملی، لوگ پریشان ہو کر ہر طرف تلاش کرتے پھرتے تھے، ہزار درم کا انعام مشتہر کیا، اتفاق سے حمام میں پانی ٹپکنے لگا، حمامی نے آگ کھینچ کر باہر کی تاکہ اس کی مرمت کرے دیکھا کہ مولاناؒ خزانہ حمام میں تشریف فرما ہیں، خواجہ مجد الدین نے حمامی کو ہزار درم دیئے۔ ؎۲

امداد اہل اسلام۔

مولاناؒ اگرچہ ظاہراً جہاد میں شریک نہیں ہوئے مگر آپ کی ہمت باطنی ہمیشہ اسلام اور اہل اسلام کی مدد میں مصروف رہتی تھی یہاں تین واقعات نقل کئے جاتے ہیں ان میں سے واقعہ اول آپ کی زندگی کا واقعہ ہے جس میں آپ نے لشکر اسلام کی ظاہراً امداد فرمائی۔

؎۱ مناقب ص ۲۴۱

؎۲ " ص ۱۲۵

یہ واقعہ کیخسرو دوم کے عہد کا ہے، اسی زمانہ میں مغلوں نے ۶۳۹ھ ۱۲۴۱ء میں روم پر حملہ شروع کیا، سلجوقیوں کو متواتر شکستیں ہوئیں، اور ۶۴۱ھ ۱۲۴۳ء کی شکست کے بعد سلجوقیوں نے بالکل ہتھیار ڈال دیئے، کیخسرو خود تو ناکارہ شخص تھا، مگر اس کا وزیر مہذب الدین اور نائب وزیر شمس الدین اصفہانی دو قابل رکن سلطنت تھے، انھوں نے اپنے حسنِ تدبیر سے ایسی صلح کی کہ ملک روم سلاجقہ پر بحال رہ گیا، مغلوں کی جانب سے اس تمام مہم کا سپہ سالار بیجو تھا، اور بیجو نویان[۱] (سپہ سالار) کے لقب سے اس کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے، چونکہ مغلوں کے نام کے ساتھ "خان" کا لفظ لگا دیا جاتا ہے بعض مورخین نے اسے بیجو خاں بھی لکھ دیا ہے، اور مناقب العارفین میں اسے ہر جگہ "باجو خاں" لکھا ہے، مولانا نے خود ایک شعر میں اس واقعہ کا اشارہ کیا ہے، مگر اس ایک شعر کو سمجھنے کے لئے پوری تاریخی واقعہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے، نہایت اختصار کیساتھ اس کا ذکر کیا جاتا ہے، مغلوں کا حملہ اوکتائی قاآن کے زمانہ میں شروع ہوا، صلح باجو خاں سے ہوئی، مگر اسکے موکد ہونے کیلئے قاآن کی منظوری کی ضرورت تھی، اس اثنا میں اوکتائی کا انتقال ہوگیا، مغلوں کے دستور کے مطابق جبتک قورلتائی (مجلس اکابر) نہ منعقد ہو، دوسرا قاآن نہیں ہوسکتا تھا، اور اس مجلس کا انعقاد ۶۴۶ھ تک نہ ہوسکا، اس مہلت سے فائدہ اٹھاکر شمس الدین نے چنگیز خاں کے بیٹے باتو خاں (فاتح یورپ) کا وسیلہ پیدا کیا، باتو خاں اس زمانہ میں خاندان چنگیزی کا بزرگِ خاندان سمجھا جاتا تھا، اس کی مدد سے شمس الدین اپنے تمام مقاصد میں کامیاب ہوکر اور قاآن اعظم کے فرامین لیکر واپس آیا، اور باجو اگرچہ نواحِ روم میں مغلوں کی جانب سے والی کی حیثیت سے برابر رہا، مگر سلطنت مغلوں کے ماتحت کی حیثیت سے خاندانِ سلاجقہ کے نام پر قائم رہ گئی، اب مولانا کا شعر ملاحظہ ہو،

---

[۱] اس لفظ کے املا میں اختلاف ہے، طبقات ناصری اور تاریخ وصاف اور جامع التواریخ (رشید الدین فضل اللہ) تینوں ہمعصر تاریخیں ہیں، اول الذکر میں "نوین" لکھا ہے، آخر الذکر میں "نویان" ہے، حبیب السیر

بدستم پرسے آمد ازاں قان ہمہ قاناں — من ایں باجو باتو را نمیدانم نمیدانم

(اس پوری غزل کے متعلق دیوان کے مباحث میں دیکھنا چاہیے)

دوسرا واقعہ باطنی مدد سے تعلق رکھتا ہے، مغلوں نے ۶۵۸ھ میں دمشق پر قبضہ کیا، اور چند ماہ بعد مملوکیوں سے شکست کھا کر شہر کو خالی کر گئے، اس موقع پر مولانا کی مدد کا جو واقعہ مناقب العارفین میں منقول ہے وہ دوسرے نمبر پر درج ہے،

تیسرا واقعہ مولانا کی وفات کے بعد کا ہے، کیخاتو اباقاآن کا بیٹا اور ہلاکو خاں کا پوتا تھا، ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ سے ۶۹۴ھ/۱۲۹۵ تک ایران کا قاآن رہا، منصب شاہی پر فائز ہونے کے قبل مغلوں کی جانب سے روم کا والی تھا، بادشاہ ہونے کے بعد ہی پھر روم کو روانہ ہو گیا، اور ایک برس کے بعد واپس آیا (یہ واقعہ اسی زمانہ ۶۹۴ھ یا ۶۹۵ھ کا معلوم ہوتا ہے) (۱)

جب باجوخاں کے لشکر نے قونیہ کا محاصرہ کیا، اور اہلِ شہر مایوس و نا امید ہو گئے، تو لوگوں نے آکر مولاناؒ کے حضور میں فریاد کی اور مدد چاہی، مولاناؒ شہر سے نکل کر میدان کے ایک ٹیلہ پر جا بیٹھے اور نماز اشراق میں مشغول ہو گئے، لشکریوں نے دیکھا کہ ایک سیاہ پوش خانی دستار سر پر رکھے ہوئے اطمینان کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہے، اور دنیا زیر و زبر ہو رہی ہے، ان لوگوں نے مولانا پر تیر چلانے کا قصد کیا، مگر سب کے ہاتھ بند ہو گئے، اور کسی سے کمان نہ کھنچی، پھر چاہا کہ گھوڑوں پر سوار ہو کر اس ٹیلے پر جائیں، گھوڑوں نے بھی قدم نہ اٹھائے، شہر کے لوگ برجوں پر سے یہ حالت دیکھ رہے تھے، اور فریاد کر رہے تھے، جب باجوخاں سے

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲۷ و ۴۲۸)

میں بھی یہی املا اختیار کیا گیا ہے، چونکہ جامع التواریخ مشہور مستشرق بلوشت کی مرتب کردہ (گب میموریل سیریز) ہے، اور بلوشت قدیم مغلوی زبان کا ماہر ہے، اس لئے "نویان" ہی صحیح معلوم ہوتا ہے،

یہ حکایت بیان کی تو وہ خود خیمے سے باہر آیا اور تیر و کمان لے کر چاہا کہ مولاناؒ پر تیر چلائے تیر ٹھیک نہ چلا اور لشکر میں گر پڑا۔ پھر گھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھنا چاہا، گھوڑا نہ بڑھا، تین بار ایسا ہی ہوا۔ غصہ میں آکر پیادہ چلنا چاہا، پاؤں نہ اٹھے آخر کہا کہ یہ شخص اولیاءاللہ سے ہے، اس کے غصہ سے بچنا چاہیے، جس شہر میں ایسا شخص ہو وہ ہرگز ہم سے مغلوب نہ ہوگا۔ شہر کے حوالی سے ہٹ کر صحرائے تلو باط میں جاکر ٹھہرا اکابر شہر مع سلطان کے بیش بہا تحائف لے کر حاضر ہوئے۔ باجو خاں راضی ہوگیا اور شہر سے درگذر کی، مولاناؒ کی نسبت پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ لوگوں نے بہاء الدین ولد کے بلخ سے آنے اور قیام کرنے کے سب حالات بیان کئے، باجو خاں نے کہا کہ میری عزت کا خیال کر کے اس شہر کے کنگرے گرادو، جب اکابر شہر نے ایسا کرنا چاہا تو لوگوں نے مولاناؒ کی خدمت میں فریاد کی، فرمایا کہو کہ گرادیں تاکہ اہل قونیہ کو معلوم ہو جائے کہ شہر قونیہ دوسرے ہی برج و بدن سے محروس و محفوظ ہے، اس برج و بدن سے محروس نہیں ہے جو ادنیٰ حکم سے خراب ہو جائیں ؎

شیر مردانند در عالم مدد	آں زماں کافغان مظلوماں رسد
نہ باں بے رشوتان یاری گراں	در مقام سخت و در روز گراں[1]

(۲)

مولاناؒ کے مریدوں میں اک بزرگ جلال الدین قصاب تھے، وہ گھوڑوں کی تجارت کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ مولاناؒ پر کچھ عجب حالت طاری ہوگئی تھی، چالیس روز تک ستار

---

[1] مناقب ص ۱۵۳ و ۱۵۴

کو گودن میں لیٹے ہوئے پھرا کیے۔ ایک روز ناگاہ پسینہ میں غرق جلال الدین کے وہاں آئے اور فرمایا کہ فلاں گھوڑا لاؤ، جلال الدین نے گھوڑا حاضر کیا، مولانا سوار ہو کر قبلہ کی طرف (جانب جنوب) روانہ ہو گئے، جلال الدین نے عرض کی کہ میں ہمراہ رکاب چلوں فرمایا ہمت سے مدد کرو، شام کو نہایت خستہ واپس آئے۔ دیو پیکر گھوڑا تھک کر چور ہو گیا تھا، دوسرے روز پھر تشریف لائے اور اس سے بہتر گھوڑا طلب کیا۔ شام کو پھر اسی طرح واپس آئے۔ تیسرے روز پھر یہی واقعہ پیش آیا مگر اس روز واپس آکر نہایت اطمینان کے ساتھ گھر جا کر آرام فرمایا، جلال الدین پر کچھ ایسی ہیبت طاری ہو گئی تھی کہ اس کیفیت کے دریافت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کچھ دنوں بعد دمشق کا ایک کارواں آیا، اس نے لوگوں سے بیان کیا کہ مغلوں سے جب دمشق میں جنگ ہوئی ہے اور مغول وہاں سے نکالے گئے ہیں، اُس وقت مولانا لشکر اسلام کی معاونت فرما رہے تھے۔ جلال الدین یہ خبر سن کر خوش خوش روانہ ہوئے کہ جا کر مولانا سے عرض کریں، جب پہنچے تو مولانا نے پہلے ہی فرمایا کہ ؎

آں سوارے کہ سپہ را شد ظفر | اہل دل را کیست سلطان البشر[1]

(۳)

مولانا کے انتقال کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ کیغا تو خاں نے امرائے قونیہ کی طلب کے لئے ایک ایلچی بھیجا تھا، بعض امرا نے اسے قتل کر ڈالا، کیغا تو خاں نے حملہ کر دیا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ لوگ جب ہر طرح عاجز آئے تو مولانا کی تربت پہ حاضر ہوئے رات کو کیغا تو خاں نے خواب میں دیکھا کہ مولانا نہایت ہیبت کے ساتھ اپنے قبہ سے

---

[1] مناقب ص ۶۴-۶۵

نکلے اور اپنے سر سے دستار کو کھول کر قلعہ شہر کو اس سے لپیٹنے لگے اور پھر آکر خان کا گلا دبایا اور فرمایا کہ "اے ترک، بجز اس فکر کو ترک کر" بیدار ہو کر اس نے اپنے امرا کو طلب کیا، خواب کا حال بیان کیا، امرا نے یک زبان ہو کر کہا کہ یہ اندیشہ ہمارے دل میں پہلے ہی سے تھا کہ یہ شہر مولاناؒ کے اقلیم سے ہے اور جس نے اس کا قصد کیا وہ تباہ ہوا مگر بادشاہ کے خوف سے ہم کچھ کہہ نہ سکے، کیغاتو نے استغفار کیا اور قونیہ میں ایلچی بھیجے کہ میں بغرض تفرج شہر میں آنا چاہتا ہوں، بعد عہد و پیمان کچھ لوگوں کے ساتھ شہر کے اندر آیا، تمام امرا و اکابر نے حاضر ہو کر نذریں پیش کیں جب اخی احمد شاہ آیا تو سب لوگ ہٹ گئے اور وہ آکر خان کے برابر بیٹھ گیا خان نے تعجب سے کہا کہ تمہارے پہلو میں کون شخص بیٹھا ہوا ہے احمد شاہ نے کہا میں اکیلا ہوں، خان نے اس شخص کا حلیہ بیان کیا تو احمد شاہ سمجھ گیا کہ یہ شکل مولاناؒ کی ہے، اس نے کہا کہ یہ شخص سلطان العلماء بہاء الدینؒ کے فرزند مولانا جلال الدینؒ ہیں، خان نے کہا کہ انھیں صاحب کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میرا گلا دبائے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ شہر میرا ہے، اب میں تم کو (احمد شاہ) اپنا باپ کہتا ہوں اور اس شہر کے خیال سے میں باز آیا، اور توبہ کی، پھر پوچھا کہ ان کی اولاد میں سے کون ہیں، احمد شاہ نے سلطان ولدؒ کا ذکر کیا۔ اور خان کو حضرت موصوف کے پاس لایا، وہ مرید ہوا اور حضرت موصوف نے از راہ مرحمت مولاناؒ کی کلاہ اسے دی۔[1]

---

[1] سپہ سالار ص۵۲ مناقب ص۳۶۸ [کیغاتو اگرچہ مسلمان نہیں ہوا مگر مسلمانوں کے ساتھ ہر طرح پر مراعات برتتا تھا۔ بادشاہ ہونے کے بعد جب روم کو روانہ ہونے لگا تو امیر شکورین ایلکانی کو دزیر کر گیا تھا واپس آکر

ذیل میں چند متفرق واقعات درج کیے جاتے ہیں، جن سے مولاناؒ کی قوت باطنی اور تصرفات روحانی کا خفیف سا اندازہ ہو سکے گا۔ واقعات قصداً ایسے ہی لے گئے ہیں جن کے ادراک سے منکرین کرامات بھی عاجز نہ ہوں ورنہ اولیا اللہ کے تصرفات کی حد و غایت نہیں ہے مگر ان کے سمجھنے کے لیے چشم بینا اور دل باصفا کی ضرورت ہے ؎

زاں نماید ایں حقائق ناتمام — کہ بریں خامہ بود فہمش حرام

[اس زمانہ میں معجزات و کرامات کو عقلاً ثابت کرنے کا ایک عام رواج ہو گیا ہے۔ مگر یہ عاجز عقلاً اس کا قائل نہیں ہے۔ اس باب میں ایک اصول کلی اپنے ذہن میں یہ قرار دے لیا ہے کہ معجزات و کرامات عقلاً ثابت نہیں ہو سکتے اور جب ثابت ہو گئے تو وہ معجزات و کرامات نہیں رہے اس لئے تاویلات بارد ہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی]

مولاناؒ ایک مرتبہ ایک تالاب کے کنارے بیٹھے ہوئے کچھ حقائق و معارف بیان فرما رہے تھے۔ اور پانی میں مینڈک شور مچا رہے تھے، جس سے استماع مشکل ہو گیا تھا، مولاناؒ نے نہایت سختی کے ساتھ فرمایا کہ اگر تم بہتر بیان کر سکتے ہو تو بیان کرو، میں چپ رہوں، فوراً سب خاموش ہو گئے۔ [1]

سلطان رکن الدین کی ملکہ گرجی خاتون کی روایت ہے کہ ایک روز ہم لوگ قدیم مکان میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ناگاہ مولاناؒ تشریف لائے اور فرمایا کہ جلد اس مکان

(حاشیہ ص ۴۲۳)

صدرالدین احمد خالدی کو "صدر جہاں" کے لقب سے وزیر مقرر کیا۔ اور بالفاظ حمد اللہ المستوفی "بادشاہ وزیر کریم جہانے و جہانِ کرم بودند"]

[1] سپہ سالار ص۱۳۱، مناقب ص۱۰۰

سے نکلو، ہم لوگ ننگے پاؤں نکل پڑے، ہم لوگوں کے باہر آتے ہی چھت گر پڑی[1]

جب شمس الدین تبریزیؒ کے پوشیدہ ہو جانے سے مولاناؒ کے مریدوں میں اختلاف برپا ہوا، اس فتنے کو فرو کرنے کے لئے مولاناؒ اپنے بعض اصحاب و اعقاب کو لے کر ملک شام کی طرف روانہ ہوئے، کسی موقع پر تین سو قزاقوں کا گروہ ساز و سامان سے نمودار ہوا، لوگ ہراساں ہو گئے، مولاناؒ نماز میں مشغول تھے، سلطان ولدؒ نے جا کر عرض کیا، فرمایا کچھ غم نہ کرو، ایک دائرہ اپنے کارواں کے گرد اگرد کھینچ دیا۔ جب قزاقوں کا لشکر قریب پہنچا، ہر چند کوشش کی گھوڑے آگے نہ بڑھے۔ ان میں سے ایک شخص گھوڑے سے اتر کر سامنے آیا اور پوچھا کہ تم لوگ کون ہو، کہاں سے آئے اور یہ کیا معاملہ ہے کہ ہمارے گھوڑے تمہاری طرف نہیں بڑھتے اور ہماری تلواریں میان سے نہیں نکلتیں، شاید تم لوگ جادوگر ہو، لوگوں نے کہا حاشا ثم حاشا ہمیں جادوگری سے کیا سروکار البتہ حضرت بہاء الدینؒ ولد بلخی کے فرزند مولانا جلال الدینؒ رومی مع اپنی اولاد و اعقاب کے ہمارے درمیان ہیں اور یہ انھیں کی ولایت کی ہیبت ہے جس نے تمہیں اس طرح مجبور کر دیا ہے یہ سن کر سب سر کھولے ہوئے حاضر ہوئے اور اظہار ارادت کیا اور حلب تک بطور بدرقہ کے ہمراہ لے گئے[2]

ایک مرتبہ مولاناؒ نے جلال الدین ابن سپہ سالار کے ذریعہ پروانہ کے نام قیصریہ میں ایک خط روانہ کیا۔ جلال الدین نے روانگی کے وقت دریافت کیا کہ اگر زبانی کچھ پوچھیں تو کیا

---

[1] سپہ سالار ص ۴۶

[2] مناقب ص ۱۲۵-۱۲۶

کہوں فرمایا کہ تم کہنے کا ارادہ کرنا جو کچھ کہنا ہوگا میں کہہ دوں گا۔ خط پڑھنے کے بعد پروانہ نے مولانا کے متعلق دریافت کیا، جلال الدین نے اس قدر حقائق و معارف بیان کیے کہ سب حیران رہ گئے، پروانہ نے کہا آپ سے بارہا ملنے کا اتفاق ہوا ہے مگر ایسا کلام آپ کی زبان سے کبھی نہیں سنا۔ جلال الدین نے حکایت بیان کی سب نے سر جھکا دیئے۔ [1]

فخر الدین دیودست کا بیان ہے کہ میں نے مولانا کے لئے کتاب حقائق سلمیٰ لکھی، بہت پسند فرمایا اور اپنا پیراہن مجھے عنایت کیا اپنی محنت پر نظر کرکے دل میں یہ خیال گزرا کہ تعجب ہے کہ مولانا نے اسی پر اختصار فرمایا۔ فوراً ہی اشارہ ہوا کہ یہ اندیشہ غلط ہے، پھر ایک حکایت بیان فرمائی کہ ایک فقیر شہر بغداد میں پنجشنبہ کو زنبیل لئے مانگتا پھرتا تھا، ایک بڑے عالیشان مکان پر گیا اور سوال کیا، کسی نے پردے میں سے ایک بڑیا اس کی زنبیل میں ڈال دی، جب اپنی جگہ آکر کل ٹکڑوں کو نکالا تو اسے تعجب ہوا کہ اتنے بڑے مکان سے اتنی سی پڑیا ملی کھول کر دیکھا کہ اس میں ایک چڑیا لپٹی ہوئی تھی جس کا وزن معلوم سے زیادہ معلوم ہوا، اس کا پیٹ سیا ہوا تھا کھول کر دیکھا تو موتی بھرے ہوئے تھے ہمیشہ کے لئے فقر و فاقہ سے نجات پا گیا۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ مولانا کے انتقال کے بعد قونیہ میں قحط پڑا، لوگ دعا کرتے کرتے عاجز آگئے، سلطان ولدؒ سفر میں تھے، شہر کے اکابر و اعیان نے وہ پیراہن مجھ سے لیکر صحرا میں جاکر اس کے وسیلے سے دعا کی، خدا کے فضل سے اسی دن بارش ہوئی کہ سب سیراب ہو گئے۔ لوگوں نے کمال اعتقاد سے میری اس قدر خدمت کی کہ بیان سے باہر ہے۔ جب اوحد الدین سانیسوی چلپی عارفؒ کے پاس آکر مرید ہوئے

---

[1] مناقب ص۲۲۱

تو وہ پیراہن فخر الدین سے لے کر چند سو تنکہ شکرانہ دیا [1]

سماع :-

مولانا کے کمالات باطنی کے اس مجمل و مقصر تذکرے کو اگر "سماع" و "رباب" پر اظہار خیال کئے بغیر ختم کر دیا جائے تو یہ بحث بہت ہی تشنہ رہ جائے گی۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سماع کی تاریخ اور حقیقت سماع پر بھی تفصیلی گفتگو کی جائے" نہ یہ ضروری ہے کہ سماع کے متعلق اصحاب ظاہر اور ارباب باطن کے درمیان روز اول سے جو اختلاف برپا ہے اس کے ایک ایک قضیہ کو معرض بحث میں لایا جائے اور قاضی بنکر خواہی نخواہی اس پر محاکمہ کیا جائے بلکہ ضرورت صرف دو امور کی ہے

(۱) اولاً یہ کہ تیمناً یہ واضح ہو جائے کہ مذہبی حیثیت سے سماع کے جواز و عدم جواز کے متعلق مولانا کے زمانہ کے قبل ہی کافی دوانی معرکہ آرائی ہو چکی تھی اور اہل تصوف بلا اختلاف اس کے جواز بلکہ استحباب کے قائل تھے۔ مولانا کو نئی بساطِ جنگ بچھانے کی حاجت نہیں تھی۔

(۲) ثانیاً یہ کہ تخصیصاً یہ معلوم ہو جائے کہ اس باب میں مولانا (اور آپ کے کلام کے شارح سلطان ولد ؒ) کے خیالات کیا تھے۔

(۱)

سماع کے متعلق دونوں جانب سے جس کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں شاید ہی کسی دوسرے اختلافی مسئلہ کے متعلق اس کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہوں مگر اول تو ان تمام کتابوں کا احصاء دشوار اور پھر نفس مطلب کے اعتبار سے سب کا مطالعہ بیکار، عدم جواز کی

---

[1] مناقب ص ۳۶۳

کتابوں سے اس وقت بحث نہیں ہے۔ جواز سے متعلق تمام مباحث کا ماحصل یہ ہے کہ۔
"لاہلہ حلال ولغیرہ حرام" اور یہی مسلک مولانا کا تھا۔

اس سلسلہ میں ابوالقاسم بن عبدالکریم بن ہوزان القشیری (۳۷۶ھ۔ ۴۶۵ھ) کی کتاب "الرسالۃ القشیریہ" کو جامع اصول و فروع ہونے کی حیثیت سے اگر فن تصوف میں ام الکتب قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا [1]

یہ رسالہ المطبعۃ العامرۃ الثمانیہ مصر میں ۱۲۰۴ھ میں طبع ہوا ہے، اس میں سماع کے متعلق باب السماع (ص ۱۹۸۔ ص ۲۰۷) میں کافی و وافی بحث کے بعد سماع کو ہر طرح بر مباح بلکہ مقبول قرار دیا ہے اور اس باب میں نہایت کثرت سے روایات و واقعات نقل کیے ہیں۔ ایک روایت ابن جریجؒ کی لکھی ہے کہ وہ سماع کو جائز رکھتے تھے، لوگوں نے پوچھا کہ قیامت کے دن جب آپ کے حسنات و سئیات سامنے آئینگے تو یہ سماع کس میں شامل ہوگا" فرمایا "نہ حسنات میں نہ سئیات میں"۔ (یعنی یہ مباحات میں سے ہے۔) اس زمانہ میں چونکہ مخالفت میں غلو نہیں تھا، اس لئے اتنا ہی کافی تھا جب مخالفت میں شدت ہوئی تو موافقت میں بھی زور استدلال صرف ہونے لگا۔

---

[1] باعتبار زمان تصوف کی متعدد کتابیں اس سے قبل تصنیف ہو چکی تھیں، از انجملہ طاؤس الفقرا ابونصر سراج (م ۳۷۸ھ) کی کتاب اللمع اغلباً چوتھی صدی ہجری کے وسط کی تصنیف ہے، سماع کی بحث اس میں موجود ہے۔ اور ابوطالب مکی (م ۳۸۶ھ) کی کتاب "قوت القلوب" بھی تقریباً اسی زمانہ کی کتاب ہے مگر "رسالہ قشیریہ" کو جو شہرت عام حاصل ہوئی اور زمانہ مابعد میں دوسرے مصنفین نے اس سے جس طرح کام لیا اس کے اعتبار سے اسے (ام الکتب) کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کتاب اللمع کو ڈاکٹر نکلسن نے ۱۹۱۴ء میں طبع کیا اور "قوت القلوب" مصر کے

"رسالہ قشیریہ" کے بعد دوسری مشہور عام کتاب علی ہجویری (المعروف بہ داتا گنج بخش) لاہوری (م ۴۶۵ھ) کی کشف المحجوب[1] ہے آپ مضافات غزنین میں قریہ ہجویر کے رہنے والے تھے، تمام عالم اسلامی میں سفر کیا تھا اور اپنے زمانہ کے تقریباً تمام ہی اکابر صوفیہ سے ملے تھے آخر میں لاہور میں قیام اختیار فرمایا اور وہیں انتقال کیا، ہندستان میں نہایت مشہور ہیں "کشف المحجوب" اپنے طرز کی بے نظیر کتاب ہے مگر ترتیب کے اعتبار سے "رسالہ قشیریہ" کے مثل واضح بین نہیں ہے، مسائل تصوف یکجا بیان نہیں ہوئے ہیں بلکہ متفرق طور پر بیان ہوئے ہیں، اس میں کشف یازدہم (جو کتاب کا بالکل آخری حصہ ہے) سماع سے متعلق ہے، ایک بہت ہی نازک نکتہ سماع کے متعلق یہ تحریر فرمایا ہے کہ "گروہے گفتند کہ سماع آلت غیبت است و دلیل آوردہ اند کہ اندر مشاہدہ سماع محال باشد کہ دوست اندر محل وصل دوست اندر حال نظر بد مستغنی شود از سماع وے .... و باز گروہے گفتند کہ سماع آلت حضور است زانچہ محبت کلیت خواہد تا کل محب بکل محبوب مستغرق نشود وے اندر محبت ناقص باشد چنانکہ دل را اندر محل وصل نصیب محبت است و سر را مشاہدت و روح را وصلت و تن را خدمت باید تا گوش را نیز نصیبے بود چنانکہ چشم را است از رویت .... پس

بقیہ حاشیہ ص ۴۳۸

المطبعۃ المیمنیہ نے ۱۳۰۴ھ میں دو جلدوں میں طبع کی ہے

[1] کشف المحجوب ص ۴۱۹ مطبوعہ مطبع اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء [حاصل مطلب:- ایک گروہ کی رائے ہے کہ سماع آلۂ غیبت ہے جب دوست خود سامنے ہے تو اس کا حال سننے کی کیا ضرورت ہے دوسرے گروہ کا خیال یہ ہے کہ سماع آلۂ حضور ہے، حضوری سے جس طرح تمام قوائے باطنی و اعضائے ظاہری کو حظ حاصل ہوتا ہے، کان کو بھی حظ حاصل ہونا چاہئے، پس سماع دو طرح کا ہوا ایک بواسطہ اور ایک بے واسطہ جو قاری سے سنے وہ آلۂ غیبت ہے جو خود دوست سے سنے وہ آلۂ حضور ہے] اس کتاب کا اردو ترجمہ فیروز الدین صاحب نے کیا ہے اور لاہور میں ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۱ء میں طبع ہوا ہے،

سماع بر دو گونہ باشد یکے بواسطہ و یکے بے واسطہ آنکہ از قاری بشنود آلت غیب باشد و آنکہ از یارے شنود آلت حضور ...." بہر حال سماع کو جائز و مستحسن قرار دیا ہے،

ان سب کے بعد جب امام محمد غزالیؒ (سنہ ۴۵۰ھ - سنہ ۵۰۵ھ) نے "احیاء علوم الدین" لکھی اور اس میں سماع پر مفصل بحث کی تو اس باب میں کسی دوسری کتاب کی حاجت ہی نہیں رہ گئی۔ احیاء العلوم کی جلد دوم کی کتاب ہشتم سماع سے مخصوص ہے، امام ہمام نے اس کتاب ہشتم کو دو بابوں میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول میں اباحت سماع کے متعلق اختلافات علماء کا ذکر ہے۔ اس میں تین بیان ہیں، بیان اول میں سماع کی تحلیل و تحریم کے متعلق علماء و متصوفین کے اقوال نقل کئے ہیں، بیان دوم میں اباحت سماع پر دلائل دیئے ہیں، بیان سوم میں قائلین تحریم کی دلیلیں درج کر کے ان کا رد کیا ہے، باب دوم میں آثار و آداب سماع بیان کئے ہیں اور اسے تین مقامات میں منقسم کیا ہے۔ مقام اول میں "فہم" سے بحث کی ہے، مقام دوم میں "بعد الفہم و تنزیل الوجد" کا ذکر کیا ہے اور مقام سوم میں سماع کے آداب بالتفصیل بتائے ہیں، یہ کل بحث مطبع مجتبائی کی مطبوعہ احیاء العلوم میں صفحہ (۱۸۸) سے صفحہ (۲۱۶) تک ہے مگر کتاب فلسکیپ کی تقطیع پر پینتیس سطری مسطر پر نہایت باریک خط میں چھپی ہے۔ اگر معمولی انداز کتابت و تقطیع ہو تو سوا سو صفحوں سے کم نہ ہوں گے۔ یہ بحث اتنی جامع ہے کہ اس کے بعد جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں سے کچھ بھی اس سے خارج نہیں ہے۔

احیاء العلوم پر خود امام صاحب کے زمانہ ہی میں اعتراضات بھی ہوئے تھے اور بحث سماع ان اعتراضات سے بچ نہیں سکتی تھی مگر امام صاحب نے ان کے جوابات "الاملاء عن اشکالات الاحیاء" میں دیا اور زمانہ مابعد میں عبد القادر بن شیخ عیدروس نے "تعریف

الاحیاء بفضائل الاحیاء" کے نام سے ایک کتاب لکھ کر بعد کے اعتراضات کو بھی اٹھا دیا ہے، بعض اشخاص نے احیاء العلوم پر ضعف روایات کا طعن کیا تھا اور اب بھی کرتے ہیں۔ اس کے متعلق حافظ الاسلام عبدالرحیم ابن الحسین العراقی (م ۸۰۶ھ) نے کتاب المغنی عن حمل الاسفار فی تخریج ما فی الاحیاء من الاخبار" لکھ کر تمام شکوک رفع کر دیئے ہیں، یہ تینوں کتابیں احیاء العلوم مطبوعہ مصر کے ساتھ طبع ہوئی ہیں اور اول الذکر دو کتابیں احیاء العلوم کی شرح "اتحاف السادۃ" کے ساتھ شامل ہیں۔

[یہ کتاب اتحاف السادۃ المتقین "ابوالفیض سید محمدؒ بن محمدؒ بن الحسین الزبیدی الشہیر بہ مرتضیٰ (م ۱۲۰۵ھ) کی تصنیف ہے اور ۱۱۹۳ھ یا مابعد لکھی گئی ہے۔ المطبعۃ المیمنیہ مصر میں ۱۳۱۱ھ و مابعد میں طبع ہوئی ہے اس میں اس سماع کی بحث کو اور بھی پھیلایا ہے اور جلد سادس کے (۱۰۷) صفحے (۴۵۴-۵۶۱) اس کے لئے وقف ہوئے ہیں۔ اس میں اعتراضات مابعد کے جوابات بھی ہو گئے ہیں]

سماع کی اس بحث کو حضرت امامؒ نے "کیمیائے سعادت" رکن دوم اصل ہشتم میں نسبتاً مختصر کرکے بیان کیا ہے [1]

امام صاحب نے جس شرح و بسط اور دلائل و شواہد کے ساتھ سماع کے متعلق بحث کرکے اسے مباح قرار دیا اس کے بعد اہل تصوف کے لئے کسی دوسری برہان و حجت کی ضرورت نہیں رہ جاتی تاہم آپ اس کے جواز و مباح ہونے تک محدود رہے

---

[1] اردو میں احیاء العلوم کا ترجمہ "مذاق العارفین" کے نام سے اور کیمیائے سعادت کا ترجمہ اکسیر ہدایت کے نام سے موجود ہے اور دونوں ترجمے مطبع نولکشور میں متعدد بار طبع ہو چکے ہیں۔

لیکن آپ کے بھائی امام احمد الغزالی (م ۵۲۰ھ) نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور خود سماع کے منکروں پر کفر کا اطلاق کر دیا۔ آپ نے احیاء العلوم کا خلاصہ 'لباب الاحیاء' کے نام سے کیا ہے اور اس کے سوا تصوف کے متعلق اور بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں انھیں میں ایک کتاب "بوارق الالماع فی تکفیر من یحرم السماع" بھی ہے، اس میں اولاً مطلق سماع پر بحث کی ہے، پھر سماع متعارف کو مفصلاً بیان فرمایا ہے، اسے زمان، مکان اور اخوان کے قیود سے مشروط کیا ہے، دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ سألنی بعض الصلحاء المتوجھین الی اللہ فی السراء والضراء ان اکتب لہ رسالۃ فی السماع وقواعدہ وشروطہا فی نحو لظہور فوائدہ مستشہداً علیہ بالقرآن العظیم والحدیث الشریف وافعال الصحابۃ وعلی اسکرتہ وما یلزمھم من المذکورات شرعاً واستدل بالکتاب والسنۃ والمعقول والمنقول علی ان من قال ان السماع حرام کفر بالاجماع وسد علیہ طرق المشائخ والاسماع ولما رأیت صدق رغبتہ اجبت سوالہ وحصلت لوالہ بتحصیل ہذا الکتاب بعد الاستخارہ فی حضرت الملک الوہاب سمیتہ بوارق الالماع فی تکفیر من یحرم السماع" علہ

یہ معلوم ہے کہ مولانا حضرت امام احمد غزالی کے سلسلہ میں تھے اور حضرت احمد الغزالی

علہ خلاصہ:۔ مجھ سے بعض اصحاب نے یہ کہا کہ سماع کے متعلق ایک ایسی کتاب لکھنا چاہیے، جسمیں قرآن حدیث اور افعال صحابہ سے استشہاد کیا جائے اور کتاب سنت اور منقول و معقول سے یہ ثابت کیا جائے کہ جو لوگ سماع کو حرام کہتے ہیں وہ بالاجماع کافر ہیں۔ میں نے ان کی صدق رغبت کو دیکھکر بعد استخارہ یہ کتاب بوارق الالماع فی تکفیر من یحرم السماع " لکھی [خواجہ حمید الدین نے اس کتاب کا اردو ترجمہ "حقیقۃ السماع" کے نام سے کیا ہے اور دلی پرنٹنگ ورکس دلی میں ۱۹۱۴ء میں طبع ہوا

کے نسبت آپ کا جو خیال تھا وہ آپ کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ

امام احمد غزالیؒ در عالم ملک گرد از دریائے علم برآوردہ علم علم را افراشتہ مقتدائے جہان گشت و عالم عالمیان شد، اگرچہ ہمچوں امام احمد غزالیؒ ذرہ عشقش بودے بہتر بودے و سر قربت محمدیؐ را چو احمدؐ معلوم کردے۔ زانکہ در عالم ہمچوں عشق استادے و مرشدے موصول نیست [1]

"رسالہ قشیریہ" کا سنہ تصنیف ۴۳۷ھ ہے "کشف المحجوب" کا سنہ تصنیف معلوم نہ ہو سکا۔ مگر دیباچہ سے اتنا مترشح ہوتا ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ نے یہ کتاب اپنی آخر عمر میں تصنیف فرمائی ہے، اور چونکہ آپ کا انتقال ۴۶۵ھ میں ہوا ہے، اس لئے لازماً یہ کتاب ۴۶۵ھ کے قبل ہی لکھی گئی ہوگی، احیاء العلوم، پانچویں صدی ہجری کے عشر آخر کی تصنیف ہے اور بوارق الالماع اوائل ششم صدی میں لکھی گئی ہے۔

غرض مولاناؒ کی ولادت سے ایک صدی قبل ہی سے سماع کی بحث ہر پہلو سے طے ہو چکی تھی، اختلافات کا سلسلہ جاری رہا اور اب تک جاری ہے مگر جس قدر دلائل دونوں جانب سے پیش ہو سکتے تھے وہ پیش ہو چکے تھے اور زور آزمائی کا خاتمہ ہو چکا تھا،

اس کے بعد خود مولاناؒ کے زمانہ ہی میں شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے تصوف کی نہایت مشہور و جامع کتاب "عوارف المعارف" تصنیف فرمائی اور اس میں سماع پر نہایت مفصل بحث کی، اس کے چار باب (ابواب ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵) بحث سماع کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴۲)
ترجمہ رواں و سلیس ہے۔]

[1] مناقب ص ۱۲۹

لئے وقف ہیں۔ باب ۲۲ "فی القول السماع قبولاً وایثاراً"

اس میں اولاً آیت کریمہ "فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ، اولٰئک الذین ہداہم اللہ واولٰئک ہم اولوالالباب" سے استدلال کر کے یہ تحریر فرمایا ہے کہ ہٰذا السماع ہو السماع الحق الذی لایختلف فیہ اثنان من اہل الایمان ...."

اس کے بعد کثرت روایات وحکایات سے اپنے اس قول کی تائید کی ہے،

باب ۲۳۔ "القول فی السماع رداً وانکاراً"

اس میں اہل رد وانکار سے بحث کی ہے اور غیر مستحسن سماع کی توضیح کی ہے۔

باب ۲۴۔ "القول فی السماع ترفعاً واستغناءً"

اس میں سماع کے مفاد ومدارج بتائے ہیں۔

باب ۲۵۔ "القول فی السماع تادباً واعتناراً"

اس میں آدابِ سماع پر بحث کی ہے۔

ان تمام مباحث میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ جن احادیث کو ضعیف سمجھا ہے ان کو ظاہر کر دیا ہے ؏

؏ یہ کتاب مستقل حیثیت سے طبع ہو چکی ہے مگر اس وقت وہ نسخہ میرے پیش نظر نہیں ہے، احیاء العلوم مطبوعہ مصر کے حاشیہ پر بھی چھپی ہے اور مباحث مذکورہ بالا احیاء العلوم کی جلد دوم کے حاشیہ پر صفحات ۱۱۲ سے ۱۶۷ تک ہیں۔

اس کتاب کا ایک ترجمہ "مصباح الہدایہ و مفتاح الکفایہ" کے نام سے شیخ محمود بن علی الکاشانی

پس اول تو مولاناؒ کا علم و فضل خود اس پایہ کا تھا کہ آپ اپنے اجتہاد پر عمل کر سکتے تھے۔ اور پھر غزالیؒ وغیرہ کے ایسے علماء اجل کی تحریرات آپ کے پیش نظر تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ صوفیان کرام نے سماع کو نہ صرف مباح قرار دے رکھا تھا بلکہ اس پر عامل بھی تھے۔ ان حالات میں مولاناؒ کا سماع کا اختیار کرنا کوئی عجیب امر نہیں تھا۔ مولاناؒ نے خود ایک موقع پر اس امر کو صاف کر دیا ہے کہ آپ نے سماع کا طریق نیا نہیں نکالا ہے بلکہ جو طریق سلف صالحین سے چلا آرہا تھا اس پر باحسن طریق عمل کیا ہے، چنانچہ ایک روز پروانہ نے یہ کہا کہ "حضرت مولاناؒ آئین سماع را در عالم نیکو نہاد" فرمایا کہ "حاشا کہ نہادؔ بلکہ نیکوتر داشت کردؔ"[علہ]

(۲)

اس تمہید کے بعد مولاناؒ کے زمانہ کے قبل ہی سماع کے جواز کے متعلق اہل تصوف کی طرف سے کافی بحث ہو چکی تھی اور مولاناؒ اس میں "مبدع" نہیں ہیں بلکہ جو طریق اہل تصوف میں رائج تھا آپ نے اسے اختیار کر لیا تھا، اب دیکھنا یہ ہے کہ خود آپ نے (ادر حلقان

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴۲

نے فارسی میں کیا ہے اور مطبع نولکشور میں طبع ہوا ہے لیکن وہ بعینہ ترجمہ نہیں ہے، اسمیں بہت کچھ ترمیم و حذف و اضافہ کیا ہے، کتاب کو دس باب میں تقسیم کر کے ہر باب میں دس فصلیں رکھی ہیں باب پنجم فصل نہم و دہم میں سماع کی بحث ہے۔ (صفحہ ۱۴۱-۱۸۴) [مولوی عبد الماجد صاحب نے "تصوف اسلام" صفحہ ۹۰ پر لکھا ہے کہ عوارف المعارف کے فارسی میں ایک سے زائد ترجمے نکل چکے ہیں مگر کسی ترجمہ کا نام نہیں دیا ہے اور مجھے اس ایک ترجمے کے سوا اور کسی ترجمہ کا پتہ نہیں چلا۔ ممکن ہے کہ دوسرے ترجمے مکمل ہوں، اردو میں ترجمہ "عوارف المعارف" کے نام سے مولوی ابو الحسن فرید آبادی نے

ولدؒ نے) اس بارے میں کن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، اور اس موقع پر مقصود اصلی یہی ہے :-

دیوان میں مولاناؒ نے سماع کی حقیقت اس طرح بیان فرماتے ہیں

سماع چیست زپنہانیانِ دل پیغام | دل غریب بیابد زنامشان آرام
شگفتہ گردد ازیں گرم غنچہائے کرم | کشادہ گردد ازیں زخمہ بستہائے مشام
سخن رسد ز ندائے خروش روحانی | ظفر رسد ز حسام کشندۂ بہرام
حلاوتے عجبے در بدن پدید آید .... | کہ از نے ولب مطرب شکر رسید بکام

ص ۵۶۹

دوسری جگہ سماع کے محل وموقع کے نسبت یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

سماع آرام جانِ زیرکانست | کسے داند کہ اورا جان جانست
سماع آنجا کن کانجا عروسیست | نہ ماتم کہ آنجائے فغان است
کسے کو جوہر خود راندیداست | کسے کاں ماہ از چشمش نہانست
چنیں کس را سماع ودف چہ باید | سماع از بہر وصلِ دلستانست

ص ۱۲۶

سماع کی دعوت ان الفاظ میں دی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴۵)

ترجمہ کیا ہے، ترجمہ مکمل اور نہایت صاف وسلیس ہے سماع کے چاروں ابواب کا پورا ترجمہ (صفحہ موجود ہے مطبع نولکشور میں ۱۳۰۰ھ ۱۸۹۰ء میں یہ ترجمہ طبع ہوا ہے۔

عله مناقب ص ۲۹۹

بیا بیا کہ توئی جانِ جانِ سماع | بیا کہ سروِ روانی بوستانِ سماع
اگرچہ بام بلنداست بامِ ہفتم چرخ | گزشتہ است ازاں بامِ نردبانِ سماع
بروں زہر دو جہاں آنکہ چو در سماع آئی | سماع ازانِ تو است، تو ہم ازانِ سماع
بزیر پائے بکوبم کہ ہر چہ غیر دیست | بیروں زہر دو جہانست ایں جہانِ سماع
(بیا رقند موانی ز شمس تبریزیؒ | کہ باز ماند زعشق لبش دہانِ سماع

رباعیات میں اس خیال کو بالکل صاف کر دیا ہے کہ "سماع" یہ نائے و دف نہیں ہے بلکہ وہ شے ہی دوسری ہے۔

آں چیست کز و سماعہا اثر فست | واں چیست کہ چوں رفت تجلّی بگفت
می آید دمی رود نہاں تا دانند | کیں ذوقِ سماعہا نہ از نائے و دفست

اہلِ دل کیلئے سماع کے مباح ہونے کے متعلق مولاناؒ کی ایک تقریر یہاں نقل کی جاتی ہے۔ جس سے واضح ہوگا کہ آپ سماع کو کس معنیٰ کر کے جائز رکھتے تھے۔

زین الدین عبدالمومن توقانی (جو روم کے بہت بڑے علماء میں تھے) روایت کرتے ہیں کہ مولاناؒ کے زمانہ میں قونیہ میں مولانا شمس الدینؒ ماردینی سے پڑھتا تھا، ایک روز کچھ لوگ مولانا شمس الدینؒ کے وہاں مولاناؒ کے کرامات وغیرہ کا ذکر کر رہے تھے اور میرے دل میں یہ تردد پیدا ہوا کہ ایسا شخص رقص و سماع کو کیوں جائز رکھتا ہے، دوسرے ہی روز مولاناؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا مولانا شمس الدینؒ ماردینی بھی ایک طرف سے آ رہے ہیں۔ انھوں نے آتے ہی سر جھکا کر مولاناؒ کے ہاتھ کو بوسہ دیا، میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ مولاناؒ نے میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ شرع میں ایک مسئلہ ہے اور میں جانتا ہوں کہ تم نے بھی پڑھا ہوگا، حالتِ اضطرار و مخمصہ میں حرام کھا لینا بھی جائز ہے تاکہ آدمی ہلاکت سے

بچ جائے پس مردان خدا کی ایک حالت وضرورت ہے جو اس اضطرار ومخمصہ سے مشابہ ہے اور اس کا دفع کرنا رقص وسماع اور وجد کے بغیر ممکن نہیں ورنہ تجلیاتِ انوارالٰہی سے اولیا ہلاک ہوجائیں پس مجھے معذور رکھو کہ میں بھی اسی مخمصہ میں گرفتار ہوں، زین الدین کہتے ہیں کہ مجھ پر ہیبت طاری ہوگئی اور جب حواس درست ہوئے تو میں نے مولاناؒ کے قدم پر سر رکھ دیا اور باخلاص تمام مرید ہوگیا، پھر سماع کے بغیر چین نہیں تھا۔[۱]

زیادہ صاف الفاظ میں سماع کے متعلق آپ کا قول یہ ہے کہ "شیخ کامل راچوں نماز موقت در روزۂ رمضان فرض است، ومریدان مخلص مقبل محب را سماع مباح است، چندانکہ می توانند وبرعوام الناس کہ نہ شیخ اندو نہ مرید حرام است"[۲]

ایک دوسرے موقع پر اس مفہوم کو زیادہ قطعی الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ "پہلے سماع کی اہلیت حاصل کرو پھر سماع اختیار کرو، میں نے کل گل شکر کو سونگھا تو گل کی بو نہیں محسوس ہوئی کیونکہ میں آمادہ نہیں تھا"

اول استعداد جنت بایدت   تاز جنت زندگانی زایدت[۳]

جو لوگ اس پر بھی نہ سمجھے ان کے لئے ایک مرتبہ قول فیصل یہ فرمادیا کہ "ہرچہ از مقامات مقبول نظر ما آر بما تعلق گرفت پھر اس کی مثال دی کہ قرآن شریف میں "انا ربکم الاعلیٰ" اگرچہ فرعون کا قول ہے، مگر جب خدا نے اس کا ذکر دیا تو وہ مبطل نماز نہیں رہا، کیونکہ اب اس کا تعلق خدا سے ہوگیا۔[۴]

---

[۱] مناقب ص۲۳۹

[۲] ، ص۱۱۵

[۳] ، ص۹۷   [۴] الفاص ۲۸۲

اس مسئلہ کو مولانا اور آپ کے اصحاب جس نظر سے دیکھتے تھے سلطان ولد نے نظم و نثر دونوں میں اسے پوری طرح صاف کر دیا ہے:۔

سماع بخلق ازاں حرام شد کہ بہوا و نفس مشغول اند، چوں سماع کنند آں حالت مذموم کردہ زیادہ می شود، پس سماع برچنیں قوم حرام آمد لیکن آنہا کہ عاشق و طالب حق اند چوں سماع حالت شاں را کہ طلب حقست افزوں می کند لابد کہ برچنیں قوم حلال باشد۔

از سماع آید بعاشق قوتِ جاں زاں ہمی رقصند شاداں عاشقاں

عاشقاں را ہست رہبر دف و نے می بردشاں پیش آں قیوم حے

غیر عاشق را اگر رہزن شود واں کہ عاشق را بحق رہبر بود

آپ نے اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ مولانا کے بعد آپ کے اصحاب کا سماع کو جاری رکھنا کس غرض و مقصد سے تھا، حضرت شمس کے ارشاد کے مطابق آپ کی حالت کے ترقی پذیر ہونے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:۔

"اب مریدین اس امید سے شیخ کی متابعت کرتے ہیں کہ اس برکت متابعت سے مقصود حاصل ہو، جس طرح کہ آنحضرت کی امت اگرچہ نماز کو اس طرح نہیں ادا کر سکتی جس طرح آنحضرت ادا فرماتے ہیں، لیکن آنحضرت کی محبت کی وجہ سے ظاہر کو نگاہ رکھتے ہیں تاکہ اس صورت نماز کی وجہ سے لوگ انھیں امت آنحضرت سے سمجھیں اور اس برکت سے معنی تک رسائی ہو جائے کیونکہ مجاز حقیقت کا پل ہے، پس اسی لئے ہمارے اصحاب بھی سماع کی اس صورت کو نگاہ رکھتے ہیں جو شیخ سے دیکھی تھی، ممکن ہے کہ اس متابعت کی برکت سے اپنے مقصود تک پہنچ جائیں۔"

ماند تا اکنوں بر آں سنت سماع | گشت یاراں را بہر جا اجتماع
جملگاں دیدند سر و خود دریں | شد سماع و رقص شاں آئین و دیں

غرض ان بیانات سے صاف واضح ہو گیا کہ مولاناؒ سماع کو انھیں شرائط و قیود کیساتھ جائز سمجھتے تھے جو صوفیائے کرام نے قرار دے رکھے تھے، اور آپ کے بعد آپکے مریدوں نے اسے اتباعِ شیخ کے طور پر جاری رکھا اور غرض اس سے ترقی روحانی تھی نہ کہ لہو و لعب۔

ان شرائط عام کو ملحوظ رکھتے ہوئے سماع میں مولاناؒ کی دو خاص عادتیں اور تھیں۔

ایک یہ کہ جب آپ سماع میں گرم ہوتے تو سر پٹکتے، چرخ کھاتے اور قوالوں سے لپٹ جاتے تھے اور یہ درود پڑھتے "اللھم صل علیٰ محمد و علیٰ آل محمد و بارک وسلم" پھر از سر نو شروع کرتے۔ [۱]

دوسرے یہ کہ اکثر کئی کئی دن بغیر کچھ کھائے ہوئے سماع میں مشغول رہا کرتے تھے اور اس لئے آپ کے مریدوں نے بھی یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ سماع سے قبل کھانا نہیں کھاتے تھے۔ مناقب العارفین کی روایتوں سے یہ پایا جاتا ہے کہ مولاناؒ ہی کے وقت میں یہ طریقہ ہو گیا تھا کہ جب مجلس سماع ہوتی تو کھانا ختم سماع کے بعد ہی کھایا جاتا تھا خواہ کتنی ہی تاخیر کیوں نہ ہو جائے، ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ایسے ہی معاملہ میں سلطان رکن الدین کو ناگواری ہو گئی۔ سماع کے ختم ہونے کے بعد

---

[۱] مناقب صـ ۲۴۷

دسترخوان بچھ چکا تھا کہ مولاناؒ پھر سماع میں مشغول ہو گئے اور دسترخوان اٹھ گیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ پروانہ کے وہاں مجلس سماع تھی۔ نصف شب گزر گئی اور کھانے کی نوبت نہیں آئی۔ کھانا ٹھنڈا ہو گیا، پروانہ نے شیخ محمدؒ خادم سے کہا اور شیخ محمدؒ نے چاہا کہ بطریق کنایہ مولاناؒ سے کہیں، مولاناؒ نے خود سبقت کرکے فرمایا کہ "اے امیر نہر کا پانی چکی کے قریب کب ٹھہر سکتا ہے" پروانہ نے اس تمام کھانے کو تقسیم کر دیا اور پھر سے کھانا تیار کرایا۔[۱]

سپہ سالارؒ نے بطریق کلیہ یہ لکھ دیا ہے کہ ہمارے طریق میں سماع کے وقت معدے کا خالی رکھنا ضروری ہے (در طریق اصحاب ما خلوے معدہ شرط است تا ذوقی وتلطف زیادہ گردد۔ چنانکہ حضرت خداوندگار ما میفرماید ؎

اے مرد سماع معدہ را خالی دار | زیرا چو تہیست نے کند نالہ وزار
چوں پُر کردی معدہ زادت بسیار | خالی یابی از دلبر و بوس وکنار[۲]

مولاناؒ نے جب اس ذوق وشوق کے ساتھ سماع کو اپنا طریق بنایا تو آپ کے مریدین مخلصین تو از خود بلا تکلف اس میں شامل ہو گئے، منکرین کو خاموشی کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہ آیا مگر بعض اصحاب ایسے بھی تھے کہ مولاناؒ سے خلوص واتحاد رکھنے کے باوجود ادھر قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ مولاناؒ جس میں اہلیت دیکھتے تھے اُسے کسی نہ کسی طرح شامل ہی کر لیتے تھے، قاضی عزالدینؒ (قونوی)، بھی ابتداءً سماع کے منکر تھے۔

---

[۱] مناقب ص ،
[۲] سپہ سالار ص۲۳-۲۴

ایک روز مولاناؒ اسی عالم وجد میں اپنے مدرسہ سے نکلے، قاضی صاحب کے یہاں پہونچے اوران کا گریبان پکڑ لیا اور فرمایا کہ "اٹھئے بزم خدا میں آیئے" ان کو اسی طرح کشاں کشاں لے آئے، مجلس میں بیٹھ کر قاضی صاحب پر ایسی بے خودی طاری ہوئی کہ کپڑے پھاڑ ڈالے اور صدق دل سے مولاناؒ کے ارادتمندوں میں شامل ہو گئے[1]

آخر مولاناؒ کے اس انہماک نے غیروں کو بھی اس درجہ متاثر کر دیا کہ جب مولاناؒ سماع میں مشغول ہوتے تو شمس الدینؒ ماردینی جیسے عالم متبحر بسا اوقات طبلک کو سر پر رکھ کر فرمایا کرتے تھے کہ "حقا حقا کہ تسبیح می گوید، ہر کہ می گوید کہ ایں سماع حرام است حرامزادہ است"[2]

غرض مولاناؒ نے سماع کو اختیار کیا، علانیہ اختیار کیا، اور اس میں غایت انہماک کا اظہار فرماتے رہے، مخالفتیں ہوئیں مگر دب کر رہ گئیں، مولاناؒ کے انتقال کے بعد لوگوں نے مخالفت کے فتنۂ خوابیدہ کو پھر بیدار کرنا چاہا اور بعض فقہا نے معین الدین پروانہ سے کہا کہ سماع بہر حال حرام ہے، مانا کہ مولاناؒ نے اپنے زمانہ میں روا رکھا مگر اب تو بند ہونا چاہیئے، پروانہ یہ سن کر شیخ صدر الدینؒ کے پاس گیا اور اس معاملہ میں ان کی رائے دریافت کی، انھوں نے فرمایا کہ اگر میری بات مانو اور درویشوں کے قول پر اعتماد ہو اور مولاناؒ کے ساتھ اعتقاد راسخ رکھتے ہو تو اس باب میں کچھ بھی مداخلت نہ کرو، کیونکہ یہ بھی ایک طرح پر اولیاء اللہ سے اعتراض کرنا ہے

---

[1] مناقب ص۸۷

[2] " ص۱۲۳

اور یہ نامبارک ہے [1]

اخی محمد نے ایک روز علاء الدین سے کہا کہ میں نے ایک خروار (انبار) کتابیں پڑھی ہیں۔ ان میں اباحت سماع کا کہیں ذکر تک نہیں ہے، تم لوگوں نے یہ بدعت کس دلیل سے اختیار کر رکھی ہے۔ علاء الدین نے جواب دیا کہ اخی صاحب نے خروار (گدھے کی طرح) پڑھا ہے اس لیے انھیں پتہ نہیں چلا۔ میں نے عیسیٰ وار پڑھا ہے، اس لئے اس راز سے واقف ہو گیا ہوں [2]

فصل سوم میں شیخ صلاح الدینؒ کے حالات میں بیان ہو چکا ہے کہ آپ نے مرتے وقت وصیت فرمائی تھی کہ میرے جنازے کے ساتھ ساتھ گویندگان ہوں اور آپ کے حسب وصیت عمل ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد سے مولاناؒ کے طریق میں یہ دستور ہو گیا تھا کہ جنازے کے ساتھ بھی سماع ہوا کرتا تھا، شیخ نے اس کی وجہ اپنی وصیت میں بیان فرمادی تھی اور سلطان ولدؒ نے اسے رباب نامہ میں واضح کر دیا ہے۔ اب خود مولاناؒ کی تصریح بھی ملاحظہ ہو۔

ایک روز کچھ لوگوں نے مولاناؒ سے یہ سوال کیا کہ زمانہ قدیم سے یہ ہوتا آیا ہے کہ جنازے کے آگے آگے قاری اور مؤذن ہوا کرتے تھے۔ اب جناب کے اس زمانہ میں گویندوں کا جنازے کے آگے آگے ہونا کس وجہ سے ہے؟ علماء و فقہا اسے برا سمجھتے ہیں اور اسے بدعت قرار دیتے ہیں، فرمایا کہ جنازے کے آگے مؤذن و قاری و حفاظ یہ گواہی دیتے

---

[1] مناقب ۲/۲۳۲ د صـ۳۴۷

[2] ایضاً ، صـ۱۲۵

ہیں کہ یہ میت مومن ہے اور ملت .... اسلام میں وفات پائی ہے ہمارے قوال بھی گواہی دیتے ہیں کہ یہ میت مومن تھا، مسلمان تھا اور ساتھ ہی عاشق بھی تھا، اس کے سوا دوسری بات یہ بھی ہے کہ روح انسانی سالہا سال زندان دنیا، چاہ طبیعت اور صندوق بدن میں قید تھی ناگاہ بفضل خدا اسے اس قید سے خلاصی حاصل ہوئی، اور وہ اپنے اصلی مرکز کو پہنچ گئی، پس کیا یہ خوشی، سماع اور شکر کا مقام نہیں ہے کہ وہ اس طرح شاداں و فرحاں رب العزت کی طرف روانہ ہو اور دوسروں کو بھی جانبازی کی رغبت ہو[1]

ربابـــــ :۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ رباب کو مولاناؒ کی ذات کے ساتھ خصوصیت خاص حاصل تھی، پس "سماع" کے بعد کچھ ذکر رباب کا بھی ہونا چاہیے کیونکہ یہ مولاناؒ کے مختصات میں تھا، سلطان ولدؒ نے اپنی مثنوی کو رباب کے ذکر سے شروع کرنے کی وجہ یہی لکھی ہے کہ "جہت آنکہ رباب بحضرت مولاناؒ قدسنا اللہ بسرہ العزیز مخصوص و منسوب است ایں مثنوی از رباب آغاز کردہ شد"

خود مولاناؒ نے اپنی اس "رباب نوازی" کی نسبت ایک مرتبہ بطریق مطائبہ یہ فرمایا کہ "میں نے تمام مراتب کو علماء و فقہا کیلئے ترک کر کے کنجِ تنہائی اختیار کی ہے،

---

[1] مناقب ص۱۳۸

رباب بھی اگر ان کے کام کا ہوتا تو انھیں کو دیدیتا اگر چونکہ اس غریب کی وہاں پرسش نہیں ہے اس لئے میں نے یہ غریب نوازی کی ہے کیونکہ غریب نوازی مردوں ہی کا کام ہے" علہ

اس مفہوم کو زیادہ عام پیرایہ میں خود رباب کی زبان سے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے،

ہیچ میدانی چہ میگوید رباب	زاشک چشم واز جگر ہائے کباب
ما غریبانِ فراقیم اے شہاں	بشنوید از الی اللہ المآب
ترک دردی وعرب گر عاشقند	ہم زبانِ اوست ایں بانگِ رباب

ص ۱۱۱

غزلوں میں رباب کی ثنا وصفت خوب دل کھول کر کی ہے، یہاں ایک غزل کے دو شعروں میں پہلا شعر مطلع ہے اور دوسرا اس کے بعد کا شعر ہے اس لئے وہ بھی بمنزلہ رباعی ہی کے ہے (اور مولانا کے رباعیات میں ایک کثیر تعداد رباعیوں کی اسی طرح جمع ہو گئی ہے۔

رباب مشرب عشقست ومونسِ حباب	کہ ابر را عربیاں نام کردہ اند رباب
چنانکہ ابر سقائے گل وگلستانست	رباب قوتِ ضمیر است ساقی الباب

ص ۱۱۵

رُباعی

اے بانگ رباب از کجا می آئی	پر آتش و پر فتنہ و پر غوغائی
جاسوس دل و پیک آں صحرائی	اسرار دلست ہر چہ میفرمائی

علہ مناقب ص ۱۰۲

رباب کے ساتھ مولاناؒ کی دلبستگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے بعض مخصوص احباب کو "ربابی" کے لفظ سے مخاطب فرماتے تھے۔

رو آں "ربابی" را بگو مستاں سلامت میکنند   واں مرغ آبی را بگو، مستاں سلامت میکنند

انہماک کا اندازہ اس فرمائش سے ہو سکتا ہے کہ

مطربا بگذرز مانے از عراق واز حجاز   در صفاہان باش امشب تا سحر میزن رباب

ص ۱۰۹

اس کہنے کی کوئی حاجت ہی نہیں ہے کہ مولاناؒ نے جب رباب پر اس درجہ "نوازش" کی ہوگی تو علمائے ظاہر ضرور اس کے خلاف ہو گئے ہونگے مگر مولاناؒ بھی "رباب" کی حمایت میں سرگرم رہا کرتے تھے، سلطان ولدؒ کی روایت ہے کہ ایک روز لوگوں نے میرے والدؒ سے کہا کہ رباب کی آواز بھی عجب آواز ہے، فرمایا کہ رباب بہشت کی آواز ہے، سید شرف الدین نے کہا کہ ہم بھی سنتے ہیں، مگر ہم پر تو یہ اثر نہیں ہوتا۔ فرمایا کہ جس طرح ہم سنتے ہیں وہ دروازے کے کھلنے کی آواز ہے اور جس طرح آپ سنتے ہیں وہ دروازے کی بند ہونے کی آواز ہے۔ [۱]

اسی زمانہ میں بعض علماء رباب کی تحریم کے بارے میں بہت کچھ قیل و قال کرنے لگے تھے۔ مولاناؒ کو جب یہ خبر ملی تو فرمایا کہ "سرد لوہا کوٹ رہے ہیں، واللہ ثم واللہ کہ انھیں قبر پر رباب بجا دینگے" اس حکایت کے راوی شمس الدین اور فخر الدین کا بیان ہے کہ واقعی ایسا ہی ہوا، [۲]

---

[۱] مناقب ص ۲۹۰   [۲] ایضاً ص ۲۴۰

معین الدین پروانہ چاہتا تھا کہ (دلدمان وزیر) کو تونیہ کا قاضی بنائے، انھوں نے اس منصب کو قبول کرنے کے لئے تین شرطیں پیش کیں اول یہ کہ رباب کا بجانا بند کر دیا جائے، پرانے چپراسی نکال دیے جائیں اور نئے چپراسیوں کو حکم دیا جائے کہ لوگوں سے کچھ لیں نہیں، پروانہ نے کہا کہ دو شرطوں کو تو منظور کر سکتا ہوں مگر رباب کو نہیں اٹھا سکتا، کیونکہ یہ ایک بڑے شخص کی وضع ہے، انھوں نے عہدۂ قضا کو قبول نہیں کیا، یہ واقعہ جب مولانا کے سمع مبارک تک پہنچا تو فرمایا کہ رباب بھی کیا مبارک شے ہے، خدا کا شکر ہے کہ رباب نے ان کی دستگیری کی اور جنگ قضا سے رہائی دلائی، عاقبت الامر عالم موصوف کی تمام اولاد مولانا کی مرید ہو گئی[1]

اس قسم کے تعرضات کم و بیش جاری رہے مگر مولانا کے اثر کی وجہ سے سلطنت کی طرف سے رباب پر کوئی قید عائد نہیں ہوئی، مولانا کی زندگی ہی میں ایک مرتبہ تمام علما قاضی سراج الدین ارموی کے پاس گئے، اور شکایت کی کہ لوگوں میں استماع رباب کی رغبت بڑھتی جاتی ہے اور مولانا رئیس علما اور سرور فضلا ہیں کیوں اسے جائز رکھتے ہیں۔ قاضی سراج الدین نے فرمایا کہ "یہ مرد مردانہ موید من عنداللہ ہے اور تمام علوم ظاہر میں عدیم المثال ہے، اس سے الجھنا ٹھیک نہیں ہے"[2]

مولانا کے انتقال کے بعد پھر کچھ لوگوں نے قاضی سراج الدین کے محکمہ میں ایک بڑا مجمع کیا، حضرت چلپی حسام الدین کو بھی بلایا اور کہا کہ رباب حرام ہے اور سماع جائز نہیں ہے، قاضی سراج الدین نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا اور حضرت

---

[1] مناقب ص ۲۴۶ [2] ایضاً ص ۱۰۳

چلپی حسام الدینؒ سے پوچھا کہ آپ کیا کہتے ہیں، فرمایا کہ میں یہ کہتا ہوں کہ عصائے موسیٰ آپ لوگوں کو چوب خشک نظر آتا ہے یا اژدہا۔ کسی نے کچھ جواب نہ دیا، فرمایا کہ ہمارا رباب بھی اس وقت تک محض لکڑی تھا، جب تک کہ مولاناؒ نے اسے اختیار نہیں کیا تھا، مولاناؒ کے ہاتھ میں پہونچکر اژدہا ہو گیا، اس بارے میں گستاخی و دلیری کرنا مناسب نہیں ہے۔ مبادا ایک نفس میں سب ہلاک ہو جائیں، سب لوگ خاموش ہو گئے اور پھر کسی نے کچھ نہ کہا۔

مولاناؒ نے رباب میں ایک جدت یہ کی تھی کہ اس کے چھ خانے کر دیئے تھے تاکہ اس سے ہر شش گوشہ عالم کی شرح ہو۔ عله

غرض سماع و رباب کو مولاناؒ نے جو اپنا آئین و طریق بنایا تو تمام تغیرات زمانہ کے باوجود آج تک اسی طرح سے جاری ہے اور توقع ہے کہ جاری رہے گا۔ ع

نیکو داں رفتند و سنتہا بماند

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ سلطان ولدؒ نے اپنی مثنوی کا آغاز رباب سے کیا ہے، مناسبت موقع کے لحاظ سے اس کے چند شعر درج کر دینا بے محل نہ ہوگا۔

بشنوید از نالہ و بانگِ رباب — نکتہائے عشق در ہر گونہ باب

با فغان و نوحہ گویاں دائما — اے خدا وائے خدا وائے خدا

. . . .

عله فرمودند کہ رباب را شش خانہ ساختند چہ از قدیم العہد رباب چار سو بودہ دفر مود شش گوشہ رباب ما شارح ہر شش گوشہ عالم است والف تار رباب بیین" بالف ارواح است بالف (مـ ۲۱)

صد ہزاراں این چنیں تسبیحہا — می سراید گاہ نالہ در ہوا
بے زباں ذکر خدا گوید نہاں — نشنود آں ذکر را جز عارفاں

....

چوں کنند اشیا ہمہ تسبیح ہو — از تر و از خشک و از سفل و علو
ہم شی است آخر رباب و چوب و پوست — آہن و ابریشم و موکند او ست
حمد باری میکند اندر نوا... — گوش کن تسبیح ہر یک را جدا
از ہمہ تسبیح بشنو بے سخن! — گر رسیدت از خدا علم لدن!
چوں نداری گوش سر در جاں نہاں — نشنوی از وے بجز بانگ و فغاں

آخر میں مولاناؒ کے مسلک و سلسلہ کے متعلق چند الفاظ لکھ کر اس فصل کو ختم کیا جاتا ہے۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ سلسلہ کے اعتبار سے مولاناؒ حضرت احمدؒ غزالی کے سلسلہ میں داخل تھے۔ سماع کا طریقہ بھی کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے جسے خاص طور پر مولاناؒ نے جاری کیا ہو۔ البتہ آپ جس کثرت سے سماع میں مشغول رہتے تھے، یہ عالم دوسری جگہ کم نظر آتا ہے، ایک رباب ایسی شے ہے جسے مولاناؒ کی ذات کے ساتھ اختصاص ہے مگر یہ بھی اس سے زیادہ نہیں ہے کہ آپ نے ایک خاص آلۂ سرود کو پسند کر لیا تھا، ورنہ آلات مزامیر صوفیہ میں پہلے بھی مستعمل تھے اور اب بھی مستعمل ہیں، اوراد و اشغال کے متعلق بھی مولاناؒ نے کوئی خاص طریقہ اختیار نہیں کیا

چند اقوال یہاں نقل کئے جاتے ہیں جن سے یہ واضح ہو سکے کہ آپ کا میلان کن خاص ریاضتوں کی طرف زیادہ تھا۔ اگر کوئی چاہے تو اسی کو مولاناؒ کا خاص طریق سمجھ لے

ایک روز معین الدین پروانہ نے مولاناؒ سے سوال کیا کہ تمام درویشوں نے ایک نہ ایک ذکر معین کر لیا تھا کوئی لا الہ الا اللہ کا کوئی لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم کا، کوئی سبحان اللہ وبحمدہ کا شغل رکھتا تھا، حضرت کا طریقہ ذکر کیا ہے، فرمایا "اللہ اللہ" کیونکہ ہم اللہیان میں سے ہیں اللہ سے آئے ہیں اللہ کی طرف جائیں گے، مازادهٔ ذاتیم سوے ذات رویم عـه

یہ بھی فرمایا کہ میرے والد بہاءالدین ولد بھی ہمیشہ اللہ سے اور اللہ کی کہتے تھے اور ذاکر اللہ تھے، کیونکہ تمام انبیاء و اولیا کے لئے ایک نہ ایک خاص نام سے تجلی فرمائی ہے اور ہم محمدیوں کے لئے اسم اللہ سے تجلی فرمائی ہے، تمام اسماء کا جامع ہے۔

ایک غزل میں اپنے مسلک کی طرف اشارہ کیا ہے، پوری غزل دیکھنے کے قابل ہے یہاں صرف تین شعر دیئے جاتے ہیں ؎

ما عاشق آئیم بے ترز بے بنا ہیم	بے منزل و براہیم با عاشقاں خبر کن
بیروں ز کفر و دینیم، برتر ز صلح وکینیم	نہ در فراق و وصلم، رو نام ما دگر کن
ما رحمت داما نیم، ما جان جان جانیم	بیروں ز ہر گمانیم، با ماز خود سفر کن

۹۔ ص ۱۶۹

محمود عرب کی روایت ہے کہ مولاناؒ دیوار مدرسہ سے سر مبارک کو لگا کر رات کو دیر تک بلند آواز سے اللہ اللہ کیا کرتے تھے، عـه

عـه مناقب ص ۱۴۹

عـه ، ص ۱۷۰

قاضی عز الدینؒ (قونیہ) قاضی عز الدین (اماسیہ) و قاضی عز الدین (سیواس) رحمہم اللہ تعالیٰ تینوں مولاناؒ کے اصحاب کبار میں سے تھے: ایک روز ان اصحاب نے مولاناؒ سے پوچھا کہ آپ کا طریق کیا ہے، فرمایا کہ قل ہٰذہ سبیلی ادعوا الی اللہ و علی بصیرۃ من اتبعنی ؎۱

لیکن یہ خاص مولاناؒ کا اپنا عمل تھا، دوسروں کو اس کا پابند نہ کرتے تھے "فیہ مافیہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اپنے مریدوں کے لئے تخصیص کے ساتھ کسی خاص ذکر یا شغل کو معین نہیں کرتے تھے بلکہ اسے لوگوں کے ذوق پر منحصر رکھتے تھے، فرمایا ہے کہ خود اپنے کو آزماؤ کہ گریہ و خندہ، صوم و صلوٰۃ، جلوت و کثرت کس چیز سے زیادہ نفع پہنچتا ہے اور کونسا طریق تمہاری حالت کے مطابق آتا ہے اور اس میں ترقی ہوتی ہے، اسی کو اختیار کرو، استفت قلبک ولو افتاک مفتیون ؎۲

اس ذکر خاص کے بعد مولاناؒ کا دوسرا مخصوص عمل کم کھانا تھا، ایک روز سلطان ولدؒ سے فرمایا کہ اگر لوگ تم سے پوچھیں کہ مولاناؒ کا طریق کیا ہے تو کہہ دو "ناخوردن" پھر فرمایا کہ نہیں بلکہ کہو "مردن" ؎۳

ایک مرتبہ قطب الدین شیرازی نے مولاناؒ سے سوال کیا کہ "راہ شما چیست" فرمایا کہ راہ ما مردن و نقد خود را بآسمان بردن، تا نمیری، نرسی" ؎۴

؎۱ مناقب ص۸۰

؎۲ فیہ مافیہ ص۳۰

؎۳ مناقب ص۱۲۰ ؎۴ ایضاً ص۱۰۹

ایک روز فرمایا کہ آدمی کے وجود "جسم" میں تین ہزار سانپ ہیں، ایک لقمہ سے ایک ہزار سانپ زندہ ہو جاتے ہیں اور ایک لقمہ کم کرنے سے ایک ہزار سانپ مر جاتے ہیں، خدائے تعالیٰ مجھے اور میرے دوستوں کو کم کھانے اور کم بولنے اور کم سونے کی توفیق دے۔ (کم خوردن و کم گفتن و کم خفتن) ع۱

خلاصہ یہ کہ مولاناؒ نے اپنے طریق کے لئے نہ اذکار و اشغال کے خاص طریقے مقرر فرمائے اور نہ اپنے سلسلے کے لئے اصول و فروع قرار دیکر اس کا انضباط کیا، صرف پیروی سنت نبوی کی غرض رکھی اور اس مقصد عظمیٰ کے لئے علائق دنیاوی کی کمی اور تزکیہ نفس و تصفیہ قلب کے لئے جو امور ضروری تھے اُن پر خود عمل کیا اور اپنے مریدوں کو اس کی ہدایت کی۔ سماع و رباب کو اس مقصد کا معاون سمجھ کر اختیار کیا۔

انضباط سلسلہ

آپ کے بعد اور بالخصوص سلطان ولدؒ کے زمانہ خلافت (۶۸۳ھ – ۷۱۲ھ) میں یہ سلسلہ دور دراز مقامات تک پھیلایا ع۲

ع۱ ایضاً ص۲۰۵

ع۲ خلفا ساخت در طریق پدر — کرد در ہر مقام یک سرور

……

خلفا شدند اندر روم — تا نماند کسے زناکے دوم

روم چوں ہمہ جہاں پُر شد — قطرۂ جملہ زیں عمان در شد

اور مولاناؒ کے پوتے امیر عارفؒ نے کچھ تو اپنے والد (سلطان ولدؒ) کی زندگی ہی میں اور زیادہ تر آپ کے بعد اطراف و جوانب میں بکثرت سفر کر کے اس سلسلہ کو نہایت درجہ منضبط و مستحکم کر دیا، اس کے بعد سے اس وقت تک تمام ممالک روم میں یہی سلسلہ سب سے زیادہ کثیر الشیوع اور سب سے زیادہ با اثر رہا یہ کہنا کچھ بیجا ہوگا کہ جس طرح سلطنت کا مسلمہ مذہب ظاہری حنفی رہا، اسی طرح سلطنت کا مسلمہ مسلک باطنی مولویہ رہا ہے،

مولاناؒ کے بعد بتدریج اس سلسلہ کے ضوابط و قواعد نہایت جزوی حد تک معین ہو گئے،

شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ "میں نے سفر کے زمانہ میں اس فرقہ کے اکثر جلسے دیکھے ہیں، یہ لوگ نمد کی ٹوپی پہنتے ہیں جس میں جوڑ یا درز نہیں ہوتا، مشائخ اس ٹوپی پر عمامہ بھی باندھتے ہیں، خرقہ یا کرتہ کے بجائے ایک چنٹ دار جامہ ہوتا ہے، ذکر و شغل کا یہ طریقہ ہے کہ حلقہ باندھ کر بیٹھتے ہیں، ایک شخص کھڑا ہو کر ایک ہاتھ سینہ پر اور ایک ہاتھ پھیلائے ہوئے رقص شروع کرتا ہے، رقص میں آگے یا پیچھے بڑھنا یا ہٹنا نہیں ہوتا بلکہ ایک جگہ جم کر متصل چکر لگاتے ہیں۔ سماع کے وقت دف اور نے بھی بجاتے ہیں لیکن سماع کی حالت نہیں دیکھی" [۱] دیگر بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ سماع میں ایک جگہ جم کر رقص نہیں کرتے بلکہ

---

[۱] سوانح مولانا روم ص۳۔ میں مصنف نے جو حالات اپنے چشم دید بیان کئے ہیں بعینہ یہی الفاظ ازین عابدین کے بھی ہیں "لباس خواص خصوص درویشان است و تاج نمدی بے درز بر سر گزارند و مشائخ ایشان عمامہ نیز بران تاج بہ بندند .... در ہنگام سماع نے و دف میزنند ص۹۸

چکر لگاتے ہیں اور اس وقت میں جو کھلا پیرہن (یعنی فرجی) پہنتے ہیں اسے "تنور" کہتے ہیں۔

سلسلہ میں داخل ہونے کا قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص اس سلسلہ میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اسے ایک ہزار ایک یوم خدمت کرنا پڑتی ہے۔ چالیس دن چار پایوں کی خدمت کرتا ہے، چالیس دن فقرا کے دروازہ پر جھاڑو دیتا ہے، چالیس دن آبکشی کرتا ہے، چالیس دن فراشی، چالیس دن ہیزم کشی، چالیس دن طباخی، چالیس دن بازار سے سودا سلف لاتا ہے، چالیس دن فقرا کی مجلس کی خدمتگاری، چالیس دن داروغہ گری۔ جب یہ مدت پوری ہو چکتی ہے تو غسل دیا جاتا ہے۔ اور تمام محرمات سے توبہ کرا کر حلقہ میں داخل کر لیا جاتا ہے، اس کے ساتھ خانقاہ سے لباس ملتا ہے اور اسم جلالی کی تلقین کی جاتی ہے علہ

یہ کل (۳۶۰) دن ہوتے ہیں یعنی ایک سال اس طرح جسمانی خدمت کرنا پڑتی ہے، بقیہ ایام دوسرے ریاضات روحانی انجام دینے ہوتے ہیں" زین العابدین نے اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ ان خدمات میں سے اگر کسی خدمت میں ایک دن بھی نقص پڑ جاتا ہے تو اس خدمت کو پھر سے شروع کرنا پڑتا ہے۔

یہ سلسلہ اُس وقت تک جس شان سے جاری ہے اس کی نسبت زین العابدین کے الفاظ یہ ہیں۔

علہ دیباچہ مثنوی شریف نوشتہ زین العابدین صہ ۹ سوانح مولانا روم صہ ۲۹ لیکن سوانح میں ایک ہزار ایک یوم درج نہیں ہے۔

"پوشیدہ نماند کہ سلسلۂ مولوی علیہ الرحمۃ در بلاد روم و شام و مصر و عرب و جزائر بحر روم و دیار روم ایلی و قرم و عراق عرب جاری و معمول است دور نزد و خورد و کلان و اعیان و دانا و نادان و حاجب و سلطان مقبول است۔"[1]

---

[1] دیباچہ مثنوی شریف نوشتہ زین العابدین ص ۸ ،

ضمیمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"در بیان آنکہ حضرت والد مولانا قدس اللہ سرہٗ از زمانِ بلوغ ہموارہ سہ روزہ داشتے وچوں بعد از سہ روز طعام خوردے آں را نیز استفراغ کردے شب ہمہ شب در نماز می بودے، بر سیرت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تا آں زماں کہ قطب الاقطاب مولانا شمس الدین تبریزی عظم اللہ ذکرہٗ بوے رسید پیش از قدومش ہرگز در سماع شروع نکردہ بود و آں تجلیہا و مقامات کہ ہیچ دلی را نبود در صورت نماز و تقوی از حق بوے می رسید وچوں مولانا شمس الدینؒ را دید بنظر بصیرت کہ معشوق سلطان اولیاست و بالائے او کس نیست عاشق و مرید او شد، ہر چہ او فرمودے آں را غنیمت داشتے و از جان و دل مطیع او گشتے، پس اشارت و امرش کرد کہ در سماع

در آکہ آنچہ می طلبی در سماع زیادہ خواہد شدن ۔ سماع بر خلق از آں حرام شد کہ بہوا و نفس مشغول اند، چوں سماع کنند آں حالت مذموم کردہ زیادہ می شود، پس سماع بر چنیں قوم حرام آمد لیکن آنہا کہ عاشق و طالب حق اند چوں سماع حالت شاں را کہ طلب حق ست افزوں می کند لابد کہ بر چنیں قوم حلال باشد پس امتثال امر او کرد و در سماع در آمد ۔ حال خود را چناں دید کہ شیخ فرمودہ بود بعد از اں باقی عمر ملازم سماع بود و آں را طریق و آئین ساختہ بود، اکنوں مریدان نیز متابعتِ شیخ خود می کنند بامید آنکہ ببرکت آں متابعت مقصود حاصل شود، چنانکہ امتان مصطفی صلعم اگرچہ نماز را بداں کہ پیغمبر می کرد نمی توانند کردن لیکن از محبتے کہ دارند بہ پیغامبر آں صورت را نگاہ میدارند کہ خلق ایشان را از امت او دانند بدیں صورت نماز کہ می کنند، شاید کہ برکت آں معنی برسند کہ المجاز قنطرۃ الحقیقۃ ۔ پس یاراں نیز صورت سماع را کہ از شیخ خود دیدہ اند نگاہ میدارند، باشد کہ ببرکتِ آں متابعت بمقصود برسند ۔

پیشتر از وصل شمس الدین بجاں
بود در طاعات روزان و شباں

سال دمہ پیوستہ آں شاہِ گزیں
بود مشغولِ علوم و زہد و دیں!

آں مقاماتش از اں درزش رسید
با تقی و زہد و رہ را می برید

اندراں مظہر بدش جلوہ زحق
ہر دمے می برد از حق نو سبق

چونکہ دعوت کرد او را شمس دیں
در سماعے کہ بداں پیشش گزیں

چوں در آمد در سماع از امرِ او
حالِ خود را دید صد چنداں زہو

شد سماعش مذهب و راه درست　　از سماع اندر دلش صد باغ رست
هم شدند اصحاب مشغولِ سماع　　تا شد ایشان را بران ره اطلاع
ماند تا اکنون بران سنت سماع　　گشت یاران را بهر جا اجتماع
جملگان دیدند سودِ خود درین　　شد سماع و رقصِ شان آئینِ دین
از سماع آید بعاشق قوتِ جان　　زان همی رقصند شادان عاشقان
عاشقان را هست رهبر دف و نے　　می برد شان پیش آن قیوم حے
غیر عاشق را اگر رهزن شود　　وان که عاشق را بحق رهبر بود

. . . .

. . . .

نیست این را آخرے گردیم باز　　سوے قمرِ شمس دینِ سرفراز
گشت غائب زین جهان خاکدان　　بے بدن اندر جهانِ جاودان
شد انیسش بعد از [illegible] دگر　　کز بدش از سرِ مولانا خبر
شد صلاح الدین زبعدِ شمس دین　　گشت او را اندران ورزش معین
حال و قالش از وجودش می فزود　　سرهاے نادر از وے می شنود
بعد ازو شد هم حسام الدین ترک　　آنکه بود اندر بقا شاهِ سترگ
می شدند از همدگر در ارتقا　　یکدگر را سوے آن سر رهنما
رتبتِ ایشان نیاید در بیان　　زانکه بود بحرِ ایشان بیکران
هر یکے او را امام و قبله بود　　بر مشائخ مدحِ ایشان می فزود
دائما در مدحِ شان مشغول بود　　امرِ ایشان پیش او مقبول بود

. . . .

. . . .

ہمچنیں عشقِ شمس دیں را شیخ — روز و شب می نمود پیدا شیخ

برگزیدن مولانا قدسنا اللہ بسرہ العزیز بعد از شمس الدین تبریزی شیخ صلاح الدین زرکوب را عظم اللہ ذکرہما۔

درچنیں جوش یک مرید از و — یافت قربت، سوار گشت نکو
چہ سوار و امیر بل شد شاہ — گشت حاکم بمنزل و بر راہ
رہرواں زو شدہ ببرگ و نوا — اہل منزل از و ببردہ عطا
در وصالِ خدا قوی کامل — نظرش کردہ سنگ را قابل
قطب ہفت آسمان و ہفت زمیں — لقبش بود شہ صلاح الدین
نور خور از رخش خجل گشتے — ہر کہ دیدیش ز اہلِ دل گشتے
چوں ورا دید شیخ صاحب حال — برگزیدش ز زمرۂ ابدال
رو بدو کرد و جملہ را بگذاشت — غیر او را خطا و سہو انگاشت
گفت آں شمس دیں کہ می گفتیم — باز آمد بما چرا خفتیم
او بدل کرد جامہ را و آمد — تا نماید جمال و خرامد

. . . .

نیست ایں را کرانہ اے دانا — شرح کن تا چہ گفت مولانا
گفت از درد سے صبا یاراں — نیست پروائے کس مرا بجہاں

من ندارم سرِ شما بر دید　　　از برم با صلاحِ دین گردید
سرِ شیخی چو نیست در سرِ من　　　نبود هیچ مرغ ہمپرِ من
خود بخود من خوشم نخواہم کس　　　پیش من زحمت است کس چو مگس
بعد ازیں جملہ سوئے او پویند　　　ہمہ از جان وصالِ او جویند
تا چو او جملہ راہ راست روید　　　بہ زگندم شوید، اگرچہ جوید
گندم چہ کہ زو شوید گہر　　　گرچہ کورید از و برید نظر
زانکہ دارد بخلق او میلان　　　جلوہا میکند گہ جولان!

. . . .

ایں چنیں سد شداست طالب شاں　　　لیک حرص و ہواست غالب شاں
ہست حرص و ہوا حجاب خدا　　　ترک حرص و ہوا کنید چو ما
بنگرید اندراں جمال لطیف　　　گر نہ آید از ضلال و کفر کثیف

. . . .

پس ولد را بخواند مولانا　　　گفت در بابِ چون توئی دانا
سر نہاد و سوال کرد از و　　　چیست مقصود ازیں بہ بندہ گو

گفت بنگر رخِ صلاح الدینؒ — که چہ ذاتست آں شہِ حق بیں
مقتدائے جہان جانست او — ملک ملک لامکانست او
گفتم آرے ولیک چوں تو کسے — بیند او را نہ ہر حقیر و خسے
گفت با من کہ شمس دینؒ اینست — آں شہِ بے براق و زین اینست
گفتمش من ہماں ہمی بینم — غیر آں بحر جاں نمی بینم
ز دل و جاں کمیں غلامِ ویم — مست و بیخویشتن ز جامِ ویم
ہرچہ فرمائیم کنم من آں — ہستم از جاں غلامت ای سلطاں
گفت ازیں پس صلاح دینؒ گیر — آں شہنشاہ راستیں را گیر
نظرش کیمیاست بر تو فتد — رحمتِ کبریاست بر تو فتد

. . . .

گفتمش من قبول کردم ایں — کہ شوم بندۂ صلاح الدینؒ
بکشتم خاک پاش در دیدہ — تا ازاں نور حق شود دیدہ
رو نہادم بوے بصدق و نیاز — بندۂ او شدم بعشق و نیاز
کرد بر من نظر چو دیدہ مرا — ہستم او را غلام در دو سرا

. . . .

جان من بود قطرہ دریا شد — دلم از پست سوئے بالا شد
فکرہا در زماں مصور گشت — روحِ صافی بشکلِ پیکر گشت

. . . .

باز گردم بشہ صلاح الدینؒ — سرورِ اولیا و قطبِ زمیں

در بیان آرام گرفتن حضرت مولانا قدس الله سرهٗ با شیخ صلاح الدین زرکوب قدس الله سرهٗ واز طلب شمس الدین تبریزی عظم الله ذکره باز آمدن وفوائد پرموائد بردن مریدان از صحبت هر دو وحسودی بعضے چنانکه درحق مولانا شمس الدین داشتند دشمنی آغاز کردن

شورش شیخ گشت ازو ساکن — واں ہمه رنج وگفت وگو ساکن
زانکه بد نوع دیگر ارشادش — بیشتر بود از ہمه دادش
انچه از اولیا بردے کس — سالہا می رسید ازو بنفس
بے لب وکام سرّہا گفتے — درّجاں بے زباں ہمی سفتے
خلق را فائده رسانیدے — گوش ازاں حرف وصوت نشنیدے

. . . .

(چنانکه) شیخ با او چنانکہ باآں شاه — شمس تبریز خاص خاص اله
خوش درآمیخت ہمچو شیر وشکر — کار ہر دو زہمد گرشد زر
نظر شیخ جملہ بردے بود — غیر او نزد شیخ لاشے بود
نه نشستے بہیچ کس جز او — چشم را برندا شتے زن رو
باز در منکراں غم وافتاد — باز درہم شدند اہل فساد
(زانکه) باز آغاز کرد جوشش حسد — زانکہ بودند غرق نفس وجسد
گفته با ہم کزآں یکے رستیم — چوں نگه می کنیم در شستیم
اینکه آمد زاولیں بترست — اولیں نور بود ایں شرراست

داشت او ہم بیان و ہم تقریر فضل و علم و عبارت و تحریر
پیش ازیں خود نبود کاں شہ ما بود ازو بیشتر بعلم و صفا
حیف می آید عجیبں کہ چرا چو بد آں شیخ پیش کمتر را
کاش کاں اولینہ بودے باز شیخ مارا رفیق و ہم دمساز
بند از قونیہ بد از تبریز بود جاں پرور و نبد خوں ریز
ہمہ ایں مرد را ہمی دانیم ہمہ ہر شہریم و ہم خوانیم
خرد در پیش ما بزرگ شدست او ہمانست اگر سترگ شدست
نہ ورا خط و علم و نے گفتار بر ما خود نداشت او مقدار
علمائے مھن و سادہ و نادل پیش او نیک و بد بدہ یکساں
دائما در دکاں بدے زرکوب ہمہ ہمسائگاں ازو در کوب
نتواند درست فاتحہ خواند گر کند زو کسے سوالے ماند
باچنیں کس کہ عالمست از حق دم بدم می دہد خداش سبق
باچنیں کس کہ چشمۂ نوراست خیرہ بر دوش جنت حوراست

. . . .

دل مردہ ز نور او زندہ گشتہ او شاہ ہر کمیں بندہ
آں کسانیکہ منکراں بودند کور و کر چوں کہ گراں بودند
گفتہ صد چیز کاں نمی باید کردہ صد کار کاں نمی شاید
خاص خاص خدائے را عامی خواندہ آں قوم جاہل از خامی
خوار دیدہ عزیز یزداں را آب و گل گفتہ آں دل و جاں را

از غرض او را بنقص کرده نظر　　جان جاں را شمرده چوں پیکر
دیده او را بجز نویش غرّه و شر　　ملکے را نهاده نام بشر
گفته بسیار زسے و ناف از کیں　　بے ادب پیش و پس چناں و چنیں
زابلهی از چنیں گزیں سلطاں　　گشته سرکش چو از خدا شیطاں
معدنِ علم را ز غایتِ جہل　　خوانده نااہل ہر خرِ نااہل
ایں ندانسته آں خسانِ پلید　　که حجابِ رہ است گفت و شنید

. . . .

زیں نمط فحشہائے زشت و درشت　　گاه گفته بروش گه پس پشت
جمله را رائے ایں چنیں افتاد　　که چو ز اسپ مراد زیں افتاد
سر نبازیم و زنده اش نهلیم　　چوں ازو جاں فگار و خسته دلیم
همه گشتند جمع در جائے　　که جز ایں نیست ماں گزیں رائے
که ورا از میانه برگیریم　　عشقِ آں شاه را ز سر گیریم
همه سوگندہا بخورده کزیں　　هر که گردد یقیں بود بیدیں
یک مریدے برسمِ طنازی　　شد از ایشاں و کرد غمازی
او هماں لحظه نزدِ مولانا　　آمد و گفت آں حکایت را
که همه جمع قصدِ آں دارند　　که فلاں را زنند و آزارند
بعد زجرش کشند از سرِ کیں　　زیرِ خاکش نہاں کنند و دفیں
پس رسید ایں بشه صلاحِ دیں　　نورِ چشم و چراغِ ہر رہ بیں
خوش بخندید و گفت آں گولاں　　که زگمراہیند بے ایماں

نیستند ایں قدر ز حق آگاه — که بجز زامرِ او نجنبد کاه
چوں کسے زامرِ او همی جنبد — کوه بے امرِ او کجا جنبد
چوں تواند کسے مرا کشتن — یا بخاک و بخوں در آغشتن

. . . .

رحمتِ محض در نه من بنفس — نهلم زنده در جهاں یک کس
کرد من کرد کردگار بود — ایں چنیں کس چگونه خوار بود
می برنجند ازیں که مولانا؟ — کرد مخصوصم از همه تنها
عاشقِ او بر جمالِ خوبِ خود است — بر دگر کس گماں مبر که بد است

. . . .

. . . .

باز رجوع کردن بقصهٔ شیخ صلاح الدین عظم الله ذکرهٗ و شنیدن او عداوت منکراں را و فرمودن که ایشاں ابلهند و جاهل من که در خیر ایشاں می کوشم و در حقِ ایشاں سعادت ابدی میخواهم بایستے که جاں فدا کردندے بشکرانهٔ آں خود عداوت می نمایند و سلم۔

گفت من نیک خواه ایشانم — مهرباں با همه چو خویشانم
ایں سزاے من است و کردارم — عوضِ گل خلند چوں خارم
واے بر قوم اگر کنم نفریں — همه را مال و سر رود هم دیں
راستیں شیخ همچو سه باشد — غیر او قالبِ بشر باشد

. . . .

خشمگیں شد ازاں گروہِ لئیم | گشت واقف زراز شیخِ علیم
ہر دو باہم زقوم گردیدند | صحبت جملہ را چو کردیدند
رہ نداند دیگر ایشاں را | آں لئیمانِ کور بے جاں را
مدتے چوں بریں حدیث گذشت | جملہ را خشک گشت رودہ و کشت
مدد از حق بدو بریدہ شد آں | لاجرم برزست در بستاں
ہمہ گشتند سرد ازاں گرمی | روئے شاں سخت شد زبے شرمی
معرفت شاں نماند وبستہ شدند | ہمگاں دل فگار و خستہ شدند
روز شاں گشت ہمچو شب تاریک | گردنِ جملہ شد زغم باریک
روزہا شیخ را نمی دیدند | ہمہ شب خوابِ بد ہمی دیدند
آخرکار جملہ دانستند | ہمچو ماتم زدہ بہم شستند
ہر یکے دست خود ہمی خائید | از دلش غصہ ہا ہمی زائید
گفتہ باہم اگر چنیں ماند | چہ شود حالِ ما خدا داند
پیش ازانکہ ردیم جملہ دست | چارہ سازیم تا رہیم از شست
سوئے ایشاں رویم توبہ کناں | وصل جوئیم تا رود ہجراں
ہمہ جمع آمدند بر درِ او | می نہادند بر زمیں سر و رو

. . . .

در بیان آنکہ چوں مولانا و شیخ صلاح الدین قدسنا اللہ بسرہما العزیز از مریدان منکر روئے گردانیدند ایشاں زیانہائے آنرا در خود مشاہدہ کردند و دیدند کہ کلی محروم خواہند شدن، بر در ایشاں بفغاں آمدند

و توبه و استغفار پیش آوردند۔

گفته از صدق ما غلامانیم   شاه خود را بعشق جویانیم
عاشقانیم سوی دوست دویم   آن او ئیم پس بر که رویم
لابها کرده زین نسق شب و روز   باد و چشم پر آب از سر سوز
گریه زار شان چو رفت از حد   بانگ و افغان شان گذشت از حد

. . . .

چو شنیدند هردو زاری را   ساز کردند چنگ یاری را
در گشادند و راه شان دادند   قفلهای بسته بگشادند
توبهاشان قبول شد آندم   شاد گشتند و رفت از ایشان غم

. . . .

سر آن رشته را که گم شده بود   یافتند و زیان شان شد سود
بندهٔ شه صلاح دین گشتند   باز عشق و را رهین گشتند
شیخ شد باز از همه خوشنود   باز از نو گناه شان بخشود
داد شان از کرم عطای نو   از رخ خوب خود لقای نو
عمر ده روز شان هزاران شد   بلکه خود بی شمار و پایان شد
کفر شان را ز لطف کرد ایمان   جان جمله رسید در جانان

. . . .

در بیان آنکه چنانکه موسیٰ با قوت نبوت و عظمت رسالت جویای
خضر گشته بود مولانا قدسنا الله بسره العزیز نیز با وجود چندین فضائل

وخصائل ومقامات وکرامات وانوار واسرار کہ در دور وطور خود بے نظیر بود ومثل نداشت طالب شمس الدین تبریزی عظم اللہ ذکرہ گشتہ بود۔

غرضم از کلیم مولاناست — آنکہ او بے نظیر وبے ہمتاست
آنکہ او چوں نبود کس بجہاں — آنکہ بود از جہاں ہمیشہ جہاں
نسبتِ او با اولیائے کرام — بودہ ہمچوں خواص را بعوام

. . . .

با چنیں عزّ وقدر وفضل وکمال — دائما بود طالبِ ابدال
طالب آخر رسد بہ مطلوبش — گر بود راست عشق محبوبش
زانکہ جوئیندہ است یابندہ — خنک آنکس کہ شد ورا بندہ
خضرش بود شمس تبریزی — آنکہ با او اگر در آمیزی
ہیچکس را بیک جوے نخری — پردہ ہائے ظلام را بدری
آنکہ از مخفیاں نہاں بوداد — خسرو جملہ واصلاں بوداد

. . . .

غیرت حق ورا نہاں میداشت — دور از وہم واز گماں میداشت
نزد یزداں چو بود مولانا — از ہمہ خاص تر بصدق وصفا
گشت راضی کہ روئے بنماید — خاص با او. بران نیفزاید

. . . .

بعد از انتظار رویش دید — ہم شنید آنچ کس ز کس نشنید

چوں کشید از نیاز بوے ورا ۔۔۔ بے حجابے بدید روے ورا
شد برو عاشق و برفت از دست ۔۔۔ گشت پیشش یکے بلندی و پست
دعوتش کرد سوئے خانۂ خویش ۔۔۔ گفت بشنو شہا ازیں درویش
خانہ ام اگرچہ نیست لائقِ تو ۔۔۔ لیک ہستم بصدق عاشقِ تو
بندہ را ہرچہ ہست ہرچہ بود ۔۔۔ بے گماں جملہ آں خواجہ بود
پس ازیں روئے خانہ خانۂ تست ۔۔۔ بو ثاقت ہمی رسی تو درست
بعد ازاں ہر دو خوش روانہ شدند ۔۔۔ شاد و خنداں بسوئے خانہ شدند
یک زمانہ بہم ہمی بودند ۔۔۔ مدتے یک دو سال آسودند
غیرتِ حق درآمد ناگاہ ۔۔۔ فجفج افتاد در ہمہ افواہ
در شناعت درآمدند ہمہ ۔۔۔ آں مریدانِ بے خبر چو رمہ
گفتہ باہم کہ شیخ ما ز چہ رو ۔۔۔ پشت بر ما کند ز بہر چو او
ما ہمہ نامدار ز اصل و نسب ۔۔۔ از صغر در صلاح و طالبِ ب
بندۂ صادقیم در رہِ شیخ ۔۔۔ ما ہمہ عاشقیم در رہِ شیخ
جملہ دیدہ ازو کرامتہا ۔۔۔ دیدہ ہر یک ازو علامتہا
شدہ ما را یقیں کہ مظہرِ حق ۔۔۔ اوست بیشک و زد بریم سبق

. . . .

ہمچوں باز صید ہا کردیم ۔۔۔ صیدہا را بشاہ آوردیم
خلقِ عالم ہمہ مرید شدند ۔۔۔ گرچہ زیں پیشتر مرید شدند
شد ز ما شیخ در جہاں مشہور ۔۔۔ دوستش شاد و دشمنش مقہور

چه کس است اینکه شیخ ما را او ... بر دا ز ما جو یک کهے را جو
این چه جو بیست کان چنان کُه را ... ہمچو کاہے ربود و برداز جا
کرد او را نہ جملہ خلق نہاں ... می نیابد کسے زجاش نشاں
روے او را گر نمی بینیم ... ہمچو او دل برش نمی شینیم
ساحر است این مگر بسحر و فسوں ... کرد برخویش شیخ را مفتوں
ورنہ خود کیست او در وے چیست ... با چنیں مکر می تواند زیست
کمترینے زماست بہتر ازو ... در سرش اینکہ نیست مہتر ازو
نے ورا اصل و نے نسب پیدا ست ... می ندانیم ہم کہ او ز کجاست
اے دریغا چہ چشم زحمت این ... کہ از و شد خراب این آئیں
ہمہ خلقاں ز وعظ شد محروم ... طالع سعد ما از و شد شوم
ہمہ گشتہ بخونِ او تشنہ ... ساختہ بہر کشتنش دشنہ
گاہ گاہیش چوں بدیدندے ... تیغ بر روے او کشیدندے
فحشہا پیش و پس بگفتندے ... ہمہ شب از غمش نخفتندے
ہمہ از فکر ایں کہ کے از شہر ... رو د او یا فنا شود از قہر
ہمچنیں غلغلہ ہمی کردند ! ... خون خود را ز غصہ می خوردند

. . . .

ہمہ گفتہ کنیم از دل و جاں ... خان و مان را فداے آں سلطاں
ہمہ او را بصدق بندہ شویم ... در رکابش بفرق سر بدویم
رنجہ کن ایں طرف قدم را باز ... چند روزے بیاد با ما ساز

آں کن تو بما کہ ما کردیم — زانکِ تو سزد و ما گردیم
چوں تو لطفی و ما یقیں ہمہ قہر — کے دہد چاشنی شکر زہر
آنچ از ما سزید اگر کردیم — ہمچو خارہ خلندہ سر کردیم
تو چو گلشن بیا و وصل نما — ہمچو ماہ ز ابرِ ہجر باز برآ
ہمچنیں زیں نسق بوسے می گو — دلِ او را بلا بہا می جو
باشد ایں گر بود مرا آں بخت — نرم گردد، نگیرد ایں را سخت
دہدم باز وصل از سرِ لطف — بہلد ہجر و بگذرد از عنف
پس ولد سر نہاد والد را — شکر کرد او خدائے واحد را
گفت رفتم کہ آرم آں شہ را — آں حبیبِ محب اللہ را
گشت از جاں رواں بسوئے دمشق — راہ را می برید از سرِ عشق
بے تعب می دوید در صحرا — کم زگی می شمرد ہر کہ را
خار آں رہ بر او چو گلشن بود — بُرد از ہر زیاں ہزاراں سود
نار گرما و سختئ سرما — می نمودش چو قند و چوں خرما

. . . .

. . . .

چوں رسید او بنزد شمس الدیں — آں شہِ اولیائے با تمکیں
بر زمیں سر نہاد ہمچو ملک — گفتش اے شہ غلام تست فلک
بعد ازاں نشست با حضور ادب — از سرِ لطف شہ کشاد دو لب
در سخن آمد و دُرر بارید — در دل و سینہ عشقِ نو کارید

سر سر حدیث دقرآں گفت ‌ ‌ ‌ کرد پیدا سرے کہ بود نہفت

. . . .

چوں شنید از ولد رسالت را ‌ ‌ ‌ خوش پذیرفت آں مقالت را
باز گشت از دمشق جانبِ روم ‌ ‌ ‌ تا رسد در امام خود ماموم
شد ولد در رکاب او پویاں ‌ ‌ ‌ نہ از ضرورت و لے ز صدق جاں
شاہ گفتش کہ شو تو نیز سوار ‌ ‌ ‌ بر فلاں اسپ خنگ خوش رفتار
ولدش گفت اے شہ شاہاں ‌ ‌ ‌ با تو کردن برابری نتواں
چوں بود شہ سوار و بندہ سوار ‌ ‌ ‌ نبود ایں روا ہرگز زنہار
بسواری توئی شہا لائق ‌ ‌ ‌ کہ تو معشوقی و منم عاشق
تو یقیں خواجہ و من بندہ ‌ ‌ ‌ ملک جانی و از توام زندہ
واجبست ایں کہ من پیادہ روم ‌ ‌ ‌ در رکابت بفرق سر بدوم
یک مہ بیش راہ رفت بپا ‌ ‌ ‌ بے سکوں گہ نشیب و گہ بالا
نیت بدکہ بود ایشاں را ‌ ‌ ‌ آں گروہ کژ پریشاں را
آں بلا باز گشت بر سرِ شاں ‌ ‌ ‌ زانکہ آں قہر بود درخورِ شاں

. . . .

. . . .

باز گردیم ازیں حدیثِ دراز ‌ ‌ ‌ قصہ شمس دیں کنیم آغاز
چوں غلو شاں بروز حد بگذشت ‌ ‌ ‌ دشمنیشاں ز حد و عد بگذشت
شمس تبریز رفت سوے دمشق ‌ ‌ ‌ تا شود پر دمشق و شام ز عشق

وا رہید از چنیں خسانِ مرید — جان خود را ز مکرِ شاں بخرید
پس خدا را گذارد شکر از جاں — کہ رہید از گروہِ بے ایماں
چوں حزیں شد ز ہجر مولاناؒ — گشت معرض ز جملہ آں دانا
دوستی را از آں نفر ببرید — مرغ مہرش ز لانہ شاں بپرید
چونک آں رائے شاں نیامد راست — عکس شد آنچ ہر یکے می خواست
گفتہ بودند اگر رود زیں جا — ماند آں شاہِ ما بما تنہا!
ہمچو اول ازو عطا ببریم — بے لب و کام قندہاش خوریم
باز دیگر ز پندہائے خوشش — بجہیم از جہان و پیچ و کشش
زیں قفس باز ہمچو مرغ پریم — پر و بال را بعونِ او بدریم
نشد این و آں قدر کہ بود نماند — زاں دل باخت تار و پود نماند
ہمہ گریاں بتوبہ گفتہ کہ وائے — عفو ماں کن ازیں گناہ خدائے
قدر او از عمے ندانستیم — کہ بداں پیشوا ندانستیم
طفل رہ بودہ ایم خردہ بگیر — یارب انداز در دلِ آں پیر
کہ کند جرمہائے ما را او — عفو کلی کزیں شدیم دو تو

. . . .

آں گروہے کہ بودشاں غفلت — کردہ بودند از سفہ جرأت
پیش شیخ آمدند لابہ کناں — کہ ببخشا مکن دگر ہجراں
تو بہا می کنیم رحمت کن — گر دگر ایں کنیم لعنت کن
توبۂ ما بکن ز لطف قبول — گرچہ کردیم جرمہا ز فضول

بارہا گفتہ اینچنیں بہ فغاں　　　ماہ ہا زیں نسق بروز و شباں

شیخ شاں چونکہ دید از ایشاں ایں　　　راہ شاں داد و رفت از و آں کیں

در بیان فرستادن مولانا قدسنا اللہ بسرہ العزیز ولد را برسالت سوئے دمشق بطلب شمس الدین تبریزی عظم اللہ ذکرہٗ۔

بود شہ را عناسیتے بولد　　　در نہاں اندروں برون از حد

خواند او را و گفت رو تو رسول　　　از برم پیش آں شہ مقبول

ببر ایں سیم را بپا بشس ریز　　　گویش از من کہ اے شہ تبریز

آں مریداں کہ جرم ہا کردند　　　زا نچہ کردند جملہ وا خوردند

گرچہ رہ صعب بود سہل نمود　　　زانکہ آں رنج قفل گنج کشود

در رہ از وے ہزار سر بشنید　　　صد جہاں از ورائے چرخ بدید

ہیچکس با نگشت آں مقدور　　　می شد از ہر عطا ز نو سرور

چوں رسید ند پیش مولانا　　　نو ش شد جملہ نیش مولانا

در سجود آمدند ہر دو شہاں　　　چوں شود تن بگو ز دیدن جاں

. . . .

یکدگر را گرفتہ خوش بکنار　　　بو سہا را نبود ہیچ کنار

واں جماعت کہ مجرماں بودند　　　منکر قطب آسماں بودند

جملہ شاں جانفشاں بہ استغفار　　　سر نہادند کے خدیو کبار

تو بہ کاریم از آنچہ ما کردیم　　　از سر صدق رد بے آوردیم

ہر یکے بر درش شدہ ساجد　　　اشک ریزاں ز عشق او واجد

کرد شان شه قبول چون دید این　　داد شان از نوازشش تمکین
بعد از آن جمله از وضیع و شریف　　حلقه بستند گرد شاهِ لطیف
پهلوے شه نشسته مولانا　　چون دو خور که زنند سر ز سما
شمس تبریز در سخن آمد　　زنده شد آنک فهم کن آمد　　آنکه
هر یکے زان سخن بعرش پرید　　هر یکے از خودی تمام برید
بعد از آن هر یکے سماعی داد　　هر یکے خوانِ معتبر بنهاد
هر یکے قدر وسع طاقتِ خویش　　از امیر و توانگر و درویش
بخشش آورد میهمانی کرد　　تا شود یار مهربانی کرد
مدتے اینچنین گذشت زمان　　در حضور شهان هر دو جهان
همه چون جام و آن دو شه چون راح　　همه چون لیل و آن دو شه چو صباح
آن دو شه چون بهار و ایشان دشت　　همه را تازه گشته ز ایشان کشت

. . . .

باز گستاخی و حسد کردن مریدان بعد از آنک توبه و استغفار کرده بودند

باز شیطان بصورتِ دیگر　　زد در ایشان کدورتے دیگر

. . . .

باز گشتند همچو اول بار　　مے ز مستی گذشت و ماند خمار
روشنی شد بدل بتاریکی　　صحتِ تن برنج باریکی

. . . .

باز چوں شمس دیں بد انسرت ایں — کہ شدند آں گروہ پڑ از کیں
آں محبت برفت از دلشاں — باز دل شد زبون آں کلشاں
عقل شاں شد اسیر نفس و ہوا — مومناں گشتہ از ہوا ترسا
نفسہائے خبیث جوشیدند — باز در قلع شاہ کوشیدند
گفت شہ با ولد کہ دیدی باز — چوں شدند از شقا ہمہ دمساز
کہ مرا از حضور مولانا — کہ چو او نیست ہادی و دانا
فگنندم جدا و دور کنند — بعد من جملگاں سرور کنند
خواہم ایں بار آنچناں رفتن — کہ نداند کسے کجا ام من
ہمہ گردند در طلب عاجز — ندہد کس ز من نشاں ہرگز
سالہا بگذرد چنیں بسیار — کس نیابد ز گرد من آثار
چوں کشندم دراز گویند ایں — کو ورا دشمنے بکشت یقیں
چند بار ایں سخن مکرر کرد — بہر تاکید را مقرر کرد
ناگہاں گم شد از میانِ ہمہ — تا رود از دل اندہانِ ہمہ
یک دو روز او چو گشت ناپیدا — گرد افغاں ز درد مولانا؟
بعد ازاں چوں بجد دراجستند — سوئے ہر کوئے ہر سرا جستند
ہیچ از وے کسے نداد خبر — نہ بکس بو رسید ازو نہ اثر
شیخ گشت از فراقِ او مجنوں — بے سر و پا ز عشق چوں ذوالنون
شیخ مفتی ز عشق شاعر شد — گشت خمار اگرچہ زاہد بد

نہ زخمرے کہ آں بود ز انگور — جان نورے نخورد جرعہ؟

. . . .

استغراق مولانا قدس اللہ سرہ العزیز در عشقِ شمس الدین تبریزی عظم اللہ ذکرہٗ و بے قراری و شور و جوش نمودن از آنچ اول داشت۔

روز و شب در سماع رقصاں شد — بر زمیں ہمچو چرخ گرداں شد
بانگ و افغانِ او بعرش رسید — نالہ اش را بزرگ و خرد شنید
سیم و زر را بہ مطرباں میداد — ہر چہ بودش ز خان و مان میداد
یکزماں بے سماع و رقص نبود — روز و شب لحظۂ نمی آسود
تا حدے کہ نماند قوالے — کو ز گفتن نگشت چوں لالے
ہمہ شاں را گلو گرفت از بانگ — جملہ بیزار گشتہ از زر و دانگ

- -

غلغلہ اوفتاد اندر شہر! — شہرچہ بلکہ در زمانہ و دہر
کیں چنیں قطب و مفتیِ اسلام — کوست اندر دو کون شیخ و امام
شورہائے کند چو شیدا او — گاہ پنہاں و گہ ہویدا او
خلق از وے ز شرع و دیں گشتند — ہمگاں عشق را رہیں گشتند

- -

عاشقی شد طریق و مذہب شاں — غیر عشقست پیش شاں ہذیان
کفر و اسلام نیست در رہِ شاں — شمس تبریز شد شہنشہ شاں

کار شان مستیست و بیخویشی　　ملتِ عشق هست بی کیشی
گفته منکر ز غایتِ انکار　　نیست بر وفق شرع و دین این کار
جان دین را شمرده کفر آن دون　　عقل کل را نهاده نام جنون

با چنان مستی و چنان جوشش　　با چنان عشق و با چنان کوشش
کرد آهنگ و رفت جانب شام　　در پیش شد روانه پخته و خام
چون رسید اندران سفر بدمشق　　خلق را سوخت او ز آتش عشق

شامیان هم شدند والهِ او　　کین چنین فاضلی پیمبر خو
از چه گشتست عاشق و مجنون　　کندرو مدرجست صد ذوالنون

شمس تبریز خود چه شخص بود　　تا پیش اینچنین یگانه دود
ای عجب شیخ از و چه می جوید　　کز پیش هرطرف همی پوید
این چه سر است ای خدا بنما　　بی حجابی بما چو خور پیدا
خود ندانسته این که فرقی نیست　　جز بخود با کیش شوقی نیست
اندرو خویش را همی بیند　　غیر را عقل هیچ نگزیند

در بیان آنکه اگرچه مولانا قدسنا الله بسره العزیز شمس الدین تبریزی را

عظّم اللہ ذکرہٗ بصورت در دمشق نیافت بمعنی درخود بیافت زیرا آں حال کہ شمس الدین را بود حضرتش راہماں حاصل شد واللہ اعلم

شمس تبریز را بشام ندید ۔۔۔ در خودش دید ہمچو ماہ پدید
گفت اگرچہ بتن ازو دوریم ۔۔۔ بے تن و روح ہر دو یک نوریم
خواہ او را ببیں و خواہ مرا ۔۔۔ من ویم او من است درو سرا

جنبش من ہمہ ز جنبش اوست ۔۔۔ ہیچ بے او مرا نہ پشت رو ست
پس ز من دائما تو او را بیں ۔۔۔ در بد و نیک در خشونت و لین
او چو خورشید و من چو یک ذرّہ ۔۔۔ او چو دریا و من چو یک قطرہ
ترے قطرہ نے کہ از دریاست ۔۔۔ ہستیٔ ذرّہ نے ز شمس ست
مدح خود کردنم ازیں رو یست ۔۔۔ کہ خم پر ز آب آں جو یست
پس ہمہ مدح اوست در تحقیق ۔۔۔ اصل را گیر و بگذار از تفریق
کرد رجعت بروم و باز آمد ۔۔۔ رفت چوں کبک و ہمچو باز آمد

چند سالے نشست و باز ز عشق ۔۔۔ رفت با جمع خلق سوئے دمشق
باز آنجا فگند صد غوغا ۔۔۔ جملہ گفتے زہے عجب سودا
مدتے کرد شور ہائے عجب ۔۔۔ گفتہ خلقاں کہ چیست ایں یا رب
ما چنیں عشق و شور نشنیدیم ۔۔۔ نہ چنیں شوق در کسے دیدیم
ما ہما در دمشق ساکن شد ۔۔۔ عاشقے کے ز عشق ساکن شد

روز و شب یکدمش قرار نبود　　بے قدح خمر عشق می پیمود

قونیہ میں آمد

آمدن مولانا قدسنا اللہ بسرہ العزیز دوم بار از دمشق بقونیہ از طلب شمس الدین تبریزی عظم اللہ ذکرہٗ۔

بعد ازاں بازگشت جانب روم　　تا زند بر جبیں شیر رقوم
سر زد از چرخ روح آں خورشید　　تا سہا را کند بہ از ناہید
گفت چوں من ندیدم چہ می جویم　　عین اویم کنوں ز خود گویم
وصفِ حسنش کہ می فرزدم من　　خود ہماں حسن لطف بودم من
خویش را بودہ ام یقیں جویاں　　ہمچو شیرہ درون خم جوشاں

شروع کردن بشرح صحبت مولانا و شیخ صلاح الدین قدسنا اللہ بسرہما کہ نائب و خلیفہ مولانا بود و یاراں از وجود ہر دو مدت دہ سال مستفید می شدند بے زحمتے و تشویشے چوں شیر و شکر بہم آمیختہ و در بیان رنجور شدن شیخ صلاح الدین عظم اللہ ذکرہٗ بعد دہ سال و رنجش دراز کشیدن و از حضرت مولانا قدسنا اللہ بسرہٗ درخواست کردن کہ مرا دستوری فرما تا نقل کنم و قبول یافتن التماس او از حضرت مولانا و سہ روز بعد از آن نارفتن و معلوم شدن او را کہ وقت نقل است و نقل فرمودن بصفائے تمام و پیوستن بمقصود بے حجابے

در پردہ کے المومنون لا یموتون بل ینقلون من
دار الی دار

شیخ بااد چو در دو تن یک جاں | بود آسودہ و خوش و شاداں
مست از ہمدگر شدہ دہ سال | داشتہ بے خمار ہجر و وصال
جمع یاراں بگرد شاں زدہ صف | آں دو چوں بحر و باقیاں چوں کف

ناگہاں شد صلاح دیں رنجور | گشت از صحتِ بدن مہجور
رنج جسمش کشید سخت دراز | دم بدم نیست می شد او زگداز

چونکہ رنجوریش دراز کشید | نالہ و کربتش بچرخ رسید
گفت با شیخ کاے شہ قادر | ایں لباس وجود را بر در
تا رہم زیں عنا شوم آزاد | بروم آنطرف خوش و دلشاد

چونکہ

کرد از وے قبول و گفت رواست | از سرِ بالشش سبک برخاست
شد روانہ بسوے خانۂ خویش | گشت مشغول مرہم آں ریش
چوں دو سہ روز با عیادتِ او | نامد و کرد رو بحضرتِ ہو
گشت بر شہ صلاح دیں روشن | گفت جاں می شود جدا از تن
شد یقیں رفتنم ز دار فنا | سوئے بے سوئے در جہان بقا
اینکہ نامد اشارتست کہ رو | اہلِ دل را بشارتست کہ رو

رایتِ عزم آنجہاں افراخت سوئے ارواح بے فرس درتاخت

کرد چشمان فراز ورفت بناز نازنازان بصدہزار اعزاز

تاکہ ازنوجہان جان را بانہ بدہدحسن وزیب وفرد طراز

شیخ فرمود درجنازۂ من دہل آرید وکوس بادف زن

سوئے گورم برید رقص کناں خوش وشاداں ودست درافشاں

تابدانندکاولیائے خدا شاد وخنداں روند سوئے لقا

ہمہ ازجان ودل وصیت را بشنیدند بے ریا بصفا

ہمہ شہر آمدند جامہ دراں بجنازہ اش بصدہزار افغاں

جسم پاک ورا جو اندرخاک بنہادند رفت پاک بپاک

دربیان آنکہ چوں شیخ صلاح الدین زرکوب قدس اللہ سرہٗ رحلت کرد خلافت بچلپی حسام الدینؒ ابن اخی ترک رسد۔

بود راضی وے از حسام الدینؒ دادہ بودش ہزار گنج گزیں

مرشد جملہ بود مولاناؒ آں خدیو یگانۂ دردوسرا

رتبتت ہریکے بُرد روشن گشتہ ہمچوں میان روح وبدن

گفت چوں خور برفت داں شب زاغ عوض آمد رسید وقتِ چراغ

آں یکے یار گفت مولانا — زیں سہ نائب کدام بود اعلیٰ
گفتش اندر جواب کے ہمراہ — شمسؒ چوں مہر بد صلاحؒ چو ماہ
چوں ستارہ ست شہ حسامؒ الحق — زانکہ گشتست با ملک ملحق
ہمہ را یک سناش چونک ترا — می رسانند ہر یکے بخدا
دامنِ ہر یکے کہ گیری تو — زندہ گردی دگر نمیری تو
چونک رفت از جہاں صلاحؒ الدین — شیخ گفت اے حسامؒ حق آئیں
بعد ازیں نائب و خلیفہ توئی — زانکہ اندر میانہ نیست دوئی
شیخ ایں را بجائے آں بنشاند — بر سرش نورہا نثار افشاند
گفت اصحاب را کہ سر بنہید — پیش او عاجزانہ بر بنہید
ہمہ امرش ز دل بجا آرید — مہر او را درونِ جاں کارید

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

جملہ را او اجست از دل و جاں — کہ غلامش شوند در دو جہاں
ہمہ یاراں مطیعِ او گشتند — آبِ لطف ورا سبو گشتند
ہر یکے زخم خوردہ بود اول — شدہ نادم ازاں خطا و زلل
گشتہ بودند با ادب جملہ — زاں نکردند ہم بریں حملہ
خوردہ بودند زخمہا ز انکار — ہمہ کردند ازاں خطر احراز
زاولیں ضربتِ قوی خوردند — در دوم فتنہ کمترک کردند
در سوم نرم و با ادب گشتند — بے حد رام مردِ رب گشتند
کس ازاں قوم سرکشی ننمود — ہر یکے امر را ز جاں بشنود

سالها شادمان بهم بودند — کامران جمله بے ستم بودند

در بیان مصاحبت کردن چلپی حسام الدین قدس الله مدت ده سال تنگاتنگ با حضرت مولانا قدس الله سره بروجه و یاران واصحاب از حضرت هر دو بیک شدے مستفید شدن و بعد ازاں نقل فرمودن مولانا قدسنا الله بسره العزیز.

بود با شیخ در زمانهٔ شیخ — همدل و همنشیں بخانهٔ شیخ
در صفا و وفا بهم همدم — همه اصحاب شادمان بےغم
بخشش هر دو بر همه شامل — همه از هر دو عالم و عامل

خوش بهم بوده چنیں ده سال — پاک و صافی مثال آب زلال
بعد ازاں نقل کرد مولانا — زیں جهان کثیف پر زعنا
پنجم ماه در جماد آخر — بود نقلان آں شه فاخر
سال هفتاد و دو بده بعدد — شش صد از هجرت احمد
چشم زخمے چنیں رسید بخلق — سوخت جانها ز صدمت آں برق
لرزه افتاد در زمیں آندم — گشت نالاں فلک دراں ماتم
مردم شهر از صغیر و کبیر — همه اندر فغان و آه و نفیر
دیهها هم ز روستا و اتراک — کرده از درد او گریباں چاک
بجنازه اش شده همه حاضر — از سر مهر و عشق نه از پے بر
اهل هر مذهبے برو صادق — قوم هر ملتے برو عاشق

کردہ او را مسیحیاں معبود — دیدہ او را جہود خوب چو ہود
عیسوی گفت اوست عیسیٰ ما — موسوی گفتہ اوست موسیٰ ما
مومنش خواندہ سرِ نورِ رسول — گفتہ او ہست عظیم بحرِ نقول
ہمہ کردہ زغم گریباں چاک — ہمہ از سوز کردہ بر سر خاک
آں فغان و خروش کا بجا بود — کس ندیدست زیر چرخ کبود
ہمچناں ایں کشید تا چل روز — ہیچ ساکن نشد دمے تف و سوز
بعد چل روز سوے خانہ شدند — ہمہ مشغولِ ایں فسانہ شدند

در بیان آنکہ چوں مولانا قدسنا اللہ بسرہ العزیز نقل فرمود چلبی حسام الدین بولدؒ گفت کہ بجائے والدؒ خویش تو بنشیں دشیخ کن تا من در خدمت ایستادہ باشم ولدؒ قبول نکرد و گفت کہ مولانا رضی اللہ عنہ نگذشتہ است حاضر است کہ المومنونَ لا یموتونَ چنانکہ در زمان مولاناؒ خلیفہ بودی بعد از دہم خلیفہ باش ۔

جانشینی

گفت ازاں پس حسام دیں بولدؒ — بعد والد توئی امام و سند
جائے او با تو میرسد بنشیں — کہ چو تو نیست عارف رہ بیں
گفت نے والدم یقیں زندہ ست — مردہ جسمش بود کہ چوں زندہ ست
روح او در جوار حق باقیست — از مئے وصل خود حق اش ساقیست

مومنون را ز لا یمو تون گفت — مصطفیٰ چونکه در معنیٰ سفت

در زمانش بدی خلیفۂ ما — ہیچ تغییر نیست پیش ورا

تو بدی چوں امام و ما ماموم — از شہ ایں کردہ ایم ما معلوم

اول و آخری خلیفۂ ما .... — پیشوائی و شیخ در دو سرا

کرد الحاح بحد آں بینا — کہ نشاید بجز ترا آں جا

کردمش گو نہ گوں زجاں لابہ — بے ریا از دل و زباں لابہ

سخنم را ز لطف کرد قبول — شد میسر ہر آنچہ بد مامول

ہمہ بودیم زیر سایۂ شاہ — ایمن از مکر دیو و سہو و گناہ

بعد دہ سال ودو ز ناگاہ او — گشت رنجور و شد نصرت بو

ماند ... ولد چوں طفل یتیم — زار گشت و نزار شد از بیم

رہ کجا رونہم اگر اگیرم — چہ بود جاں چیست تدبیرم

گفتم اے جانِ پاک اگر رفتی — بتن و زیر خاکداں خفتی

جان پاکِ تو حاضرست یقیں — بر من و جملہ ناظر است یقیں

وعدہ ہائے عظیم دادہ بدی — گفتہ بودی رہانمت ز خودی

نقد فرمائے تا شود ایمن — گردم از خوف فوت آں ساکن

در تقریر آنکه چلپی حسام الدین قدس اللہ سرہٗ خود را در واقعہ بولدؒ نمود و گفت کہ ہر ولی واصل را کہ بیابی در حقیقت آں منم مقصود ازو حاصل شود۔

با ولدؒ شہ حسام دیں در خواب
گفت چوں سائلی شنو تو جواب

تا جہاں قایم ست ما ہستیم
ہیچ پنہاں نہ ایم در شستیم

گرچہ تن جامہ را بگردانیم
ہر کہ از ماست داندایں کانیم

نور حقیم در لباس بشر
نور حق چوں مسیحؑ و تن چو خر

بہر تو سر زنیم از بدنے
تا دہیمت ز نو طرب و فنے

تا کہ گردی تمام در رہِ حق
رسدت نو بنو ز عشق سبق

تا رہی زیں جہاں ہمچو دام
تا رسی ہمچو واصلاں در کام

یافتم بعد خواب آنکس را
گشت بر من سرِ نہاں پیدا

گفت نیکم ببیں کہ من آنم
در تن آب و گل چو مہمانم

لیک از من مکن بخلق خبر
اینچنیں گنج را تو تنہا بر

دربیان آنکه چون چلپی حسام الدینؒ قدس الله سرهٗ از دنیا نقل کرد خلق جمع شدند و ولدرا گفتند که بجائے والد بنشین و شیخی کن تا اکنون بهانه می کردی که حضرت مولانا قدس الله سرهٗ چلپی حسام الدینؒ را خلیفه کرده بود درین حال که او نقل کرد باید که قبول کنی و بهانه نیاوری و منقاد شدن ولد و قبول کردن شیخی را۔

خلق جمع آمدند پیر و جوان — همه شان جمع شدند لابه کنان

کای ولدؒ جائے والد آن تو بود — زانکه پیوسته مهربان تو بود

کردیش با حسام دینؒ ایثار — زانکه بد پیش والدت مختار

چونکه رفت او بهانه ایت نماند — حق تعالی چون این قضا راند

بعد ازین کن قبول شیخی را — خلق را شو امام و راه نما

سر این قوم شو که بی سر — هیچ کاری نیاید از لشکر

همچنین این سخن دراز کشید — کرد ازیشان ولدؒ قبول و شنید

بر سر تخت رفت بے پائے — در جهانی که نیستش جائے

مدت هفت سال گفت اسرار — بر سر تربهٔ پدر بسیار

رجوع بدان قصه که ولدرا چلپی حسام الدینؒ در خواب نموده بود۔

هست مردے دریں جہاں پنہاں　　مثل نقرہ وزر اندر کان
ظاہرش خاک و باطنش زر پاک　　تن او ہست جان او چالاک
ذات او نور آسمان و زمیں　　گر ترا ہست نور چشم ببیں
کو چہ شکلست و چہ بدیع نگار　　بے نظیرست در میان کنار

وصف او کردہ بد من در خواب　　شہ حسام الحق لطیف جواب
ہم چناں ست بلک صد چنداں　　نتواں کرد شرح او بزباں　　بلکہ

رجوع کردن بقصۂ شفاعت مریدان و پذیرفتن ولد سخن ایشان را و بمقام والد خود شیخی بنشستی۔

چونکہ بنشست بر مقام پدر　　داد با ہر گدا دفینہ زر
کمترینے کہ بد بعقل حقیر　　گشت فرزانہ و علیم و خبیر
بے عدد مرد و زن مرید شدند　　ہمہ اندر ہنر مزید شدند
خلفا ساخت در طریق پدر　　کرد در ہر مقام یک سرور
زانکہ از دور اہالی ہر شہر　　ہمہ بودند تشنۂ ایں نہر
ماندہ بودند در وطن ناکام　　ہمچو مرغان بستہ اندر دام
واجب آمد کزیں طرف ہر جا　　برود یک خلیفۂ از ما
تا نمانند تشنگان لقا　　خشک و بے آب از چنیں دریا
خلفا پر شدند اندر روم　　تا نماند کسے ز ما محروم
روم چہ بل ہمہ جہاں پر شد　　قطرۂ جملہ زیں عماں در شد

در بیان آنکہ شمس الدینؒ و صلاح الدینؒ و حسام الدینؒ قدسنا اللہ بسرہم کہ خلفائے حضرت مولانا قدس اللہ سرہٗ بودند در ولایت و بزرگی و علوم مشہور نبودند از تقریر ولدؒ ہمچو مولانا شہرت گرفتند و معروف شدند اگرچہ ولایت و بزرگی ایشاں عظیم پنہاں بود چوں آفتاب ظاہر گشت۔

گرچہ بد والدؒش قوی مشہور | بند او ہمچو شمسؒ دیں مستور
ہمہ او را ز جان مرید بدند | در زمان ولدؒ مرید شدند
اولیا را کہ والدؒش بگزید | نہ ز تقلید بل ز غایت دید
بد والدؒش شد از ولدؒ پیدا | کہ چہ شاں داشتند کار و کیا
شرح شاں کرد از دل و از جاں | بر ملا تا شنید پیر و جواں
یکدمے کرد شرح طاعتِ شاں | یکدمے عزلت و قناعتِ شاں
یکدمے شرح قال جانی شاں | یکدم از حالت نہانی شاں
ہر یکے را کرامتش چوں بود | در نماز استقامتش چوں بود
ہر یکے را چہ شکل صحبت بود | ہر یکے را ز حق چہ رتبت بود
ہر یکے را چگونہ بود ارشاد | ہر یکے را چہ نوع بخشش و داد

حاصل احوال جملہ را یک یک | بنمود و رہید خلق از شک

همه از تو مرید و بنده شدند | همه بود ند مرده، زنده شدند
همه را گشت بیگماں معلوم | که بود ایں سر آں زماں مفهوم
شده است از ولد کنوں پیدا | حال ایشاں بنزد پیر و فتےٰ
که ندارند در جمال نظیر | پیش ایشاں کبیر گشته صغیر
جمله اولیا حبیب بدند | خاصگی حق و قریب بدند
همه مظهر بدند یزداں را | همه جاں داده خلق بیجاں را
همه شاں دستگیر خلق بدند | همه بے جسم روح محض شدند
شده اندریں زماں چو حق پنهاں | کس از ایشاں نداده هیچ نشاں

در بیان مرید شدن سید برهان الدین محقق رضی الله عنه حضرت مولانا بهاء الحق والدین ولد عظم الله ذکره، در بلخ و دیدن مفتیان بلخ پیامبرؐ را در خواب که در خیمه بزرگ نشسته بود، بهاء الدین ولد را استقبال کرد و باکرام و اعزاز تمام بالائے خود ... اند و بمفتیاں فرمود که بعد ازیں او را سلطان العلما، خوانیده و آمدن مفتیاں بامداد باتفاق تا آں عجائب را که همه در یکشب دیده بودند عرضه کنند که دوش چنیں دیدیم پیش از آنکه ایشاں بسخن آیند حضرتش جمله را بعین آں صورت که ایشاں دیده بودند بعلامات تمام بیان فرمود و بیهوشی و حیرت آں جماعت یکے در هزار شد و پیوسته ضمائر خلق گفتے و بر سر آں فایده هائے دیگر

فرمودے کہ سرِ سرائیشاں بود و ازاں خبر نداشتند۔

در جوانی ببلخ چوں آمد — خواست کاں بجا پگاہ آزاد
جدِ ما را چو دیداں طالب — کہ برو بود عشقِ حق غالب
لقبش بد بہاءِ دین ولد — عاشقانش گذشتہ از حدِ عد
جملہ اجداد او شیوخ کبار — ہمہ در علم و در عمل مختار
اصل او در نسب ابوبکرؓ — زاں چوں صدیق داشت او صدرے
مثل او کس نبود در فتوے — از فرشتہ گذشتہ در تقوے

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

مفتیانِ بزرگ اندر خواب — دیدہ یک خیمہ کشیدہ طناب
مصطفیٰ اندرون خیمہ بناز — زدہ تکیہ بصد ہزار اعزاز
ناگہانے بہاءِ دینِ ولد — از در خیمہ اندروں آمد
مصطفیٰ چوں کہ دید جست از جا — پیش رفت و گرفت دستش را
بر دو پہلوے خویش بنشاندش — زاں ملاقات گشت کارش خوش
گفت ازاں پس بمفتیاں ایں را — کہ از امروز ایں شہ دیں را
جملہ سلطان عالماں گویند — در رکابش بجان و دل پویند
بامداداں باتفاق ہمہ — از سر صدق بے نفاق ہمہ
بر درش آمدند تا گویند — سرِ آں خواب راز و جویند
پیش ازاں کہ کنند عرض و گفت — خوابشاں را و سر کرد نہفت
داد شاں از مقام حالِ نشاں — ہمہ را کرد او تمام بیاں

جمله پیشش فغان برآوردند | بی دف و نای شورها کردند
خیره گشتند در کرامت او | وز خبرهای با علامت او
دائما او ضمیر خلقان را | باز گفتی برای برهان را
تا بدانند کاهل ذوق و صفا | یافتند از خدای کار و کیا

گشت سید مریدش از دل و جان | تا روان را کند ز شیخ روان
در مریدی رسید خوش بمراد | زانکِ شیخش عطای بیحد داد زانکه
چشمهای در او گشاد چو باز | تا سوی شاه خویش آید باز
بی‌نوا آمد و نواها یافت | رفت از وی کدر صفاها یافت

در بیان آنکه چون بهاء الحق والدین قدس الله سره از قوم بلخ و
محمد خوارزمشاه رنجید از حق تعالی بوی خطاب آمد که ازین ولایت
برون رو که من ایشان را هلاک خواهم کردن سبب خرابی آن ولایت
و هلاک آن قوم از آن شد همچنین هر قومی را حق تعالی هلاک نکرد
تا پیغامبر آن زمان از ایشان نرنجید. که ؎

تا دل اهل دلی نامد بدرد | هیچ قرنی را خدا رسوا نکرد

و در تقریر آمدن مولانا بهاءالدین ولد اعظم الله ذکره بقونیه و مرید شدن علاءالدین و
کرامتهاش را بعین دیدن و عشقباز بهاء ولد باختن بهاءالدین ولد و بعد از نقلش هفت روز تعز

داشتن سلطان ناشنیدن و تمامت اہل قونیہ را عرس دادن و مالہا بخش کردن

چونکہ از بلخیاں بہائے ولد
گشت دل خستہ آں شہ سرمد

ناگہش از خدا رسید خطاب
کاے یگانہ شہنشہِ اقطاب

چوں ترا ایں گروہ آزردند
دل پاک ترا زجا بردند

بدر آ از میانِ ایں اعدا
تا فرستمشاں عذاب وبلا

چونکہ از حق چنیں خطاب شنید
رشتۂ خشم را دراز تنید

کرد از بلخ عزم سوئے حجاز
زانکہ شد کارگر در آداں راز

بود در رفتن در رسید خبر
کہ ازاں راز شد پدید اثر

کرد تاتار عزم آں اقلیم
منہزم گشت لشکر اسلام

بلخ را بستد و بزاری زار
کشت ازاں قوم بیحد و بسیار

شہرہائے بزرگ کرد خراب
ہست حق را ہزار گونہ عذاب

آمد از کعبہ در ولایت روم
تا شدند اہل روم از و محروم

از ہمہ ملک روم قونیہ را
برگزید و مقیم شد ایں جا

بشنیدند جملہ مردم شہر
کہ رسید از سفر یگانہ دہر

ہمچو گوہر عزیز و نایاب ست
آفتاب از عطاش پرتاب ست

نیستش در ہمہ علوم نظیر
ہست از سرہائے عشق خبیر

رو نہادند سوئے او خلقاں
از زن و مرد و طفل و پیر و جواں

آشکارا کراتش دیدند
زو چہ اسرارہا کہ بشنیدند

ہمہ بردند از دولا تیہا | ہمہ کردند از وردا تیہا
چند روزے بریں نسق چو گذشت | کرد مہ مرد و زن مریدش گشت
بعد ازاں ہم علاء دیں سلطاں | ز اعتقادِ تمام با میراں
آمدند و زیارتش کردند | قند پند او راز جاں خوردند
گشت سلطاں علاء دیں چوں دید | روئے او را بعشق و صدق مرید
چونکہ وعظش شنید شد حیراں | کرد او را مقام در دل و جاں
دید بسیار از و کرامتہا | یافت در خویش از دعاتیہا

بعد دو سال از قضائے خدا | سر بہ بالیں نہاد او ز عنا
شاہ شد از عطائے او محزوں | ہم ازاں غصہ اش نماند سکوں
آمد و نشست پیشِ او گریاں | با دو چشم پُر آب و دل بریاں
گفت ایں رنج دیم از و زائل | شود ار ہست حق بما مائل
گر شود نیک بعد ازیں سلطاں | او بود من شوم رہیش از جاں
ہمچو لشکر کشیش کردم من | خدمت او کنم بجان و بتن
چوں بدید پیش ہر زماں سلطاں | باز کردے اعادہ آں پیماں
شہ چو گشتے روانہ سوئے سرا | او بگفتے بحاضراں کہ ہلا
اگر ایں مرد راست می گوید | از خدا او دما ہمی خواہد
وقت رحلت رسیدہ است مرا | رفت خواہم ازیں جہانِ فنا
زانکہ گر من شوم بظاہر نیز | بادشاہ، ایں جہاں شود ناچیز

همه عالم شوند مستِ خدا — همه چون من روند بے سر و پا
همه از کارہا فرو مانند — همه حیران عشق ہو مانند
حالتِ جملہ چون چنیں گردد — عشقِ شاں دائما قریں گردد
نشود یافتہ خورش پوشش — خلق مانند جملہ از کوشش
زانکہ آں شہریار سلوک — گفت دارند ناس دین ملوک
چون جہاں را ہنوز مہلت ہست — گرچہ خود نیست ہست او پیوست
عمر دارد ہنوز ایں ہستی — ماند خواہد بلندی و پستی
پس یقیں شد کہ رفت خواہم من — تا نگردد خراب عالم تن
خود ہمہ بود ناگہ از دنیا — نقل فرمود جانبِ عقبےٰ
چون بہار ولدؒ نمود رحیل — شد ز دنیا بسوئے ربِ جلیل

شہ ز غم ہفت روز بر ننشست — دل چون شیشہ اش ز درد شکست
ہفتہ خواں نہاد در جامع — تا بخوردند قانع و طامع

تعزیہ چون تمام شد پس ازاں — خلق جمع آمدند پیر و جواں
ہمہ کردند رو بفرزندش — کہ توئی در جہاں مانندش
بعد ازیں دست ما و دامنِ تو — ہمہ بنہادہ ایم سوئے تو رو
شاہ ما بعد ازیں تو خواہی بود — از تو ما ہم جملہ مایہ و سود

در بیان نشستن مولانا جلال الدین قدسنا اللہ بسرہ العزیز برجائے والدش بہاء الدین ولد رضی اللہ عنہ و بعلم و عمل و زہد و تقوے و فتوی ہمچوں پدر آراستہ شدن و رسیدن سید برہان الدین محقق عظم اللہ ذکرہ بطلب شیخ خود بقونیہ و شیخ را نایافتن و فرزندش مولانا جلال الدین را قدس اللہ سرہ دیدن کہ در علوم ظاہر بنہایت شدہ بود و بمرتبہ پدر رسیدہ و بدو گفتن کہ بعلم وارث پدر شدی الا پدرت را غیر ازیں احوال دیگر بود و آں آمدنیست نہ آموختنی بر رستہ است و بر بستہ و آں احوال از حضرتش بمن رسیدہ است آنرا نیز از من کسب کن تا در ہمہ چیز ظاہراً و باطناً وارث پدر گردی و عین او شوی واللہ اعلم۔

شست برجاش شہ جلال الدین	رو بدو کرد خلق روئے زمیں
چوں پدر گشت زاہد و دانا	سرور و شاہ جملہ علما
مفتی شرق و غرب گشت بعلم	از جہاں جہل در نوشت بعلم
علم دین احمدی افراشت	ہر کہ آں داشت مرد ابتر داشت
کہ پدر او ست وز پدر افزوں	حرکاتش ز یک دگر موزوں
بے قراراں شدند از و ساکن	ہمہ در ظلّ او ز خوف ایمن

مدتے چوں بماند در ہجراں	طالب شیخ خویش شد برہان
گشت بسیار و اندر آخر کار	داد بادے خبر یکے مختار

گفت شیخت بدان که در روم است — غیرت پنهان بجمله معلوم است
این طرف عزم کرد آن طالب — عشق شیخش چو شد برو غالب
آمد از عشق شیخ خود تازان — با هزاران تبختر و نازان
گشت از شیخ پُر چو جام از مے — همچنان کز شکر شود پُر نے
چونک شادان بقونیه برسید — شیخ خود را ز شهریان پرسید چونکه
همه گفتند آنک می جوئی — هر طرف بهر او همی پوئی آنکه
هست سالے که رفت از دنیا — رخت را برد باز در عقبیٰ
جسم خاکیش رفت اندر خاک — جان پاکش گذشت از افلاک
گفت ریدک که شیخ اندر ماست — شیخ جانست و جان ز تن نه جداست
عین شیخم ز من نماند اثر — هیچ دیدی شکر جدا ز شکر

کرد آغاز گفت جلوه کنان — که منم شیخ بے خطا و گمان
خلق را پیش خویش دعوت کرد — گشت از جان غلام او زن و مرد
شهر جمله مرید او گشتند — در درون تخم مهر او کشتند
همه گفتند توئی بهاء ولد — بلک هم سر سر و نور احد بلکه
در گمان شان نبود هیچ خطا — صد چنان بود آن شه والا
گفت از ان پس بشه جلال الدین — گرچه در علم نادری و گزین
لیک بد والد تو صاحب حال — جوے آن زاو درگذر از قال
قال او را گرفته بد دوست — همچو من شو ز حال او سرمست

تا تمامت تو وارثش باشی　　نور اندر جهان چو خور پاشی
وارث والدی تو اندر پوست　　مغز من برده ام نگر در دوست
از مرید پدر چوں آن بشنید　　گشت جان دیگر در تن نه تمید

در بیان مرید شدن مولانا جلال الدین قدس الله سره العزیز سید برهان الدین محقق را رضی الله عنه و مدت نه سال در صحبت او بودن و بعد ازاں نقل کردن سید برهان الدین و مولانا جلال الدین بمجاهده و ریاضت مشغول شدن و بکمال شیخی رسیدن و عین او گشتن و قطب زمان خویش شدن چنانک کاملان و واصلان و قطبیان اولین و آخرین محتاج عنایت او بودند۔

شد مریدش زجان و سر بنهاد　　همچو مرده به پیش او افتاد
پیش او چوں بمرد زندش کرد　　گریه اش بر دکان خندش کرد
گشت غم را و عین شادی کرد　　دیده را کشاد و هادی کرد

بود در خدمتش بهم نه سال　　تا که شد مثل او بقال و بحال
هم مرد مر شدند در معنی　　زانک یکدل بدند در معنی　　زانکه

ناگہاں سید ز جہانِ فنا | کرد رحلت سوئے سرائے بقا
ماند بے او جلال دیں تنہا | روز و شب کرد روی سوئے خدا
خواب و خور را دراں ہوس بگذاشت | علم جہت دجوے را افراشت
پنج سال ایں چنیں ریاضت کرد | از سر صدق و سوز نالہ و درد
عمل دور در را چو کرد قریں | رفت ہمچو ملک بچرخ بریں
بے عدد شد کرامتش پیدا | پیش ہر پیر و نزد ہر برنا
دہ ہزارش دید بیش شدند | گرچہ اول ز صدق درد بدند

وعظ گفتے زجود بر منبر | گرم دیگرا جو وعظ پیغامبر

در چنیں دعوت ذکی مشغول | عاشقاں را مراد ازو حصول

بالائے عالم اولیا عالم دیگرست وآں مقام معشوقیست ایں خبر در عالم نیامد و ہیچ گوشے نرسید، مولانا شمس الدین تبریزی عظم اللہ ذکرہ جہت مولانا جلال الدین قدسنا اللہ بسرہ ظاہر شد تا اورا از عالم عاشقی و مرتبہ اولیائے واصل سوے عالم معشوقی برد زیرا از ازل گوہر آں دریا بود کہ کل شیئ یرجع الی اصلہ

ناگہاں شمس دیں رسید بوے | گشت فانی ز تاب نور شے

ازورای جهان عشق آواز — برساند بی دف و بی ساز
شرح گردش ز عالم معشوق — تا که سرش گذشت از عیوق
گفت اگرچه بباطنی تو گرد — باطن باطنم من این بشنو
سر اسرار و نور انوارم — نرسند اولیا با اسرارم

دعوتش کرد در جهان عجب — که ندید آن بخواب ترک و عرب
شیخ استاد گشت نوآموز — درس خواندی بکودکیش هر روز
منتهی بود مبتدی شد باز — مقتدی بود مقتدی شد باز
گرچه در علم فقه کامل بود — علم نو بود که بوی بنمود
عاشق راستین بود نادر — باشد از مردمان نهان چو سر

شمس تبریز بود از آن شاهان — دعوتش کرد لاجرم سوی آن
جنس او بود هم بدان پیوست — از ره جان بجان جان پیوست
رهبرش گشت شمس تبریزی — آنکه بودش نهاد خونریزی
پیش ازین گفته ایم قصهٔ او — در سر آغاز جوی آنرا تو

مولانا شمس الدین ح ...

تبریزی عظم الله ذکره که سردر بادشاه معشوقان بود مولانا قدس الله سره
بسره ازین روجهت وی میفرماید۔

طیور الضحیٰ لا تستطیع شعاعه فکیف طیور اللیل تطمع ان تریٰ

لیک معشوق را نکرد خدا مشتہر نے نہاں و نے پیدا
حال معشوق مانده است نہاں از خواص و عام در دو جہاں
نے ولی دید نے عدو او را حق ز غیرت نہفت آں رو را
شمس تبریز بود ازاں شاہاں کہ ز غیرت خداش کرد نہاں
زاں سبب خویش را بمولانا بنمود او کہ بود جنس او را
ہر دو یک سر بدند و یک گوہر زاده از نور سر و تاب از خور
در مراتب ز جملہ بگذشتند روز و شب یار ہمدگر گشتند

بود یک روز مست مولانا گفت فردا بروز حشر و جزا
اولیا جوق جوق برخیزند شاد و با ہمہ گرد در آویزند
انبیا ہمچناں گروه گروه حشر گردند شاد بے اندوه
مومناں نیز ہر طرف افواج سر برآرند چوں ز بحر امواج
ده ده و صد صد و ہزار ہزار جنس با جنس خویش روز شمار

شمس دین و من از ہمہ ممتاز حشر گردیم ہر دو بے انباز

در بیان آنکه مولانا قدسنا اللہ بسرہ در غیب مشاہدہ می کرد قطبے را دید
که چہار ہزار مرید داشت، ہمہ اولیا رگشتہ وبحق رسیدہ، درچلہ از حق تعالیٰ
حالتے ومقامے می خواست کہ بداں نرسیدہ بود و در تمنائے آں یارب
یارب می گفت تا حدے بزرگ بود کہ بموافقتِ او ہمہ اجزائے زمین
وآسمان وارواح سفلی وعلوی یارب می گفتند، نور خدائے تعالیٰ تا
بمقدار سیرے لطیف بر گوش مولانا شمس الدین تبریزی عظم اللہ ذکرہ می زد
ومی گفت لبیک لبیک چون سہ بار ایں معنیٰ مکرر شد شمس الدین از سر
ناز گفت کہ یارب آں شیخ می گوید لبیک یا او گو، در حال پے ایں سخن نور
پیاپے بر گوش شمس الدین می زد کہ لبیک لبیک واللہ اعلم بالصواب
والیہ المرجع والمآب،

سخن شمس دین ہمی گفتی	در اسرار او ہمی سفتی
بہر فہم جماعت محجوب	ترک کردیم ذکر آن محجوب
باز در راہ منزل افتادیم	باز سر رشتہ را زکف دادیم
چہ توان کرد چونکہ قوم لئیم	ترک گوہر کنند از پے سیم
دید یک روز فاش مولانا	عالم غیب در شہے والا
کہ بداو را مرید چار ہزار	ہمہ دانا و واصل و مختار
بانگ می کرد در طلب یارب	باہزاران نیاز و شوق وادب

همه هستی از آشکاره و نهفت — گشته با او رفیق در آن گفت
با چنیں مرتبه خداو را — یک جوابی نداد از استغنا
نور حق از ورای حسن بشر — گشت چون قرص آفتاب و قمر
بر سر و روی و گوش شمس الدین — نیز و آن نور بی یسار و یمین
گفته لبیک بی عدد آن دم — نور صاف لطیف بی لب و دم
گفت یارب چو او همی گوید — نور سوی من از چه می پوید
چون چنیں گفت نور بی اهمال — خویش صد بار زد و بر و در حال
با هزاران تواضع و لبیک — کرد اکرام شمس دین آن بیک
زین بدان کو چگونه معشوقست — گر ترا نور و سر فاروقست

محامدِ اصحاب

سید برہان الدینؒ محقق ترمذی

پختہ گرد و از تغیر دور شو — رو، چون برہانِ محقق نور شو
چون ز خود رستی ہمہ برہان شدی — چونکہ گفتی بندہ ام سلطان شدی

حضرت شمس الدین تبریزیؒ

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب — گر دلیلت باید از وی رو متاب
از وے ار سایہ نشانے میدہد — شمس ہر دم نورِ جانے میدہد
سایہ خواب آرد ترا ہمچو سمر — چوں برآید شمس، انشق القمر
خود غریبے در جہاں چوں شمس نیست — شمس جاں باقیست کو را امس نیست
شمس خارج اگرچہ ہست فرد — مثلِ او ہم می توان تصویر کرد
لیک آں شمسے کہ شد ہستش اثیر — نبودش در ذہن و در خارج نظیر

در تصور ذات او را گنج کو — تا درآید در تصور مثل او

شمس تبریزی که نور مطلق است — آفتاب است وز انوار حق است

چو حدیث روی شمس الدین رسید — شمس چارم آسمان سر در کشید

واجب آمد چونکه بردم نام او — شرح کردن رمزی از انعام او

این نفس جان دامنم برتافته است — بوی پیراهان یوسف یافته است

کز برای حق صحبت سالها — باز گو رمزی از آن خوش حالها

تا زمین و آسمان خندان شود — عقل و روح و دیده صد چندان شود

گفتم ای دور افتاده از حبیب — همچو بیماری که دور است از طبیب

لا تکلفنی فانی فی الفنا — کلت افهامی فلا احصی ثنا

کل شیء قاله غیر المفیق — ان تکلف او تصلف لا یلیق

هرچه می گوید موافق چون نبود — چون تکلف نیک نالائق نمود

من چه گویم یک رگم هشیار نیست — شرح آن یاری که او را یار نیست

خود ثنا گفتن ز من ترک ثناست — کاین دلیل هستی و هستی خطاست

شرح این هجران و این خون جگر — این زمان بگذار تا وقت دگر

مشرق خورشید برج قیرگون — آفتاب ما ز مشرقها برون

مشرق او نسبت ذرات او — نی برآمد، نی فرو شد ذات او

باز گرد شمس میگردم عجب — هم ز فر شمس باشد این سبب

شمس باشد بر سیہا مطلع   ہم از وجہلِ سیہا منقطع
صد ہزاراں بار بریدم امید   از کہ از شمس، ایں شما باور کنید
تو مرا باور مکن کز آفتاب   صبر دارم من و یا ماہی زآب
ور شوم نو امید، نومیدی من   عین صنع آفتاب است اے حسن
از عشقِ شمس دین بے ناخنیم   ورنہ ما آں کوررا بینا کنیم

شیخ صلاح الدین زرکوب ؒ

در عیاں خواہی صلاح الدین نمود   دیدہ ہا را کرد بینا و گشود
فقر را از چشم و از سیمائے او   دید ہر چشمے کہ دارد نور ہو
شیخ فعّال است بے آلت چو حق   با مریداں دادہ بیگفتے سبق
دل بدستِ او چو موم نرم رام   مہر او گہ ننگ سازد گاہ نام
این صدا در کوہ دلہا بانگ کیست   گہ پر است از بانگ ایں گہ تہی است
ہر کجا ہست آں حکیم اوستاد   بانگِ او زیں کوہ دل خالی مباد

حسام الدین ابن اخی ترک

چونکه موصوفی باوصافِ جلیل — ز آتشِ نمرود بگذر چون خلیل
گردد آتش بر تو هم برد و سلام — ای عناصر مر مزاجت را غلام

زان ضیا گفتم حسام الدین ترا — که تو خورشیدی و این دو وصفها
کاین حسام و این ضیا یکیست هین — تیغِ خورشید از ضیا باشد یقین
نور از آنِ ماه باشد وین ضیا — آنِ خورشید این فرو خوان از نبا
شمس را قرآن ضیا خواند ای پدر — وان قمر را نور خواند این را نگر
شمس چون عالی‌تر آمد خود ز ماه — پس ضیا از نور افزون دان بجاه

بر فلک محمودی ای خورشید فاش — بر زمین هم تا ابد محمود باش
تا زمینی با سمائی بلند — یک دل و یک قبله و یک خو شوند
تفرقه برخیزد و شرک و دوئی — وحدت است اندر وجودِ معنوی
چون شناسد جانِ من جانِ ترا — یاد دارند اتحاد و ماجرا
موسیٰ و هارون شوند اندر زمین — مختلط خوش همچو شیر و انگبین

ای ضیاء الحق حسام الدین راد — اوستادانِ صفا را اوستاد

گر نبودے خلق محجوب و کثیف — ور نبودے حلقہا تنگ و ضعیف

در مدیحت دادِ معنی دادمے — غیر این منطق لبے بکشادمے

شرحِ تو غیب است بر اہلِ جہاں — ہمچو رازِ عشق دارم در نہاں

مدح تو حیف است با زندانیاں — گویم اندر مجمعِ روحانیاں

قدرِ تو بگذشت از درکِ عقول — عقل در شرحِ شما شد بوالفضول

من بگویم وصفِ تو تا رہ برند — پیش ازاں کز فوتِ آں حسرت خورند

نورِ حقی و بحق جذابِ جاں — خلق در ظلماتِ وہم اندر گماں

شرطِ تعظیم است تا ایں نورِ خوش — گردد ایں بیدادگاں را سرمہ کش

اے ضیاء الحق حسام الدین و دل — کے تواں اندود خورشیدے بگل

قصد کردستند ایں گل پارہا — کہ بپوشانند خورشیدِ ترا

در دلِ کہ لعلہا دلالِ تست — باغہا از خندہ مالامالِ تست

محرمِ مردیت را کو رستمے! — تا ز صد خرمن یکے جو گفتمے

چوں بخواہم کز سرت آہے کنم — چوں علیؓ سر را بچاہے کنم

چونکہ اخواں را دلِ کینہ ور است — یوسفم را قعرِ چہ اولیٰ تر است

اے ضیاء الحق حسام الدینؒ بیا — کہ نروید بے تو از شورہ گیا

از فلک آویختہ شد پردۂ — از پئے نفرینِ دل آزردۂ

ایں قضا را ہم قضا داند علاج — عقلِ خلقاں در قضا گیج است گیج

اژدہا گشت است آں مارِ سیاہ — آنکہ کرمے بود افتادہ براہ
اژدہا و مار، اندر دستِ تو شد عصا، اے جانِ موسیٰ مست تو
حکم خذہا لاتخف دادت خدا تا بدست اژدہا گردد عصا
ہیں ید بیضا نما اے بادشاہ صبحِ نو بکشا ز شبہائے سیاہ

صحت نامہ

غلط	صحیح	صفحہ	سطر
جواہر حیفہ	جواہر مضیہ	۶	۴
	″	″	۱۰
افغانستان	افغانستان کا	″	۱۹
زذالث	ابن اثیر جزو ثالث	۱۰	۱۸
خا	اتحاد	۱۱	۸
مولانا شبلی مرحوم نے	مولانا شبلی مرحوم نے لکھا ہے کہ	۱۷	۱۶
باسر	انسر	۲۳	۵
نہیں	انہیں	۳۱	۱۲
جلبا	طلبا	۳۵	۱۶
عالم رویا	عالم رویا	۳۶	۹
برینیکا	برٹینیکا	۴۰	۱۸
موانا	مولانا	۵۳	۱۲
اسدم	اسلام	″	۱۸
زورجہ	زوجہ	۵۷	۱۷
نند	عتیقانند	۷۵	۷
بہ بدیانت	بہ دیانت	۷۷	۳
رحم آیا	رحم نہیں آیا	۱۱۳	۵
بالصراہ	بالصراحۃ یہ	۱۱۵	۱۲
جندی	تجنذی	۱۳۰	۱۳
درالحکم	دررالحکم	۱۴۵	۷
سبت	رست	۱۵۱	۳
غزل سر	غزل سرا	″	۱۳
بہانہائے	بہ بیانہائے	۱۵۹	۱۴

غلط	صحیح	صفحہ	سطر
رڈیا	رڈیاؤس	۱۶۲	۱۹
میکنی ثمن	اور ابنطلے چہ بیسہ می کنی کمن	۱۷۵	۱۴
مولانا کو	مولانا سے	۱۸۵	۱۱
ایلجز	ریلیجز	۱۸۶	۱۲
سہردر	مسرور	۱۹۷	۹
ریویو	ریو	۲۰۷	۴ و ۵
حضرت مولانا	مولانا حضرت	۲۲۰	۱۷
برتوے	برتوی	۲۲۷	۳
خدآئے	خدمت میں آئے	۲۳۶	۲
حوس	خوش	۲۳۸	۱۶
تذویر	تزویر	۲۴۴	۶
قنائے بستہ	حنائے بستہ	۲۴۵	۱۰
خوبریاں	خوب رویاں	۲۴۹	۸
بیت	بہت	۲۵۵	۱۱
اس بغیر	اس کے بغیر	۲۷۶	۱۷
اکمل	اکمل الدین تبریزی	۳۰۴	۱۹
بیزرہ	بیزار	۳۱۲	۱۰
جھول	چول	۳۲۴	۱۳
توجہ کی	توبہ کی	۳۳۷	۱۳
	خطاب	۳۳۸	۴
عال	عال	۳۳۹	۳
یہ مرد نستتی	یہ امر دانستنی ہے	۳۴۶	۱۳
تو میرے ایزیاں	تو میری انتڑیاں	۳۸۹	۱
بوارق الالماع	بوارق الاسماع	۴۴۲	۴
منکرۃ	منکریہ	〃	۹
نفباط	انضباط	۴۶۲	۱۱

ہماری سوانح عمریاں

الفاروق۔ حضرت فاروق اعظمؓ کی لائف اور طرز حکومت اور عراق و شام، مصر اور ایران کی فتح کے پُراثر واقعات۔ قیمت عللہ

سیرۃ عمرؓ بن عبدالعزیز۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز خلیفۂ اموی کے سوانح حیات اور انکے مجددانہ کارنامے۔ قیمت للعہ

سیرۃ النعمان۔ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی سوانحعمری اور اجتہادات و مسائل۔ قیمت للعہ

المامون۔ خلیفہ مامون الرشید عباسی کے عہد سلطنت کے مفصل حالات جن کو پڑھکر دولت عباسیہ کے عروج و زوال کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے پھرجاتا ہے۔ قیمت صہ

الغزالی۔ امام غزالی کی سوانح عمری، ان کا فلسفہ، علم کلام اور تصوف میں انکے مجددانہ کارنامے۔ قیمت معہ

سوانح مولانا روم۔ اسلام کے مشہور صوفی شاعر اور متکلم مولانا جلال الدین رومی کی مفصل سوانحعمری، فضائل و مناقب، انکے تصوف کے اسرار، علم کلام کے رموز اور مثنوی شریف پر مبسوط تبصرہ اور اس کے منتخب مضامین کے اقتباسات۔ (زیر طبع)

امام رازی۔ امام رازی کے سوانح و حالات اور تصنیفات کی تفصیل۔ قیمت ہے

حیات شبلیؒ۔ علامہ شبلیؒ کے سوانح حیات اور علمی و عملی کارنامے، جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندویؒ کی زندگی کا آخری عظیم الشان علمی کارنامہ

قیمت عہ

معارف سلیمان نمبر۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے سیر و سوانح، اخلاق و شمائل، فضائل و کمالات اور انکے علمی و دینی، قومی و ملی، اصلاحی و تعلیمی کارناموں اور خدمات کا دلآویز مرقع۔ قیمت للعہ

سیرۃ عائشہؓ

حضرت عائشہ صدیقہ کے حالات زندگی اور ان کے مناقب و فضائل اور انکے علمی کارنامے

قیمت ے